نقوش

سالنامہ



رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲
ٹیلیفون نمبر ۵۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

سالنامہ

۱۲۴
جنوری ۱۹۷۹ء

مدیر
محمّد طفیل

ادارۂ فروغِ اُردو ایبک روڈ انارکلی لاہور
قیمت موجودہ شمارہ ۲۴ روپے

ترتیب

افسانے ، اسکیچ

نظمیں ، غزلیں

مضامین

(جو صرف علامہ اقبال سے متعلق ہیں)

اور تبصرے

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر اور ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے طبع کرا کے ادارہ فروغ اُردو لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

"آپ کمزور ہو گئے ہیں!"

"جی ہاں! ان دنوں عشق کی فرصت نہیں ملی۔"

یہ مکالمہ جس سے ہوا۔ وہ میرا دوست تھا، میرے دکھ درد کا شریک، میری سلامتی کا خواہاں، میری عزت کا طالب، چنانچہ وہ بہت گھبرایا۔ اُسے وسوسوں نے آن گھیرا۔ اُسے وہموں نے آن دبوچا، اُس نے میرے کچھ ادھورے اور کچھ نیم راضی عشقوں کو ٹٹول ڈالا۔

اِدھر میں اپنی للک میں غلطاں، اپنی سوچ کے سمندروں میں غرق!

پھر میرا دوست طیش میں آ گیا۔ اس نے مجھے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں پشیمان، میں نادم! غرض اس کی زبان پر جو کچھ آیا۔ اُس نے کہہ ڈالا۔

پھر اُس نے پھنکارتے ہوئے مجھ سے براہ راست سوال کر ڈالا "کیا ابھی تک اس مشغلے سے دل نہیں بھرا؟" میں اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے جواب چاہتا تھا۔

میں عجیب کشمکش میں تھا۔ جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا۔ سچ کہہ نہیں سکتا تھا۔ بالآخر ہمت کی اور کہہ ڈالا "دل ابھی تک نہیں بھرا۔"

اُس کا دھیان قلوپطرہ کی طرف نکل گیا۔ مونالیزا کی طرف نکل گیا۔ میرا دھیان نقوش کے خالی صفحات کی طرف نکل گیا۔ جس میں مَیں نے ابھی لاکھوں کروڑوں حروف سجانے تھے۔

میرا دوست، جو میرا ضمیر تھا۔ وہ بھی حیران تھا۔ میں بھی پشیمان تھا۔

مَیں بھی پشیمان تھا۔ وہ بھی حیران تھا۔

محمد طفیل


افسانه

نئی قمیص

کرشن چندر

یاد نہیں کس نے پہلے پہل ملوایا تھا دھواں دھواں سی آنکھیں میلی بھوری جلد جسم پہ سر سے پاؤں تک کہیں جھکاؤ نہیں ٹانگیں ملا کے اور بالکل اکڑ کے چلنے کا انداز کپڑے اتنے میلے اور کثیف کہ اب ان کے اصلی رنگ و روپ اور ساخت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا یہ بھی نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ پتلون پہنے ہے یا پائجامہ بس یہ محسوس ہوتا تھا کہ جو وہ پہنے ہے وہ اس کے جسم کا ہی ایک حصہ ہے پہلی نگاہ میں معلوم ہو گیا کہ آدمی میرے ڈھنگ کا ہے اس کے میلے گندے ہونٹوں کا تبسم بیحد ذہین اور طنز آمیز تھا۔

"ان سے ملو یہ عرش ہیں فلمی مکالمے بہت عمدہ لکھتے ہیں" ملوانے والے نے مجھ سے کہا۔ اپنے تعارف کے جواب میں اس نے بڑے بڑے ناخنوں والا میلا ہاتھ میری طرف سرکا دیا میں نے اسے ذرا سا ہلا کے واپس کر دیا مگر غالباً اسے اپنے ہاتھ کے واپس آجانے کا احساس نہ تھا وہ ہاتھ میرے اور اس کے درمیان کئی لمحوں تک خلا میں ایک عجیب بے یقینی کے عالم میں جھولتا رہا۔

عرش میری طرف دیکھ کر تھوڑا سا ہنسا اس کی ہنسی بڑی گاڑھی تھی گہری صعوبتوں کا ملغوبہ بڑی بد ذائقہ ہنسی تھی۔ مگر آپ کچھ نہیں کر سکتے ایسی ہنسی کا۔ کیونکہ اس دنیا میں دوسرے لوگ بھی تو رہتے ہیں وہ ہنستے ہیں تو آپ کو ان کی ہنسی جھیلنا پڑتی ہے یہی حال غالباً دوسرے لوگوں کا ہوتا ہوگا آپ کے سلسلے میں ایک زنجیر ہے عرش سے فرش تک.....

"انھیں کچھ کام دیجئے۔" ملوانے والے نے مجھ سے کہا (اس وقت حافظہ ملوانے والے کی تصویر سے بالکل خالی ہے کوئی صورت نہیں ابھرتی بس اتنا یاد ہے کہ ان دنوں میرے پاس فلمی کام بہت تھا بالعموم نہیں ہوتا اتفاق سے ہو گیا اس لئے ایک مددگار کی تلاش میں تھا) میں نے عرش کی آنکھوں میں جھانکا مگر ان کی آنکھوں کی پتلیوں پہ کہرا چھایا ہوا تھا میں کچھ معلوم نہ کر سکا، اس کی پتلیوں کا رنگ بھی معلوم نہ کر سکا۔

پھر اس دھند سے نکل کر ایک جھجکتی شرمیلی مہذب سی نگاہ مجھ تک پہنچی جیسے میرے دل کو ٹٹول رہی ہو بہت آہستہ سے دستک دے رہی ہو میں نے عرش سے کہا۔ "آپ کہاں کے ہیں عرش صاحب؟"

"اکبر آباد کا مغل ہوں۔" اس نے کڑی آواز میں کہا پھر وہی گاڑھی ہنسی..... بیزار کن..... جلدی سے وہ سر جھکا کر بیڑی پینے لگا جیسے بیڑی کے دھوئیں میں وہ اس ہنسی کو چھپا لے گا۔

میں نے مکالمے لکھوا کے دیکھے واقعی عمدہ تھے زبان شستہ و رفتہ منجھا ہوا مشاق قلم سین سمجھتا ہوا ڈرامے کے اسلوب سے واقف، کیمرے کی ضروریات سے آگاہ کرداروں کی افتاد طبع سے آشنا مجھے بڑی حیرت ہوئی میں نے پوچھا "عرش صاحب آپ دوسروں کے لئے ادھر ادھر کے چند متفرق سین کیوں لکھتے ہیں جن پہ آپ کا نام بھی نہیں دیا جاتا آپ خود سے کوئی فلم کیوں نہیں لکھتے

"صاحب چھ سات فلمیں لکھی تھیں۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا۔

"پھر؟"

"دو نے سلور جوبلیاں بھی منائیں۔" وہ پھر چپ ہو گیا۔

پھر؟ میں نے پوچھا

"پھر کچھ نہیں۔" اس نے آہستہ سے اپنے سر کے سیاہ و سفید بالوں میں اپنی نیم مردہ انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "اگلا سین دیجئے۔" میں نے اگلا سین دیا اس نے دو گھنٹے میں لکھا مجھے پسند نہیں آیا پھر سے لکھنے کو کہا تین گھنٹے کے بعد اسی سین کا نیا خاکہ سنایا جو پہلے سے بھی بُرا تھا۔

"دراصل بات یہ ہے۔" وہ سر جھکا کے بولا۔ "میں پہلی چوٹ والا رائٹر ہوں پہلا وار اگر اچھا پڑا تو دوسرا اس سے بھی اچھا پڑتا ہے دھند غبار اور کہرے میں لپٹی ہوئی اس کی پتلیوں کے اندر سے پھر وہی شرمیلی جھجکتی سی نگاہ مجھ تک آئی۔ مجھے بُرا نہیں لگا وہ آدمی میرے لکھنے کا انداز بھی وہی ہے میں نے اسے بتایا ذہن پہلی مرتبہ جو راستہ بنا لیتا ہے پھر اسی جادہ پر رواں ہو جاتا ہے برق رفتاری سے منزل تک پہنچتا ہے اِدھر اُدھر بھٹکنے کاٹ چھانٹ کرنے دوبارہ آگے پیچھے دیکھنے سے جی بہت گھبراتا ہے ہاں حرفِ اول ہی حرفِ آخر ہے شاید اسی لئے آپ بھی فلموں میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ میں نے اس سے کہا۔ "صرف یہی بات نہیں ہے۔" عرش چاقو سے پنسل کی نوک تیز کرتے ہوئے بولا۔ "پھر کیا بات ہے۔" میں نے پوچھا۔ وہ دیر تک چپ رہا کچھ دیر تک ہونٹ سکوڑے گم صم بیٹھا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ "بس معاملہ کچھ نہیں ...... آگئے ......"

چار چھ روز کی ملاقاتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بحث سے کتراتا ہے اپنی دلیل پر زیادہ دیر تک نہیں ٹکتا وہ کسی دوسرے سے اپنی بات منوانے اور دوسرے کو قائل کر دینے کا قائل بھی نہیں ہے وہ بس اپنی رائے دے گا دے کر چپ ہو جائے گا آپنے اس کی بات مان لی تو ٹھیک ورنہ وہ آپ کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا۔ زیادہ باتیں کرنے سے "کج بحثی سے" شیخی مارنے سے اسے نفرت ہے یہ سب خامیاں جس فلمی ادیب میں ہوں اس کا کامیاب ہونا تقریباً ناممکن ہے نامعلوم کس گھپلے میں وہ پہلی دو سلور جوبلی فلمیں لکھ گیا۔

اس کی کامیابی کے راستے کے عین بیچ ضرور کچھ ہوا ہوگا اب میں اتنے دن ملنے کے بعد محسوس کر سکتا تھا کہ کیا ہوا تھا اس کی مہذب شرافت اُس کا شرمیلا پن اس کی باہر کی دنیا سے زیادہ نہ الجھنے کی خواہش اس کے راستے میں آئی تھی وہ دھیرے دھیرے کامیابی کی منزل سے بچھڑتا گیا اور جتنا زیادہ بچھڑتا جاتا اتنا ہی وہ خود اور پیچھے ہٹتا جاتا حتیٰ کہ کامیابی بہت دور رہ گئی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی گردن کو ذرا سا خمیدہ کر کے کہہ رہا ہے۔ "جی ہاں آپ آگے جائیے میں پیچھے کو جاتا ہوں آداب عرض۔"

سنا ہے اسے ایک لڑکی سے محبت ہوئی تھی وہ غالباً اس کی فلم کی ہیروئین تھی مگر بیچ میں پروڈیوسر کود گیا اور پروڈیوسر ظاہر میں رائٹر سے بہتر آدمی ہوتا ہے اس نے عرش کی قابلیت اور کارکردگی کے باوجود اسے اپنی دوسری فلم سے کاٹ دیا۔

عرش نے کہیں اور ملازمت کر لی وہ فلم نہیں چلی دوسری بھی نہیں چلی۔ اس کی وجہ سے نہیں فلم نہ چلنے کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں

پھرا سے وہ تکمرِ طم بھی نہیں آتی تھی جس کے ذریعے آدمی بڑی آسانی سے اپنی ناکامی کا بوجھ کسی دوسرے نالائق کے کندھے پر ڈال کر خود سرخرو ہوجاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرش بڑی تیزی سے زوال کی سمت جانے لگا۔ زوال کی بھی منزلیں ہوتی ہیں آدمی ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف اور پھر ایک ہی جست میں نیچے بھی اترتا ہے پہلے دبی دبی شریفانہ مزاحمت، ایک عادت کی ایک سلسلے کی مخالفت پہلے تو عرش نے اس زوال کے خلاف مزاحمت کی ہوگی پھر مجھے ایسا لگتا ہے کہ زندگی کی منزل پر آ کر عرش نے اپنے زوال سے مفاہمت کر لی ہوگی اب وہ انتہائی دل لگن اور انہماک سے اس راستے پر گامزن تھا اب وہ خود کوشش کر کے اس پتھر کو بیچ میں سے ہٹا دیتا تھا جو اسے نیچے جانے سے روک سکتا تھا۔

مگر یہ سب کچھ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

پہلے دن تو صرف معاملت کی بات ہوئی تین سو ماہانہ پر بات طے ہوگئی اگلے چھ ماہ کے لئے۔ عرش نے کہا "مگر میں روز کے روز تنخواہ لوں گا دس روپے روز"۔ "روز کے روز کیوں ماہ بماہ کیوں نہیں اکٹھی رقم ملنے سے آپ کو آسانی رہے گی"۔ "جی نہیں دقت رہے گی" اس نے جواب دیا۔ "روز کے روز ہی ٹھیک ہے"۔ "اچھا چلئے روز کے روز حساب کیجیے دس روپے لیتے جائیے صبح دس بجے آئیے شام کو پانچ بجے جائیے۔

"ٹھیک ہے فی الحال دو دن کا ایڈوانس دے دیجیے"۔ عرش بیس روپے لے کر چلا گیا پھر چار روز تک نہیں آیا میں نے ملوانے والے سے شکایت کی وہ میری بات سن کر بہت ہنسا۔ بولا عرش کسی بھٹی والے کے جھونپڑے میں بیٹھا ٹھرا پی رہا ہوگا جب تک وہ بیس روپے ختم نہ ہوں گے نہیں آئے گا۔ آپ اس کو کبھی ایڈوانس مت دیجئے شام کو جب کام کر کے جائے دس روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیجئے۔ چوتھے دن عرش صبح صبح آ گیا اس نے ایسے کرب ناک لہجے میں اپنی بیوی کی شدید علالت کا ذکر کیا کہ وہ بالکل ایکٹنگ کرتا ہوا نظر نہ آتا تھا خیر میں نے پھر سے کام پر لگا لیا تین دن تک بالکل ٹھیک سے کام کرتا رہا چوتھے روز وہ کوئی بارہ بجے کے قریب آیا اس نے مجھے شکایت کرنے کا موقعہ بھی نہیں دیا۔ "لوکل ریلوے کا پاس کھو گیا تھا"۔ وہ آزردہ ہو کر بولا میں نے اسے لوکل کے پاس کے لئے ساڑھے آٹھ روپے دیئے وہ روپے جیب میں ڈال کر بولا "سین لائیے"۔ میں نے سین سمجھایا دس پندرہ منٹ کام کر کے بولا اگر آپ اجازت دیں تو میں ریلوے سٹیشن سے لوکل پاس بنوا کے آ جاؤں مشکل سے ایک گھنٹہ لگے گا شام کو بیحد لمبا کیو ہوتا ہے"۔ "جائیے"۔ عرش ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر گیا پھر اس دن نہیں آیا دوسرے دن آیا دیر تک میں نے اس سے کچھ نہیں کہا وہ بھی نہیں بولا دونوں خاموشی سے کام کرتے رہے۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا۔ "اتنا اچھا کام کرتے ہو"۔ میں بھڑک اٹھا۔ "اور کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔ اس شراب کی خاطر" وہ کچھ نہیں بولا۔ ان دنوں مجھ پر سدھار کا موڈ بہت غالب تھا میں سمجھتا تھا کہ انفرادی کوششوں سے افراد بدلے جا سکتے ہیں میں نے اس سے کہا۔ "میں تمھیں بدل دوں گا"۔ "جی"۔ وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ "تمھیں بدلنا ہوگا"۔ میں نے غصے سے کہا۔ "اتنا اچھا ادیب یوں گمنامی میں سڑتا رہے۔ میں اس فلم میں اپنے علاوہ تمہارا ٹائیٹل بھی دلواؤں گا "ADDITIONAL DIALOGUES BY ARSH" اس کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر پیدا نہ ہوا وہ سر جھکائے اپنی پنسل کی نوک تیز کرتا رہا۔ "تمھیں اپنی عادات بدلنا ہوں گی"۔ اب میں نے دوٹوک

فیصلہ کن لہجے میں اسے حکم دینا شروع کیا۔ "یہ کپڑے نہیں چلیں گے میرے ساتھ چلو بازار۔ آج ہی ابھی تمہارے لئے نئے کپڑے خریدے جائیں گے۔" وہ کچھ بولا نہیں مگر میری طرف رحم کی نظروں سے دیکھ رہا تھا کبھی کبھی ہونٹوں کے خم سے معلوم ہوتا گویا کہہ رہا ہو۔ "کیسے احمق سے پالا پڑا ہے۔" مگر کچھ بولا نہیں۔

میں نے بازار سے اس کے لئے تین جوڑے کپڑے خریدے تین تپلونیں تین قمیصیں ریڈی میڈ۔ ایک جوتا دو رومال پھر اسے شیونگ سیلون میں دھکیل دیا پھر اسے ایک حمام والے کے سپرد کیا وہاں سے جو نکلا تو اس کی جلد میں اس کے جسم کی اپنی رنگت جھلکنے لگی۔ "جی جب میں پہلے پہل بمبئی آیا تھا تو یہی رنگت تھی۔" عرش نے بڑی بیزاری سے کہا۔

"تمھی کیا اب نہیں ہے۔" "اب" وہ چپ ہو گیا اور اس کی پتلیوں کے گرد غبار گہرا ہو گیا پھر دیر تک نہیں بولا۔

"اب نہانے کو نہیں ملتا ہے۔ روز روز۔" آخر اس نے کہا۔ "تم شراب کم کر دو تو تمہیں نہانے کو روز ملے گا۔"

"شراب کم کر دینے سے نہانا کم کر دینا بہتر ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "دھیرے دھیرے بتدریج میں تمہاری شراب بھی کم کرا دوں گا تمہیں پھر سے انسان بنا دوں گا۔" میں بہ زیادہ زور تھا میری گفتگو میں۔ جیسے وہ تو موم کا پتلا ہو۔

"جی۔ جی۔ بہت اچھا۔" وہ بھی میری گفتگو کے دوران نرم موم لہجے میں میری ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔

"تم دن میں کتنی پی لیتے ہو؟"

"جتنی بھی مل جائے۔"

"پھر بھی؟"

"آدھی بوتل تو صبح ضروری ہے نہار منہ صبوحی۔ آدھی دوپہر میں رات کو ایک بوتل ڈیڑھ بوتل دو بوتل۔ رات کو جتنی بھی مل جائے۔" "تمہیں اپنی عادت کے خلاف جدوجہد کرنا پڑے گی۔" میں نے اس سے کہا۔ "صبح کو آدھی بوتل ملے گی دوپہر میں آدھی بوتل شام کو چلتے وقت تمھیں ایک بوتل کے پیسے دے دوں گا۔ باقی رقم ماہ بماہ تمہارے گھر پہنچا دی جائے گی۔"

"ماہ بماہ نہیں روز کے روز دیجئے گھر پر بھی۔"

"اچھا پندرہ دن کے بعد دے دوں گا۔"

"جی نہیں روز کے روز۔" "روز کے روز کیوں؟" "راشن لانا ہوتا ہے۔" "تمہارے ہاں کیا راشن روز آتا ہے راشن تو ہفتے کے ہفتے آتا ہے لہٰذا ہفتے کے ہفتے تمہارے گھر پہ رقم پہنچ جائے گی مگر تمھیں نہیں ملے گی تمھیں شراب چاہیئے نہ وہ تمھیں مل جائے گی اور کیا چاہیے۔"

"بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔" پھر وہ اپنی گاڑھی ہنسی ہنسا کوئی آٹھ دس روز تک ٹھیک کام چلا وہ وقت پہ آتا تھا کپڑے بھی صاف ستھرے پہن کر آتا تھا شیو بھی بنی ہوتی تھی لہجے میں ایک نئے اعتماد کی جھلک ملنے لگی میں بہت خوش ہوا اب اگلا تجربہ شروع کرنا چاہیے۔

میں نے آٹھ دس روز کے بعد کہا۔ "آج دوپہر میں تمھیں شراب نہیں ملے گی۔" وہ ایک تذبذب کے عالم میں دیر تک

میری طرف گھورتا رہا پھر بولا ٹھیک ہے۔ دوپہر کو اسے شراب نہیں دی گئی اس نے کچھ نہیں کہا کسی طرح کی وحشت نہیں ظاہر کی اطمینان سے کام کرتا رہا سہ پہر کو کوئی ساڑھے چار بجے کا وقت ہوگا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے روتے کیوں ہو۔ میں نے عرش سے پوچھا "روتا نہیں آنکھ سے پانی بہتا ہے" اس کی آواز میں کسی طرح کی اداسی یا لرزش نہیں تھی "کیوں بہتا ہے یہ" "ایسا ہی ہوتا ہے جب شراب نہیں ملتی تو آنکھوں سے پانی گرنے لگتا ہے" وہ بار بار رومال سے اپنی آنکھیں صاف کرتا جاتا مگر آنسو برابر اس کی آنکھوں سے بہے جاتے تھے ساڑھے پانچ بجے کے قریب اس کی یہ حالت ہو گئی گویا آنکھوں سے آنسوؤں کی جگہ جھرنے بہہ رہے تھے مگر کوئی شکایت نہیں کر رہا تھا۔ عاجز آ کر میں نے جلدی سے اس کے لئے ٹھرا منگایا دوسرے پیگ میں اس کے آنسو بہنے بند ہو گئے مگر میں آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہوں دوسرے دن میں نے اسے پھر دوپہر کے وقت ٹھرا نہیں پینے دیا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ڈیڑھ دو گھنٹے تو میں نے اور اس نے دونوں نے صبر کیا پھر ہولے ہولے اس کے سارے جسم پر کپکپی طاری ہونے لگی اس کا سارا جسم ایک خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا۔

پھر ٹھرا پلاتے ہی ٹھیک ہو گیا۔

بہت سوچ بچار کرنے کے بعد میں اسے ڈاکٹر سنگھل کے ہاں لے گیا ڈاکٹر سنگھل ہمارا فیملی ڈاکٹر ہے اس نے بڑی ہمدردی سے عرش کا معائنہ کیا دیر تک معائنہ کرتا رہا آخر کار میری طرف مڑ کر کہنے لگا۔

"آپ کا دوست الکوہلزم کا شکار ہے بہت پرانا مرض معلوم ہوتا ہے"

"پھر کیا ٹھیک نہیں ہو سکتا" "محض دواؤں سے ٹھیک نہیں ہو سکتا" "تو کیا کرنا چاہیے" "اسے چھ ماہ تک کسی نرسنگ ہوم میں رکھنا پڑے گا چوبیس گھنٹے نگرانی میں رکھنا ہوگا الکوہلزم کے مریض پر کڑی نگرانی رکھنا پڑتی ہے آہستہ آہستہ شراب کی مقدار کم کر دی جاتی ہے ساتھ میں دوائیں دی جاتی ہیں بالعموم مریض چھ سات ماہ میں ٹھیک ہو جاتے ہیں" "پورے علاج پر کتنا خرچ آئے گا" ڈاکٹر صاحب نے حساب کر کے بتایا۔ "اگر چالیس روپے روز والا کمرہ بھی لیں تو بارہ سو تو یہی ہو گیا تین سو خوراک کے سمجھ لیجیے دو ہزار روپیہ مہینہ کا تخمینہ پڑے گا چھ ماہ میں بارہ ہزار خرچ ہوں گے دو تین ہزار اوپر کے رکھ لیجئے"

"پندرہ ہزار"؟

"پندرہ ہزار ایک ذہین لائق قابل آدمی کو بچانے کے لئے زیادہ نہیں ہیں مگر پندرہ ہزار کون دے گا یہ دنیا کسی غریب کو ایک وقت کی روٹی تو دے نہیں سکتی پندرہ ہزار کہاں سے دے گی خود میرے اپنے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں رقم اس پر خرچ کر سکتا پندرہ ہزار کیا میں اس رقم کی ایک چوتھائی بھی فی الحال اس پر خرچ کرنے سے قاصر تھا میں عرش کو ڈاکٹر کے ہاں سے لے کر چلا آیا میرا شوق ٹھنڈا پڑنے لگا یونہی ہوتا ہے سدھار کرنے کے لئے نکلتا ہوں بیچ میں ایک بہت بڑی اور اونچی دیوار آجاتی ہے جسے توڑنے کے لئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں سر جھکائے واپس چلا جاتا ہوں مگر کوئی تو راستہ ہوگا۔

ایک دن ٹھرا پینے میں میں نے بھی اس کا ساتھ دیا ٹھرا پی کر اس دن وہ مجھ سے بہت کھل گیا جس لڑکی سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا وہ آج فلم کی ایک مشہور اداکارہ ہے اس کی بے وفائی کا گھاؤ آج تک اس کے دل میں تازہ ہے پھر مجھے اس نے اپنی کئی غزلیں

سنائیں اور مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ ایک اچھا شاعر بھی ہے جو ہٹ کے کہتا ہے "تو تم اپنا کلام چھپواتے کیوں نہیں ہو"۔ "کیونکہ مجھے اپنے زخم دکھانے کی عادت نہیں ہے"۔ وہ بڑی تلخی سے بولا۔ میں چپ ہو گیا وہ بھی چپ رہا یہ پورا پیگ خاموشی میں گذرا پھر موضوع بدل دیا گیا اور ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں مگر میرے ذہن کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی دو تین پیگ پینے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہاری اس عظیم ناکامی کا راز کیا ہے"۔ "کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولا۔ "میں دھکا نہیں دے سکتا"۔ "کیا مطلب" میں حیرت سے اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ اپنی گاڑھی ہنسی ہنسا پھر اس نے ایک لمبا گھونٹ پی کے الٹے ہاتھ سے اپنے میلے ہونٹ صاف کئے اور میری طرف دیکھ کر بڑی حقارت سے بولا "جب میں کامیابی کے اونچے زینے پر کھڑا تھا اور اوپر جانے کیلئے پر تول رہا تھا تو اسی سیڑھی پر اسی زینے پر دو تین آدمی اور بھی تھے اور وہ میرے ساتھ ایک ہی سیڑھی پر کھڑے تھے اور جگہ بہت تنگ تھی اوپر جانے کی ایک ہی صورت تھی یا تو وہ مجھے دھکا دے دیتے یا میں انھیں دھکا دے دیتا مگر میں اس پوزیشن میں ہونے کے باوجود انھیں دھکا نہیں دے سکا کسی طرح میرا ضمیر آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

پھر کیا ہوا۔ میں نے پوچھا وہ اپنے خالی گلاس پر غور کرتے ہوئے بولا "پھر انہوں نے مجھے دھکا دے دیا"۔ عرش میرے ساتھ زیادہ دن نہیں چل سکا روز شیو بناؤ روز صاف کپڑے پہنو روز وقت سے آؤ وقت سے جاؤ شراب کم پیو بیوی کو زیادہ پیسے دو یہ کیا ہو گئی ہے اس نے سوچا ہوگا۔ پھر وہ بیچ بیچ میں ناغے کرنے لگا آج بیوی بیمار ہے تو کل بچہ بیمار ہے پرسوں وہ خود بیمار ہے چونکہ وہ ایک اچھا ادیب اور شاعر تھا اس لئے اس کے بہانے بھی بڑے عمدہ اور متنوع ہوتے تھے انھیں سنکر کچھ عرصے کے لئے یقین آ جانا لازمی تھا مگر نا گئے جوں جوں اس کے تقاضے بڑھتے گئے اس کے ناغے بھی بڑھتے گئے کپڑے بھی گندے اور میلے ہوتے گئے داڑھی بھی بڑھتی گئی شراب کی مقدار بھی بڑھتی گئی آخر دو ماہ کے بعد جس دن وہ مجھ سے مڑ کے گیا اس روز وہ اتنا ہی کثیف گندا اور میلا تھا جتنا کہ پہلے روز وہ مجھ سے ملنے اور کام لینے کی غرض سے آیا تھا اس کے بعد ایک سال تک میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی یہ دوسرے سال کا ذکر ہے میری نئی پکچر "آئی رت بہار کی" کی شوٹنگ شروع ہوئے تین چار ماہ گذر چکے تھے میں اپنے مطالعے کے کمرے میں ایک میز کے سامنے بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا کچھ سوچ رہا تھا فضا مست اور سہانی تھی دماغ میں کوئی عشقیہ کہانی تھی کہ اتنے میں کسی نے کھڑکی کے قریب آ کر زور سے کھنکارا میں نے چونک کر دیکھا اتنے میں کسی کی جانی پہچانی بیزار کن ہنسی سنائی دی یہ عرش تھا کھڑکی کے باہر فریم سے لگا حلیہ پہلے سے بدتر جسم پہلے سے دبلا آنکھیں پہلے سے زیادہ میلی اور کھرے میں دھنسی ہوئی کپڑے پھٹے اور تار تار جسم سے ایسی بدبو آتی تھی کہ ناک پر رومال رکھنے کو جی چاہتا تھا دیر تک میں اس کی طرف دیکھتا رہا دیر تک وہ کھڑکی میں کھڑا میری طرف دیکھ کر ایک عجیب کھسیانے انداز میں مسکراتا رہا کچھ عجیب الجھا الجھا پریشان شپٹایا ہوا سا کھڑا رہا۔ خاموش کھڑا رہا۔

"کہو"۔ میں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے نہایت درشت لہجے میں اس سے سوال کیا (اپنے ناکام تجربے کو کون دہرانا چاہتا ہے) "کام چاہیئے"۔ اس نے اپنے گاڑھے تلخ لہجے میں کہا۔ "لکھنے کا کوئی کام میرے پاس نہیں ہے"۔ میں نے اسے فوراً جواب سنا دیا "لکھنے کا کوئی کام مجھے چاہیے بھی نہیں"۔ اس نے سر ہلا کر مجھ سے کہا۔ "پھر کونسا کام"؟ "وہ جو نئی فلم آپ کی بن رہی ہے "آئی رت بہار کی" جس کے چند سین میں نے بھی لکھے ہیں اس فلم میں کوئی چھوٹا سا کام مجھے بھی دلوا دیجئے"۔ "وہ کس طرح کا"؟ "ایکسٹرا کا رول بھی مل جائے تو غنیمت ہے"۔

میں دیر تک اسے گھورتا رہا یہ عرش ہے میرے سامنے ایک ادیب ایک شاعر ایک مکالمہ نگار تین کامیاب تصویروں اور دو سلور جوبلی

کا خالق ! یہ اپنے لئے فلموں میں ایکسٹرا کا رول کرنے کے لئے تیار ہے مگر اب یہ کہانی کیوں نہیں لکھے گا۔ کیونکہ شاید اس شدید ابتری اور گہرے زوال کے باوجود کہیں پر اس کے دل کے اندر اپنے پیشے کی صحیح عزت و عفت محفوظ ہے۔ محفوظ رکھنا چاہتا ہے کیا؟ کیا اسی لئے نہیں لکھے گا اور اپنے شراب کے دام ایکسٹرا کا رول ادا کر کے حاصل کرے گا یا یہ بات ہے کہ مسلسل شراب نوشی سے لکھنے کی صحیح صلاحیت بھی کھو بیٹھا ہے جانے اصل بات کی صداقت کیا ہے۔ میں نے مزید غور و خوض کئے بغیر اسے فلم کے ڈائرکٹر کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیا اس خط کی بنا پر اسے میری لکھی ہوئی فلم میں کام بھی مل گیا سات آٹھ روز کے بعد اس سیٹ کی شوٹنگ شروع ہونے والی تھی جس میں عرش کو کام کرنا تھا جس دن اس کی شوٹنگ تھی وہ دوپہر میں لنگڑاتا ہوا میرے گھر آ گیا اور میرے مطالعے کے کمرے سے باہر کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا اس کے میلے کچیلے رخسار الکحل کی حدت سے سلگ رہے تھے آواز میں شرابیوں کی سی لکنت تھی اور ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اسے اس حالت میں دیکھتے ہی مجھے غصہ آ گیا۔

"کیوں کیا ہوا کام پر نہیں گئے آج تمہاری شوٹنگ تھی نہ" میں نے اس سے ڈپٹ کر پوچھا "تھی"۔ اس نے شرابی لہجے میں کہا۔ "پھر گئے نہیں وہاں"؟ "گیا تھا"۔ "تو کیا شوٹنگ ختم ہو گئی"؟ "نہیں"۔ وہ رکا پھر ایک دم بول پڑا۔ "انہوں نے مجھے نکال دیا"

"کیوں نکال دیا"؟

"کہنے لگے تم مکالمے ٹھیک سے ادا نہیں کر سکتے"۔

"یوں بھی ہو سکتا ہے"۔ میں نے کہا۔ "تم نے زیادہ پی رکھی ہو گی"۔

یہ تو میں نے بعد میں پی ہے عرش نے بے بسی کے لہجے میں مجھ سے کہا اس وقت تو معمول کے مطابق پی رکھی تھی اسسٹنٹ ڈائرکٹر مجھے الفاظ کا تلفظ بتا رہا تھا یوں بولتے ہیں یوں نہیں بولتے ہیں میں سر ہلا ہلا کے جی ہاں جی ہاں کہتا گیا مگر جب کیمرے کے سامنے کام کرنے کا موقعہ آیا تو میں وہی بولا جو مجھے بولنا چاہیے تھا اس پر اسسٹنٹ ڈائرکٹر کو بہت تاؤ آ گیا اور اس نے مجھے سیٹ سے باہر نکال دیا۔

اتنا کہہ کر وہ زور سے ہنسا اس کی ہنسی بہت خوفناک تھی مجھے ایسا لگا جیسے خون سے اس کا حلق بھر گیا ہو۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے"؟ "بات یہ ہے"۔ وہ ذرا سا سر جھکا کے بولا۔ "وہ سین میرا ہی لکھا ہوا تھا"۔ بیچ بیچ میں لمبے وقفے آتے ہیں چھ ماہ کے، سال کے، دو سال کے وہ کبھی کبھار مجھ سے ملتا ہے کسی شدید ضرورت سے مجبور ہو کر ۔۔۔۔ اس کا بیٹا مر گیا ہے اس کی ماں مر گئی ہے بہن پاگل ہو گئی ہے چھ ماہ سے جھونپڑے کا کرایہ نہیں دیا ہے عید آئی ہے ایک دفعہ اس کی بیوی کا اپریشن ہونے والا تھا نانا وتی ہسپتال میں۔ اسے فوری طور پر ایک سو روپوں کی ضرورت تھی میرے پاس صرف بیس روپے تھے وہ میں نے دے دیئے مگر باقی اسی روپوں کے لئے میں دن بھر بھٹکتا رہا۔ شام کو جب مل گئے تو میں انھیں لیکر نانا وتی ہسپتال پہنچا جو وارڈ اس نے بتایا تھا جو بیڈ نمبر اس نے بتایا تھا وہاں پر عرش نہ تھا نہ اس کی بیوی بعد میں معلوم ہوا کہ اُس کی بیوی گھر پہ اپنے میاں کے انتظار میں بیٹھی ہے اور عرش صاحب کسی جھونپڑے میں بیٹھے ٹھرا پی رہے ہیں اس قدر مجھے غصہ آیا ہے اس پر اُس دن اور میں ایسا بیوقوف بنا ہوں مگر اس دن اس کی ایکٹنگ بھی لاجواب تھی اس قدر زار و قطار وہ رو رہا تھا کہ مجھے اس کے آنسو بالکل پُرخلوص معلوم ہوتے ——— بار بار چوٹ کھانے کے بعد اس بار پھر میں اس سے چوٹ کھا گیا جی چاہا کہ کہیں اگر مل جائے تو مار مار کر اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں مگر اس واقعے کے بعد تقریباً دو سال تک وہ میرے نزدیک نہیں پھٹکا وہ ماہر نفسیات بھی تھا

پھر اس واقعے کے کوئی دو سال بعد میرے ایک شاعر دوست کے بنگلے پر فراق صاحب کے اعزاز میں ایک پارٹی دی گئی تھی اسکاچ کی ایک درجن سے زیادہ بوتلیں کھلی تھیں فلم انڈسٹری کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب گلوکار اور موسیقار مدعو تھے عورتوں کے پرسے کے پرسے پرانے جے پوری زیوروں اور نئی بانک ساڑیوں میں ملبوس گلاب کے تختوں کی طرح مہک رہے تھے محفل شباب پر تھی چاروں طرف نور اور رنگ، شراب اور نغمہ شاعری اور خوشبو کی دھنک بھیلی ہوئی تھی کسی نے آکر مجھ سے کان میں کہا۔ "ایک صاحب آپ کو باہر بلاتے ہیں۔"

میں باہر گیا برآمدے میں کوئی نہ تھا میں نے پوچھا "وہ صاحب کہاں ہیں۔" "گھر کے باہر کھڑے ہیں۔" دو تین برآمدوں سے گذر کر سیڑھیوں سے اتر کر میں گھر کے باہر گیا اس وقت رات کے گیارہ بجے بمبئی سے دور سات بنگلے کے مقام پر کون مجھ سے ملنے کے لئے آیا ہے۔

گھر کے باہر عرش کھڑا تھا۔

مجھے دیکھ کر زور سے ہنسا۔ "آپ نے ایکبار کہا تھا ناں کہ تم ہمیشہ جھوٹ بول کر مجھ سے پیسے لیتے ہو آج سچ سچ کہہ رہا ہوں مجھے شراب کے لئے پیسے چاہئیں صرف شراب کے لئے . . . بس . . ." میں اسے دیکھتا رہ گیا اب اس کی حالت بہت بگڑ گئی تھی ایک ملے سکے لیے عرش کو اس کے پھٹے پرانے فقیروں کے سے چیتھڑوں میں ملبوس سردی سے ٹھٹھرے ہوئے دیکھ کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے آخر وہ ہمیں میں سے ایک تھا اس نے بھی کئی کامیاب تحریریں لکھی تھیں آج بھی اسکے قلم میں وہی زور تھا جو اس کے ہمعصروں میں تھا جو اندر اس مہکتی ہوئی گلزار محفل میں بیٹھے دعوت نا و نوش میں مصروف تھے جن کے گھروں پر وہ ایک بھکاری کی طرح جاتا تھا جن کی کھڑکیوں کے باہر وہ ایک سوالی کی طرح چپ چاپ کھڑا ہو جاتا تھا جن کے نام ادبی اور فلمی پرچوں کے پہلے صفحے پر آتے تھے وہ ان میں سے کسی ایک سے بھی قابلیت لیاقت اور فنی صلاحیت کم نہیں رکھتا تھا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسے شراب نے مارا آخر کتنی شراب پیتا تھا وہ؟ آدھی بوتل صبح آدھی دوپہر اور ایک رات کو۔ کل دو بوتلیں ٹھرے کی جو اس زمانے میں چھ سات روپے کی ہوتی تھیں کل چھ روپے کی شراب وہ پیتا تھا اتنی شراب تو یورپ امریکہ اور دوسرے ملکوں کے کروڑوں لوگ شب روز پیتے ہیں اور عزت و عافیت سے زندہ رہتے ہیں چھ روپے کی شراب کیا بہت ہو گئی ایک فن کار کے لئے . . . . . ہم لوگ خوب صورت روشنیوں اور رنگوں کے ہالے میں اور وہ اس سے باہر تھا اندر جام لنڈھائے جا رہے تھے اور وہ باہر پیاسا کھڑا تھا۔ میں مبہوت ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا کیا یہ میرا ماضی ہے یا مستقبل۔ کیوں اس طرح سے سر جھکائے کھڑے ہو عرش، کیوں مانگ کر پیتے ہو کیوں نہیں دوسروں کی طرح دنیاداری کی چالیں سانہ شینی سیکھتے ہیں اور فریب نہیں کرتے اندر ہم لوگ اسکاچ پی رہے تھے کیونکہ زندگی کے کسی مرحلے پر ہم نے کسی دوسرے کو دھکا دینا تھا اور تم سے ایک دھکا نہ دیا گیا اور سے کسی کے لات ماری ہوتی ظالم۔ تو آج اس زبوں حالت میں میرے سامنے نہ کھڑے ہوتے۔

یکایک وہ زور سے ہنسا جیسے سوڈے کی بوتل پھٹ گئی اور تیز کانچ کی کرچیں چاروں طرف بکھر گئیں" کیوں کیسی نفسیاتی چوٹ

کی میں نے "وہ طنز آمیز لہجہ میں شدید حقارت سے مجھ سے مخاطب ہوا۔

یکایک میرے سارے نرم گرم رحمدلی اور ہمدردی کے جذبے اس کے لئے اس کی گاڑھی ہنسی میں دب گئے مجھے غصہ آنے لگا تو یہ سارا ڈرامہ اس لئے کھیلا گیا تھا کہ اس تضاد کو دیکھ کر ایسے خیالات میرے دل میں آئیں اور عرش ان سے فائدہ اٹھا کر پورے روپے مجھ سے لے جائے میں نے دانت پیس کر کہا" کمینے"۔ اس نے سر جھکا کے ہاتھ بڑھا کے کہا۔" آداب عرض کرتا ہوں"۔ اس وقت اس سے الجھنا فضول تھا میں نے جلدی سے جیب سے نکال کر دس روپے اسے دے دیئے اور واپس ہو لیا لوٹ ہی رہا تھا کہ اس کی آواز آئی" اندر سے نثار کو بھیج دیجئے گا اسے بھی نفسیاتی چوٹ دوں گا"

اس رات عرش نے ایک سو روپے اکٹھے کر لئے تھے مگر میں نے بھی طے کر لیا تھا کچھ ہو جائے اب عرش کو کبھی منہ نہ لگاؤں گا مگر یہ زندگی اس قدر عجیب ہے کہ یہاں کوئی قول فیصل بہت دیر تک نہیں رہتا چند ماہ کی خفگی کے بعد میں پھر اسے کام دینے لگا اب وہ میرے اور دوسرے ادیبوں کے مسودے نقل کرتا تھا، جو ملتا اس میں سے ایک چوتھائی گھر دے دیتا تین چوتھائی رقم کی شراب پی جاتا اب اس پر کسی گالی، جھاڑ، طعنے شکوے کا کوئی اثر نہیں ہوتا اب وہ زیادہ باتیں بھی نہیں کرتا تھا چونکہ کسی زمانے میں وہ کاتب بھی رہ چکا تھا اس لئے اس کا خط بہت اچھا تھا میرے مسودوں کی نقل کا کام زیادہ تر اسی کو دیا جانے لگا ہولے ہولے اس نے پھر اپنا رنگ مجھ پر جما لیا یہاں تک کہ جب ایک بار میری بیوی اپنے میکے چلی گئی تو میں نے اسے کھڑکی میں کھڑا رکھنا مناسب نہ سمجھا اسے گھر کے اندر آنے اور پھر گھر میں بیٹھ کر کام کرنے کی دعوت دیدی اب ہم لوگ اکٹھے چائے پیتے کبھی کبھی اکٹھے کھانا کھاتے وہ مجھے اپنی خوشحالی کے زمانے کی داستانیں سناتا اور اپنے جاننے والوں پر عمدہ طنزیہ فقرے کستا جیسے اب بھی اس کی ذہانت میں کوئی چنگاری باقی ہے۔

ایک دن میں چند گھنٹوں کے لئے اسے گھر میں اکیلا چھوڑ گیا مجھے کسی کام سے باہر جانا تھا اور جو مسودہ وہ نقل کر رہا تھا اسے آج ہی ڈاک سے بھیجنا تھا اس لئے میں اسے گھر میں کام کرتا چھوڑ گیا چند گھنٹوں کے بعد جب واپس آیا تو وہ اسی طرح اپنی جگہ پر بیٹھا کام کر رہا تھا میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی ادھر اُدھر نگاہ ڈالی وہ بھڑک کر کہنے لگا۔

"ہاں دیکھ لو۔ . . . دیکھ لو۔ میں نے کچھ نہیں چرایا ہے تمہاری بیوی کے چاندی کے برتن تک محفوظ ہیں اور وہ علی گڑھی پاندان بھی . . . . اچھی طرح سے دیکھ لو۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہو عرش . . . میں تو یونہی۔"

"یونہی نہیں جناب ٹھیک سے سارے گھر کی تلاشی لے لو ممکن ہے کوئی چیز غائب ہو۔"

میں شرمندہ ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا کام ختم ہو گیا تو میں نے اسے پیسے دے دیئے پیسے لے کر وہ چلنے والا ہی تھا کہ میں نے اسے چائے پی کر جانے کے لئے کہا اس نے بہت انکار کیا لیکن میں نے اصرار کر کے بٹھا لیا جب چائے تیار ہو ئی تو میں کچن میں چمچے ڈھونڈنے لگا دیکھا تو کچن میں ایک چمچہ بھی موجود نہیں ہے پچاس ساٹھ چمچے تھے سب غائب۔

میں نے عرش کی طرف دیکھ کر کہا" کچن میں تو ایک چمچہ بھی نہیں عرش فوراً بھڑک کر بولا کیا تم مجھے چمچے کے بغیر چائے نہیں پلا سکتے

کما: نہیں کھاسکتے زندہ نہیں رہ سکتے۔" اس دن میں نے عرش کو پھر گھر سے نکال دیا اور قسم کھائی آئندہ کے لئے ختم۔

مگر اس واقعہ کے چند ماہ بعد وہ پھر میری کھڑکی میں آموجود ہوا بہت دُبلا اور نحیف معلوم ہوتا تھا پیٹ پر ایک موٹی پٹی باندھ رکھی تھی جس سے اس کا پیٹ ابھرا ہوا دکھائی دیتا تھا لمبے لمبے سانسوں کے درمیان بولا بہت بیمار ہوں خونی پیچش ہو گئی ہے پچیس روپے دے دو۔

"یہ بہانے بازی اب نہیں چلے گی۔" میں نے گرج کر اس سے کہا۔ "چلے جاؤ۔" "نہیں سچ مچ بیمار ہوں واقعی۔۔۔۔ بیس روپے ہی دے دو میری حالت دیکھو۔" وہ اپنے پیٹ کی پٹی کھولنے لگا۔ "رہنے دو رہنے دو اب یہ ایکٹنگ یہاں نہیں چلے گی۔" "اچھا تو کوئی کام ہی دے دو مسودہ نقل کرنے کے لئے اور کچھ ایڈوانس دیدو پندرہ روپے ہی دے دو۔" "ایک پیسہ نہیں ملے گا۔" میں نے انتہائی درشتی سے اسے جواب دے دیا اور کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔

چوتھے دن مجھے معلوم ہوا کہ عرش مر گیا میں تمبھو پان والے کی دکان پر کھڑا گلگتھی پان کا جوڑا کھا رہا تھا کہ شکیل بدایونی کے ایک نوکر جو ان کے گھر سے تیس پانوں کا آرڈر لے کر آیا مجھے پہچان کر اور سلام کر کے بولا آپ کو معلوم نہیں عرش صاحب مر گئے۔

ایک دھچکا سا لگا تو کیا وہ سچ کہتا تھا واقعی بیمار تھا۔ "کب" میں نے اس سے پوچھا۔ "آج صبح" نوکر نے جواب دیا۔ "ان کے گھر سے ایک لڑکا آیا تھا شکیل صاحب وہیں گئے ہیں۔" میں نے ایک ٹیکسی بلائی اور عرش کے گھر کی طرف روانہ ہوا سانتا کروز ویسٹ کے ایک جھونپڑے میں رہتا تھا قریب میں بھینسوں کا ایک تبیلہ تھا وہ بدروئیں بہہ رہی تھیں ان کو پھلانگ کر عرش کے جھونپڑے تک پہنچا جا سکتا تھا عرش کی لاش جھونپڑے کے عین بیچ رکھی تھی، بیوی ہولے ہولے بین کر رہی تھی بچے کچھ نیم برہنہ کچھ ننگ دھڑنگ لاش کے گرد نیم دائرہ بنائے حیران و پریشان کھڑے تھے سب سے چھوٹے لڑکے امجد کی عمر چار سال تھی۔

عرش کا چہرہ صاف سفید اور دُھلا ہوا تھا آنکھیں نیلی تھیں پہلی بار میں نے ان آنکھوں کا رنگ دیکھا۔ ایک ہزار سال پہلے جب تم سمرقند سے چلے ہو گے تو یہی آنکھیں لے کے چلے ہو گے کہاں کہاں پہنچے اس کا مجھے غم نہیں غم صرف اس بات کا ہے کہ یہ آنکھیں زندگی میں بھی اسی طرح صاف اور نیلی کیوں نہ دکھائی دیں جیسی پرسکون اور صاف تمہاری موت ہے ایسی ہی زندگی تمہیں کیوں نہ ملی۔

دو تین بچے ناک سڑک رہے تھے کہ سسکیاں لے رہے تھے کہ حیرت سے ان آنے جانے والے لوگوں کو دیکھ رہے تھے ان بچوں کو غالباً حیرت اس بات کی تھی کہ ایسے خوش لباس انسان اس سے پہلے اس جھونپڑے میں کیوں نہ آتے تھے ان کے فاقہ زدہ جسموں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ عرش کی مصیبت تو کٹ گئی اب ان کی شروع ہونے والی ہے۔

حالانکہ وہ میرے سامنے دفن ہوا مگر یقین نہیں آتا کتنے ہی دن میں کھڑکی کھولے اس کا منتظر رہا خیال تھا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے میری کھڑکی کے قریب آ کر رک جائے گا اور میں اسے وہ پچیس روپے دیدوں گا کسے معلوم تھا کہ بالکل آخر وقت میں وہ بالکل سچ بول کر مجھے چرکا دے جائے گا

اپنے ضمیر کو تسکین دینے کے لئے مجھے اس بار پچیس روپوں سے زیادہ خرچ کرنے پڑے حالانکہ اس وقت پچیس روپیوں میں ہی کام چل سکتا تھا مگر اب عرش کو واپس نہیں بلا سکتا ان مُردوں میں ذرا سی بھی انسانیت نہیں ہے زندوں کو اس طرح تنگ کرنے کا انہیں کیا حق ہے۔

ایک دوست نے اس کے جھونپڑے کا سات ماہ کا کرایہ ادا کیا ایک دوست نے دو ماہ کا راشن بھر دیا میں نے اس کی بیوی بچوں کے لیے کپڑے بنوا دیئے عرش کے تیجے میں اس کے جھونپڑے میں گیا تو چار سال کا ننھا امجد نئی قمیص پہنے اپنی اماں کی گود میں بیٹھا تھا اور خوش ہو کر کہہ رہا تھا " اماں نوی قمیض "۔

مجھے دیکھ کر عرش کی بیوی نے ذرا سا گھونگٹ کاڑھ لیا اور آنسو بھرے لہجے میں بولی " ہاں بیٹا تیرے ابا مر گئے ناں تو یہ انہوں نے .... تیرے ابا کے دوست نے میرے لئے قمیض بنوا دی ہے انھیں سلام کرو بیٹا "

مگر ننھا امجد ابھی صرف چار سال کا تھا ابھی اس نے کسی کو خوشامد سے سلام کرنا نہیں سیکھا تھا۔ ابھی اسے یہ بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ مرنا کسے کہتے ہیں دوست کون ہوتا ہے اپنی ماں کی بات سے صرف یہ پتہ چلا کہ اس کے ابا مر گئے ہیں اور آج اسے نئی قمیص ملی ہے۔

یہ جان کر وہ گہری سوچ میں پڑ گیا اور اس کے معصوم ماتھے پر سوچ کی ایک گہری شکن نمودار ہوئی اس نے اپنی نئی قمیص کے دامن میں انگلیاں پھنسا کر اپنی اماں سے پوچھا۔

" تو اماں ..... تو ..... ابا اس سے پہلے کیوں نہ مر گئے "

(ہندسی رسم الخط سے ترجمہ)

ترجمہ اسلم شیخ

کرشن چندر (چند یادیں)

میرزا ادیب

یہ بات چند ماہ پہلے کی ہے۔ بمبئی سے کرشن چندر کا خط آیا تھا اور صد افسوس یہ میرے نام اُس کا آخری خط تھا۔ اس خط میں اس نے اُس دلگداز سانحے کا ذکر کیا تھا جس کی وجہ سے اُس کی بہن 'سرلا دیوی' اپنے بھائی کو، اپنے سارے عزیزوں کو اور اُردو ہندی افسانے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر رخصت ہو گئی تھی۔ اس خط کی ایک ایک سطر گہرے کرب میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس خط میں اُس نے اپنے آپ کو ایک ایسے درخت سے تشبیہہ دی تھی جس کی شاخیں بے برگ و بار ہو گئی ہوں اور وہ اُداس کھڑا ہو۔ اس نے واقعی عقیدت کا اظہار کیا تھا۔ کرشن چندر کا محبوب بھائی مہندر ناتھ تپ دق میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا اور اب اس کی بہن بھی دِلّی کی ایک سڑک پر خاک و خون میں لتھڑی بے حس و حرکت پڑی تھی۔ کرشن چندر کو جاننے والوں کی بیشتر تعداد فقط انہی دو حادثوں سے واقف ہے مگر اُس کی زندگی کا ایک تیسرا حادثہ بھی ہے جو اس کے لئے کرب مسلسل بن گیا تھا۔ یہ حادثہ تھا اُس کی پہلی رفیقہ حیات کی اس کے ساتھ عدم مطابقت جس سے اُس کی بیٹی بھی متاثر ہو گئی تھی اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی۔

یہ ہے کرشن چندر کی باطنی زندگی کی کیفیت۔ اُس کرشن چندر کی جو اُردو کا بڑا ہی نہیں بہت بڑا افسانہ نگار تھا۔ ناول نگار تھا، انشائیہ نگار تھا، اُردو ادب کی سب سے بڑی تحریک۔ ترقی پسند تحریک کا روح رواں تھا۔ بہت ہی پیارا دوست، بہت ہی پیارا انسان تھا۔ یقیناً وہ یہ سب کچھ تھا لیکن زندگی کے آخری دور میں ایک بے برگ و بار درخت بھی تھا۔

میں نے کرشن چندر کو دیکھا ہے۔ بار ہا دیکھا ہے اس سے باتیں کی ہیں۔ بے شمار مرتبہ باتیں کی ہیں۔ لاہور کی کئی سڑکوں اور راستوں پر اس کے ساتھ گھوما ہوں۔ کبھی گفتگو کرتے ہوئے اور کبھی چپ چاپ۔

میرے دوستو اور ساتھیو! جیتے رہنا ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت سے انکار کفرانِ نعمت کے مترادف ہے مگر عزیزو! جب وہ چراغ یکے بعد دیگرے بجھتے چلے جائیں جن سے دِل منور اور تابناک ہوتا ہے تو پھر چاروں طرف کتنا گہرا، کس قدر اذیت ناک اندھیرا چھا جاتا ہے۔ آج میرے دل کی جو کیفیت ہے اُسے شاید کسی شاعر کے اس مصرعے ہی سے واضح کیا جا سکتا ہے۔

اِک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی

کرشن چندر مجھ سے ہزاروں میل دور تھا، میں لاہور کے ایک مضافاتی علاقے میں اور وہ بمبئی کے مغربی سانتا کروز میں ــــ ان تیس برسوں میں صرف ایک بار اس سے ملاقات ہوئی تھی اور اس وقت جب میں ڈاکٹر تارا چند کی دعوت پر رائٹرز گلڈ کی طرف سے پاک ہند ثقافتی کانگریس میں شرکت کے لئے نئی دہلی گیا تھا ـــ پھر بھی کرشن چندر میرے قریب ہی رہتا تھا۔ اس کی یادیں میرے سینے میں ہمیشہ فروزاں رہتی تھیں۔ وہ میرے دل میں تھا اور دل کے باہر بھی۔ اتفاق دیکھئے کہ میں نے جو گھر بنایا ہے تو وہ کرشن نگر میں ہے۔

کرشن چندر کا نام لیتا ہوں تو ایک دم میرے سامنے ایک دریچہ وا ہو جاتا ہے جس میں سے چاند کی نرم اور ملائم کرنیں اور ہوا کے عطر بیز جھونکے اندر آکر میرے ذہن کو چھونے لگتے ہیں۔ کتنی ہی کرنیں ہیں۔ کتنے ہی جھونکے ہیں۔ میں کس کرن، کس جھونکے کا حال لکھوں۔ ایک کرن ان لمحوں کی قوس قزح کے رنگوں میں ڈوب کر آئی ہے جن میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

کرشن چندر یونیورسٹی لا کالج کا طالب علم تھا۔ اُس زمانے میں اس کا پہلا افسانہ "جہلم میں ناؤ پر" ماہنامہ "ہمایوں" میں چھپا تھا اور اس افسانے میں کرشن چندر نے سحر انگیز کیفیات کو کچھ اس طرح الفاظ میں سمیٹ لیا تھا کہ یہ افسانہ چھپتے ہی ادبی محفلوں میں موضوعِ گفتگو بن گیا تھا۔

اس وقت تک اُردو ادب میں رومانوی تحریک کے بڑے بڑے علم بردار اپنی نادرہ کار تحریریں پیش کر چکے تھے مگر یہ رومانوی افسانہ اِن ساری تحریروں سے مختلف تھا۔ رومان نگار حسن کا دلدادہ ہوتا ہے اور بالعموم حسین لب و رخسار کا ذکر کرتا ہے لیکن "جہلم میں ناؤ پر" کی ہیروئن ایک بدصورت عورت تھی۔ اس کی بدصورتی میں بھی اپنا ایک حسن تھا۔ یا یوں کہئے کہ سحر طراز افسانہ نگار نے اس کے بے ڈھب خد و خال کے اندر وہ رعنائیاں بھر دی تھیں جن سے حسین سے حسین چہرہ بھی محروم ہوتا ہے۔

ایک ایڈیٹر تو اس تاک میں ہوتا ہے کہ کوئی نئی ذہانت ابھرے اور وہ اس پر جھپٹ پڑے۔ کرشن چندر کا غلغلۂ شہرت بلند ہوا تو میں نے ادبِ لطیف کے مینجر مرحوم چودھری نذیر احمد کے ساتھ یہ منصوبہ بنایا کہ دونوں مل کر کرشن چندر کو ڈھونڈیں گے اور اس سے افسانے حاصل کریں گے۔

آپ حضرات کو اس سڑک پر چلنے کا ضرور اتفاق ہوا ہوگا جو اسلامیہ کالج سول لائنز کے موڑ سے آگے ایمپل ہیسنڈری ہوسٹل کے پہلو سے پھوٹ کر سنت نگر سے جا ملتی ہے۔ اس زمانے میں یہاں ہوسٹل نہیں تھا۔ اس سڑک کے شروع ہی میں ایک عمارت واقع ہے جس کے علیحدہ علیحدہ حصے آج رہائش گاہوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ان دنوں یہ عمارت طالب علموں کے لئے ایک پرائیویٹ ہوسٹل کے طور پر استعمال ہوتی تھی یا ممکن ہے اس کا صرف ایک ہی حصہ ہوسٹل کی حیثیت رکھتا ہو۔ اس عمارت کی دوسری منزل میں ایک معمولی سے کمرے کے اندر میں اور چودھری نذیر احمد جا پہنچے تھے۔

فرش کی اینٹیں جابجا اکھڑ چکی تھیں۔ دیواریں سفیدی کو ترس رہی تھیں اور ان دیواروں کے سایے میں ایک پھٹی پرانی دری کے اوپر چند نوجوان بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ دری کے ایک کونے میں ایک سفید رنگ کا نوجوان بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے اثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس کھیل میں شریک ہونا پسند نہیں کرتا۔ جب ہم سیڑھیاں طے کر کے اُوپر پہنچے تھے تو وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے دایاں پاؤں کھجلا رہا تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

میں نے تاش کھیلنے والوں میں سے ایک صاحب سے پوچھا۔

"کرشن چندر صاحب یہاں ہیں؟"

جس صاحب کو مخاطب کیا گیا تھا اس نے مڑ کر کونے والے شخص سے کہا۔

"پاپا! یہ آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔"

اس وقت معلوم ہوا کہ ہم جس کرشن چندر کی تلاش میں اس کمرے کے اندر پہنچے ہیں وہ یہی صاحب ہیں جو تاش کے کھیل سے کچھ بیزار بیزار نظر آ رہے ہیں۔

کرشن چندر شاید اٹھ بیٹھے تھے بہرحال اُن کے ساتھیوں نے پرے پرے کھسک کر ہمارے لئے بیٹھنے کی جگہ بنا دی تھی۔

میں نے ذرا غور سے کرشن چندر کو دیکھا۔ رنگ سفید، پیشانی چوڑی، سر کے درمیانی حصے میں بال نسبتاً کم، آنکھیں بڑی بڑی اور گہری رنگت سُرخ و سفید۔ اس روز بہت کم باتیں ہوئیں اور ان باتوں میں بیشتر اس کے افسانے ہی کا ذکر کیا گیا۔

چند روز بعد کرشن چندر نے ایفائے وعدہ کے طور پر ادبِ لطیف کو اپنا پہلا افسانہ دیا جس کا عنوان تھا 'یرقان'۔ اس افسانے نے ادبِ لطیف کے قارئین کو چونکا دیا اس کے چند روز بعد اس کا افسانہ 'قبر' چھپا اور پھر تو اس کے افسانے مسلسل پرچے میں چھپتے گئے۔

کرشن چندر کشمیر میں پیدا ہوا تھا۔ باپ ایک ڈاکٹر تھا جن کے متعلق کرشن نے ایک بار بتایا تھا کہ وہ سخت گیر آدمی تھے۔ کرشن چندر نے لاہور آ کر پہلے گورنمنٹ کالج سے ایم اے کیا اور پھر ایل ایل بی۔ معلوم نہیں اس نے وکالت کی تعلیم کیوں حاصل کی اور جب حاصل کر لی تھی تو وکیل بننا کیوں پسند نہ کیا تھا؟

میں سمجھتا ہوں اس کا فطری رجحان پیشۂ وکالت کے بالکل خلاف تھا۔ زیادہ گفتگو کرنی ——پُر زور گفتگو کرنی —— یہ دونوں چیزیں اس کے اختیار میں نہیں تھیں۔ وہ تو ایک نرم مزاج، کم گو، اندر اور باہر سے ایک بڑا ملائم انسان تھا۔ وہ کشمیر کی وادیٔ گلپوش کو چھوڑ آیا تھا لیکن اس وادی سے پھولوں کی نزاکتیں اور لطافتیں اپنے ساتھ لے آیا تھا اور یہ نزاکتیں اور لطافتیں اس کے مزاج میں پوری طرح رس بس گئی تھیں۔

آج تو ادبی رسالوں کے مالک اپنے بعض مضمون نگاروں کو کچھ نہ کچھ معاوضہ دے دیتے ہیں مگر اُس زمانے میں معاوضہ مانگنے اور دینے کا رواج نہیں تھا یا یوں کہیے کہ بہت کم رواج تھا۔ کرشن چندر ٹھہرا بے حد شرمیلا آدمی۔ اس کے بہت خوبصورت افسانے 'ادبِ لطیف' میں چھپے تھے جن کی وجہ سے پرچے کی مقبولیت میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ وہ معاوضہ طلب کرتا تو ضرور مل جاتا۔ مگر اس نے اس طرف توجہ ہی نہ کی لیکن زندگی کی ضروریات کیونکر پوری ہو سکتی تھیں۔ اس کے لئے کرشن چندر نے ایک انگریزی پرچے کی ادارت سنبھال لی۔ اس انگریزی پرچے کا نام تھا "مائی میگزین" اور یہ طالب علموں کے لئے تدریسی مقاصد کے زیرِ اثر چھپتا تھا۔

'مائی میگزین' کا دفتر ادبِ لطیف کے دفتر کے قریب واقع تھا اور ادبِ لطیف کا دفتر اس جگہ تھا جہاں نیا ادارہ ہے 'مائی میگزین' یا تو بند ہو گیا یا کرشن نے اس سے قطع تعلق کر لیا —— کچھ مدت بعد کشمیر چلا گیا۔ اُنہی زمانے میں پطرس بخاری جو آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی کنٹرولر تھے ان کی نظرِ انتخاب کرشن پر پڑ گئی اور کرشن بطور پروگرام اسسٹنٹ ریڈیو سے وابستہ ہو گیا۔

کرشن کو بھاٹی دروازے کی کھیر بڑی پسند تھی۔ مہندر ناتھ بھی یہ کھیر بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ چودھری برکت علی جب موڈ میں ہوتے تھے تو کھیر منگوا کر سب کو کھلاتے تھے۔ کرشن آدھی پلیٹ ہی نہیں کھاتا تھا۔ عام طور پر اس کا مطالبہ شدید ہوتا تھا اور

جب یہ مطالبہ پورا ہو جاتا تھا تو اس کی عملی قوت سست پڑ جاتی تھی۔ یہ میرا مشاہدہ ہے۔

دوستو! یادوں کا دریچہ کھل جاتا ہے تو بند ذرا مشکل ہی سے ہوتا ہے تاوقتیکہ آدمی خود بند نہ کر دے۔ کرشن کی ہر بات مجھے رہ رہ کر یاد آ جاتی ہے۔ میری شادی ہونے والی تھی۔ کرشن بار بار کہتا تھا "میرزا ادیب جلدی شادی کراؤ۔ پلاؤ زردہ پیٹ بھر کر کھانا چاہتا ہوں"۔ مگر آپ یہ بات کر شاید حیران ہوں کہ شادی کے موقعے پر کرشن نے پلاؤ کو ہاتھ تک نہ لگایا، مٹھائی کھائی۔ اوپندر ناتھ اشک نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ان کے برعکس راجندر سنگھ بیدی نے پلاؤ کو مع اس کے تمام لوازم کے خوب ڈٹ کر کھایا۔

کرشن جیسے متحرک آدمی میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ میرے پاس کرسی پہ بیٹھتا تھا تو پیپر ویٹ کی شامت آ جاتی تھی۔ کبھی اُسے ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ پر رکھا جا رہا ہے۔ اور کبھی اُسے لٹو بنا کر گھمایا جا رہا ہے۔ ایک بار۔ جو اُس نے پیپر ویٹ کو لٹو بنا کر گھمایا تو وہ میز پر رکھی ہوئی دوات سے جا ٹکرایا۔ دوات کھلی رہ گئی تھی۔ نتیجہ یہ کہ سیاہی نے میرے کپڑوں کا ستیاناس کر دیا۔ کرشن کھڑا ہو گیا۔ چہرے پر پشیمانی کے اثرات اور بار بار گلے لگا کر معافی مانگ رہا ہے اور اس گلے لگانے کے عمل میں اس کے اپنے کپڑے بھی خراب ہو گئے ہیں۔ خیال نہیں یقین تھا کہ اب کرشن کا پیپر ویٹ سے اس نوعیت کا رابطہ ختم ہو جائے گا مگر نہیں۔ کرشن کے اندر تو پیار ہی پیار تھا۔ کسی سے پیار کرتا تھا تو پھر پیار کرنے سے باز نہیں آتا تھا خواہ یہ پیار پیپر ویٹ ہی سے کیوں نہ ہو۔ پیار سے ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا۔

ایک بار میں نے پوچھا۔

کرشن! پیار آپ بھی کرتے ہیں اور کرشن مہاراج بھی۔ مگر آپ دونوں میں فرق کیا ہے!

بولا۔

"میرزا! وہ مکھن چُراتے تھے اور میں مکھن نہیں چراتا۔ ہم میں شریف کون ہیں یہ تم سمجھ سکتے ہو۔"

کرشن بہت نفاست پسند آدمی تھا۔ اپنی تحریر کے لئے بہت خوبصورت پیڈ استعمال کرتا تھا۔ قلم بھی بڑھیا ہوتا تھا مگر بدخط پرلے درجے کا تھا۔ میں نے اس کے مسودات میں کاٹ چھانٹ بہت کم دیکھی تھی۔ ایک بار جو لکھ دیا بس لکھ دیا۔ خیالات کے ساتھ مناسب الفاظ کا ایک طوفان چلا آتا تھا اور قلم کہیں بھی رکتا نہیں تھا۔ میں نے اسے لکھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اس سلیقے کے ساتھ بیٹھ کر نہیں لکھتا تھا جس کے ہم تن آسان عادی ہو گئے ہیں، اسے میز کرسی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ زمین پر بیٹھ کر کبھی ایک اور کبھی دوسرے زانو کے اوپر پیڈ رکھ لیتا تھا اور تیزی سے لکھنا شروع کر دیتا تھا۔

ایک اور واقعہ بھی سن لیجیے!

ایک دن کرشن دفتر میں آیا اور کرسی میں بیٹھ کر "شوں شوں" کرنے لگا۔ اگر آپ کو جمیل الدین عالی کے قریب بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ بخوبی اس "شوں شوں" کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔

میں نے کہا "افسانہ دیجئے جناب!"

"اچھا۔ دے دیں گے۔"

"کب! پرچہ پریس جانے کے لئے پر تول رہا ہے؟"

میں نے اصرار کیا تو بولا:

"ایک افسانہ ہے تو سہی مگر تم چھاپو گے نہیں۔"

"کیوں نہیں چھاپوں گا؟" میں نے پوچھا۔

کرشن نے غالباً مولانا حامد علی خاں مدیرِ ہمایوں کے حوالے سے بتایا کہ یہ افسانہ خوفناک قسم کی چیز ہے۔ میں نے کہا۔ کرشن بھائی! آپ مجھے دے دیں۔ ضرور چھپے گا یہ ممکن نہیں کہ کرشن کا افسانہ ادبِ لطیف میں نہ چھپے۔

میرے جوش و خروش سے کرشن کسی قدر متاثر ہو گیا۔ بولا۔

"میں تمھیں افسانہ سنا دوں گا میرے پاس ہے نہیں۔ گھر میں ہے۔"

طے یہ ہُوا کہ میں دوسرے روز شام کے وقت کرشن کے ہاں جاؤں گا اور وہ مجھے اپنا افسانہ سنا دے گا۔ اگر میں نے مولانا حامد علی خاں کے خیال کے برعکس افسانہ پسند کر لیا تو پرچے کے لئے لے آؤں گا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق میں موہنی روڈ پہ کرشن کے مکان کے دروازے پہ پہنچ گیا۔

آج کل موہنی روڈ کی جس گلی میں امام بخش پہلوان اپنے کنبے کے ساتھ رہتے ہیں اس کے متصل ایک چھوٹے سے مکان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں کرشن نے اپنی زندگی کی کچھ مُدت گزاری ہے۔

میں نے آواز دی۔ کرشن باہر آ گیا اور مجھے اندر لے گیا۔

گھر کا نقشہ ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔

ساتھ ساتھ دو کمرے۔ ایک طرف ایک چارپائی کے اُوپر ایک خوبصورت جوان بیٹھا ہوا۔ سامنے بائیں کونے میں ایک چھوٹی سی لڑکی۔ ملبوترا چہرہ۔ افسردہ اور اُداس سی اور دوسرے کمرے میں ایک معمر خاتون۔

یہ خوبصورت نوجوان مہندر ناتھ تھا جو بعد میں اُردو کا نامور افسانہ نویس اور ناول نگار بنا۔ "چاندی کے تار" کا مصنف۔ "راکھ" اور "سرائے کے باہر" کا ہیرو اور یہ افسردہ رو لڑکی تھی سرلا دیوی۔ خود مشہور افسانہ نگار بنی جو بوتی سرن شرما کی بیوی بنی اور وہ معمر خاتون ان کی والدہ محترمہ۔

بغیر کسی تمہید کے کرشن نے جیب میں سے مسودہ نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔

یہ افسانہ ایک ایسے لڑکے کے گرد گھومتا تھا جو ایک انگریز افسر کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے اور انگریز افسر اسے منتقمانہ کارروائی کا نشانہ بنانے میں ذرہ برابر تامل نہیں کرتا۔

اس افسانے میں کرشن کی وہ رومانیت، وہ شعریت، وہ سحر طرازی نہیں تھی جو اس کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی تھی —— سپاٹ افسانہ تھا ویسے میرے خیال میں قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ "دے دیجیے۔" یہ الفاظ میں نے مروتاً کہے تھے۔

کہنے لگا۔ "دے دوں گا۔ ذرا نظرِ ثانی کروں گا۔"

یہ الفاظ کہہ کر اس نے کاغذ تہہ کر کے دوبارہ جیب میں ڈال لئے۔

"اوہو۔ میں نے تمہاری خاطر تواضع تو کی ہی نہیں۔" کرشن کو یک لخت احساس ہوا اور وہ چارپائی سے اُٹھ بیٹھا۔ سامنے کمرے میں گیا۔ ایک گوشے میں برتن نظر آرہے تھے۔ ایک طرف ایک پرانی تانبے کی مٹی پڑی تھی۔ مٹی کے اوپر نہ جانے کتنے مٹکے رکھے گئے تھے۔ کرشن کو دیکھ کر والدہ مکرمہ مٹی کی طرف اشارہ کرکے خود آٹا گوندھنے لگیں۔

کرشن نے ایک مٹکا اٹھایا، دوسرا اٹھایا، تیسرا اٹھایا۔ چوتھا اٹھایا اور ان سب کو ایک ایک کرکے زمین پر رکھتا چلا گیا جب مٹی کے سر سے سارا بوجھ اتر گیا تو اُس نے مٹی کے اندر ہاتھ ڈال کر رومال میں بندھی ہوئی کوئی چیز نکالی اور اسے لے کر کمرے سے باہر نکلنے لگا۔ ماں کے منہ سے "ہوں" نکلا۔ واپس آگیا الماری میں سے ایک تھالی نکالی اور رومال اس پر رکھ کر قدم اٹھانے لگا۔

"کرشن کیا کرتے ہو!"

ماں کی آواز سن کر کرشن پھر رک گیا۔ واپس مٹی کے پاس پہنچا اور اس کے اوپر مٹکے یکے بعد دیگرے رکھنے لگا۔ اس دوران میں ماں نے آٹے کی پرات کے پاس رکھے ہوئے ایک ڈول کے اندر ہاتھ ڈال کر انھیں صاف کیا اور تھال میں پڑے ہوئے رومال کو کھول دیا۔ رومال پاس چارپائی کے اوپر رکھ اور تھالی کرشن کے حوالے کر دی۔

کرشن تھالی میں لڈو، کچھ برفی اور قلاقند وغیرہ لایا تھا۔

"یہ دیسی مٹھائی ہے — گھر میں بنائی ہے۔" کرشن نے مٹھائی کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

مٹھائی واقعی بہت مزیدار تھی اور ہم دونوں نے تھالی خالی کر دی۔

تو یہ تھا کرشن چندر جس کی یادیں وہ پھول ہیں جو کبھی کملا نہیں سکتے کیونکہ یہ پھول من کی کیاری میں کھلے ہیں اور من کی کیاری کے پھول آنسوؤں کی اوس میں ہمیشہ تر و تازہ رہتے ہیں۔

بہت مدت ہوئی کرشن نے ایک افسانہ نما مضمون لکھا تھا۔ جس کا عنوان تھا "دو فرلانگ لمبی سڑک" اور آج میں بمبئی سے ہزاروں میل دور کرشن نگر کے ایک نوآباد گوشے میں — ایک مکان کی چھوٹی سی لائبریری کے اندر بیٹھا ہوا چشم تصور سے سانتا کروز کی وہ ہزاروں فرلانگ لمبی سڑک دیکھ رہا ہوں جس کے آخر میں ایک سایہ چلا جا رہا ہے۔ چلا جا رہا ہے — کبھی واپس نہ آنے کے لئے — کبھی بھی واپس نہ آنے کے لئے۔

تو کرشن چندر چلا گیا ہے — جو ہم سب کا تھا — جو اردو ادب کا تھا۔ جو ساری دنیا کا تھا۔ جس نے سب کو پیار دیا تھا۔ وہ پیار جس کے پھول کبھی نہیں کملاتے — کبھی افسردہ نہیں ہوتے!

پرانی شراب نئی بوتل

ممتاز مفتی

ہائی کی آواز سن کر نمی نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ہاتھ میں سٹیتھوسکوپ لٹکائے اس کی سہیلی صفو کھڑی تھی۔
"ہائیں اس وقت بستر میں" صفو نے پوچھا۔
جسٹ لیزنگ۔ ان بیڈ
میں تو تجھے لینے آئی ہوں۔
کہاں۔
پکچر پر۔
کیوں۔
بڑی چارمنگ پکچر لگی ہے۔ بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے مجھے۔
مشکل سے کیوں
بھئی فائنل ایر ہے۔ چھٹی کیسے دیں۔ چلو اٹھو۔
اونہوں — موڈ نہیں۔
آج آخری دن ہے۔ پکچر اتر جائیگی۔
اتر جائے۔
پتہ ہے لی میجر ہے اس میں۔
اونہوں آج لی میجر بھی ان نہیں۔
کون ان ہے آج۔ صفو مسکرائی۔
آج تو صرف نمی ان ہے۔
ویسے لگتی تو آوٹ ہو۔ ناکڈ آوٹ۔
نانسنس۔ نمی نے صفو کا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پہ کھینچ لیا۔ بیٹھو باتیں کرتے ہیں۔ ایوننگ شو دیکھیں گے آنسٹ۔
گھر والے کہاں ہیں۔ صفو نے پوچھا۔
وہ شہزادی آئی تھی۔ پتہ نہیں کہاں لے گئی ہے۔

کون شہزادی ۔
تم نہیں جانتی اسے ۔
اُونہوں ۔
سبھی جانتے ہیں اسے ۔ بڑی لاؤڈ وومن ہے ۔ اتنی بھڑکیلی ہے کہ دیکھ کر جھرجھری آتی ہے ۔ ست رنگا لباس پہنتی ہے ۔ جھلمل ٹائپ ۔
وہی تو نہیں جو گشت ٹر گیدرسنیک بار پر ملی تھی ہمیں ۔
جب تو میں اور انور وہاں بیف برگر کھا رہے تھے ۔ یاد نہیں انور نے اسے دیکھ کر کہا تھا ۔ یہ تو نری لپس ہی لپس اور ہپس ہی ہپس ہے ۔
ہاں وہی ۔ نمی چلائی ۔ وہی تو ہے ۔
تمہارے گھر کیسے آ پہنچی ۔
ڈیڈی ایک روز انگلی لگا کرلے آئے تھے ۔ پھر خود آنے لگی اچھا تو ڈیڈی نے انگلی لگا رکھا ہے ۔
اونہوں ۔ اب تو وہ ڈیڈی کو انگلی لگائے پھرتی ہے ۔
تیرے ڈیڈی بھی سمجھ میں نہیں آتے صفو مسکرائی ۔
خواہ مخواہ بالکل ٹرانسپیرنٹ ہیں ۔ اندر جھانکے بغیر دیکھ لو ۔
ان کا ایک نا ایک افیئر تو چلتا ہی رہتا ہے ۔
اونہوں ۔ افیئر نہیں ۔
انہیں صرف اس بات کا شوق ہے کہ کوئی انگلی لگائے پھرے ۔ صرف اتنا ۔ آگے پتہ نہیں ۔
چاہے کوئی لگائے ۔
کوئی ہو ۔ یک رنگی ہو ست رنگی ہو ۔ بدرنگی ہو ۔ ڈیڈی بڑے سنٹیمنٹل ہیں ۔ جذبے میں لت پت رہتے ہیں ۔ بس ذرا چھیڑ دو ۔ اور کھل گیا ۔
تمہاری ممی بھی ساتھ گئی ہیں کیا ۔
ہاں ۔ وہ ہمیشہ ساتھ جاتی ہیں ۔ سپرویژن کے لئے ۔
کیا مطلب صفو نے پوچھا ۔
ممی اس ڈر کے مارے ساتھ چل پڑتی ہیں کہ کچھ ہو نہ جائے ۔
صفو نے قہقہہ مارا ۔ جیسے روک ہی لیں گی ۔
ہاں ۔ اپنی طرف سے تو پورا زور لگاتی ہیں ۔ پوّر ممی ۔

مطلب یہ کہ بات نہیں بنتی۔

بات کیسے بنے۔ ڈیڈی تازہ کے قائل ہیں۔ تتلہ کے نہیں اور ممی کو باسی ہو جانے میں کمال حاصل ہے۔ دراصل ممی کو ڈیڈی سے عشق ہے۔ اپنا سب کچھ ان کے چرنوں میں ڈال رکھا ہے۔ سب کچھ چرنوں میں ڈال دو تو دوسرا بے نیاز ہو جاتا ہے۔ پھر آہیں بھرو۔ انتظار کرو۔

آئی ہیٹ سچ ساب سٹف۔ یہ بات تو پرانے زمانے میں چلتی تھی۔ اب نہیں چلتی۔

اور جو انور سے بات چل رہی تھی تمہاری وہ۔

آئی لائکڈ انور۔ آل رائٹ۔ بہت اچھا کم پینین تھا۔

بڑا اگری ایبل۔

لکس بھی تو تھے۔

لکس کی کون پروا کرتا ہے آج کل۔ ویسے ڈونٹ میٹر۔

پرانے زمانے میں لوگ پری چہرہ ڈھونڈا کرتے تھے۔ سوہنی پہ جان دیتے تھے۔ یوسف کی طرف دیکھ کر انگلیاں چیر لیتے تھے۔ اب وہ باتیں گئیں۔

عظمہ تو کہتی تھی نی از سٹرکن وِد لو فار انور۔

گڈ لارڈ۔ ناٹ می۔ بھئی مجھ سے یہ نہیں ہوتا کہ اپنے جذبات کی بھٹی کو ہوا دوں۔ دیتی رہوں۔ دیتی رہوں اور جب بھانبڑ مچ جائے تو بیٹھ کر روؤں۔ نو نو۔ آئی ایم ناٹ دی سابنگ اینڈ سائنگ ٹائپ۔ میں ہر حد توڑ سکتی ہوں صفو۔ دور جا سکتی ہوں لیکن اتنی دور نہیں کہ واپسی ناممکن ہو جائے تو تو لینڈ آف نو ریٹرن میں لے جاتی ہے۔ ہیو گڈ ٹائم ——— بٹ نو ——— نو نو ——— ینور۔

بھئی اس لحاظ سے میں تو ماڈرن نہیں صفو نے کہا۔ پھر وہ نمی کے قریب تر ہو گئی۔ کچھ پتہ ہے وہ آنکھیں مٹکا کر بولی تیرے پڑوس میں ڈاکٹر نجمی کے ہاں کون آیا ہوا ہے۔

کون ہے۔

لگتا ہے جیسے گلیکسو بے بی ہو۔ گھرے بھورے بالوں کا آنا بٹہ آتا ج گول چہرا۔ نکھرا رنگ اور آنکھوں میں لال ڈورے۔

صفو نے یوں سینہ تھام کر کہا جیسے اندر ہل چل بھی ہو۔

ابھی کی بات کر رہی ہو صفو نے پوچھا۔

تو اسے جانتی ہے۔

ہاں دو ایک مہینے ہو گئے اسے آئے ہوئے۔

ملنے ملانے کے لئے آیا ہے کیا۔

اونہوں پوسٹنگ ہوئی ہے یہاں۔ الاٹ منٹ کی انتظار میں بیٹھا ہے ادھر۔
کوئی ریلیٹیو ہے ڈاکٹر نجمی کا۔
نیفیو قسم کی چیز ہے۔
کیسا لگا تمہیں۔ صفو نے پھر سینہ سنبھالا۔
اچھا خاصہ ہے۔ نمی نے بے پروائی سے کہا۔
اب بنو نہیں۔ نمی
میں تو نہیں بنتی۔ وہ بنتا ہے پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے۔ ہے نمی صفو نے پھر سینہ سنبھالا۔
پنک چیک شرٹ اورنج سٹرائپڈ کوٹ اور شاکنگ ——— گرین ٹائی۔ میں تو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ سٹنڈ۔

ہاں چارمنگ تو ہے نمی نے کہا۔
سلی — چارمنگ از نو ورڈ فار اٹ کبھی ملی ہو اس سے۔
روز آجاتا ہے۔ ممی نے سر چڑھا رکھا ہے
اور تم نے۔
اونہوں۔
تم سے بھی ملتا ہے کیا۔
ہاں۔
پھر — صفو کا تنفس تیز ہو گیا۔
پھر ——— نمی آنکھیں بند کر کے پڑ گئی۔
سارا جھگڑا اس پھر — کا تھا۔
اسی پھر — کی وجہ سے نمی اس روز بستر میں پڑی تھی لیز کر رہی تھی۔ لیز تو خیر بہانہ تھا۔ لیز تو اس وقت ہوتا ہے جب امن ہو۔ اندر جھگڑے کی ہنڈیا پک رہی ہو تو امن کیسا۔ اور امن نہ ہو تو لیز کیسا۔ مانا کہ جھگڑا دل کی اتھاہ گہرائیوں میں تھا جہاں کے شور و غوغا کی آواز ذہن تک نہیں پہنچتی۔ مشکل یہ ہے کہ ذہن تک آواز نہ پہنچے تو بات اُور اُلجھ جاتی ہے۔ خود کو تسلیاں دینا بھی ممکن نہیں رہتا۔ بہرحال سارا جھگڑا اس پھر — کا تھا۔
نمی کا دل پوچھ رہا تھا۔ پھر —
اس کی نحیف آواز سن کر ذہن کہہ رہا تھا پھر — کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب سرے سے کوئی بات ہی نہیں تو پھر ——— کیسا۔

نمی ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ ماڈرن گھر میں پرورش پائی تھی ماڈرن ماحول میں جوان ہوئی تھی۔ اسے اپنے ماڈرن ازم سے عشق تھا عشق۔ چاہے کچھ ہو جائے ماڈرن ازم ہاتھ سے نہ جائے۔ اس کا دل پھر — پھر — کر رہا تھا۔ گمراہ رہا تھا۔ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس وقت نمی کی زندگی کی ایک واحد پرابلم تھی کہ دل کی آواز نہ سنے۔ سنائی دے تو ان سنی کر دے اس کا صرف ایک حل تھا کہ ذہن سے چھٹ جائے اور قریب اور قریب جس طرح جونک خون کی رگ سے چمٹ جاتی ہے۔

نمی میں ذہن اور دل کی کشمکش پہلے کبھی اس شدت سے نہیں ابھری تھی۔

نمی نے زندگی میں چند ایک افیر چلائے تھے۔

سب سے پہلے سعید تھا۔ ان دنوں وہ بی اے میں پڑھتی تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا معنک لڑکا تھا۔ جب بھی کالج میں نمی اس کے سامنے آتی تو اس کی آنکھیں پھٹ جاتیں منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا اور وہ گویا پتھر کا بن جاتا۔ پھر ہواس گم قیاس گم وہ ٹُر ٹُر نمی کو دیکھتا رہتا۔ دیکھتا رہتا۔ حتیٰ کہ سب کو پتہ چل جاتا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ لڑکے پھبتیاں کستے مذاق اڑاتے لیکن اسے خبر ہی نہ ہوتی۔

پہلے تو نمی کو سعید پر بڑا طیش آتا رہا کہ یہ کیا ڈرامہ لگا کہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اسے ترس آنے لگا۔ نن کم پوپ دیکھنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا — بے شک دیکھے۔ کون منع کرتا ہے لیکن پہلے دیکھنے کا انداز تو سیکھے۔

دوسرا جی اے اوپس تھا۔ ادھیڑ عمر۔ ڈیڈی کا ہم کار۔ اسے دیکھنے کا سلیقہ تھا۔ اتنا سلیقہ تھا کہ نظر بھر کر دیکھتا ہی نہ تھا۔ بات ہوئی نا۔ بھلا دیکھنا مقصود ہوتا ہے کیا۔ لوگ بھی کتنے احمق ہوتے ہیں یوں ٹُر ٹُر دیکھنے لگتے ہیں جیسے دیکھنا مقصود ہو۔ یا شاید اتنا دیکھتے ہیں اتنا دیکھتے ہیں کہ بھول جاتے ہیں کہ مقصد کیا تھا دیکھنا خود راستے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ چلو مان لیا کہ دیکھنا تعارف کے لئے ضروری ہے لیکن انٹی میسی مقصود ہو تو ———

پھر وہ انور تھا۔ کتنا اچھا کمپینین تھا۔ لیکن اکیلے میں کبوتر سی آنکھیں بنا کر بیٹھ جاتا۔ بھئی کوئی بات کرو جو چھیڑ دے کوئی جوک جو گدگدا دے ہنسا دے۔ کوئی منتر پھونکو کہ کلی کھل کر گلاب بن جائے۔ بھلا گھٹنے ٹیکنے سے کیا ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ کا سکینڈل۔ محبت میں یہی تو عیب ہے شور و غوغا مچا دیتی ہے۔ ڈھول اڑا دیتی ہے۔ راستے مسدود کر دیتی ہے مواقعے تباہ کر دیتی ہے۔

نمی کے افیرز تو بہت تھے۔ اب انھیں گنوانے کا فائدہ۔ بس تھے۔ دو ایک تو خاصی دور رہے گئے تھے۔ ان تیلیوں نے نمی کو کلی سے پھول بنا دیا تھا ایسا پھول جو بھنوروں کو بیٹھنے نہیں دیتا۔ لیکن اڑاتا بھی نہیں — تیتریوں کی اور بات تھی۔ وہ بھن بھن کر کے شور نہیں مچاتی تھیں۔ ڈھول نہیں اڑاتی تھیں۔ لیکن اس گلیکسو بے بی امجی نے آ کر مشکل پیدا کر دی تھی۔

پہلے دن تو باؤنڈری وال سے ہیلو ہیلو ہو گیا۔ امجی نے اپنا تعارف کرا دیا۔ دوسرے دن وہ بڑی بے تکلفی سے گھر آ گیا اور نمی کے چھوٹے بھائی عمران سے جڑی کھیلنے لگا۔ ممی آ گئیں تو ان سے گپیں ہانکنے لگا۔ ممی کو وہ لفٹ دی وہ لفٹ دی کہ انھیں کبھی ملی نہ تھی وہ تو بوکھلا گئیں پھر نمی کے پاس آ بیٹھا۔ بات چھیڑ دی۔ باتیں تو خیر کلچرڈ تھیں لیکن نگاہیں

بالکل ہی کمر دڑ چونکا دینے والی۔ چبھنے والی۔ بڑی ان یوپوال — بھلا پاس بیٹھ کر کبوتر سی آنکھیں بنانے کا مطلب ایڈیٹ۔

گلیڈ آئی تو خیر ہوا ہی کرتی ہے۔ وہ تو یوں ہے کہ دور بیٹھ کر رومین ٹاک کرتے کرتے ایک دم گلیڈ آئی کے ذریعہ جھپ لگایا اور گود میں آ بیٹھے ذرا سی گدگدی کی اور پھر واپس اپنی سیٹ پہ دور جا بیٹھے یہ تو جدید انداز ہے نا۔ اپنی توجہ جتائی۔ گڈ ٹائم کی خواہش کو آنکھوں میں سجایا اور پھر اینڈ یو ور ہو کر ایٹ ایز بیٹھ گئے۔ لیکن مسلسل آڑی ترچھی آنکھیں بنا کر بیٹھے رہنا — نانسنس۔

گلیڈ آئی تو گڈ ٹائم کی دعوت ہوتی ہے نا۔ اور آنکھیں بنا کر بیٹھے رہنا تو گویا اس بات کی رٹ لگائے رکھنا ہوا کہ دیکھ میں تیرے بنا کتنا دکھی ہوں۔

وہ مثبت بات — اور یہ خالص نیگیٹو۔

ہاں تو امجی ویسے تو بڑا پیارا آدمی تھا۔ آدمی کہاں آدمی نما لڑکا — اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا بولنا سب کلچرڈ تھے بس اک ذرا آنکھیں بنانے کی بیماری لگی ہوئی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ نمی پہلے روز ہی امجی کو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا آئیڈیل کپڑے پہن کر سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔ وہ تو اچنبھے میں رہ گئی تھی۔ اب اس اچنبھے کا اظہار خود سے کیسے کرتی۔ جو دل کی آواز پر کان دھرتی تو محبت کی راہ پر گامزن ہو جاتی۔ اس کا انتظار کرتی۔ آہیں بھرتی۔ گھڑیاں گنتی۔ اولڈ مینشن۔ غیر مہذب دقیانوسی باتیں۔

ایک پیاری سی سمارٹ سی خوب صورت ماڈ لڑکی ماڈرن ازم کو چھوڑ کر دقیانوسی کیوں بنے۔ اس لئے نمی سب کچھ پی گئی اور یوں تن کر بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

بہر طور امجی اپنا چکر چلا گیا تھا۔ اگر اس میں آنکھیں بنانے کی بیماری نہ ہوتی تو یقیناً افیر چل جاتا —

افیر تو خیر اب بھی چل پڑا تھا۔ لیکن وہ خالصتاً تفریحی نہ بن سکا۔ اور خالص تفریحی نہ ہو تو افیر کیسا۔

اس کے بعد امجی نے ایک اور قیامت ڈھائی۔ فسٹ فلور پہ اس کا کمرا نمی کی کھڑکی کے عین سامنے کھلتا تھا کمبخت نے اپنی کرسی دروازے میں بچھا لی اور نمی کی کھڑکی پہ نگاہوں کی چاند ماری شروع کر دی۔

اس پر نمی اور بھی چڑ گئی۔ وہ بھلا نگاہوں کی چاند ماری کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اَن نیسے سری مبشر نہ اور کیا۔ بھئی جو ناک کو ہاتھ لگانا ہو تو سیدھا لگا لو ہاتھ کو سر کے پیچھے سے گھما کر لانے کی کیا ضرورت ہے۔

دو ایک مرتبہ اس نے کھڑکی سے جھانکا اور وہ ان جانے میں جھینپ گئی اس پر اُسے غصہ آ گیا۔ بھلا جھینپنے کی کیا بات ہے اس میں بس دیکھ ہی رہا ہے نا۔ احمق کو اتنا نہیں پتہ کہ یوں دیکھنے سے بات بنتی نہیں بگڑتی ہے — چلو دیکھنا ہے تو پڑا دیکھے۔ وہ اطمینان سے سرہانے سے ٹیک لگا کر کتاب پڑھنے لگی۔ لیکن ہر چند ساعت کے بعد کتاب کے صفحے سے وہ آنکھیں ابھریں۔ —— دل پھر —— پھر —— کرنے لگتا اور وہ پھر سے جھینپ

جاتی -

پھر ایک روز امجی اسے فلم پر لے گیا -

شاید وہ انکار کر دیتی لیکن نمی کا چھوٹا بھائی عمران ضد کرنے لگا ممی بھی ان کی طرفدار ہو گئی - ہوا کیا حرج ہے - فلم دیکھنے میں واقعی کوئی حرج نہ تھا - سارا فساد تو نگاہوں کا تھا نا - سینما ہال کے اندھیرے میں نگاہیں تو چلتی ہی نہیں رہا قرب کا سوال تو قرب پہ تو اُسے کوئی اعتراض نہ تھا -

جب امجی نے اندھیرے میں اس کا ہاتھ پکڑا تو نمی ذرا نہ جھینپی - یہ تو یوبوال بات تھی - بارہا وہ اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھی - وہ اس خوشبودار اندھیرے سے واقف تھی - اور اندھیرا خوشبودار ہو تو ہاتھ پکڑنا تو ہوتا ہی ہے - امجی نے پکڑا تو نمی نے حسبِ دستور بازو ڈھیلا کر دیا -

جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ امجی کا دباؤ یوبوال نہیں ہے یوبوال دباؤ تو موقعہ کی مناسبت پر عمل میں آتا ہے نا فلم میں اظہارِ محبت ہو تو ـــ گڈ ٹائم کا اشارہ ہو تو ـــ لیکن یہ دباؤ تو مسلسل تھا - دباؤ ختم ہوتا تو امجی کی ہتھیلی نمی کے ہاتھ پر چلنے لگتی جیسے ہاتھ کے بند بند کا جائزہ لے رہی ہو - جیسے ہاتھ پر کوئی امریکہ دریافت کرنے میں لگا ہو -

نمی کی ہتھیلی پر پسینہ آ گیا - ہاتھ کے اس لمس نے پتہ نہیں کیا کر دیا - اک اَن یوبوال رابطہ قائم ہو گیا ـــ دل سے رابطہ - دل پھر ـــ پھر کرنے لگا - یہ کیا مصیبت ہے اُس نے ہاتھ چھڑا لیا -

جب بھی دل پھر ـــ پھر ـــ کرنے لگتا تو وہ ہاتھ چھڑا لیتی ـــ لیکن کچھ دیر کے بعد ان جانے میں اس کا بازو پھر اُدھر ہو جاتا - ہاتھ کرسی کے بائیں ہتھے پر ٹک جاتا ـــ اور پھر وہی دباؤ -

بیچاری عجیب مشکل میں تھی - دباؤ ہوتا تو بھی چاہتا کہ یوبوال ہو جائے - نہ ہوتا تو جی چاہتا کہ ہو -

گھر میں وہ روز ہی ملتے تھے - وہ روز آ جاتا تھا - نہ آتا تو عمران پکڑ کے لے آتا - ممی آواز دے کر بلا لیتی - ممی کے لئے تو وہ گھر کا فرد بن چکا تھا - ممی پہلے روز ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ نمی میں انٹرسٹڈ ہے نرا گڈ ٹائمر نہیں - وہ تو خوش تھی پڑھا لکھا لڑکا اور پھر چھوٹے ہی افسر - کیریئر - رہت بہت بالکل جدید طرز کی - اور پھر انڈیپنڈنٹ - چچا کے گھر میں صرف الاٹ منٹ کے انتظار میں بیٹھا ہے - پتہ نہیں کس روز مل جائے - دور چلا گیا تو شاید توجہ بٹ جائے ہٹ جائے اس لئے وہ چاہتی تھی کہ جلد کچھ ہو جائے - آخر نمی کی شادی تو ہونی ہی تھی - ایم اے کر چکی تھی - رشتے تو آئے تھے لیکن وہ تو سبھی سوشل قسم کے تھے یہ تو جوڑ کا تھا -

ڈیڈی بھی خوش تھا اس نے پہلے روز ہی بھانپ لیا تھا کہ لڑکا سیریس ہے - بیماری لگا بیٹھا ہے اُن کی ساری ہمدردیاں امجی کے ساتھ تھیں - کیسے نہ ہوتیں وہ خود سیریس نس کی بیماری میں مبتلا تھا - بہرطور وہ بے نیاز قسم کا آدمی بات بن گئی تو اوکے نہیں تو کے، اجی ادلیس تو ہے ہی - بڑا افسر ہے پیچھے مربعے ہیں - صرف یہی نا کہ ادھیڑ عمر کا ہے - بال جھڑ چکے ہیں لیکن نمی کو اپنانے کے لئے کتنا بے تاب ہے - حکومت کرے گی عیش کرے گی - بیاہ اسی لئے تو کیا جاتا ہے -

اس کے بعد امجی اور نمی کی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ ہوٹلوں میں پارکوں میں سینما گھروں میں۔ انہوں نے شاپنگ کیں۔ ڈرائیونگ پر گئے۔ یک نک سپاٹ دیکھے ان ملاقاتوں میں امجی نے طرح طرح کے حربے آزمائے کہ نمی اس سے اظہارِ محبت کرے۔ نمی اس ضد پہ اڑی رہی کہ امجی کے سر سے عشق کا بھوت اتر جائے۔ اور وہ سیدھا سیدھا بوائے فرینڈ بن جائے۔

جب کبھی وہ شاپنگ پر جاتے امجی کوئی ناکوئی تحفہ نمی کے لئے خرید لیتا۔ ایک دن اس کی ممی نے کہا نمی تو نے اسے کوئی تحفہ نہیں دیا۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا۔

نمی نے سوچا کوئی ایسا تحفہ دوں کہ جل کر راکھ ہو جائے۔

مطلب جلانا نہیں تھا۔ بلکہ اشارتاً سمجھانا تھا کہ مرد بنو۔ آہیں بھرنا چھوڑو۔ آنکھیں بنانا بے کار ہے۔ بھکاری نہ بنو۔ چھین کر لینا سیکھو۔ اس نے سوچ سوچ ایک چارم خریدا۔ ایک روپیلا بریسلٹ جو کلائی پہ چوڑی کی طرح پہنا جاتا ہے۔

امجی اس چارم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا سمجھا شاید نمی کے دل میں اس کے لئے جذبہ پیدا ہو گیا ہے اسے قطعاً خیال نہ آیا کہ کیپ سیک کے پردے میں نمی اسے چوڑی پہنا رہی تھی۔ بہر حال اس نے بڑی خوشی سے وہ چوڑی پہن لی۔

اُسی شام وہ دونوں ڈرائیونگ کے لئے جا رہے تھے دفعتاً ایک ویران جگہ پر امجی نے گاڑی روک لی نمی کا دل خوشی سے اچھلا۔

اس سے پہلے ڈرائیونگ کے دوران کئی بار اسے خیال آتا تھا کہ امجی گاڑی روک دے گا۔ ویران جگہ گاڑی رکنے کی بات تو فیشن تھی۔ کریز تھا۔ یوبوال تھا۔

اس یوبوال سے وہ اچھی طرح واقف تھی —— لیکن امجی نے کبھی گاڑی نہ روکی تھی۔ اس کی تو ساری توجہ نمی کے چہرے پر مرکوز رہتی یا وہ نمی کے ہاتھ کو تھامے رکھتا یوں جیسے بلور کا بنا ہو۔

اس روز گاڑی رکی تو نمی خوشی سے اچھل پڑی پھر آنکھیں بند کر کے خواب دیکھنے لگی۔ گھرے بھورے بال اس کی طرف لپکے اس کے منہ سے ٹکرائے پھر سارے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ بریسلٹ والا بازو اس کی کمر میں حمائل ہو گیا۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا آج سب نارمل ہو جائے گا۔ کبوتر سی آنکھیں بنانے اور خالی خولی ہاتھ تھامنے کی بیماری ختم ہو جائے گی —— اور پھر —— وہی —— یوبوال گولڈن یوبوال۔

دیر تک وہ آنکھیں بند کر کے پڑی رہی۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا اس نے آنکھیں کھول دیں ساتھ والی سیٹ پر امجی بیٹھا دیوانہ وار اس کا ہاتھ چوم رہا تھا —— ایڈیٹ وہ ملائی کی برف کی کلفی کی طرح جم کر رہ گئی۔

آخر امجی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا بولا۔ نمی آج مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔

اچھا تو بات کرنے کے لئے گاڑی روکی ہے اسے غصہ آگیا۔ ان حالات میں بھلا منہ زبانی بات کی کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ باتوں کی جلیبیاں تلنا۔ سلی فول۔

نمی - امجی بولا - کیا تمہارے دل میں میرے لئے کوئی محبت نہیں -

محبت محبت محبت وہ چڑ کر بولی - ڈونٹ ٹاک لائیک این انکل امجی - ابھی ہم ریشنل دور میں رہتے ہیں - بی ریزن ایبل - ذرا سوچو - تو کیا ہے ایک متھ - ویسے آئی لائیک یو آل رائٹ -

ٹھیک ہے اس نے جواب دیا - لیکن میں اپنے سوال کا ڈائریکٹ جواب مانگتا ہوں ڈو یو لو می

وہاٹ از لو وہ بولی - ایک خود فریبی ایک خود پیدا کی ہوئی فرنزی - ہے نا - کیا تم لو کے جھوٹے سنہرے جال سے آزاد نہیں ہو سکتے -

نہیں وہ بولا - مجھے تم سے محبت ہے آئی لو یو میڈ -

اوہ - اٹ از لیے پٹی - نمی کے منہ سے نکل گیا -

دیر تک وہ خاموش رہے پھر امجی بولا نمی میں ایک ایسا جیون ساتھی تلاش کرنا چاہتا ہوں جو مجھ سے محبت کرتا ہو -

وہ ہنسی - پھر تم وائلڈ سٹی کا رخ کرو - یہاں کلچرڈ ماحول میں تمہیں کوئی سوہنی نہ ملے گی -

یہ ان کی آخری گفتگو تھی -

اگلے روز نمی کو پتہ چلا کہ امجی شفٹ کر گیا ہے اسے گھر مل گیا ہے -

یہ جان کر نمی کا دل ڈوب گیا -

لیکن خود کو سنبھالا - اچھا چلا گیا ہے - سو واٹ ٹز آل رایٹ -

دل کو سمجھانے کے باوجود کئی ایک مہینے بار بار سوتے جاگتے ان جانے میں گھرے بھورے بال اڑتے اس کے چہرے پر ڈھیر ہو جاتے - پھر بریسلیٹ والا ہاتھ بڑھ کر اسے تھام لیتا - بار بار وہ خود کو جھنجھوڑتی - چلا گیا ہے تو کیا - سو وہاٹ اٹ از آل رائٹ -

ایک سال بعد نمی کی کے جی اویس سے شادی ہو گئی - اور اسے سب کچھ مل گیا - سجا سجایا گھر نوکر چاکر - ساز و سامان - کاریں - سب کچھ اس کا خاوند اویس بڑا کلچرڈ آدمی تھا - اور چونکہ ادھیڑ عمر کا تھا - اس کی زندگی کا تمام تر مقصد نوجوان بیوی کو خوش رکھنا تھا - بلکہ سپائل کرنا تھا -

اویس میں بڑی خوبیاں تھیں صرف عمر ڈھلی ہوئی تھی بال گر چکے تھے ٹانٹ نکل آئی تھی -

بہرحال نمی خوش تھی بہت خوش -

شادی کے دو سال بعد ایک روز اویس بے سبب تذکرہ کرنے لگا - ڈارلنگ وہ تیری ایک ڈاکٹر سہیلی تھی، کیا نام تھا اس کا -

صفو کی بات کر رہے ہو -

کہاں ہوتی ہے وہ آجکل -

پہلے تو پنڈی میں اس کا کلینک تھا اب پتہ نہیں دو سال سے نہیں ملی وہ -

پنڈی میں کس جگہ کلینک تھا -

شاید لال کرتی کے چوک میں - کیوں کوئی کام ہے صفو سے -

نہیں تو۔ اویس بولا۔ ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔

دس پندرہ روز کے بعد اچانک صفو آ گئی۔

ارے تو صفو۔ نمی خوشی سے چلائی۔

کیسی ہے تو صفو نے پوچھا۔

فسٹ ریٹ۔

آر یو ہیپی۔

ہیپی از نو ورڈ فار اٹ نمی آنکھیں چمکا کر بولی۔

اچھا صفو سوچ میں پڑ گئی۔

بات کیا ہے۔ نمی نے پوچھا۔ کیا اویس ملا تھا تجھے

ہاں ملا تھا۔ صفو نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔ تیرے فکر میں گھلا جا رہا ہے۔ وہ میرے فکر میں۔

ہاں ہی از ویری مچ کنسرنڈ — ووریڈ۔

مذاق نہ کرو صفو۔

آئی ام ڈیڈ سیریس۔ اویس کہتا ہے تمہیں ہیلوسی نیشن ہوئے ہیں۔

مجھے۔

ہاں۔

مثلاً۔

کہتا تھا جب اکیلے میں میرے ساتھ ہوتی ہے تو کہتی ہے ڈارلنگ تم بال کیوں نہیں سنبھالتے میرے منہ پر پڑتے ہیں اور صفو رک گئی۔

نمی چپ ہو گئی۔

اور جاؤ تم بریسلٹ تو اتار لیا کرو۔

نانسنس نمی چیخی۔ ایسی بے معنی باتیں میں کرتی ہوں کیا۔

بے معنی تو نہیں صفو بولی میں خود اپنے میاں سے یہی کہا کرتی ہوں۔

کیا۔

کہ بال سنبھال لیا کرو میرے منہ پر پڑتے ہیں اور

اور — اپنا بریسلٹ تو اتار لیا کرو۔

مذاق نہ کر نمی چلائی۔

تمہیں پتہ نہیں کیا۔ صفو سنجیدگی سے بولی۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ ابھی سے۔

جلتا بجھتا دیا

ممتاز مفتی

ابنِ انشا کی شخصیت جلتے بجھتے مٹی کے دیے کی مصداق تھی۔ بجھ جاتا تو گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ جلتا تو بھیرو سماں بندھ جاتا۔

بنیادی طور پر وہ گھپ اندھیرا تھا۔ چہرا ڈھلک جاتا حسیات ساکت ہو جاتیں۔ بے تعلقی اور اکتاہٹ کے ڈھیر لگ جاتے۔ ایک بے نام دھند لکا چھا جاتا۔ اور اس دھند لکے میں ایک فرد کھویا کھویا۔ دکھی۔ اکیلا۔ گونگا۔

جلتا تو چہرا مسکراہٹ سے منور ہو جاتا اس مسکراہٹ میں مسرت کم خلوص زیادہ چھپا خلوص بے لبسی بھرا ٹوٹ بھرا پیار نم۔

شہرت پانے سے پہلے وہ اکثر و بیشتر بجھا رہتا تھا شہرت پانے کے بعد بجھے رہنے کے دوران کم ہوتے گئے۔ مسکراہٹ میں چمک بڑھ گئی۔ گونگا بولنے لگا۔

لگتا تھا جیسے اس کی یادوں کے طاقچے میں کوئی پھنیر سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ ڈر کے مارے اس نے یادوں کا طاقچہ بند کر رکھا تھا۔ یادوں کی روشنی سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے ان جانے میں یا شاید جہاں چالاکی سے خود پہ گھپ اندھیرا طاری کر رکھا تھا۔

بڑا شاعر بنانے کے لئے قدرت کیا کیا جتن کرتی ہے۔

شیر محمد خان ۱۹۲۷ء میں پھلور کے قریب ایک گاؤں تھلہ میں نہ گڑ راجپوت خاندان میں پیدا ہوا۔ باپ منشی خان ایک معمولی کسان تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ اس دلخراش حقیقت کو بھولنے کے لئے پنجابی میں شعر کہنے کا شغل اپنا رکھا تھا۔ اچھے شعر کہتا تھا خوش گلو تھا۔ یوں گزر بسر ہو رہی تھی۔

شیر محمد کو بچپن میں بکریاں چرانا پڑیں تعلیم حاصل کرنے کے امکانات بہت کم تھے۔ شوق باپ سے ورثہ میں پایا تھا۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ آٹھویں جماعت میں ایک ہفتہ وار ادبی جریدہ شائع کرنا شروع کیا۔ یہ جریدہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا۔ شیر محمد خود ہی کاتب تھا خود ہی مدیر۔ سرکولیشن تو بہت تھی لیکن تعداد اشاعت صرف ایک تھی۔ ہاتھ سے لکھا جاتا ـــ ہاتھوں ہاتھوں پڑھا جاتا

ابن انشا کا پہلا نام شیر محمد خان تھا۔ پھر اس کے ساتھ چودھری کا اضافہ ہو گیا۔ جب وہ جریدے کا مدیر بنا تو لازم تھا کہ اپنے نام کے ساتھ تخلص کا اضافہ کرے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اپنا نام چودھری شیر محمد خان مایوس صحرائی عدم آبادی رکھ لیا۔ دیر تک یہی نام چلتا رہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ یہ نام بہت لمبا ہے انسے بدل کر قیصر صحرائی لکھنا شروع کر دیا۔

جوانی میں وہ پھر سے اپنے نام سے غیر مطمئن ہوگیا۔ اب کی بار اپنے والد منشی خان کے حوالے سے ابن انشا کا نام اپنالیا۔

دسویں جماعت لودھیانہ سے جیسے تیسے پاس کی۔ لودھیانے میں اپنے جدیدیے کی وجہ سے ادیبوں ادب پسندوں سے راہ و رسم ہوگئی۔ مسافر لودھیانوی اور حمید اختر اس کے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔

اس زمانے میں ترقی پسندی کی تحریک زوروں پر تھی۔ ترقی پسندوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا لہٰذا اُن جانے میں ابن انشا ترقی پسندانہ راہ پر چل نکلا۔ ابتدا میں اس نے طویل نظمیں لکھیں ان نظموں میں بڑی جان تھی لیکن یہ دور ہنگامی ثابت ہوا۔ ابن انشا کی شاعری اس وقت جوبن پر آئی جب اس کے کلام میں ذات کا جوگ ابھرا دسویں پاس کرنے کے بعد کالج میں تعلیم حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ نوائے وقت کے حمید نظامی کے بلانے پر شوق ایڑ لگا کر اسے لاہور لے آیا۔ لاہور میں وہ بری طرح سے دربدر ہوا۔ ٹیوشنیں پڑھائیں۔ اخباروں میں کام کیا ٹھوکریں کھائیں۔ بڑی مشکل سے بی اے کیا۔ پھر دلی میں پوسا انسٹیٹوٹ کے ایک رسالے میں، نوکری مل گئی۔ وہاں دیوندر ستھیارتی سے میل ہوا۔

تقسیم کے وقت وہ دلی میں ریڈیو نیوز میں مترجم تھا۔ اس زمانے میں دلی ریڈیو سٹیشن پر بڑے بڑے ادیبوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ کرشن چندر، منٹو، راشد، بیدی، مہندر ریوں ادیبوں سے میل جول بڑھا۔ پھر برصغیر کی تقسیم پر دلی سے لاہور اور لاہور سے کراچی پہنچا۔ کراچی میڈیو نیوز میں چراغ حسن حسرت کے ساتھ کام کرتا رہا۔ وہاں اسامی تخفیف میں آگئی تو احمد بشیر نے ویلیج ایڈ میں پاک سرزمین کا ایڈیٹر بنا دیا۔

ابن انشا کی پہلی شادی بچپن ہی میں ہوگئی تھی۔ دلہن بڑی تھی، دولہا چھوٹا۔ اتنا چھوٹا کہ جب اسے سہرے لگا کر ہمبو کاٹ پر بٹھایا گیا تو ضد کرنے لگا کہ میں سیٹ پر نہیں بلکہ اس بانس پر بیٹھوں گا جس کے ساتھ گھوڑا جتا ہوا ہے اور بانس پر ہی بیٹھ کر سسرال گیا۔

پتہ نہیں کیوں یہ شادی اس کے ذہن میں ایک پھوڑے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرتا تھا۔ کوئی کرتا تو ذہن کا فیوز اڑ جاتا۔ اس شادی سے دو بچے ہوئے ان کی کفالت ضرور کی لیکن انھیں دور رکھا کبھی اپنایا نہیں کسی سے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ پھر بیوی سے علیحدگی ہوگئی۔ تو انشا نے یادوں کا طاقچہ ہمیشہ کے لئے مقفل کر دیا اور خود پر کھویا پن طاری کر لیا۔

۱۹۵۷ء میں میں پہلی بار ابن انشا سے ویلیج ایڈ کے دفتر میں ملا۔ احمد بشیر نے جگر چلایا اور ڈی ایف پی سے میری خدمات مستعار لے لیں۔ یوں میں بھی ویلیج ایڈ کے دفتر میں منتقل ہوگیا۔

یہ دفتر صدر میں کیفیٹریا کے قریب ایک چھوٹی سی کوٹھی میں واقع تھا۔ دفتر میں صرف چار افسر تھے۔ حفیظ جالندھری ڈائرکٹر تھے احمد بشیر ان کا نائب تھا ابن انشا پاک سرزمین کا ایڈیٹر تھا اور میں فلم سکرپٹ افسر تھا جسے حفیظ صاحب نے اپنا پی اے بنا رکھا تھا۔

پانچ دن میں حفیظ صاحب مجھے ایک ڈی او لکھوایا کرتے پھر دس روز اسے پالش کرنے میں گزارتے۔ اس پر دن میں مسلسل سات آٹھ گھنٹے شدت سے محنت کرتے۔

یہ دفتر ہمارے لیے صرف دفتر ہی نہ تھا۔ ہمارا کلب تھا تفریح گاہ تھا کافی ہاؤس تھا۔ گھر تھا۔ اکھاڑہ تھا۔

اس دفتر میں ڈھائی سال مجھے انشا کے ساتھ رہنے کا موقعہ ملا۔ وہاں میں نے پہلی مرتبہ اس "بجھتے دیئے" کو دیکھا۔ دیر تک میں سوچتا رہا کہ یہ بجھتا کیوں ہے پھر مجھے پتہ چلا کہ یہ تو ازلی طور پر بجھا ہوا ہے۔ پھر یہ حیرت دامنگیر ہوئی کہ اتنی گہری بجھن کے باوجود یہ جلتا کیسے ہے۔

کبھی سوچتا کہ یہ تو ایک کھلنڈری عورت کے مصداق جو ایک ساعت آپ کی طرف یوں بیگانہ وار دیکھتی ہے جیسے آشنا نہ ہو۔ دوسری ساعت مسکرا کر آپ کی گود میں آبیٹھتی ہے کبھی محسوس کرتا بکار خویش ہشیار دیوانہ ہے کبھی یوں لگتا جیسے قلندر ہے جو لا ادر الا اللہ کی منزل طے کر رہا ہے

کئی بار ایسا ہوا کہ دفتر کے باہر سڑک کی دوسری پٹڑی سے انشا نے مجھے آواز دی۔ ادھر آنا ضروری بات ہے سڑک پار کر کے اُدھر گیا تو انشا کا نام و نشان نہ تھا اگلے روز دفتر میں پوچھا انشا تم نے مجھے بلایا تھا پھر چلے کیوں گئے۔ بولا "اچھا میں چلا گیا تھا کیا"۔ ایسی باتیں۔ ورنہ ہوتی تھیں۔ پوچھتا تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھتا۔ اچھا میں نے ایسے کیا تھا۔ اس کے انداز میں اتنی معصومیت ہوتی کہ مزید بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔

کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ابن انشا نے کام کرتے کرتے کوئی دور رس بات کہہ دی میں نے کہا انشا واہ کیا خوب بات کی تو نے چونک کر بولا۔ کون سی۔ میں نے بات دہرائی حیرت سے میری طرف دیکھا یہ ہنسا ہائیں میں نے یہ بات کی تھی مفتی جی کہیں آپ اپنی باتیں میرے منہ میں تو نہیں ڈال رہے۔

بڑی سے بڑی بات بھی انشا کو جذب نہیں کر سکتی تھی۔ آپ اسے قتل کی لرزہ خیز داستان سنائیں۔ ابتدا میں وہ شوق سے سنتا تھا۔ پھر سوئچ آف کر کے بیٹھ جاتا۔ بظاہر ہاں ہاں کرتا رہتا۔ اس لحاظ سے وہ ایک گھونگھے کی مصداق تھا۔ ہر چند ساعت کے بعد وہ اپنے خول میں دبک جانے پہ مجبور تھا۔

رابطے کے اولیں دور میں میں سمجھتا رہا کہ اس کے کھوئے اور اکیلے پن کو عشق سے تعلق ہے۔ اس کے عشق کے کوائف جان کر یہ مفروضہ دم توڑ کر رہ گیا۔

انشا کی شخصیت کی طرح اس کا عشق بھی منفرد تھا عام طور پر بڑے عاشق واپسی کی کشتیاں جلا دیتے ہیں تاکہ میدان میں پیٹھ دکھانے کا خطرہ نہ رہے۔ انشا نے آگے بڑھنے کی کشتیوں کو بھی آگ لگا دی تھی "تاکہ کہیں کامیابی کی صورت نہ پیدا ہو جائے کہیں بیراگ کو چھوڑ کر محبوب کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ کہیں وصال کی قیامت نہ ٹوٹ پڑے احمد بشیر کا کہنا ہے کہ انشا نے بڑی سوچ بچار سے عشق رگایا تھا۔

ایسی محبوبہ کا چناؤ کیا تھا جو پہلے سے ہی کسی اور کی ہو چکی تھی۔ شادی شدہ تھی بچوں والی تھی جس کے دل میں انشا کے لئے جذبہ ہمدردی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ جس سے ملنے کے تمام راستے مسدود تھے۔ اپنے عشق کو پورے طور پر محفوظ کر لینے کے بعد اس نے عشق کے ساز پر بیراگ کا نغمہ چھیڑ دیا۔

مواقعے تو ملے لیکن انشاؔ نے کبھی محبوبہ سے بات نہ کی۔ ہمت نہ پڑی۔ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا "بس" یار اُسے کہو کہ مجھ سے بات کرے"۔ اس کے انداز میں بڑی منت اور عاجزی ہوتی۔ پھر عاشق کا جلال جاگتا۔ کہتا "دیکھ اس سے اپنی بات نہ چھیڑنا۔ باتوں باتوں میں بھرما نہ لینا"۔

محبوبہ تیز طرار تھی۔ دنیا دار تھی۔ پہلے تو تمسخر اڑاتی رہی پھر انشا کی دیوانگی کو کام میں لانے کا منصوبہ باندھا۔ اس دلچسپ مشغلے میں۔ میاں بھی شریک تھا۔ انشا کو فرمائشیں موصول ہونے لگیں۔ اس پر انشا پھولے نہ سماتا۔ دوستوں نے اسے بارہا سمجھایا کہ انشا وہ تجھے بنا رہی ہے۔ انشا جواب میں کہتا کتنی خوشی کی بات ہے کہ بنا تو رہی ہے۔ یہ بھی تو ایک تعلق ہے۔ تم مجھے اس تعلق سے محروم کیوں کر رہے ہو۔

ایک روز جب وہ فرمائش پوری کرنے کے لیے شاپنگ کرنے گیا تو اتفاق سے میں بھی ساتھ تھا۔ میں نے انشا کی منتیں کیں انشا جی اتنی قیمتی چیز نہ خریدو تمہاری ساری تنخواہ لگ جائے گی۔

انشا بولا مفتی جی۔ تمہیں پتہ نہیں اس نے مجھے کیا کیا دیا ہے۔ اس نے مجھے شاعر بنا دیا۔ شہرت دی زندگی دی۔ انشا کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

ایک روز میں نے احمد بشیر سے پوچھا یار یہ انشا جو اپنے اندر ایک تابوت اٹھائے پھرتا ہے یہ عشق سے متعلق نہیں تو کیا پہلی شادی سے متعلق ہے احمد بشیر بولا مجھے علم نہیں۔ شاید پہلی شادی سے متعلق ہو۔ مثلاً انشا کے لئے لاہور ایک پھوڑا ہے۔ وہ لاہور کی بات نہیں کرتا۔ لاہور کی بات کرو تو اٹھ کر چلا جائے گا۔

کیوں لاہور کو کیا ہے میں نے پوچھا۔

شاید اس لئے کہ اس کی مطلقہ بیوی لاہور میں رہتی ہے۔

میں نے کہا یار اسے لاہور بھیجو۔ سرکاری حکم دو تاکہ ٹال نہ سکے۔

اگلے روز ہی وزارت کی طرف سے حکم موصول ہو گیا کہ انشا فلاں کام کے لئے لاہور جائے۔

انشا اس حکم کو دیکھ کر سخت گھبرا گیا۔ سارا دن حکم نامے کو سامنے رکھ کر بیٹھا رہا۔

شام کو کہنے لگا۔ لو لاہور ہی جانا ہے نا۔ تو ہو آؤں گا لاہور سے اس میں کیا بات ہے بھلا۔

اگلے روز احمد بشیر اور میں اسے سٹیشن پہ چھوڑنے گئے۔ گاڑی روانہ ہو گئی تو میں نے احمد بشیر سے کہا تو تو کہتا تھا یہ لاہور نہیں جائے گا۔

حیرت کی بات ہے احمد بشیر نے جواب دیا۔

اگلے روز جب ہم دفتر میں بیٹھے تھے تو دفعتاً ابن انشا داخل ہوا۔ ہم نے کہا یار تو تو لاہور گیا تھا۔

بولا میں بھی کل سے یہی سوچ رہا ہوں۔ بات سمجھ میں نہیں آتی یہاں سے گاڑی چلی تو میں پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ گاڑی رکی تو اتر کر میں نے چائے پی سگرٹ خریدے۔ پھر گاڑی میں آ بیٹھا پڑھنے لگا۔ پھر جو دیکھا تو گاڑی کراچی کے

سٹیشن پر کھڑی ہے۔ مجھے تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ گاڑی کراچی سے چل کر پھر سے کراچی کیسے پہنچ گئی۔

ان دنوں ابن انشا میں خودکشی کا رجحان بڑی شدت پر تھا۔ یہ رجحان موروثی تھا۔ درحقیقت اسے زندگی سے محبت تھی موت کا ڈر اتنی شدت سے غالب تھا کہ وہ کبھی کبھی اس کے اعصاب پر سوار ہو جاتا جس سے گلوخلاصی کے لیے وہ جذبۂ خودکشی کا سہارا لیتا تھا۔ ہر چھ ماہ یا سال کے بعد اسے شدت کا دورہ پڑتا تھا۔

احمد بشیر کو پتہ چلا تو اس نے بڑا ہمدردانہ انداز اختیار کیا۔ کہنے لگا یہ تو معمولی سی بات ہے فنکاروں اور ادیبوں کو ایسے دورے پڑا ہی کرتے ہیں۔ اگر تم اپنی زندگی کو ختم کرنا چاہتے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہاں ایک بات ضروری ہے خودکشی ایسے انداز سے کرنی چاہیے کہ ایک تو خود کو تکلیف نہ ہو دوسرے پولیس والے گھر والوں کو تنگ نہ کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بدنامی نہ ہو جگ ہنسائی نہ ہو۔

انشا کو آخری دلیل بہت پسند آئی چونکہ وہ بدنامی اور جگ ہنسائی سے بہت خائف تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ احمد بشیر نے انشا سے وعدہ لے لیا کہ جب بھی دورہ پڑا وہ احمد بشیر سے مشورہ کئے بغیر کچھ نہیں کرے گا۔ اس کے بعد ناچار ایک بار آدھی رات کے وقت احمد بشیر کے گھر کا دروازہ بجا۔ باہر انشا کھڑا تھا۔ اوسان چھوٹے ہوئے۔ از خود رفتہ۔

احمد بشیر اس کے ساتھ باہر نکل جاتا، اور وہ دونوں رات بھر کراچی کی سڑکوں پہ گھومتے ہوئے منصوبہ تیار کرتے۔

احمد بشیر کہتا۔ سلیپنگ پلز او نہوں۔ یہ سخت نامناسب طریقہ ہے۔ اسپتال لے جاتے ہیں بچ جانے کا امکان ہوتا ہے بچ جاؤ تو بڑا شور شرابہ ہوتا ہے۔ افیون سخت تکلیف دہ چیز ہے پھر سوچنا یہ ہے کہ پولیس کے نام کیسا خط لکھا جائے کہ گھر والے ملوث نہ ہوں۔

یوں احمد بشیر بولے جاتا بولے جاتا حتیٰ کہ پھوڑا پھوٹ جاتی اور دورے کی شدت ختم ہو جاتی۔

انہی دنوں ابن انشا قدرت اللہ شہاب سے متعارف ہوا۔ قدرت اللہ کی شخصیت سے وہ بہت متاثر ہوا۔ یہ تعلق اتنا بڑھا کہ آخری دور میں دوسرے تعلقات مدھم پڑ گئے۔

انہی دنوں اس کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا حلقۂ احباب میں عالی اور گلڈ شامل ہو گئے۔ پھر مرکزی حکومت راولپنڈی میں منتقل ہو گئی تو اس نے قدرت اللہ کو خط لکھنے شروع کر دیئے یہ خط رنگینی روانی اور مزاح سے بھرپور ہوتے تھے۔

ایک دن شہاب نے کہا انشا آپ مزاح کیوں نہیں لکھتے۔ اس پہ بہت ہنسا بولا شہاب صاحب اب آپ مجھ سے مزاح لکھوائیں گے۔ دیر تک وہ ہمارے مشورے کو مذاق سمجھتا رہا پھر پتہ نہیں کیسے اس نے اپنا پہلا کالم لکھا۔ ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔ انشا اچنبھے میں رہ گیا۔

وہ منفرد سادھو شاعر جس نے کبھی اپنا کلام کبھی دوسروں کو نہ سنایا تھا جس کے پاس گھنٹوں بیٹھ کر بھی آپ کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ شاعر ہے۔ دوستوں سے پوچھتا پھرتا آج آپ نے اخبار نہیں پڑھا کیا۔ جیب سے اخبار خرید کر احباب میں بانٹتا پھرتا۔

دفتر میں ملاقاتیوں کے سامنے اپنے کالموں کے تراشوں کی فائل رکھ کر معذرت کرتا - آپ اجازت دیں تو میں ایک ضروری نوٹ لکھ لوں - وہ ابن انشا جو جواہرات کو اپنے چیتھڑوں میں چھپائے رہتا تھا ڈنڈی بلبوں کو کھنکھناتے لگا -

اگرچہ شہرت نے ابنِ انشا پر شدت سے اثر کیا لیکن بنیادی طور پر انشا وہی انشا رہا - ہاں ضمنی طور پر اس میں بڑی تبدیلیاں عمل میں آئیں -

شہرت نے اسے بیساکھیاں عطا کر دیں - لنگڑا چلنے لگا - اس کی بے بسی بھری مسکراہٹ میں دم خم پیدا ہو گیا - خود اعتمادی نے گرتے کو سنبھال لیا - لیکن ململ قمیص اور ٹیلیسکو سوٹ تلے وہی جٹا دھاری سادھو براجمان رہا - اس کے الجھنے کے تو اثر میں تخفیف تو ہو گئی لیکن بجھن جوں کی توں قائم رہی - البتہ وہ عشق کی گھٹن سے آزاد ہو گیا اور محبوبہ کی ذات سے بے نیاز انہی دنوں انشا نے لاہور ہیریہ کو پار کر لیا -

جب ویلیج ایڈ کا محکمہ تخفیف میں آنے لگا تو انشا قدرت اللہ سے کہنے لگا - شہاب صاحب زندگی میں میری صرف ایک آرزو ہے اگر آپ اُسے پورا کر دیں تو موج ہو جائے - کونسی شہاب نے پوچھا ؟

انشا نے جیب سے کچھ کاغذات نکالنے کہنے لگا یہ دیکھئے یونیسکو کے پلان کے مطابق پاکستان میں ایک نیشنل بک سینٹر بننے والا ہے - مجھے اس کا ڈائریکٹر بنا دیجئے -

شہاب نے کہا یہ نوکری تو بالکل معمولی ہوگی -

مجھے معمولی ہی چاہیے -

اس میں ترقی کی گنجائش نہ ہوگی شہاب نے کہا -

مجھے ترقی نہیں چاہیئے قیام چاہیئے انشا نے جواب دیا -

یہ بھی پتہ نہیں شاید یہ محکمہ پانچ سال کے بعد قائم ہو - چاہے دس سال بعد قائم ہو میں انتظار کروں گا -

نیشنل بک سنٹر کے قیام کے بعد انشا کو ملک ملک گھومنا پڑا - کتاب کے متعلق عالمی کانفرنسوں میں شمولیت کرنی پڑی - اس کی کارکردگی دیکھ کر یونیسکو نے انشا کو ایک آسامی آفر کر دی جس کی تنخواہ اس کی تنخواہ سے بیس گنا زیادہ تھی انشا نے یونیسکو کی آسامی کو رد کر دیا - جب اس سے پوچھا گیا کہ انکار کی وجہ کیا ہے تو انشا نے کہا میں پاکستان کی نوکری چھوڑ کر نہیں جاؤں گا اسے پاکستان سے عشق تھا -

انشا کو شاپنگ کا بہت شوق تھا - گھنٹوں دکانوں میں گھومتا پھرتا - کوئی پوچھتا انشا جی کیا خریدنے کے ارادے ہیں تو کہتا ابھی میں سوچ رہا ہوں - انشا کی محبوب ترین دکانیں کھلونوں کی دوکانیں تھیں - گھنٹوں کھلونے دیکھنے کے بہانے ان سے کھیلتا رہتا اور آخر میں ایک گڈی خرید کر گھر لے آتا - بیرونی ممالک میں جہاں بھی گیا وہاں سے کبھی کوئی کام کی چیز نہ خریدی لیکن ہر ملک سے ایک گڈی ضرور خریدی -

گھر میں ایک بڑی الماری ان گڈیوں کے لیے مخصوص تھی - یہ الماری ملک ملک کی رنگا رنگ گڈیوں سے بھری ہوئی ہے

پتہ نہیں یہ گڑیاں وہ کس کے لئے خرید کر لاتا تھا۔ گھر میں دو لڑکے ضرور تھے لیکن انہیں گڈیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگا مفتی جی کوئی مصروفیت نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔ مجھے بہت ضروری شاپنگ کرنی ہے۔

آج کل یہ رواج عام ہے کہ لوگ کسی نہ کسی کو شاپنگ کے لئے ساتھ لے جاتے ہیں تاکہ چیز خریدنے کا فیصلہ کرنے میں مدد دے۔ میں سمجھا شاید اسی وجہ سے انشا مجھے ساتھ لے جا رہا ہے۔ دکان میں داخل ہونے سے پہلے وہ مسکرا کر کہنے لگا مفتی جی شاپنگ میں میری مدد کرنا ——— خریدنے میں نہیں بلکہ نہ خریدنے میں۔ اس پر میں بہت حیران ہوا۔ بہر حال دو گھنٹے ہم دکانوں میں گھومتے پھرے۔ انشا چیزیں پسند کرتا رہا اور میں ان میں عیب نکالتا رہا۔

آخری دکان میں انشا کو ایک کٹائی پسند آ گئی میں نے حسب معاہدہ کٹائی میں نقص نکالنے شروع کر دیئے جب دکاندار کاؤنٹر کی طرف گیا تو انشا نے منت سے کہا مفتی جی ایک کٹائی تو خرید لینے دو۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ایک روز انشا بہت پریشان تھا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ بولا۔ بس حسب عادت پریشان ہوں تحقیق کے بعد بمشکل سے پتہ چلا کہ کسی دوست سے ملنے گیا تھا۔ دوست سخت مالی مشکلات میں مبتلا تھا۔ دروازے پر مالک دکان کرایے کے لیے تقاضہ کر رہا تھا۔ انشا نے دو ماہ کا کرایہ ادا کر دیا اور دوست سے ملے بغیر لوٹ آیا اب اسے یہ فکر دامن گیر تھا کہ کہیں مالک مکان دوبارہ کرایہ وصول نہ کرے۔ اسے یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ دوست کو یہ علم ہو کہ اس نے کرایہ ادا کر دیا ہے۔

بات نہ کہنے میں انشا کو کمال حاصل تھا۔ اس کے قریبی دوست بھی اس کی ذاتی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے واقف نہ تھے۔ مثلاً روزنامہ امروز کا بیان ہے دروغ برگردن راوی کہ انشا نے ایم اے کرنے کے بعد کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی لیکن اس نے اس تفصیل کے متعلق کبھی تذکرہ نہ کیا۔ نہ خود کو ڈاکٹر لکھا۔

ابن انشا کی باتیں دانشورانہ باتوں سے مختلف ہوتی تھیں۔ ان میں عقل دلیل یا ذہانت کی چمک نہ ہوتی تھی۔ وہ ذہن سے نہیں بلکہ دل سے پھوٹتی تھیں وہ چینی کی رکابی میں رکھ کر پیش نہیں کی جاتی تھیں۔ چمکیلی باتیں کرنے سے انشا محروم تھا۔ چمکدار بات کو بھی مٹی میں رول دیتا۔ اس کے منہ سے نئی بات بھی یوں سنائی دیتی جیسے دقیانوسی ہو۔ منہ زبانی ٹھس تھا۔ تحریر میں چمکتا تھا۔

کہتے ہیں ابنِ انشا بہت بڑا کالمسٹ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی تحریریں کالم میں چھپتی تھیں لیکن وہ کالمسٹ نہیں تھا بلکہ مزاح نگار تھا۔ کالم نویس کے لئے لازم ہے کہ اسے سیاسی شعور حاصل ہو اور اس کی طنز میں کاٹ ہو۔ انشا میں نہ تو سیاسی شعور تھا نہ اس کے طنز میں کاٹ تھی بڑی سے بڑی طنز ایسے لطیف انداز میں لکھتا کہ لطافت ہی لطافت محسوس ہوتی۔ کاٹ نہیں انشا کے مزاح میں سادگی تھی روانی تھی۔ فکر نہ تھا مٹی کے تیل کی بو نہ آتی تھی۔

انشا کو سمجھانا۔ دلیل دینا۔ بحث کرنا۔ وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ اسے بدلنا ممکن نہ تھا۔ اس پر اثر انداز ہونا ناممکن۔ اس کے برتاؤ کے خلاف احتجاج کرنا یا اس سے روٹھنا بے معنی تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ لاحاصل تھا۔

آپ ایک حد تک اس کے قریب جا سکتے تھے۔ اس کے بعد دھندلکے کی دیوار حائل ہو جاتی۔ اس دیوار میں کوئی دروازہ نہ تھا جس سے آپ داخل ہو سکتے۔ خود انشا کو علم نہ تھا کہ اس دھندلکے کی دیوار کے پیچھے کیا ہے۔

ایک حد تک آپ انشا کی توجہ جذب کر سکتے تھے چونکہ وہ زیادہ دیر اپنے خول سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ازلی طور پر اکیلا تھا۔ گونگا اور دکھی آخری ایام میں جب اسے پتہ چلا کہ وہ ہاجسن کی بیماری میں مبتلا ہے تو ایکدم اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا اس حد تک کہ اس نے خطوں میں غزلوں میں اور کہیں کہیں کالم میں "حافظ خدا ہمارا" قسم کے مضمون باندھنے شروع کر دیئے اس پر اس کے قریبی دوست آگے بڑھے تاکہ انشا میں زندگی کے متعلق بھروسہ پیدا کریں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے انشا کے دل سے موت کی preoccupation دور کی۔ شہاب اس عمل میں پیش پیش تھا۔

پھر ڈاکٹر اجمل اور قدرت اللہ شہاب نے کوشش کر کے انشا کا تبادلہ لندن کرا دیا جہاں ہاجسن ڈیسیز کا واحد ہسپتال ہے۔ ہسپتال میں انشا نے علاج کی پہلی قسط پوری کر لی۔ اس کی صحت اس حد تک بحال ہو گئی کہ پھر سے جینے کے پروگرام مرتب ہونے لگے۔

پھر انکوائری کمیٹی نے اس کی اسامی کو تخفیف میں لا کر اسے وطن واپس آنے کا حکم دیا۔ یہ حکم ایسے بھونڈے انداز سے دیا گیا کہ انشا کو شدید جھٹکا لگا۔

اگرچہ شہاب نے مل ملا کر اسے علاج مکمل کر لینے کی مہلت لے دی لیکن اس کی صحت پھر سے بحال نہ ہو سکی ذہن پر اس قدر شدید چوٹ لگی کہ مفلوج ہو گیا۔ نو روز ہسپتال میں گہری بے ہوشی میں پڑا رہا۔ دسویں روز انتقال کر گیا۔

آج سے کوئی ایک سال پہلے میرے پبلشر نے ایک منصوبہ بنایا تھا کہ مشہور ادیبوں کی خود نوشت آپ بیتیاں پیش کی جائیں۔ اس سلسلے میں میں نے انشا کو لکھا کہ اپنی آپ بیتی لکھے۔ ابن انشا نے اپنی شخصیت کے متعلق جو مضمون لکھا وہ حرف بحرف درج ذیل ہے

"تم نے جو سکیچ مانگا ہے اس کی نوعیت معلوم نہیں ہوتی اگر تھرڈ پرسن میں چاہیئے تو میں کیوں لکھوں۔ تم خود کیوں نہ لکھو۔ لیکن نہیں میاں تمہارا کیا اعتبار کہ کیا لکھ دو لہذا اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ چند سطریں لکھ رہا ہوں انہیں گھٹا بڑھا لو۔"

مشرقی پنجاب کے دوابے کا دیہاتی کہیں بھی پہنچ جائے لاہور کراچی لندن کیلیفورنیا اپنی ادا سے فوراً پہچانا جاتا ہے یہ لوگ لکھتے بھی ہیں تو وارث شاہ کے استاد کے بقول مونج کی رسی میں موتی پروتے ہیں لیکن ابن انشا کو موتی چنداں نہیں بھاتے۔ اپنی مونج کی رسی میں وہ کاٹھ کے منکے پروتا ہے۔ اس کا محاورہ لہجہ دلی لکھنؤ ہر جگہ کی سکہ بندی سے دور ہے اور سچ پوچھو تو یہی ایک سلیقے کی بات اس نے کی ہے۔ ورنہ ادب کے بازار میں جس کی تعریف پوچھو۔ اپنے کو فلاں ابن فلاں اور موتیوں کا خاندانی سوداگر بتاتا ہے۔

ابن انشا کو بارہا اللہ کا شکر ادا کرتے دیکھا گیا ہے کہ اس کے خاندان میں کوئی صاحب دیوان یا بے دیوان شاعر نہیں ہوا۔ ورنہ اسے یا تو اس کے نام کا سہارا لینا پڑتا اور یا اس کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑتا۔

سید انشا اللہ خان انشا سے بھی اس کی نسبی نسبت نہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہے۔ اور خطوں میں اسے سید ابن انشا تک لکھتے

ہیں۔ یہ چاہتا تو اس نسبت سے سید بن سکتا تھا لیکن یہ عزت سادات بھی اسے کبھی مرغوب نہیں ہوئی۔ اپنی دہقانیت پر خوش ہے اور اللہ اسے اسی میں خوش رکھے۔

پڑھائی کو دیکھیے تو اس نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے تجربے کو دیکھیے تو بڑے پاپڑ بیلے ہیں اور ایران توران بلکہ فرنگستان تک گھوما ہے۔ مطالعہ میں اردو پنجابی اور انگریزی سے باہر فارسی اور ہندی سے بھی شغف ہے۔ نظم نثر سبھی میں قلم آزمائی کی ہے لیکن اپنے لئے باعث عزت فقط شاعری کو سمجھتا ہے۔ شاعری جس میں جوگی کا فقر۔ طنطنہ۔ وارفتگی اور آزادگی ہے۔

بات چیت کیجیے تو بعض اوقات بقراطیت بھی چھانٹے گا۔ لیکن اصل میں بقراطوں سے نفور ہے۔ فقط انشائی ہے۔ بقول خود ؎

شاعر ہے تو ادنٰے ہے عاشق ہے تو رسوا ہے
کس بات میں اچھا ہے کس وصف میں اعلےٰ ہے

بچوں کے لیے بھی شاعری کی ہے لیکن ایسی نظمیں تو بچے بھی لکھ سکتے ہیں یا شاید بچے ہی لکھ سکتے ہیں۔ نثر لکھنے کا انداز شگفتہ ہے جسے مزاح لطیف بھی کہتے ہیں لیکن اس ذیل میں کم لکھتا ہے حالانکہ اس کا میدان یہی ہوتا تو خوب ہوتا۔

خاموش ہے عزلت گزیں ہے۔ یبھبگڑ ہے۔ ذمہ داریاں قبول نہیں کرتا تاکہ نبھانی نہ پڑیں۔ فخر اپنے دوستوں پر کرتا ہے جو اس پر یا اس کی سادگی بھولپن یا حمق پر جان چھڑکتے ہیں اور ناز اٹھاتے ہیں۔

عشق بھی کرتا ہے جو لوگ سمجھتے ہیں کہ میاں قیس کے انتقال کے ساتھ یہ قوم ناپید ہوگئی ہے وہ اس سے ملیں۔ یہ ہماری نہیں ابن انشا کی اپنی فرمائش ہے ؎

انشا سے ملو۔ اس سے نہ روکیں گے ولیکن
اس سے یہ ملاقات نکالی ہے کہاں کی
مشہور ہے ہر بزم میں اس شخص کا سودا
باتیں ہیں بہت شہر میں بدنام میاں کی

―――――――――

ممتاز مفتی

یہ کون آگھسا ہے میرے گھر میں۔ بن بلائے بن پوچھے۔ بن بتائے۔ کیوں۔

یہ کیسی موجودگی ہے۔ میرا سارا گھر اس سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ہر کمرے میں بیٹھا ہے۔ سیڑھیوں میں بیٹھا ہے صحن میں برآمدے میں باورچی خانے میں۔ ہر جگہ۔ ہر وقت دن ہو یا رات صبح ہو یا شام۔ میرا گھر مجھ سے اس قدر بھرا ہوا نہیں جس قدر اُس سے بھرا ہوا ہے۔

کیا مصیبت ہے۔ زندگی میں پہلی بار میں دوکیلا ہوا ہوں ـــــ میں جو ازلی طور پر اکیلا تھا۔

بچپن میں بھرے گھر میں اکیلا تھا۔ چلا جاتا تو کسی کو پتہ نہ چلتا کہ کوئی چلا گیا ہے۔ آجاتا تو کوئی محسوس نہ کرتا کہ آگیا ہے۔

جوانی میں اپنا اکیلا پن دور کرنے کے لئے میں نے ایک عورت سے محبت لگالی۔ اپنا سبھی کچھ دے کر خود اس کی دہلیز پہ بیٹھ گیا۔ لٹ پٹ گیا تو پتہ چلا کہ اکیلا پن اور بھی گہرا ہو گیا ہے جرأت ہوتی تو دہلیز سے اُٹھ جاتا۔ لیکن ایک بار بیٹھ کر اُٹھ جاتا۔ میری سرشت میں نہ تھا۔ نہیں ہے ـــــ لہٰذا اُٹھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس لئے بیٹھا رہا بیٹھا رہا سولہ سال بیت گئے حتیٰ کہ لٹے پٹے اور اکیلے رہنے کی لت پڑ گئی۔ پھر وہ اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آگئی۔ میری ہو گئی اور میں اپنے گھر کی دہلیز پہ آبیٹھا۔

مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی بولی "اب میں تیری ہوں"۔

"ہاں" میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ کتنی خوشی کی بات ہے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی دیکھتی رہی میں خوشی کے نشے میں چور اسے دیکھتا رہا دیکھتا رہا۔

"تو مجھے دیکھ رہا ہے" وہ بولی۔

"اور میرا کام ہی کیا ہے"۔

"میں یہاں ہوں یہاں تیرے پاس"۔

"ہاں تو میرے سامنے ہے"۔

"لیکن تو تو اب بھی دہلیز پہ بیٹھا ہے"۔

"اور کہاں بیٹھوں"؟

"قریب آجا"۔

"قریب آگیا تو تو مجھے نظر کیسے آئے گی"۔

"پتہ ہے تیری جگہ کونسی ہے" اس نے اپنی گود پھیلا دی۔

"وہی جہاں میں بیٹھا ہوں" میں نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

پھر آہستہ آہستہ وہ بند ہوتی گئیں۔ بند ہوتی گئیں۔ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں —— اور میں پھر سے اکیلا رہ گیا۔

پھر لوگوں نے "زبردستی" پکڑ کر میری شادی کر دی جب میں نے پہلی بار اپنی بیوی کو دیکھا تو مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بھی مجھ ایسی ہے۔ لٹی پٹی اکیلی۔

اس نے سات سال اپنے پہلے دولہا کی انتظار میں دہلیز پر بیٹھ کر گزار دیئے تھے۔

ہمارا آپس میں اَن کہا سمجھوتہ ہو گیا۔ اور ہم دونوں دو کیلے میں اکیلے اکیلے رہنے لگے۔

ہاں میں تو ازلی طور پر اکیلا ہوں۔ اب یہ کون آ گیا ہے میرے گھر میں کیوں دھرنا مار کر بیٹھ گیا ہے یہاں آخر —— وجہ —— مطلب

ویسے دیکھنے میں آج بھی میں اکیلا دکھتا ہوں —— کسی کو خبر نہیں کہ گھر میں کوئی آ گیا ہے۔ میری بیوی کو بھی پتہ نہیں۔ صرف میں جانتا ہوں کہ میں اکیلا نہیں رہا —— وہ آ گیا ہے۔ اور میرا گھر اس سے یوں بھر گیا ہے جیسے ماں کا سارا وجود ہونے والے بچے سے بھر جاتا ہے۔

صاحبو مجھے پتہ نہیں کہ وہ کون ہے صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہے۔ کیوں۔ کس لئے اس نے میرے اکیلے پن کی مسند کو یوں تار تار کر دیا ہے۔ مجھے علم نہیں۔ صرف دکھ ہے۔ اپنے اکیلے پن کو کھو دینے کا دکھ۔

زندگی میں میں نے ایک ہی امتیاز حاصل کیا تھا۔

زندگی کرنے کا ایک ہی طریقہ سیکھا تھا۔

اکیلے پن نے مجھے بڑا اعزاز بخشا تھا، مقام بخشا تھا۔

مجھے بت بنا دیا تھا —— بہت بڑا بت۔

صاحبو۔ اکیلا پن بہت بڑا بت گر ہے۔

زندگی بھر میں بت بنا رہا۔

بت کا مطالبہ ہے کہ کوئی پجاری ہو۔ نہ ملے تو وہ خود اپنا پجاری بن جاتا ہے۔ زندگی بھر میں خود کی پوجا کرتا رہا۔ اس لئے نہیں کہ جھکنا سیکھوں۔ بلکہ اس لئے کہ بت کی شان قائم رہے لیکن جب سے وہ آیا ہے۔ بت تڑخ رہا ہے ٹوٹ رہا ہے ریزہ ریزہ ہوا جا رہا ہے۔ میری ساری زندگی کی کمائی میری آنکھوں کے سامنے لٹی جا رہی ہے۔

سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایک بے نام موجودگی نے اتنے بڑے بت کو کیسے توڑ دیا۔ اس کے ہاتھ میں تیشہ نہیں کلہاڑا نہیں کدال نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں اس کے انداز میں تشدد نہیں طیش نہیں غصہ نہیں پھر یہ کیسے ہوا۔

بتوں کو توڑنے کے لئے تو غزنوی پیدا ہوتے ہیں۔ حملے کیے جاتے ہیں۔ ایک دو نہیں۔ سولہ سترہ فوجیں چڑھائی کرتی ہیں۔ تہس نہس کرتی ہیں یوں تو کبھی نہیں ہوتا کہ ایک بے نام اَن جانا وہ چپکے سے آئے دھرنا مار کر بیٹھ جائے اور اس کی موجودگی سے بت خود بخود تڑخنے لگے۔

کبھی کبھی مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ وہی تو نہیں جس کا نام لے لے کر چھٹپنے میں بڑے بوڑھے مجھے ڈرایا کرتے تھے جس سے ڈر ڈر کر میں جوان ہوا تھا۔ پھر جوانی میں دانشوروں سے ملا تو ہم مل کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ دراصل بچپن میں اس سے ڈر ڈر کر اب ہم اس سے انتقام لے رہے تھے۔

پھر ادھیڑ عمر میں میں اس سے بے نیاز ہو گیا۔ تو پڑا ہو۔ نہیں ہے تو نہ سہی کیا فرق پڑتا ہے لیکن نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو بہت ڈراونا تھا۔ اس نے آگ کی ایک بہت بڑی بھٹی جلا رکھی تھی ہاتھ میں سونٹا تھا۔ سونٹا چلاتا۔ لوگوں کو دھڑا دھڑ آگ میں ڈالتا جاتا۔ بس یہی اس کا کام تھا۔

پھر جوانی میں علم کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت اجاگر ہوئی۔ عظمت ہی عظمت، عظمت ہی عظمت۔ ڈر اور خوف کی جگہ حیرت نے جنم لیا۔ نہیں یہ وہ بھی نہیں۔ یہ موجودگی نہ تو ڈراؤنی ہے نہ حیرت کا جذبہ طاری کرتی ہے۔ یہ تو ایسے ہے جیسے لگن اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی اک فضا ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے ماں کی کوکھ نے پھیل کر میرے گھر کو سمیٹ لیا ہے ایک "نگ" ہے جو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ایک عجیب سا سکون۔ لطافت کا ایک ٹھہراؤ۔

مجھ پر خواہ مخواہ ایک احساس مسلط ہوا جا رہا ہے۔ جیسے میں نے پا لیا ہے۔ کیا پا لیا ہے! دنہوں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ بس پا لیا ہے۔ جیسے سب کچھ پا لیا ہے میں نے کبھی اس کی آرزو نہیں کی تھی۔ اس کے لئے ڈھونڈ نہیں کی تھی۔ اسے پانے کی آرزو نہ کی تھی کبھی اسے چاہا نہ تھا کتنی عجیب بات ہے کہ ڈھونڈے بغیر پا لو۔ جانے بغیر جان لو۔

پہلی مرتبہ جب میں نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا تو میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ان دنوں میں سخت فکرمند تھا۔ بے چین تھا۔ میرے افسر نے مجھ پر دو جھوٹے کیس بنا رکھے تھے جو بڑی سنگین نوعیت کے تھے۔ وہ اس دھوم دھڑکے سے بار بار انکا ذکر کیا کرتا تھا کہ مجھے خود شک پڑنے لگا تھا کہ وہ مجھ پر الزام نہیں دھر رہا بلکہ سچ بول رہا ہے۔ میں خود کو مجرم سمجھنے لگا تھا۔ مجھ پر احساس جرم چھائے جا رہا تھا۔

اس روز شام کا وقت تھا بڑی اداس شام تھی وہ۔ لٹی پٹی۔ اس روز دفتر میں میری بہت تذلیل ہوئی تھی۔ انکوائری کمشن نے میرے بیان کا مضحکہ اڑایا تھا۔ وہ لوگ جو جانتے تھے کہ مجھ پر بہتان لگایا گیا ہے انہوں نے بھی میرے حق میں گواہی نہ دی تھی۔ دکھ فکر اور اندیشوں کی بوجھل گٹھڑی کندھوں پر اٹھائے میں گھر پہنچا۔ پہنچتے ہی دھڑام سے کھاٹ پر گر پڑا۔ وہاں پڑا رہا پڑا رہا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک پڑا رہا ——— پھر دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے سر پر کوئی بوجھ نہ ہو ——— وہ گٹھڑی کیا ہوئی میں اٹھ بیٹھا۔

میرے گرد ایک عجیب سی فضا معلق تھی۔ جیسے جیسے ایک لوری ہوا میں تیر رہی تھی۔ جیسے کمرے میں ایک پتھی کنڈیشنر لگا ہو۔ جیسے کمرے میں کوئی ہو۔ لگن اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی موجودگی یہ کون ہے۔ میرے گھر میں کون گھس آیا ہے میں نے سارے گھر کا چکر لگایا کہ شاید کوئی ہو کوئی بھی نہ تھا۔ پھر بھی کوئی ضرور تھا۔ اس بے نام موجودگی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

باورچی خانے میں میری بیوی گھٹنوں میں سر دبائے پیاز چیر رہی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ دیکھتا رہا وہ اکیلی بیٹھی تھی۔ —— اکیلی —— لاتعلق تنا —— اسے دیکھ کر مجھے پتہ چل گیا کہ کوئی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گھر کی موجودگی ایک کو متاثر کرے دوسرے کو خبر ہی نہ ہو۔

سونے سے پہلے میں پڑھنے کا عادی ہوں۔ اس لئے نہیں کہ مجھے پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ ایک تو اس لئے کہ کتاب سامنے ہو تو نیند آنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ تلخ حقائق سے بچنے کے لئے مطالعہ ایک نعمت ہے۔

ان دنوں تو مطالعہ میرے لئے از بس ضروری تھا دفتری حقائق سے فرار کا ایک ہی راستہ تھا۔ پھر بھی میں زبردستی کتاب پڑھتا تھا۔ بار بار دفتری حالات سامنے آکھڑے ہوتے۔ مطالعے کا عمل رک جاتا دل پہ ایک ٹھیس سی لگتی پھر اندیشوں کی لہریں رینگنے لگتیں۔ سرخ چیونٹے ذہن کی طرف یورش کرتے پھر سارے جسم میں خوف کی دھنکی بجتی۔

اس روز پتہ نہیں کیا ہوا۔ کتاب ہاتھ میں اٹھائے میں بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔ حالانکہ عام طور پر میں سوچنے سے گریز کرتا ہوں۔ کیونکہ سوچ مجھے دل خراش وسوسوں کی طرف بہا کر لے جاتی ہے —— پھر وہی ٹھیس —— وہی چیونٹے —— وہی دھنکی اس روز میں سوچ رہا تھا لیکن ذہن میں کوئی بات نہ تھی جیسے ذہن کلفتوں رنجشوں اور خدشیوں سے بے نیاز ہو چکا ہو ماؤف ہو چکا ہو۔

ذہن خیالات سے خالی تھا۔ کوئی تلخی نہ تھی ٹھیس نہ تھی چیونٹے نہ تھے دھنکی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں خلا میں ٹنگا ہوا ہوں اور یہ خلا بے نام راحت سے بھرا ہوا ہے۔ مطالعہ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب کوئی خوف ہی نہ ہو تو فرار کیسا نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ ایسی خوشگوار فضا کو چھوڑ کر کون سوئے۔

اگلے روز جب میں نیند سے بیدار ہوا تو —— ارے میں چونکا —— عام طور سے جب میں جاگتا ہوں تو یوں تھکا ٹوٹا ہارا ہوا اٹھتا ہوں جیسے کوئی مار کھا کر اٹھا ہو۔ اس روز میری کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے گیس بھرا غبارہ ہو۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پھول کمرے میں آگھسے ہوں۔ چڑیاں چہک رہی تھیں اور سورج کھڑکی میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ارے یہ کیا —— میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا یہ کیسی صبح ہے۔ کیا میں میں ہی ہوں یا کوئی اور ہے ساتھ ہی مجھے غصہ آنے لگا۔ یہ کون ہے جو میری شخصیت کو بدل رہا ہے —— کیوں؟

پھر کوئی ان جانا ہاتھ بڑھا اور اس نے مجھے تھپکنا شروع کر دیا۔ جیسے تھپک تھپک کر مجھے وسوسوں سے دور لے جا رہا ہو۔ سارا کمرہ اس تھپک سے بھر گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ ہاتھ میری ماں کا ہاتھ ہے۔ وہ مجھے تھپک رہی ہے سو جانے کے لئے نہیں بلکہ جینے کے لئے۔ سارا کمرہ جینے کی لذت سے بھرا ہوا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔

پھر دفتر گیا تو وہاں بھی سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ تذلیل و تضحیک کی باتیں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے دور سے آ رہی ہوں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ باتیں میرے متعلق نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں تھیں۔ ذہن میں ایک اطمینان سا تھا میری میز کے گرد ایک تبسم گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔

آج بھی میرا سایہ۔ اگھراسی تبسم سے بھرا ہوا ہے رات کو سوتا ہوں تو وہ میری چارپائی پہ بیٹھا مجھے تھپک رہا ہوتا ہے۔ جاگتا ہوں تو وہ میرے سرہانے کھڑا مسکرا رہا ہوتا ہے، کام کرتا ہوں تو وہ میرے پاس بیٹھا اپنی گڈوں کی شعاعیں بکھیر رہا ہوتا ہے باہر جاتا ہوں تو مجھے دروازے پر چھوڑنے آتا ہے واپس آتا ہوں تو دہلیز پہ بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہوتا ہے کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اس نے میری ذاتی زندگی کو کیوں تہس نہس کر رکھا ہے۔ غصے میں میری کنپٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے تم کون ہو۔ کیوں ہو۔ بولو۔ جواب دو۔

اس نے زبان سے مجھے کبھی جواب نہیں دیا۔ وہ گونگا ہے۔ اس کے وجود سے شعاعیں سی نکلتی ہیں۔ ایک لطیف سی لرزش میرے بند بند سے ٹکراتی ہے جسم میں اک ٹکٹکی سی بجنے لگتی ہے پھر احساسات کا ایک دھواں سا اٹھتا ہے۔ میرے سوال کی ساری تلخی نچڑ جاتی ہے۔ مٹھاس کی اک پھوار پڑتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے میرے سوال کا جواب مل گیا ہو۔

اس نے کبھی میری میں میں ردوبدل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میری غلاظت پہ کبھی ناک نہیں چڑھائی میری کج فہمیوں اور کج رویوں کا نوٹس نہیں لیا لیکن میری انا کے غلیظ گوشوں پر جب اس کی روپیلی روشنی پڑتی ہے میں انھیں دیکھتا ہوں تو میرا دل کراہت سے بھر جاتا ہے۔ سر احساس ندامت سے جھک جاتا ہے۔

پھر میری انا کا تڑخا ہوا بت سر اٹھاتا ہے نہیں نہیں میں ان گوشوں کو صاف نہیں کروں گا نہیں کروں گا۔ میں جیسا بھی ہوں، ہوں۔ مجھے خود پہ کوئی ندامت نہیں ہے۔ میں ایسے ہی جینا چاہتا ہوں۔ کسی کو مجھے بدلنے کا حق نہیں۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے فضا سے ایک سرگوشی ابھرتی ہے مجھے اپنی میں سے پیار ہے میں اپنی میں کو نہیں بدلوں گا کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔ اردگرد کی فضا مجھے تھپکتی ہے۔

تو کیوں میری ہر بات مانے جا رہا ہے۔ کیوں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ ضرور اس میں کوئی چالاکی ہے سارا کمرہ ایک بے نام لطیف تبسم سے بھر جاتا ہے بے شک اس نے مجھے اپنا رکھا ہے لیکن میں۔ میں اسے کبھی نہیں اپناؤں گا۔ کیوں اپناؤں کیوں مجھے پتہ ہے وہ اپنی رواداری سے۔ ہمدردی سے محبت سے میری میں کو توڑ دے گا۔ پھر میرے پلے کیا رہ جائے گا۔ آج تک اس نے مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ صرف ایک مطالبہ۔ وہ بھی مطالبہ نہیں چونکہ اس میں طلب نہیں منت ہی منت ہے۔

اس کا کہنا ہے اپنے دکھوں وسوسوں پریشانیوں غموں اور تکلیفوں کی گٹھڑی خود نہ اٹھا۔ مجھے سونپ دے۔ مجھ پر بھروسہ کر۔ خود کو میرے بھروسے پر چھوڑ دے۔

جب میں اپنے فکروں کی گٹھڑی سر پہ اٹھائے گھر پہنچتا ہوں۔ تو گھر کی فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے

گردچاروں طرف سے منت بھرے ہاتھ لپکتے ہیں - یہ گٹھڑی مجھ پہ لاد دے مجھے دے دے - خود نہ اٹھا - فضا سرگوشیوں سے بھر جاتی ہے منتوں کا اک طوفان امڈ آتا ہے - مجھ پہ بھروسہ کر -

نہیں نہیں - گٹھڑی میں اس کے حوالے کیوں کروں - یہ میری گٹھڑی ہے - میری ساری زندگی کی کمائی ہے مجھے اپنی مشکلات سے عشق ہے اپنی فکرمندیوں سے محبت ہے - میں بڑی محنت سے اپنے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہوں - بڑے شوق سے اپنے راستوں پر خاردار پودے اگاتا ہوں تاکہ اپنی آبلہ پائی پہ بیٹھ کر رو سکوں یہی میری سب سے بڑی مشکل ہے -

یہی میری سب سے بڑی لذت ہے -

میں اپنے دکھوں کی گٹھڑی کیسے اسے دے دوں -

میں تو شک کا دیوانہ ہوں -

میں کس طرح اس پہ بھروسہ کر لوں -

چاروں طرف سے میری جانب ہاتھ لپکتے ہیں -

منتوں سے سارا کمرہ بھر جاتا ہے -

کب سے یہی ہوتا آ رہا ہے -

وہ منتیں کر کر نہیں ہارا -

میں دھمکیاں دے دے کر ہارتا جا رہا ہوں -

مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے دکھوں کی گٹھڑی اس کے حوالے نہ کر دوں - مجھے ڈر ہے کہ میں اس پہ بھروسہ کر کے بیٹھ نہ جاؤں -

صاحبو کیا وہ کبھی مجھ سے مایوس نہ ہوگا -

دل کا دورہ

کنہیا لال کپور

ایک زمانہ تھا جب ہمیں اِس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ کیسے ایک بھلے چنگے آدمی کو بیٹھے بیٹھے دِل کا دورہ پڑتا ہے اور وہ چشم زدن میں اللہ کو کچھ اِس طرح پیارا ہو جاتا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہو:

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے مَیں اُٹھ جاؤں گا
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

جب ہم کسی اخبار میں اِس قسم کی خبر پڑھتے ——— نو بجے تک وہ دوستوں کی محفل میں چہچہا رہے تھے۔ دس بجے اچانک اُن کے سینہ میں درد اُٹھا۔ ڈاکٹر کو فون کیا گیا۔ لیکن اِس سے پہلے کہ ڈاکٹر اُن کے ہاں پہنچتا وہ چل بسے ——— تو حیران ہو کر کہتے تھے۔ "بڑے جلد باز نکلے! ڈاکٹر کی آمد کا انتظار تو کر لیتے شاید وہ انھیں بچا ہی لیتا۔ اور پھر یہ بھی کیا ذرا سا درد ہوا اور مر گئے۔ نازکی کی بھی حد ہو گئی۔"

ہمیں یاد ہے۔ ایک مرتبہ ہم نے کسی اخبار میں پڑھا۔ "امراضِ دل کے فلاں ماہر سامعین کو بتا رہے تھے دردِ دل کو روکنے کے لئے کیا تدابیر کرنا چاہئیں کہ اچانک اُن کے اپنے دل میں درد ہونے لگا۔ اور وہ لڑکھڑا کر اسٹیج پر گر پڑے اور اُسی وقت اُن کی موت ہو گئی۔" ہمیں یہ خبر پڑھ کر انگریزی کی وہ کہاوت یاد آ گئی تھی۔ جس میں کہا گیا ہے "ڈاکٹر! مریضوں کا علاج کرنے سے پہلے اپنا علاج تو کر لو!"

یہ وہ زمانہ تھا جب ہمیں دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ اور جب ہم کہا کرتے تھے۔ لوگ دِل کے دورے سے نہیں بلکہ اِس خوف سے انھیں دِل کا دورہ پڑا ہے جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ نہیں تو دِل کا دورہ کوئی ایسا خطرناک مرض نہیں اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب ہمیں دل کا دورہ پڑ گیا۔ یک لخت ہمارے سینہ میں درد اُٹھا جو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ چند لمحوں کے بعد ہمیں محسوس ہونے لگا۔ ہمارے سینہ کو کسی فولادی شکنجہ میں کس دیا گیا ہے۔ ہمارے چہرے کا رنگ روئی کی طرح سفید ہو گیا۔ جی متلانے لگا اور ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے۔ ایسی حالت میں بھی خدا جانے ہمیں فراقؔ گورکھپوری کا یہ مصرع کیسے یاد آ گیا:-

وہ درد اُٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

ہم نے دِل میں کہا۔ "فراق صاحب! وہ درد آپ کے سینے میں نہیں گھٹنے میں اُٹھا ہو گا۔ مزا تو تب تھا وہ سینے میں اُٹھتا اور آپ پھر مسکراتے۔"

ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اُس نے ہمیں دیکھ کر اِس قسم کی اداکاری کی جیسے دل کا دورہ ہمیں نہیں اُسے پڑا ہے جب اِس کے ہوش ٹھکانے

ذرا ٹھکانے ہوئے۔ اُس نے بڑی دھیمی آواز میں کہا "میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ انھیں جلد از جلد بڑے اسپتال لے جاؤ۔ حالت بہت نازک ہے۔" ہمیں اسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں ڈاکٹر نے "پیتھے ڈین" کا ٹیکہ لگا دیا۔ درد ختم گیا اور ہم پر غنودگی طاری ہوگئی۔

تھوڑی دیر میں یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی ہمیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ جسے دیکھو اپنا ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر ہمارا حال پوچھنے چلا آ رہا ہے۔ ڈاکٹر نے ہمارے کمرے کے باہر نوٹس لگا دیا تھا کہ مریض کو پریشان نہ کیا جائے۔ مگر وہ تیمار دار ہی کیا جو مریض کو پریشان نہ کرے! جب حال پوچھنے والوں کو ہم سے ملاقات کرنے کی اجازت نہ ملی۔ وہ ہماری بیوی اور بچوں کا دماغ چاٹنے لگے "دورہ کب پڑا؟ کیوں پڑا؟ کیا بچنے کی کوئی اُمید ہے؟ ہوش میں ہیں یا بے ہوش پڑے ہیں؟ ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟ کیا آکسیجن دی جا رہی ہے؟ کیا رشتہ داروں کو بذریعہ تار مطلع کر دیا ہے؟"

یہ باتیں بعد میں ہمیں بیوی اور بچوں نے بتائیں اور یہ بھی بتایا کس طرح ہمارے احباب کے چہروں پر رونق آجاتی تھی جب انھیں بتایا جاتا تھا کہ بچنے کی اُمید بہت کم ہے۔ ہمارے کچھ مہرباں ایسے بھی تھے۔ جو ہر گھنٹہ کے بعد پتہ کرنے کے لئے آتے تھے کہ مریض کا اب کیا حال ہے۔ دراصل وہ کوئی خوشخبری سُننے کے لئے تشریف لاتے تھے۔ لیکن یہ جان کر کہ مریض ابھی تک زندہ ہے۔ اُن کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر جاتا۔ اُن میں سے ایک جب بارھویں بار ہمارا حال پوچھنے آیا۔ ہماری بیوی نے جل کر کہا "اُن کی حالت نازک ضرور ہے لیکن وہ کم از کم آج نہیں مریں گے۔ آپ بار بار آنے کی تکلیف نہ کیجیے۔"

جس دن ہمیں دل کا دورہ پڑا لوگوں نے قیاس کے گھوڑے دوڑانا شروع کر دیئے کہ ہم بیٹھے بیٹھے کیوں بیماریِ دل میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ کسی نے کہا۔ ننانوے کے پھیر میں پڑ گیا تھا۔ دن رات زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانے کے لئے دوڑ دھوپ کیا کرتا تھا۔ کسی اور نے کہا۔ بڑے درجے کا کنجوس تھا۔ گوشت کی بجائے مونگ کی دال کھایا کرتا تھا۔ کوئی بولا صحت کے پیچھے لٹھ لے کر پھرتا تھا۔ دن میں دس بار چائے پیتا تھا اور کوئی اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہنے لگا "قرض لے کر کبھی واپس نہیں کرتا تھا۔ دل کا دورہ نہ پڑتا تو اور کیا ہوتا۔"

اسپتال میں ایک ماہ رہنے کے بعد جب چھٹی ملی۔ ڈاکٹر نے اتنی ہدایات دیں اور اس قدر پابندیاں لگا دیں کہ ہم سوچنے لگے۔ بچ تو گئے ہیں لیکن اب جی کر کیا کریں گے۔ "سگرٹ مت پیجیئے۔ گھی مت کھائیے۔ نمک کا استعمال مت کیجیے۔ چٹپٹی چیزوں سے پرہیز کیجیے۔ اُبلی ہوئی سبزیاں کھائیے۔ نہایت آہستہ چلا کیجیے۔ لکھنا پڑھنا چھوڑ دیجیے۔ اپنے بلڈ پریشر کا خیال رکھا کیجیے۔ ہر دو ماہ کے بعد ای سی جی کرانے کے لئے اسپتال آئیے۔"

کچھ دن اور گھر پر آرام کرنے کے بعد ہمیں چلنے پھرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اب جب بھی ہم سیر کو جاتے۔ لوگ باگ کرید کرید کر پوچھتے۔ کیا سینے میں درد تو نہیں ہوتا؟ چلتے وقت سانس تو نہیں پھول جاتا؟ نبض ڈوبتی ہوئی تو محسوس نہیں ہوتی؟ چکر تو نہیں آتا؟ آنکھوں کے آگے اندھیرا تو نہیں چھا جاتا؟ ہم جب اِن تمام سوالوں کا جواب نفی میں دیتے۔ انھیں بڑی مایوسی ہوتی۔ بظاہر وہ کہتے "خدا کا شکر ہے۔ اُس نے بڑا کرم کیا ہے۔" لیکن بباطن یہ کہہ رہے ہوتے "اللہ رے اِس کی سخت جانی۔ اتنا بڑا دورہ بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکا!"

ایک برس کے بعد ہمارے احباب کو شک ہونے لگا۔ ہمیں دل کا نہیں کسی اور چیز کا دورہ پڑا تھا۔ اب جب اُن سے ملاقات

ہوتی وہ سوال کرتے "کیا آپ کو سو فی صد یقین ہے آپ کو دل کا ہی دورہ پڑا تھا؟" "کیا وہ ڈاکٹر جنہوں نے آپ کا علاج کیا تھا امراضِ دل کے ماہر تھے یا معمولی ڈاکٹر تھے؟ اگر وہ دل کا دورہ تھا۔ اُس کے بعد آپ کو پھر کبھی کیوں نہیں پڑا؟" ہمیں اُن کے سوالات سُن کر کسی شاعر کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ جاتا:

وہ ارماں جو نہ نکلے دشمنی سے
نکالے جا رہے ہیں دوستی سے

آج کل جب کبھی ہماری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ ہمارے کچھ دوست بھاگم بھاگ ہمارے یہاں پہنچتے ہیں اور مصنوعی ہمدردی جتاتے ہوئے کہتے ہیں "خیر تو ہے کہیں دل کا دوسرا دورہ تو نہیں پڑ گیا؟" جب ہم اُنھیں مطلع کرتے ہیں "جی نہیں۔ معمولی زکام ہے" وہ پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے مشورہ دیتے ہیں "پھر بھی آپ کو محتاط رہنا چاہیے۔ کئی بار زکام بھی دل کے دوسرے دورے کا باعث بن جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ایسے کئی کیس ہوئے ہیں۔"

سُنا ہے۔ ہمارے گھر سے واپس جاتے وقت وہ آپس میں اس قسم کی باتیں کرتے ہیں:۔

"ہم نے تو سمجھا تھا۔ دل کا دوسرا دورہ ہو گا۔ یہ تو محض زکام نکلا۔"

"اجی بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ آج نہیں تو کل انھیں دل کا دوسرا دورہ ضرور پڑے گا۔"

"دوسرا دورہ عموماً جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔"

"ہوتا تو ہے۔ اگر آدمی اِن کی طرح ڈھیٹ نہ ہو۔"

"حضرت! اُس کے آگے کسی کی ڈھٹائی نہیں چلتی۔"

"آپ کو شاید علم ہو گا۔ میر تقی میرؔ کو جب دل کا دوسرا دورہ پڑا تھا۔ انھوں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے یہ شعر موزوں کیا تھا:۔

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
آخر اس بیماریِ دل نے اپنا کام تمام کیا

پیش لفظ

کنہیّا لال کپور

طنز تنقید ہے۔ صدائے احتجاج ہے۔ دشنام یار ہے۔ تبصرہ ہے تازیانہ ہے اِس کا مقصد اصلاح ہے۔ پگڑی اُچھالنا ہے۔ احساسِ برتری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ بیہودہ اشیا اور اشخاص کا مضحکہ اُڑانا ہے۔

مزاح مبالغہ ہے مشغلہ ہے۔ مہتابی ہے۔ انار ہے پھلجھڑی ہے۔ اپنے آپ پر ہنسنے کا نام ہے۔ چٹکی لینا ہے۔ ہمدردانہ نقطۂ نظر سے انسانی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کا فن ہے۔

طنز نگار سرجن ہوتا ہے۔ قصاب ہوتا ہے۔ احساسِ کمتری کا شکار ہوتا ہے۔ کچھ نہ کہہ کر سب کچھ کہنے کے فن میں ماہر ہوتا ہے۔ بددماغ ہوتا ہے۔ بیدرد ہوتا ہے۔ بے لحاظ ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی ہوتا ہے۔ کرشن چندر ہوتا ہے۔ فکر تونسوی ہوتا ہے۔

مزاح نگار مسخرہ ہوتا ہے۔ خوش طبع ہوتا ہے۔ شگوفہ چھوڑتا ہے۔ گل کترتا ہے۔ دور کی کوڑی لاتا ہے۔ اپنی تحریروں سے ہمیں چونکاتا ہے۔ احمد شاہ بخاری پطرس ہوتا ہے شوکت تھانوی ہوتا ہے شفیق الرحمٰن ہوتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ہوتا ہے مجتبیٰ حسین ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا باتیں عموماً طنز و مزاح کے بارے میں کہی جاتی ہیں۔ اِن سب کی مناسب مثالیں پیش کرنا صرف اس حالت میں ممکن ہے۔ جب آدمی وزیر آغا یا خواجہ عبدالغفور ہو۔ تاہم دو ایک امثال جو بے ساختہ یاد آ گئی ہیں حاضر ہیں۔

۱۔ کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا کرتے ہیں لوگ!

ا۔ ایک فوجی جرنیل ابراہیم لنکن سے بحث کر رہا تھا۔ جب لنکن نے اُس کی ہر دلیل کو رَدّ کر دیا۔ اُس نے برہم ہو کر کہا "مسٹر پریذیڈنٹ! کیا آپ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں۔ لنکن نے مسکرا کر جواب دیا "میں تو آپ کو بیوقوف نہیں سمجھتا لیکن ممکن ہے میں غلطی پر ہوں "!

ب۔ ایک پروفیسر صاحب جن کے پاس پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تھی تقریر کر رہے تھے کسی مسخرے نے شرارتاً پوچھا "کیا آپ مویشیوں کے ڈاکٹر ہیں"؟ پروفیسر صاحب نے برجستہ کہا "کیا جناب کی طبیعت ناساز ہے"؟

ج۔ وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے!

۲۔ چونکا دینے والی بات کرنا

ا۔ خوبصورت عورتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ وہ جو واقعی خوب صورت ہیں۔ اور وہ جنھیں ازراہِ اخلاق (یا مذاق) خوبصورت

کہا جاتا ہے۔

ب۔ شاعر تین اقسام کے ہوتے ہیں۔ وہ جنہیں اُن کے علاوہ کوئی شخص شاعر تسلیم نہیں کرتا وہ جو دو ایک غزلیں کہنے کے بعد دعوے کرتے ہیں دیکھیں اِس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا۔ اور وہ جو عمر بھر عروسِ سخن کو سنوارنے کے بعد دبی زبان سے اعتراف کرتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا!

ج ۔ ؎

نجد سے بھاگا تو بھاگا اونٹ بھی قبلے کی سمت

دُم کے پیچھے قیس تھا۔ آگے خدا کا نام تھا (ظریف لکھنوی)

۳۔ اپنے آپ پر ہنسنا

؎

اُن کو حالی بھی بُلاتے ہیں گھر اپنے میہماں

دیکھیے آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

۴۔ شگوفہ چھوڑنا

ا۔ وہ شخص واقعی خوش نصیب ہے جو صرف اپنے آپ سے محبت کرتا ہے کیونکہ اُس کا کوئی رقیب نہیں ہوتا۔

ب۔ بیوی وہ ہوتی ہے جو شوہر کی اُن تمام مصیبتوں میں اس کا ساتھ دیتی ہے۔ جو کبھی پیدا نہ ہوتیں اگر وہ اُس سے شادی نہ کرتا!

ج۔ ایک اطالوی عقلمند لگتا ہے اور واقعی عقلمند ہوتا ہے ایک ہسپانوی عقلمند لگتا ہے لیکن دراصل بیوقوف ہوتا ہے۔ ایک فرانسیسی بیوقوف لگتا ہے۔ لیکن دراصل عقلمند ہوتا ہے۔ ایک انگریز بیوقوف لگتا ہے اور واقعی بیوقوف ہوتا ہے۔

د۔ کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو دِل میں سوائے یار کسی کا گزر نہیں (یگانہ)

ہر ایک ذہین طنز و مزاح نگار جدت پسند اور روایت شکن ہوتا ہے۔ اس لئے وہ فرسودہ موضوعات پر طبع آزمائی کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ وہ تب تک قلم نہیں اُٹھاتا۔ جب تک اُسے کوئی نادر یا تازہ موضوع نہیں سوجھتا۔ یہی وجہ ہے اچھی مزاحیہ اور طنزیہ تحریریں کمیاب ہیں۔ بقول امیر مینائی ؎

امیر ایسے ویسے تو مضموں ہیں لاکھوں نئی بات کوئی کبھی سوجھتی ہے۔

میں

جیلانی بانو

"آدھی رات کو کسی نے خبر سنائی کہ عامر مل گیا ہے۔ میں اندھے بادلوں کی طرح اُٹھی۔ جانے کتنا تیز بھاگی۔ عامر کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ کبھی سوچتی کہ یہ عامر ہی ہے یا کوئی اور ——"

اماں نے ہزاروں بار یہ قصہ سنایا تھا اور ہر بار میں گھبرا کے اماں سے پوچھتا۔

"اماں، اماں، آپ کو یہ شک کیوں ہوا کہ میں عامر نہیں ہوں ——؟"

"بس یوں ہی —— میرے دل میں شک تھا کہ کہیں کھوئے ہوئے بچے بھی ملے ہیں۔ کسی نے میرا دل بہلانے کے لئے کوئی اور بچہ نہ تھما دیا ہو۔"

اور ہر بار اماں کی اس بات پر میں لرز اُٹھتا تھا۔

کہیں سچ مچ اماں کو کسی نے دوسرا نہ تھما دیا ہو۔ دل بہلانے کے لئے۔ اور وہ کھویا ہوا "میں" جانے کہاں بھٹک رہا ہوگا۔ جانے کونسی ماں اس "میں" کو تھام کر بہلائی گئی ہوگی۔ پھر میں کون ہوں۔ مجھے اماں کا دل بہلانے کے لئے رات کے اندھیرے میں کہاں سے لائے تھے۔

میرے چاروں طرف سوالوں کے پھندے بڑھتے گئے۔ جیسے کوئی اُلجھی رسیوں میں پھنستا جا رہا ہو۔ اپنے وجود پر سے میرا یقین اُٹھتا جا رہا تھا۔

اور پھر جب میں ذرا بڑا ہو گیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں اس کھوئے ہوئے عامر کو ڈھونڈوں گا جسے اماں ریل میں سوتا چھوڑ کر اتر گئی تھیں۔ اور وہ ریل آگے بڑھ گئی۔ ایک بار میں نے ریل کی پٹریاں دیکھی تھیں۔ اتنی لمبی۔ یا اللہ —— یہ پٹریاں کہاں ختم ہوتی ہوں گی! آخر آخری اسٹیشن کونسا ہے ——!

میں نے جب کبھی ابّا سے یہ بات پوچھی۔ وہ ہنسنے لگتے۔

"احمق، پٹریاں کہیں ختم نہیں ہوتی ہیں۔ ان کا جال تو سارے ہندوستان میں بچھا ہوا ہے۔"

ایک بچے کو اس کی ماں سے دُور رکھنے کے لئے سارے ہندوستان میں جال بچھایا گیا ہے؟ میں حیران ہو کر سوچتا ——

وہ بیچارا عامر کب تک ریلوں میں گھومے جائے گا ——؟

اماں بھی کیسی بھولی ہیں۔ مجھ سے بہل گئیں۔ مگر کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اماں کو بھی میرے وجود پر شک ہے۔

یوں میرے کھوئے کھوئے رہنے پر سب مجھے تشویش بھری نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ کوئی مجھے پکارتا مگر میں جواب ہی نہیں دیتا۔

جیسے عامر تو کسی اور کا نام تھا۔ میں کیوں جواب دوں!

میری ایسی حرکتوں پر بڑی آپا کو بڑی ہنسی آتی تھی۔ وہ میری گردن ہلا کر پوچھتیں۔ ابھی تم کہاں تھے —؟

"ریل میں —؟" میرے جواب پر سب ہی ہنس پڑتے۔

ایک بار اماں بیمار پڑ گئیں۔ جانے کیا ہوا — روٹی پکاتے پکاتے اٹھیں اور دھڑام سے آنگن میں گر پڑیں۔ ذرا سی دیر میں بڑی آپا کی چیخوں سے ہمارا آنگن پڑوسنوں سے بھر گیا۔ بڑی آپا نے اماں کو دودھ میں گھول کر خمیرہ مروارید پلایا۔ صابرہ کہتی تھی کہ اس خمیرے میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ مُردے کو دے دو تو کھڑا ہو جائے۔ مگر اماں نے صرف آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور کروٹ بدل کر سو گئیں۔ کئی دن ہو گئے۔ روز رات کو اماں کے پاس سونے کو جی چاہتا۔ مگر ان کی ہائے ہائے سے گھبرا کے میلے کپڑوں کے ڈھیر پر سو گیا۔ اور پھر سوتے وقت مجھے اس بات پر رونا آتا تھا کہ اماں مجھے اپنے پاس کیوں نہیں بلاتیں اور پھر ایک دن اماں نے میری طرف غصہ سے دیکھ کر کہا۔

"اسے دیکھو۔ جب سے میں بیمار ہوئی ہوں ایک بار بھی میرے پاس نہیں آیا۔ جیسے میرا بیٹا ہی نہیں ہے۔"

اماں کی اس بات پر میں دن بھر سوچتا رہا۔ کہیں سچ مچ اندھیری رات میں لوگوں نے اماں کو دھوکا تو نہیں دیا تھا! جبھی تو اماں کی بیماری سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ بڑی آپا، صابرہ اور بھیا پریشان صورتیں لئے سارے گھر میں بھاگے بھاگے چلاتے تھے۔ اماں کو زبردستی دوائیں کھلائی جاتیں۔ لیکن مجھے اُلٹا غصہ آتا تھا کہ یہ کب تک نخرے کیے لیٹی رہیں گی!

کئی بار اماں میری آوارہ گردی پر جھنجلا جاتی تھیں۔

"تو ہر وقت باہر کیوں گھومتا ہے۔ اپنے گھر میں جی نہیں لگتا۔ باہر تیرا کون سگا بیٹھا ہے؟"

اماں کی بات سن کر کرکٹ بیٹ میرے ہاتھ سے گر گیا۔ ڈر کے مارے دل دھک دھک کرنے لگا۔ اماں نے یہ بات کیوں کہی آج! کیا انھیں بھی ڈر ہے کہ میں کہیں اپنے سگوں میں نہ چلا جاؤں! دو دن ہو گئے۔ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ سارا دن پلنگ پر لیٹا رہا۔ کروٹیں بدل بدل کر سوچے جاتا کہ کیا سوچوں! اب اماں سمجھتیں مجھے کوئی روگ لگ گیا ہے۔ "باہر جاؤ — اٹھ کر بیٹھو۔ ہوم ورک کرو —"

ہر شخص پاس سے گزرتے وقت مجھے ایک حکم سنا دیتا۔

"کوئی سوال سمجھ میں نہ آئے تو اسے پھیلا کر حل کرو۔" ابّا پڑھاتے وقت مشورہ دیتے تھے۔ تو کیا اس سوال کو بھی پھیلا دوں —؟

مگر وہ تو میرے پھیلانے سے پہلے ہی ہر طرف پھیل چکا تھا، دن رات میرے دماغ میں ایک کلکیولیٹر اس سوال کو بھائے جاتا۔ جانے کیوں بعض وقت دماغ میں وہی باتیں بھر جاتی ہیں جن کے تصور سے ہی وحشت ہوتی ہو۔

آخر سب نے یہ بات طے کر لی کہ میرا دماغ اپنی جگہ سے ہٹ چکا ہے۔ اور ایک دن بڑی آپا نے ابّا سے شکایت کی۔

"ابّا، عامر اسکول کا ہوم ورک نہیں کرتے۔ ہر وقت کتاب بند کر کے جانے کیا سوچتے رہتے ہیں۔

"بھئی ہمارے خاندان میں تو کوئی جاہل نہیں رہا ہے۔ اگر عامر بڑے ہو کر رکشا چلانا چاہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" ابا بے حد غصہ میں کہہ رہے تھے۔

ہمارے خاندان میں — یعنی ابا کا خاندان، جو میرا خاندان نہیں ہے —؟ میں نے بڑے دکھ سے سوچا۔ میرا رنگ بھی تو ابا سے بہت گورا ہے۔ ابا تو نرے کالے ہیں۔

جب میں بہت چھوٹا سا تھا اور ابا مجھے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے تو پھوپی جان ہنس کر کہتی تھیں۔

"اللہ قسم بھیا۔ اتنا گورا بیٹا تمہاری گود میں نہیں سجتا۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ کسی اور کا بچہ اٹھا لیا ہے۔"

اور میں ابا کی گود سے اتر جاتا تھا۔ یوں جیسے کسی غیر کی گود میں چلا گیا تھا۔ سب بہن بھائی مجھے اپنے سے دور رکھتے۔ مجھے چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر صابرہ اور ریحو سرگوشیاں کرتے — غالباً انہیں بھی یہ کہانی معلوم ہو چکی ہے۔

رات کو کبھی کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا تھا تو میں گھبرا کے اٹھ بیٹھتا۔ جیسے مجھے لے جانے آیا ہو —— مل گیا — مل گیا — اور میں کسی ممتا بھرے سینے سے لگ جاتا اماں کے سینے میں بھدے میلے کرتے سے ناک رگڑ کے رونے لگتا۔

"کوئی روشنی کرو — یہ عامر ہی ہے نا ——؟"

پھر روشنی ہو جاتی۔ پل بھر میں اماں دور ہٹ جاتیں۔ میری کھلی ہوئی باہوں کو دھکیل کر وہ غور سے دیکھتیں — نہیں نہیں، کہیں کھوئے ہوئے بچے بھی ملے ہیں! اور پھر اماں میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہتیں — "بیچارا ——

"کیا ہوا مجھے ——؟ کیوں کانپ رہا ہے —" اماں آنکھیں ملتی ہوئی سوتے سے اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھتی تھیں۔

"اماں عامر کو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ جیسے کوئی اسے لے بھاگے گا۔" صابرہ مجھے تشویش بھری نظروں سے دیکھ کر کہتی۔

"میں جو ہوں — کسی کو کیوں لے جانے دوں گی۔" اماں مجھے اپنے سینے سے لگا کر تھپکنے لگیں۔

"نہیں نہیں میں جاؤں گا۔" اماں کا ہاتھ جھٹک کر میں ضد کرنے لگا۔

"کہاں —؟ کس کے ساتھ —؟" اماں نے تعجب سے پوچھا۔

کہاں —؟ کس کے ساتھ —؟ کہاں —؟ کس کے ساتھ ——؟ ساری رات یہ سوال میرے کانوں میں گونجتے تھے۔ کسی کھوئے ہوئے بچے کو کسی کی مدد کے بغیر ڈھونڈنا کتنا کٹھن کام ہے۔ پھر میں اپنے آپ کو کیسے ڈھونڈوں! کھیلتے ہوئے بچوں میں — دوڑتی ہوئی بسوں میں — بھاگتی ہوئی ریلوں میں۔ ایک دن سڑک پر ایک عورت چھوٹے سے بچے کو گھسیٹتی ہوئی مار مار کے کہیں لئے جا رہی تھی۔

راہ چلتی کسی عورت نے غصہ سے کہا۔

"اری کیوں اتنی بے دردی سے مار رہی ہے۔ کیا بچہ تیرا نہیں ہے؟"

کہیں وہ بچہ بھی پٹ رہا ہو گا جو میری بجائے کسی اور ماں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہ مائیں دوسروں کے بچوں کو اتنا کیوں مارتی ہیں! اماں کو بھی جب مجھ پہ غصہ آتا ہے تو پھر وہ پاگل سی ہو جاتی ہیں۔ شاید انہیں غصہ آتا ہے کہ میں ان کے گھر میں کیوں آ گیا!

میں جو اپنی ماں سے بچھڑ گیا۔ جو کبھی ایک تھا اور پھر دو ہو گیا —— ایک حصہ جو اماں کا ہے۔ اور ایک حصہ جو کسی ٹرین کی بوتھ پہ بیٹھا اپنے پیچھے بھاگنے والی دنیا کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ نظروں کے سامنے تیزی سے گزرنے والے چہروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ہیں "کب ملے گا! کب میں ایک ہو سکوں گا۔

ادھر بالکنی پر گھنٹوں ٹہل ٹہل کر میں سوچتا ہوں کہ اچانک کوئی دوڑتا ہوا آئے گا —— تم یہاں کیسے آ گئے! جاؤ اپنے سگوں میں مل جاؤ۔ اور وہ دوڑتا ہوا سیولا میں ہوں گا۔ اور پھر میں —— لیکن کیا میں اکیلا ہی انتظار کا یہ دکھ برداشت کر رہا ہوں! اور کوئی مجھے اس عذاب سے چھڑانے نہیں آئے گا۔ مگر وہ بھی تو کھو گیا ہے۔ اپنے گھر سے دور کہیں کسی چلتی ٹرین کے ڈبے میں سو رہا تھا۔ سوتا رہے گا۔ اس ٹرین کی پٹڑیوں کا انت کہیں نہیں ہے۔ وہ زندگی بھر گھومتا رہے گا۔ پٹڑیاں بدلتی رہیں گی۔

سیاہ انجن اسے خوفناک غاروں میں، اندھیرے جنگلوں میں اور ہیبت ناک پہاڑوں پر لے جائے گا۔

میں اکثر خواب دیکھتا کہ میں نے ریل کی تمام پٹڑیوں کا سلسلہ کاٹ دیا ہے۔ تمام دنیا کی ریلیں رکی کھڑی ہیں۔ مگر وہ بے وقوف سو رہا ہے۔ کوئی اُسے اٹھاتا کیوں نہیں —— چل بھاگ اپنے گھر جا——

ایک دن اخبار میں ایک خبر دیکھی میں نے۔

"اطہر! تم کہاں ہو ——؟ جہاں بھی ہو فوراً چلے آؤ تمہاری ماں تمہارے لئے
سخت بے چین ہیں۔ تم سے کوئی شکایت نہیں کی جائے گی۔"

اچھا! تو یہ اشتہار میرے لئے ہے۔ میں نے کئی بار اشتہار پڑھ کر فیصلہ کیا اور چپکے سے پتے کی سمت روانہ ہو گیا۔

"کیا یہاں کوئی کھو گیا تھا!" میں نے دروازے پر دستک دے کر پوچھا۔ مگر وہ سب میرے پھٹے کپڑے، خون ٹپکاتے پاؤں اور گرد آلود چہرے کو دیکھ کر سہم گئے۔

"پاگل —— پاگل ہے۔ اندر آ جاؤ نہیں تو مارے گا۔" ایک بچی نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔

میں مایوس ہو کر لوٹ گیا——

سامنے سے ایک لڑکا آ رہا تھا۔ میرے ہی جتنا۔ میری طرح وحشت زدہ، زخم خوردہ۔ سہما سہما سا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا —— جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ٹھہرو——"

وہ ٹھہر گیا——

"کیا اس سامنے والے گھر میں لوگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ یہ دیکھو میرے کھو جانے کا اشتہار اخبار میں چھپا ہے۔"

"تم کون ہو ——؟" اس نے اخبار مجھے لوٹاتے ہوئے کہا۔

"ہر شخص مجھے پہچاننے سے انکار کر چکا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے میرے سگے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ مجھے پہچان لیں گے۔"

"جھوٹ مت بولو ——" وہ غصہ میں بپھر گیا۔ "یہ اشتہار تو میرے لئے تھا۔ میں اپنے گھر واپس آ گیا ہوں۔" اس نے مجھے شک

بھری نظروں سے دیکھا۔

"اچھا تو تم نے ریل کی پٹریوں کو کاٹ ڈالا۔ نیند سے جاگ اُٹھے —" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"تم کون ہو —؟" وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔

"لو — پھر وہی چکر شروع ہو گیا" میں نے بڑی دیر تک اس بات پر غور کیا اور پھر خوشی سے اچھل پڑا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں 'میں' ہوں اور تم 'تم' ہو — ہم دونوں اپنے اپنے گھر میں آ گئے ہیں۔" اور پھر میں خوشی کے مارے بھاگنے لگا۔ میں نے راہ کے تمام پتھروں کو ٹھوکروں سے اڑا دیا۔ سائیکلوں اور کاروں کی زد سے نکل گیا۔ شریر بچوں کی طرف سے آنے والے پتھروں کو ہاتھوں پر سہا۔ آج مجھے بڑی خوشی تھی کہ وہ سب ظالم بچے مجھے پہچان گئے۔ جبھی تو آج انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پتھر پھینکے۔ اپنے محلے میں لوگ مجھے دیکھتے ہی چلانے لگے۔

"پاگل — پاگل پھر آ گیا —"

ہاں، آج سب نے مجھے پہچان لیا۔ اب اماں بھی مجھے پہچان لیں گی۔ تو آج 'میں' مل گیا۔

یہ کتنا لمبا سفر تھا، اپنی پہچان کے لئے، جو میں نے طے کیا — تھکن سے چور ہو کر میں نے سوچا۔

میں دور سے دیکھ رہا تھا۔ بہت سے لوگ میرے منتظر تھے۔ میں جو اپنے پہچان کے سفر سے لوٹا تھا تو لوگ مجھے حیران حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان آنکھوں میں میرے لئے رحم بھی تھا اور تشویش بھی۔

پھر سب نے میرے گرتے ہوئے بدن کو تھام لیا۔

"لو بھئی تمہارا بیٹا آ گیا۔ ذرا دیکھو تو اس نے کیا حال بنا رکھا ہے اپنا۔"

لوگوں نے مجھے اماں کی گود میں دھکیل دیا۔

"یا اللہ یہ — یہ عامر ہے —؟" اماں نے پریشان نظروں سے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرا تھام کر غور سے دیکھا تو اچانک "ادل بدل" ہو گیا۔ میں نے اماں کو دور دھکیل دیا اور نڈھال ہو کر سوچا — تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی 'میں' "نہیں ملا ہوں" —— ؟

ایک شخص

اختر انصاری دھلوی

میرے دوست حامد حسین ایک معمولی انسان کی طرح جیے لیکن ایک قطعی غیر معمولی انسان ہو کر مرے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک معمولی حیثیت، معمولی تعلیم، معمولی شکل و صورت اور معمولی مزاج و طبیعت کے آدمی تھے۔ مگر جب پینتالیس سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے جاننے والوں میں ہر شخص نے بے اختیار یہ محسوس کیا کہ وہ ہرگز کوئی معمولی آدمی نہیں تھے، بلکہ اس حد تک غیر معمولی واقع ہوئے تھے کہ اُن کو بآسانی عجیب الخلقت اور نادر الوجود خیال کیا جا سکتا تھا۔

انہوں نے دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں بی۔ اے پاس کیا۔ فلسفے میں ایم۔ اے کرنا چاہتے تھے کیونکہ علم کی اس شاخ سے بہت دلچسپی تھی اور یہ اُن کا پسندیدہ مضمون تھا لیکن اُن دنوں جنگ سے متعلق دفاتر میں نوجوانوں کو دھڑا دھڑ نوکریاں مل رہی تھیں اور ادھر اُن کی مالی حالت بھی کچھ بہت اچھی نہیں تھی۔ اس لئے مزید تعلیم کا ارادہ ترک کر کے محکمۂ فوج کے کسی دفتر میں ملازم ہو گئے۔ گویا فلسفے کے شوق کو بالائے طاق رکھا اور طلب زر کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ لڑائی ختم ہوئی تو رجسٹریشن کے محکمے میں نوکری مل گئی اور جلد ہی سب رجسٹراری کے عہدے تک پہنچ گئے۔ خاصے مزے کے ساتھ زندگی بسر ہوتی تھی۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں۔ بے اولاد تھے۔ بیوی بالکل نو عمری ہی میں داغِ مفارقت دے چکی تھیں اور دوسری شادی بس ٹلتی ہی رہتی تھی۔ ماں باپ بھی خدا کو پیارے ہو چکے تھے۔ افرادِ خاندان کے نام پر لے دے کے ایک بیوہ بھاوج اور اُن کے دو یتیم بچے تھے جو حامد حسین کے بڑے بھائی صاحب مرحوم کی یادگار نشانیاں تھیں اور اسی نسبت سے اُن کو عزیز تھیں۔ گاؤں میں جو آبائی مکان تھا اس کی رکھوالی انھیں کے سپرد تھی اور انھیں کی کفالت حامد حسین کی تنہا اقتصادی ذمہ داری بھی تھی۔ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ اُن کو خرچ بھیجا کرتے تھے لیکن اُن کو دے دلا کر بھی اتنا بچ رہتا تھا کہ اُن کے عیش و آرام میں کوئی خلل نہیں پڑتا تھا۔ سیر و شکار، پینا پلانا اور ادب اور فلسفے کا مطالعہ اِن کی زندگی کے تین اہم مشغلے تھے۔ اگر کوئی غم تھا تو صرف یہ کہ فلسفے میں ایم اے نہیں کر سکے۔ یا پھر یہ کہ بدن کا مٹاپا روز افزوں ترقی پر تھا اور ذیابیطس کے ساتھ ضعفِ بصارت کا مرض بھی لاحق ہو چکا تھا۔

اب یہاں سے حامد حسین کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں انہوں نے پے بہ پے قلابازیاں کھائیں اور عجیب الخلقت یا نادر الوجود ہونے کے واضح ثبوت فراہم کئے۔

مکانی فاصلے کے باوجود میری اُن کی ملاقات دوسرے چوتھے مہینے ہوتی ہی رہتی تھی۔ کبھی وہ میرے یہاں اور کبھی میں ان کے یہاں کا ورد رہتا تھا۔ ایک مرتبہ آئے تو یہ خبر سنائی کہ میں ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔

"ملازمت چھوڑ رہے ہو؟ آخر کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ میں ایم اے کرنا چاہتا ہوں"۔ انہوں نے بڑی سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"مگر ایم۔ اے کرنے کے لیے ملازمت چھوڑنا کیا معنی؟"

"ملازمت چھوڑے بغیر میں ایم۔ اے نہیں کر سکوں گا"۔

وہ بولے "میں نے پری میچور ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی ہے۔ جو کچھ تھوڑی بہت پنشن ملے گی وہ لے لوں گا اور نوکری سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ یونیورسٹی میں باقاعدہ داخلہ لے کر ایم۔ اے کروں گا اور ایم۔ اے کے بعد فلسفے میں ریسرچ کا بھی ارادہ ہے"۔

یہ سب سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ مزید پوچھ گچھ کی تو بولے: "میرے پاس تین چار سال سے زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس تین چار سال میں میں ایم اے اور ریسرچ دونوں مکمل کر لینا چاہتا ہوں"۔

تین چار سال کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پوچھا تو انہوں نے بتایا: "میری بینائی بہت تیزی کے ساتھ زائل ہو رہی ہے۔ آنکھ کا آپریشن کرایا، مگر کچھ نہیں ہوا۔ داہنی آنکھ تو بالکل بے کار ہے ہی۔ بائیں آنکھ کی بھی ایک چوتھائی روشنی ختم ہو چکی ہے۔ صرف تین چوتھائی باقی ہے جو تین چار سال سے زیادہ نہیں چلے گی۔ ڈاکٹروں نے یہی کہا ہے"۔

مجھے اپنے حواس غائب ہوتے ہوئے معلوم ہوئے۔ لیکن انہوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ مجھے مطلع کیا: "میں نابینا ہونے سے پہلے ایم۔ اے اور ڈاکٹریٹ دونوں سے فارغ ہو جانا چاہتا ہوں"۔

• اس گفتگو کے بعد میرے اور اُن کے درمیان ردّ و قدح اور بحث و تمحیص کا جو معرکہ گرم ہوا اُس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ اپنے فیصلے پر اٹل تھے۔ بلاشبہ وہ قبل از وقت پنشن لیکر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایم۔ اے کا دو سال کا کورس پورا کیا۔ امتحان دیا اور امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے بعد ریسرچ کا نمبر تھا، لیکن اُس کی نوبت نہیں آئی۔ شاید قدرت اُن کے ساتھ اتنی دور تک جانے کے لئے تیار نہیں تھی!

ہوا یہ کہ ایک دن دہلی کے سفر میں اُن پر فالج گرا۔ گھر پہنچائے گئے اور پھر اسپتال منتقل کئے گئے۔ مجھے اس حادثے کی اطلاع ذرا دیر سے ملی، اور جس ذریعے سے ملی اُسی ذریعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حامد حسین شادی کا ارادہ رکھتے ہیں، اور بہت جلد! یعنی اس بیماری کی حالت میں!

میں بدحواس ہو کر گھر سے نکل پڑا۔ سیدھا اُن کے یہاں پہنچا۔ اسپتال سے واپس آ چکے تھے لیکن حالت خراب تھی۔ دونوں ٹانگوں پر فالج کا اثر تھا۔ بغیر کسی دوسرے شخص کے سہارے نہ اُٹھ سکتے تھے نہ چل پھر سکتے تھے۔ اُن کا حال شاعر کے اس شعر کا مصداق تھا:

بیٹھا تو عجزِ نقشِ کفِ پا لئے ہوئے
اٹھا تو دردِ دل کا سہارا لئے ہوئے

بات چیت ہوئی تو کوشش کے باوجود میں شادی کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ بہت دیر تک وہ بھی نہیں کھلے۔ جس سے خیال ہوا کہ شاید وہ اطلاع جو مجھے ملی تھی غلط تھی۔ لیکن پھر جلد ہی وہ اس موضوع کی طرف آئے اور پتا چلا کہ مجھ تک جو اطلاع پہنچی تھی غلط نہیں تھی۔ حامد حسین واقعی شادی رچانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اُن کی بیوہ بھاوج اُن کی عمر بھر کی خدمت اور مالی امداد

کے صلے میں اُن کے ساتھ نکاح پڑھوانے پر تیار ہوگئی تھیں۔ مجھ میں یارا دم نہیں تھا کہ میں اُن کے اس اقدام کی مخالفت کرتا۔ لیکن اِس قدر جاننے کی خواہش ضرور تھی کہ اس شادی کا محرک کون سا جذبہ ہے اور اس میں کون سی علتِ غائی کارفرما ہے معلوم ہوا کہ شادی رچانے میں اُن کے پیشِ نظر جو مقصد تھا وہ یہ تھا کہ اولاد کے ذریعے اُن کا اس دنیا سے تعلق قائم رہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ موت اُن کے سلسلۂ حیات کو منقطع کر دے، اور آنے والی نسلیں اُن کے وجود کے اثرات سے بالکل خالی اور تہی دست ہوں۔ کہنے لگے۔ اگر میں اولاد چھوڑے بغیر اس دنیا سے اُٹھ جاؤں گا تو قیامت تک نسلِ انسانی کا مقروض رہوں گا اور میری روح اس بوجھ کے نیچے ہمیشہ ہمیشہ کراہتی رہے گی۔

میں اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا۔ پھر میرے اندر کے عام دنیادار انسان نے سر اٹھایا اور میں نے دبے لفظوں میں کہا: "یہ سب تو درست ہے لیکن صحت اِن سب باتوں پر مقدم ہے۔ میرے خیال میں جب تک مکمل تندرستی حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک تو شادی کو ملتوی ہی رکھنا چاہیے۔"

انہوں نے کہا۔ "اِس منصوبے کی تکمیل کے لئے میرے پاس صرف دو سال ہیں۔ مجھے جو کچھ کرنا ہے انہیں دو سالوں میں کرنا ہے۔"

"کیوں؟ انہیں دو سالوں میں کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "دو سال بعد کیوں نہیں؟"

"دو سال بعد میں مر جاؤں گا۔" انہوں نے جواب دیا۔ آواز سادہ، سپاٹ، بے رنگ اور ہر جذبے سے خالی تھی۔

پھر انھوں نے خود ہی اِس کی تفصیل ان الفاظ میں بتائی: "میرے اوپر جس فالج کا اثر ہے وہ ایک ترقی پذیر فالج ہے ابھی صرف ٹانگیں متاثر ہیں۔ اوپر کا جسم بتدریج زد میں آئے گا۔ جب یہ اثر قلب تک پہنچے گا تو میری موت واقع ہو جائے گی۔ اس میں دو سال لگیں گے۔ ڈاکٹروں نے یہی بتایا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گویا ختم ہو چکی تھی۔ کچھ توقف کے بعد حامد حسین نے پھر کہا: "میرے پاس صرف دو سال ہیں۔ مجھے جو کچھ کرنا ہے انہیں دو سالوں میں کر ڈالنا ہے۔ اُس کے بعد قصہ ختم ہے۔"

وہ نظر سے نظر ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔ جس طرح ایک نابینا شخص بات کرتے وقت آپ کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ دُور خلا میں تکتا رہتا ہے کچھ وہی انداز حامد حسین کا بھی تھا۔ اِس وقت بھی اُن کی نظریں دُور کسی چیز پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اُن کے تصورات میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ چپ چاپ وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اُسی دن اُن سے رخصت ہو کر گھر کے واپسی سفر پر روانہ ہو گیا۔

حامد حسین نے اپنے منصوبے کے مطابق بیوہ بھاوج کے ساتھ شادی کی لیکن اس سے آگے ایک مرتبہ پھر قدرت کی طرف سے تعاون میں کچھ کمی ہوئی اور قبل اس کے کہ وہ باپ بنتے خدا کے گھر سے بلاوا آ گیا۔ اُن کا منصوبہ بہرحال تشنۂ تکمیل نہ رہا۔ مرنے کے چند ماہ بعد اُن کے گھر میں بیٹے نے جنم دیا۔ گویا مستقبل کی دنیا سے اُن کا تعلق بحال ہو گیا، اور جوئے حیات کا تسلسل قائم رہا۔ یہی وہ چاہتے بھی تھے!

عذاب

مسعود مفتی

آسمان کے ایک گوشے میں تین فرشتے اپنا دفتر لگا کر بیٹھے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ دنیا میں ہر مرنے والے کی پوری زندگی کا جائزہ لے کر رپورٹ تیار کریں کہ آیا اُسے جنت میں جانا چاہیے یا دوزخ میں۔

تینوں فرشتے ہر کیس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اپنی سفارش کرتے تھے۔ اور آسمان کے قریبی گوشے میں اپنے نگران فرشتے کو پیش کر دیتے تھے۔ جو حالات کو از سر نو جانچنے کے بعد آخری رپورٹ تیار کر کے اللہ میاں کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔

اللہ میاں کا فیصلہ آخری ہوتا تھا اور اس کے مطابق مرنے والے کی روح کو جنت یا دوزخ میں بھیجا جاتا تھا۔

دفتر میں ایک نئی روح داخل ہوئی۔ جو دنیا میں ایک آدمی کی موت کے بعد بدن سے رہا ہو کر عالمِ بالا پر پہنچی تھی۔ روح کا مرغولہ سیدھا اٹھ کر ان تین فرشتوں کے سامنے پہنچا اور ایسے اونچا نیچا ہوا۔ جیسے جھک کر آداب بجا لا رہا ہو۔

اس روح کے پہنچتے ہی مرنے والے کے کراماً کاتبین اس کی زندگی کا جملہ ریکارڈ لے کر وہاں پہنچ گئے۔ اور ہر واقعہ کی تفصیل دھوئیں کی شکل میں وہاں انڈیل دی۔

تینوں فرشتوں نے کمپیوٹر کے انداز میں منٹوں میں ان واقعات کا کچا چٹھا دیکھ ڈالا۔ اور بغیر گفتگو کئے روح سے بھی نوری شعاع کے ذریعے رابطہ قائم رکھا۔ جس سے اُن کو مرنے والے کے نقطۂ نظر کا بھی ساتھ ساتھ اندازہ ہوتا گیا۔ یہ گویا اس کی جواب طلبی تھی۔

چند ہی لمحوں بعد انہوں نے اپنی رپورٹ مکمل کر لی اور سفارش کی کہ مرنے والے کے چند گناہ ایسے ہیں کہ اسے کچھ عرصہ کے لئے دوزخ میں بھیجا جائے۔

روح تھرتھراتی کانپتی لرزتی ہوئی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ اور آخری فیصلے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے مرغولوں میں کچھ ایسے پیچ و تاب رونما ہوئے۔ جیسے کوئی بدن سجدے میں پڑا دعا کر رہا ہو۔

آسمان کے دوسرے گوشے میں رپورٹ نگران فرشتے کے پاس پہنچ گئی۔

وہاں بھی کمپیوٹر کے انداز میں چند ہی ثانیوں میں رپورٹ کھنگالی گئی۔ مگر اسے آخری شکل دینے کی بجائے نگران فرشتے نے ابتدائی رپورٹ بھیجنے والے تینوں فرشتوں کو طلب کر لیا۔

"تمہاری رپورٹ میں بعض کوائف واضح نہیں ہیں۔" نگران فرشتے نے کہا "موت کے وقت متوفی کی عمر پچاس (۵۰) برس تھی۔ مگر یہ واضح نہیں کہ موت کیوں واقع ہوئی۔"

تینوں میں سے سینئر فرشتے نے کہا "اس سوال کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب تو یہ ہے کہ موت ۱۹۷۶ء میں دل کے عارضے میں واقع ہوئی۔ مگر دوسرا جواب یہ ہے کہ جن اسباب کی وجہ سے دل کا عارضہ ہوا۔ وہ کئی سال پہلے سے شروع ہو گئے تھے۔"

"وہ کیا اسباب تھے؟" نگران فرشتے نے پوچھا۔

"متوفی سیدھا سادا انسان تھا۔ اور سیدھی سادی زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ اس نے مکان بنانا شروع کیا۔ لیکن جو مکان کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ وہ دراصل اس کی موت کی بنیاد تھی۔"

"وہ کیسے؟"

"اس نے اپنے مکان بنانے کا ٹھیکہ ایک ٹھیکیدار کو دیا۔ جب نصف کے قریب مکان بن چکا تو اس کے کچھ حصے گرنے لگ گئے۔ تب اس کو اندازہ ہوا کہ ٹھیکیدار بے ایمان ہے۔ خراب مصالحہ اور سامان لگا رہا ہے۔ اس نے احتجاج کیا تو ٹھیکیدار نے کام بند کر دیا۔ اور کہا کہ وہ کام کسی اور سے کروا لے۔ مگر جتنا خرچہ ہوا ہے وہ اسے ادا کر دیا جائے۔ جب اس خرچے کا بل دیا گیا تو وہ قریباً اتنا ہی تھا جتنا شروع میں مکان بنانے کا تخمینہ لگایا گیا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر یہ پولیس کے پاس گیا۔ مگر پولیس والے کارروائی کرنے سے پہلے اس سے رشوت کی رقم طلب کرتے تھے۔ اس نے محکمہ کے بالا افسران سے شکایت کی تو انہوں نے لمبے چوڑے وعدے کئے مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ اتنے میں ٹھیکیدار نے پولیس والوں کو پیسے چڑھا دیئے۔ تو انھوں نے متوفی کے خلاف ہی پرچہ درج کر دیا کہ یہ ٹھیکیدار کے پیسے نہیں دیتا۔"

"پھر؟"

پھر اس نے عدالت کی طرف رجوع کیا۔ عدالت نے اس کا استغاثہ تو لے لیا۔ مگر عدالتی طریقہ اتنا لمبا تھا کہ کئی ماہ اور گذر گئے۔ اور مقدمہ وہیں کا وہیں رہا۔ اتنا عرصہ گذر جانے کی وجہ سے مکان کا جو تھوڑا سا ڈھانچہ بنا تھا۔ وہ بھی گرنے لگ گیا۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہوا۔ کہ اس کے گواہ شہادت دینے سے انکاری ہو گئے۔"

"وہ کیوں؟"

"انھیں اس علاقے کے غنڈے نے دھمکایا تھا کہ اگر انھوں نے متوفی کے حق میں شہادت دی تو ان کی بیوی کی بے حرمتی کی جائے گی۔ ورنہ بالغ بیٹی یا نابالغ لڑکے کو اغوا کر لیا جائے گا۔ اس غنڈے کے خوف سے گواہوں نے شہادت دینے سے انکار کر دیا۔"

"مگر غنڈے نے یہ کیوں کیا؟"

"ٹھیکیدار بڑی باقاعدگی سے غنڈے کو غنڈہ ٹیکس ادا کیا کرتا تھا۔ مگر اس کے علاوہ بھی اس نے اسے ایک بھاری رقم ادا کی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر متوفی دوبارہ پولیس کے پاس گیا۔ مگر انہوں نے غنڈے کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ غنڈے کی پشت پناہی اس علاقے کا سیاسی لیڈر کر رہا تھا۔"

"پھر؟"

"وہاں سے مایوس ہو کر متوفی سیاسی لیڈر کے پاس گیا۔ اس نے مدد کا وعدہ کیا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ جب متوفی نے سیاسی لیڈر کے گھر کے کئی چکر لگائے۔ تو وہ کہنے لگا۔ کہ وہ غنڈے کو ناراض نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ اس کا ووٹر ہے۔ اس پر متوفی نے کہا۔ کہ ووٹ تو اس نے بھی اسے ہی دیا تھا۔ مگر لیڈر نے کہا کہ تمہارا تو صرف ایک ووٹ تھا۔ اور اس غنڈے کی وجہ سے کئی ووٹ ملے تھے۔ متوفی نے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ نیکی کرو گے تو میں اس کا چرچا کروں گا۔ اس سے تمہیں میری وساطت سے کئی ووٹ مل جائیں گے۔ مگر سیاسی لیڈر نے کہا کہ خالی اتنی ہی بات نہ تھی۔ بلکہ کچھ اور بھی تھا۔ اصل بات یوں ہے کہ میں نے پچھلے الیکشن پر بہت زیادہ روپیہ خرچ کیا تھا اور اگلے الیکشن پر بھی کروں گا۔ یہ غنڈہ مختلف طریقوں سے پیسہ بنانے میں میری مدد کرتا ہے۔ اس غنڈے کی وجہ سے میں اپنا پچھلا خسارہ بھی پورا کروں گا اور اگلی دفعہ کے لئے بھی آمدنی کروں گا۔ تم میرے لئے یہ کام نہیں کر سکتے۔"

"پھر؟"

"پھر متوفی ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے مذہبی رہنما کے پاس گیا۔ اور اسے کہا کہ وہ لوگوں سے اپیل کر کے غنڈے سے نجات دلائے۔ مگر مذہبی رہنما نے کہا کہ جب تک سب لوگ نیک نہیں ہو جاتے اور مذہب کی رسی مضبوط نہیں پکڑتے۔ اس وقت تک وہ کسی غنڈے یا سیاستدان یا پولیس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔ اگر سب لوگ بدی چھوڑ دیں۔ تو ایسی مشکلات پیدا ہی نہیں ہوں گی یہاں اگر ان تینوں میں سے کوئی کبھی اس کی مذہبی تقریر سننے آگیا تو اسے یقین ہے کہ ان کے دل پر اس کی بات کا اثر ہو گا۔ اور اللہ ضرور ان کو سہارا دے گا۔"

"پھر؟"

"پھر متوفی نے تنگ آکر عدالت سے مقدمہ واپس لے لیا اپنی بیوی کے زیورات بیچے۔ اپنی جوان سال لڑکی کی شادی ملتوی کی اور اس پیسے سے ٹھیکیدار کا بل ادا کیا۔ پھر خود بازار سے سامان خرید کر مکان بنانے لگا۔"

"پھر؟"

"پھر اس نے دیکھا کہ بازار میں سامان یا تو بلیک مارکیٹ میں ملتا ہے۔ یا ملاوٹ والا اور گندہ ملتا ہے۔ اس کے کئی دکانداروں سے جھگڑے ہوئے۔ مگر اس پچھلے واقعے کے بعد یہ عدالت میں نہیں گیا۔ اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ بلیک مارکیٹ سے سامان خریدنے کی وجہ سے اسے بنک سے قرضہ بھی لینا پڑا۔ ایک سال بعد جب بنک کے قرضے کی ادائیگی کا وقت آیا اور اس نے دیکھا کہ اس پر اتنا سود چڑھ گیا ہے۔ تو اسے پہلی دفعہ دل کا دورہ پڑا۔"

"اس کی بیوی نے گھر کی باقی چیزیں بھی فروخت کر دیں۔ کار بھی بیچ ڈالی اور قرضہ اتارا۔ اور پھر یہ سارا کنبہ اپنے اس نئے گھر میں رہنے لگا ...... مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ نئے گھر میں ان کا ہمسایہ ایک سمگلر تھا۔ اور متوفی کے بچے سکول میں اس سمگلر کے بچوں کے ساتھ پڑھتے تھے۔ جبکہ اس کی بیوی کا بھی اس کی بیوی سے ملنا جلنا ہو گیا۔"

"پھر جیسے جیسے سال گذرتے گئے متوفی کے بیٹے جوان ہوتے گئے اور اس کی بیوی بوڑھی ہوتی گئی۔ بیوی کو آرام کی ضرورت

تھی۔ اور بچوں کو نئی زندگی شروع کرنے کی۔ اس لئے ان سب کو متوفی سے گلہ ہونے لگا کہ اس نے اپنی زندگی ضائع کی ہے۔ علاقے میں ان کے ہمسائے کی عزت بھی زیادہ تھی۔ اور اس کے گھر میں روپے پیسے اور دیگر آسائش زندگی کی فراوانی بھی تھی۔ اس کے مقابلے میں متوفی کے گھر میں فراخی بھی نہیں ہے اور نہ لوگ اس کی عزت بھی نہیں کرتے۔"

"پھر؟"

"اس سے متوفی کے گھر میں اکثر چخ چخ رہنے لگی۔ اور گھر کا کوئی فرد بھی اپنی اپنی جگہ خوش نہ رہا۔"

"تب کیا ہوا؟"

"اب متوفی کی اولاد جوان ہو گئی تھی۔ ان میں سے کسی کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ تھا اور کسی کی شادی کا۔ مگر ان کے پاس اتنی فراخی نہ تھی۔ ایک دن شام کو کھانے کی میز پر بات بڑھی تو بیوی بچوں نے متوفی سے کہا کہ اس نے موجودہ وقت کی بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھوئے اس لئے وہ بیوقوف ہے۔ احمق ہے۔ اور ان کا ہمسایہ بہت عقلمند ہے۔ جس نے حالات کا ساتھ دے کر عملی طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا ...... ان باتوں کا متوفی کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اسی رات اسے پھر دل کا دورہ پڑا۔ اور وہ صبح ہونے سے پہلے مر گیا۔"

نگران فرشتے نے تھوڑا غور کیا۔ اور پھر تینوں فرشتوں کو واپس بھیج دیا۔

بعد ازاں وہ کافی دیر تک سوچتا رہا...... سوچتا رہا......

بالآخر اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا: "متوفی کی موت کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے جس خطے سے یہ فوت ہو کر آیا ہے۔ وہاں کا معاشرہ سلگنے والے عذابِ الٰہی کی گرفت میں ہے۔ جس شخص کا کوئی قصور نہیں اسے بھی کوئی سکون نہیں۔ متوفی کو دوبارہ دوزخ میں بھیجنے کا کوئی جواز نہیں ......"

نگران فرشتے نے اپنی رپورٹ اللہ میاں کی بارگاہ میں بھجوا دی۔

کرموں

صادق حسین

پانچ برس پہلے جب میر زمان پردیس گیا تو اُس نے اپنے آبائی گاؤں سے راولپنڈی کے ریلوے اسٹیشن تک پیدل سفر کیا تھا جونہی ریل گاڑی کا انجن بھک بھک کرتا آیا، اُس نے اپنا کالا ٹرنک اور دری میں لپٹا بستر، دونوں، نچلے درجے کے ڈبے کی کھڑکی میں سے دھماد ھم اندر پھینک دیئے تھے۔ "بچ او سنگی" اُس کی پاٹ دار آواز گونجی تھی اور پھر وہ اپنے پوڑے چکلے سینے اور مضبوط بازوؤں سے دوسروں کو دھکیلتا اندر جا دھمکا تھا۔ اُس کا ڈیل ڈول دیکھ کر کسی مائی کے لال نے مزاحمت کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔ راولپنڈی سے کراچی تک سفر کے دوران اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اُسے قید کر رکھا ہو۔ گاؤں میں تو وہ کبڈی کھیلتا، بھینس کو چارا ڈالتا، دودھ دوہتا، درانتی سے کھڑی فصل اور کھرپے سے گھاس کاٹتا، ہل چلاتا، بیج بوتا، شادی بیاہ پہ کھڑتالیں بجاتا، بسمی کھیلتا اور رات کے وقت نمبردار کی بیٹھک میں سیف الملوک کے اشعار سن کر جھوم جھوم جاتا۔

کراچی میں چند دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اُسے بار بردار جہازوں سے مال اُتارنے کا کام مل گیا۔ اُس نے اپنی پیٹھ پر دو دو بوریاں بیک وقت لاد کر پھیرے لگائے تو دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ دھوپ میں چمکتا اُس کا تانبے ایسا جسم سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ مزدور اُسے اُستاد میرا کہہ کر پکارتے لگے۔ شام کے وقت محنت کشوں کی محفل جمتی۔ دن بھر کی تھکن دور کرنے کے لیے کوئی تاڑی پیتا، کوئی چرس کا دم لگاتا۔ میر زمان الگ تھلگ رہتا۔ وہ تو مغرب میں پھولی شفق کی طرف دیکھتا رہتا۔ جب آفتاب سمندر کے نیلے پانی میں غوطہ لگاتا تو اُس کے منہ سے بے اختیار نکل جاتا "خدا حافظ"۔

ایک دن میر زمان، ماہی گیروں کے ساتھ ٹرالر میں بیٹھ کھلے سمندر میں چلا گیا۔ اتنی مچھلیاں ہاتھ آئیں کہ وارے نیارے ہو گئے۔ شکار کا نصف حصہ ٹرالر کے مالک نے وصول کر لیا۔ دوسرا نصف، ماہی گیروں نے منڈی میں بیچ کر رقم آپس میں بانٹ لی۔ میر زمان، شلوار کے نیفے میں نوٹ اُڑس کر بے حد خوش ہوا۔ جب کوئی موٹی رقم ملتی تو وہ اُسے جوں کا توں اپنی ماں کو بھیج دیتا۔ وہ ماں جس نے اُسے بڑی محنت سے پالا تھا۔ اٹھارے کے اٹھوارے، وہ گاؤں خط بھیجتا، جس میں یہ ضرور لکھواتا "ماسی جنتے کو میرا سلام پہنچے"۔ لفافے پر، ضلع تحصیل اور گاؤں کے نام کے بعد تحریر کروانا "ماسی بھاگ بھری کو ملے"۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ کرم جان کی خیر خیریت بھی دریافت کرے۔ کرم جان اُس کے ساتھ کی کھیلی تھی۔ وہ بھی اُس کی طرح یتیم تھی اور اکلوتی۔

گاؤں کے چھوٹے بڑے، سب کے سب میر زمان کی ماں کو ماسی بھاگ بھری اور کرم جان کی ماں کو ماسی جنتے کہہ کر پکارتے ماسی بھاگ بھری اور ماسی جنتے نے اُس وقت دوپٹا بدل کر بہناپا جوڑا تھا، جب وہ سہاگنیں تھیں۔ دونوں بڑوسنیں بھی تھیں۔ دونوں کے کچے مکان شانے سے شانہ ملا کر کھڑے تھے۔ برسات کی آمد سے پہلے وہ مل جل کر مکانوں کی لپائی پوتائی کرتیں۔ سردیوں میں بنجری

بناتیں تو ایک ساتھ۔ گرمیوں میں آم کا اچار ڈالتے وقت ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتیں۔ انہوں نے آنگن کی مشترک دیوار میں ایک موکھا بنا رکھا تھا۔ جب چاہتیں موکھے سے باتیں کر لیتیں۔ سرسوں کے ساگ کی رکابی ادھر سے اُدھر پہنچ جاتی۔ دن تہوار پر گڑ کے حلوے یا دودھ سے بنی سویوں کا ادل بدل ہو جاتا۔

میرزمان، دل میں اٹھتی خواہش دبا کر، خط میں کرم جان کے متعلق کوئی بات نہ لکھوا تا۔ وہ سوچتا کہ خط لکھنے والا دل میں کیا کہے گا۔ اُس کی ماں کے دل میں خیال آئے گا "میرزمان بے شرم ہو گیا ہے۔" وہ جانتا تھا کہ اُس کے گاؤں میں اس بات کو بُرا سمجھا جاتا تھا کہ ایک کنوارا کسی کنواری کا نام اس طرح زبان پہ لائے۔

یہ الگ بات تھی کہ ماسی بھاگ بھری اور ماسی جنتے، دن میں کئی مرتبہ میرزمان اور کرم جان کی شادی کی باتیں کرتیں۔ کرم جان مائیوں بیٹھے گی تو نائن کی چاندی ہو جائے گی۔ مہندی آئے گی۔ ڈھولک بجے گی۔ میرزمان موتیا کے پھولوں کا سہرا باندھے گا۔ ساگی سانگ بھریں گے یہ باتیں کرم جان سنتی تو مارے شرم کے بیر بہوٹی بن جاتی۔ اُسے وہ وقت یاد آ جاتا جب میرزمان نے پردیس جانے سے پہلے، رات کے وقت، دیوار کے موکھے سے باتیں کی تھیں۔ گرمیوں کے دن تھے۔ لوگ چھتوں پر سو رہے تھے۔ میرزمان نے کہا تھا "کرم جان میں پردیس جا رہا ہوں۔ صرف روپیہ اکٹھا کرنا ہے۔ میں تیرے لیے سونے کا جھومر اور تورے توے کی چوڑیاں بنوا کر لاؤں گا۔" کرم جان نے اُسے ایک تعویذ دے کر کہا تھا "اسے اپنے بازو میں باندھ لو۔ یہ تعویذ میری نانی نے میری ماں کو دیا تھا اور میری ماں نے مجھے۔"

خبردار! خبردار! گلی سے گشت کرتے دیہاتیوں کی آوازیں بلند ہوئیں تو میرزمان اور کرم جان موکھے سے ہٹ گئے۔ میرزمان کو بھی یہ سب باتیں یاد تھیں۔ اسی لیے تو جب آفتاب سمندر کے نیلے پانی میں غوطہ لگاتا، وہ زبان سے کہتا "خدا حافظ" اور دل میں کہتا "کرم جان"۔

ایک دن میرزمان، ماہی گیروں کی ٹولی سے کھسک کر ایک لانچ میں سوار ہو گیا۔ اُس نے بازو میں بندھے تعویذ پر ہاتھ رکھ کر اپنا مستقبل سمندر کی طوفانی موجوں کے حوالے کر دیا۔ اُسے لانچ میں لے جانے والے شخص نے کہا "یہ زمین خدا کی ہے۔ سمندر خدا کے ہیں۔ لوگوں نے زمین اور سمندروں کے حصے بخرے کر رکھے ہیں ہم انسان کے بنائے ہوئے قانون کو نہیں مانتے۔ ہم جہاں جانا چاہیں گے، جائیں گے۔ چنانچہ وہ شخص انسانوں کا ریوڑ وہاں لے گیا جہاں دولت زیادہ تھی اور افرادی قوت کم۔ وہاں میرزمان نے ڈھیروں روپیہ کمایا۔ آج وہ پانچ سال بعد راولپنڈی کے ریلوے اسٹیشن پر اُترا تھا۔

وہ بے دھڑک، اوّل درجے کی انتظار گاہ کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ ایک سوٹ کیس کھول کر صابن، تولیا اور کنگھی نکالی غسلخانے میں جا کر نہایا۔ بالوں میں خوشبو دار تیل لگا کر کنگھی کی۔ نیلے رنگ کا دھاری دار سوٹ پہنا۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ مونچھوں کو دو چار تاؤ دیئے۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر گاؤں پہنچا۔ اُسے پکی سڑک کے خاتمے پر ٹیکسی سے اُترنا پڑا۔ آگے کچا راستہ تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس لے کر پیدل چل پڑا۔ نیلے آسمان میں ٹھہرے ہوئے سفید سفید بادل گاؤں کی طرف دیکھ رہے تھے چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ کسان درانتیوں سے گندم کی فصل کاٹ رہے تھے۔ پکے ہوئے شربتی خوشوں کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں مچل رہی تھی۔

وہ سستانے کے لئے شیشم کے پیڑوں کی چھاؤں میں کھڑا ہو گیا۔ دونوں سوٹ کیس زمین پر رکھ دیے۔ وہاں گاؤں کے بچے لُکن مِٹی کھیل رہے تھے میرزمان کو دیکھ کر بچوں نے کھیلنا بند کر دیا۔ وہ متجسس نگاہوں سے میرزمان کی طرف دیکھنے لگے۔
اتنے میں ایک بیل گاڑی شیشم کے پیڑوں کے قریب پہنچ کر رُک گئی۔ گاڑی بان نے بائیں ہاتھ کی پشت سے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر میرزمان کی طرف غور سے دیکھا اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اوئے تو میرا ایں۔" گاڑی بان نے کہا۔

میرزمان نے آگے بڑھ کر گاڑی بان سے ہاتھ ملایا۔ "سلام چاچا جی۔"

"تو کب آیا ہے؟"

"ابھی پہنچا ہوں۔"

"بیٹھ گاڑی میں تجھے گھر پہنچا دوں۔"

"نہیں چاچا جی۔ مہربانی۔"

"اوئے تو بابو بن گیا ویں۔ بیل گاڑی میں بیٹھتے سے شرم آتی ہے۔"

تڑاخ! تڑاخ!! گاڑی بان نے بیلوں کو چابک رسید کئے۔ گاڑی دوڑتی ہوئی شہر کی طرف چلی گئی۔

میرزمان دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ سوٹ کیس اٹھا، قدم قدم چلنے لگا۔ اس کی پرچھائیں بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے رُکا تو اس کی پرچھائیں بھی رُک گئی۔

"میریا تیری خیر ہووے۔" عقب سے ایک آواز آئی۔

میرزمان نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے پاگل بابا کھڑا تھا۔

سر کے لمبے لمبے اُلجھے ہوئے بال۔ میلے کچیلے کپڑے۔ ننگے پاؤں۔ بڑھی ہوئی ڈاڑھی۔

بچے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

پاگل بابا نے کہا۔ "میریا! تو اپنے سائے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دھوپ ہو تو سایہ ہوتا ہے۔ تو پردیس سے دھوپ لے کر آیا ہے۔ اب سائے تیرے ساتھ ساتھ چلیں گے۔"

"جی بابا جی۔"

"کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھ کر سوچا کرو۔"

"کیا سوچوں بابا جی؟"

پاگل بابا ہنسنے لگا۔ اُس کے پیلے پیلے دانت اور منہ سے اُڑتے جھاگ دیکھ کر بچے بھی ہنس پڑے۔

پاگل بابا بولا۔ "میریا! اگر تو سو برس کے بعد بھی لوٹ کر آئے تو میں تجھے پہچان لوں گا۔ اِس لئے کہ میں پاگل ہوں اور میں پاگل اِس لئے ہوں کہ یہ گاؤں والے میری طرح سوچتے نہیں۔"

دفعتاً پاگل بابا شیشم کے پیڑوں کے پیچھے چلا گیا۔ اُس نے للکارکر کہا "چلے جاؤ یہاں سے۔"

بچے سہم گئے۔ میرزمان، سوٹ کیس اُٹھا، گاؤں کی طرف چل دیا۔

ایک عورت کوڑے کرکٹ کی ٹوکری، گھورے پر اُلٹا، اینڈوا سنبھال، پیچھے ہٹی تو میرزمان کو دیکھ کر بولی "جی او پُتر! تو کب آیا ہے؟"

"ماسی جی، ابھی پہونچا ہوں۔"

میرزمان گلی میں داخل ہوا تو ایک عورت مکان کی دیوار پہ گوبری پھیر رہی تھی۔ وہ ہاتھ روک کر بولی "بلے او میریا! تُو تو پکا بابو بن گیا ہے۔"

میرزمان گلی میں اجنبی چہرے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ یہ تو اُسے بعد میں معلوم ہوا کہ گاؤں کے لوگوں نے اپنے مکان شہریوں کو کرائے پر دے رکھے تھے۔ شہری زندگی تیزی سے پھیلتی، گاؤں کی گلیوں میں پہنچ چکی تھی۔

جب میرزمان نے اپنے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تو ماسی بھاگ بھری چھاج میں غلہ پھٹک رہی تھی۔

"بسم اللہ بسم اللہ"۔ ماسی بھاگ بھری نے بیٹے کی چٹ چٹ بلائیں لیں۔

بچوں کی ٹولی، میرزمان کے پیچھے پیچھے چلتی آنگن میں پہنچ گئی تھی۔

"میریا! تو صاب بن گیا ایں"۔ ماسی بھاگ بھری بولی۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔

میرزمان، دونوں سوٹ کیس دالان میں رکھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

ماسی بھاگ بھری نے آنچل کی گرہ کھول، ایک روپے کا نوٹ ایک بچے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "جا ایک روپے کے مُرنڈے لے کر بچوں میں بانٹ دے"۔ بچے شور مچاتے دوڑ کر باہر چلے گئے۔

پچھلے چند دنوں سے ماسی بھاگ بھری کے گھٹنوں میں درد ہو رہا تھا۔ آج وہ درد آناً فاناً ختم ہو گیا۔ وہ لپک کر اندر گئی اور بولی "میریا! تو بڑا نکما ہے۔ آنے کی اِطلاع بھی نہیں دی۔"

"ماں جی! میں تے تو کراچی سے تار دیا تھا۔"

"مجھے کوئی تار وار نہیں ملا۔ اچھا اب تو ہاتھ مُنہ دھولے۔ میں تیرے لیے پراٹھے پکاتی ہوں۔"

"ابھی بھوک نہیں لگی۔"

"اچھا تو پھر اِتنی دیر میں میں منتیں پوری کر لوں۔"

ماسی بھاگ بھری نے دیوار کے موگھے سے دوسری طرف جھانک کر کہا "کرم جان! میرا آ گیا ہے۔ لپک کر جاؤ اور نائن کو میرے پاس بھیج دو۔"

"اچھا ماسی جی"۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔

یہ وہی آواز تھی جو پردیس میں بھی میرزمان کے کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔ وہ انتظار کرنے لگا کہ ابھی ماسی جنتے آئے گی اور اُس کے ماتھے پر بوسہ دے، جھولیاں بھر بھر دعائیں دے گی۔ اتنے میں نائن آ گئی۔

ماسی بھاگ بھری نے نائن سے مخاطب ہو کر کہا "اندر سے پاؤ بھر گھی لے لو۔ میرا نام لے کر مودی سے ایک پاؤ سُوجی اور

ایک پاؤ شکر ہے کہ تینوں چیزیں کرم جان کو دے دو۔ اُسے کہنا حلوہ پکا کر بانٹ دے۔ ایک پاؤ سرسوں کا تیل ہے کہ سائیں کے مزار پر چراغوں میں ڈال دو۔"

جب ماسی بھاگ بھری احکامات جاری کر رہی تھی تو دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دیوار کے موکھے میں نمودار ہوئیں۔ ایک حسین لمحہ تڑپ کر ماضی کی طرف نکل گیا۔ میرزمان نے سوچا آج کرم جان کتنی خوش ہوگی۔ ایک دن کرم جان نے کہا تھا "میریا! تو میرا ماہیا ہے۔ میں محبت تجھ سے کرتی ہوں مگر حکم اپنی ماں کا مانوں گی۔"

میرزمان نے جواب دیا تھا "کرموں! تو فکر نہ کر۔ میری ماں نے سب ٹھیک کر رکھا ہے۔ لا ہاتھ، وعدہ کر۔۔۔۔"

کرم جان بات کاٹ کر بولی تھی۔ "میریا! ہٹا لے اپنا ہاتھ۔ تو بھول گیا ہے کہ میں جاٹ کی بیٹی ہوں۔"

ماسی بھاگ بھری پلٹ کر اندر جانے لگی تو دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دیوار کے موکھے سے ہٹ گئیں۔

میرزمان نے ایک سوٹ کیس کھولا تو ماسی بھاگ بھری ہکا بکا رہ گئی۔

"ماں جی! یہ تیرے لئے ہے۔" میرزمان نے نارنجی رنگ کا ریشمی جوڑا پلنگ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"موٹی عقل۔ میری عمر اور یہ کپڑے۔" ماسی بھاگ بھری پلنگ پر بیٹھتے ہوئے۔ ہنس کر بولی۔

"ماں جی! تو یہ لباس میری شادی پہ پہنے گی۔"

ماسی بھاگ بھری چپ ہوگئی۔

"اور یہ جوڑا ماسی جنتے کے لئے۔" میرزمان آسمانی رنگ کا ریشمی جوڑا، نارنجی رنگ کے جوڑے کے برابر پلنگ پر رکھتے ہوئے بولا۔

ماسی بھاگ بھری اپنی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر کچھ سوچنے لگی۔ اُس کے چہرے کی جھریاں تھرتھرانے لگیں۔

میرزمان کے دل میں خیال گزرا: شاید ماسی جنتے کا جوڑا، ماں جی کے جوڑے سے بہتر ہے۔

"ماں جی! یہ جوڑا آپ لے لیں اور وہ جوڑا ماسی جنتے کو دے دیں۔" میرزمان، سنجیدہ ہو کر بولا۔

ماسی بھاگ بھری، پلنگ پر بچھی چادر کی جھالر ہاتھ میں لے کر اُسے بیچ کی انگلی اور انگوٹھے سے مروڑنے لگی۔

"یہ سونے کا جھومر اور چھ چوڑیاں اور باقی سارے کپڑے اُس کے لئے۔" میرزمان نے آنکھیں نیچی کر کے کہا۔

ماسی بھاگ بھری پلنگ سے اُٹھ کر برآمدے کے اُس کونے میں چلی گئی جہاں مٹی کا چولھا بنا ہوا تھا۔ گھڑونجی پہ پانی سے بھرے گھڑے رکھے ہوئے تھے اور کارنس پہ مٹی کی رکابیاں، صحنک، چھنی اور چنگیر۔

ماسی بھاگ بھری پیڑھی پہ بیٹھ کر صحنک میں آٹا چھاننے لگی۔

میرزمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں جی کس بات پر خفا ہو گئی ہے۔ خاموش لمحات کی اذیت سے بچنے کے لیے وہ اُٹھ کر چارپائی کی ادوائین کسنے لگا۔

"ماں جی! تو کس بات پہ ناراض ہوگئی ہے؟" میرزمان، زور سے رسی کھینچتے ہوئے بولا۔

ماسی بھاگ بھری آٹا گوندھنے لگی۔

"ماں! تو بولتی کیوں نہیں؟"

"میر یا! تو پردیس سے لوٹ کر آیا ہے تو مجھے دو جہان کی دولت مل گئی ہے۔"

"تو پھر اس طرح چپ کیوں ہو؟"

"دیکھ میر یا! تو مرد ہے اور مرد کا کلیجا مضبوط ہوتا ہے بعض اوقات انسان سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ ہے۔" ماسی بھاگ بھری آٹے کو ٹکیاں لگاتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا ہے ماں؟" میر زمان دوسری پیڑھی لے کر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

"تیری ماسی بختے مر گئی ہے۔"

"اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔"

"مرنے سے پہلے اُس نے کرم جان کے ہاتھ پیلے کر دیئے تھے۔"

دھڑام! خوابوں کا تاج محل اڑا اڑا کر گر پڑا

"اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔" ماسی بھاگ بھری نے یہ کہہ کر آٹے کو کس دینے کے لیے چنگیر سے ڈھانک دیا۔

"مرنے سے پہلے بختے نے مجھ سے کہا تھا۔" ماسی بھاگ بھری نے مٹی کے پیالے میں پانی سے ہاتھ دھوتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "اس دنیا میں تیرے سوا کرم جان کا کوئی نہیں۔ اُس کا خیال رکھنا۔"

"ماں! ماں!! یہ سب کچھ تو نے مجھے خط میں کیوں نہیں لکھا۔ مجھے پتا چلتا تو میں اڑ کر یہاں پہنچ جاتا۔"

"میری تمنا تھی کہ کرم جان میری بہو بن کر اس گھر میں آئے۔ تقدیر کا لکھا یوں ہی ہوتا ہے۔ رخصتی کے وقت، کرم جان میرے سینے سے لگ کر زار و قطار روئی۔ اُس کے آنسوؤں نے میرا دوپٹا بھگو دیا۔ میں اُس کے آنسوؤں کا راز جانتی تھی۔"

"ماں! تو نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔"

"یہ الزام ماتا پر لگاتے ہو۔"

"ماں! میں نے زندگی کی اتنی بڑی جنگ کس لیے لڑی؟ پردیس میں مصیبتیں کس لئے اٹھائیں۔ یہ سب کچھ میں نے کرم جان کے لیے کیا۔ وہ کون ہے جس نے مجھ سے کرم جان چھین لی ہے۔ میں اُسے قتل کر دوں گا۔"

میر زمان دوڑ کر اندر سے چھوی لے آیا۔ اس کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"کوئی ہوگا تو اُسے قتل کرو گے۔" ماسی بھاگ بھری چولھے میں آگ سلگاتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب؟" میر زمان نے پوچھا۔

"وہ شخص جس سے کرم جان کی شادی ہوئی تھی، مر گیا ہے۔"

ایک انسان مر گیا۔ میر زمان کو ایک دھچکا سا لگا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ بھول گیا کہ کسی کی موت کا ذکر ہو رہا تھا۔

"میر یا! میری باتیں غور سے سن۔ کرم جان بیوہ ہو کر میکے آگئی ہے۔ اب ہم ہی تو اس کا میکا ہیں۔ بچاری میری دیکھ بھال

کرتی ہے۔کنوئیں سے پانی بھر کر لاتی ہے۔ہنڈیا پکاتی اور تنور میں روٹیاں لگاتی ہے برتن مانجتی اور کپڑے دھوتی ہے بھینس کو چارا ڈالتی، دودھ دوہتی اور دہی بلوتی ہے۔اس وقت میں کام کر رہی ہوں کیونکہ تیری موجودگی میں کرم جان کا یہاں آنا مناسب نہیں۔ جوان جہان ہے۔کسی کی زبان پکڑی نہیں جاتی۔"

میرزمان نے اندر جا کر چھوی اپنی جگہ پہ رکھ دی۔وہ، اُسی چُست لباس میں پلنگ پہ لیٹ گیا۔

ماسی بھاگ بھری نے اندر جا کر آہستہ سے کہا "کرم جان تیرا رشتہ ٹھیک کر رہی ہے۔کہتی ہے کہ تیرے لیے ایسی لڑکی چُن کر لائے گی کہ گاؤں والے دنگ رہ جائیں گے۔"

میرزمان نے مُنہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔اُس کی نگاہ، پائنتی کی طرف، کونے میں، اینٹوں پہ رکھی اُس گھڑولی پہ پڑی، جسے کاغذوں کے ملیدہ سے تیار کر کے اُس پہ نقش و نگار بنا دیئے گئے تھے۔

"ماں جی! یہ گھڑولی کس نے بنائی ہے؟"

"کرم جان نے۔"

"اِن دستی پنکھوں پہ رنگدار کپڑے کی گوٹ کس نے لگائی ہے؟"

"کرم جان نے۔"

"اِس پلنگ پوش پہ کس نے گُل بوٹے کاڑھے ہیں؟"

"کرم جان نے۔"

"ماں جی! تو پھر یہ سارا گھر کرم جان کا نہیں؟"

"ہے اور نہیں بھی۔"

میرزمان کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"میرپا! تو کیوں ہنس رہا ہے؟"

"ماں جی! تو نے کہا ہے کہ میں مرد ہوں اور مرد کا کلیجا مضبوط ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ماں جی! تو پراٹھے کیوں نہیں پکاتی۔مجھے بھوک لگ رہی ہے۔میں سیر ہو کر کھاؤں گا اور خوب نیند کروں گا۔"

کھانا کھا کر سچ مچ وہ گھوڑے بیچ کر سو گیا۔اُس کے خراٹوں کی آوازیں سن کر ماسی بھاگ بھری نے دیوار کے موکھے کے قریب جا کر کہا "کرم جان! برتن دھو جا۔میرا سو گیا ہے۔"

کرم جان نکل مارے اندر آئی، پیڑھی پہ بیٹھ، آستینیں چڑھا، برتن مانجنے لگی۔

ماسی بھاگ بھری دالان کے دروازے کے سامنے پیڑھی پہ بیٹھ گئی۔

کرم جان کی گوری گوری کلائیاں خالی تھیں۔اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں نے دالان کے دروازے کی طرف دیکھنے

سے گر پڑا گیا۔ اُس کی ناک میں لونگ تھا نہ کانوں میں بُندے۔ اُس نے سیدھی مانگ نکال رکھی تھی۔

برآمدے کے کونے میں چکی کے پاٹ پر بیٹھا چڑیا کا بچہ اُڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ چڑیا کی چوں چوں ممتا کی بے چینی کا برملا اظہار کر رہی تھی۔ آنگن کے ایک کونے میں شہتوت کے درخت کے نیچے کھرل میں بچا کھچا چارا پڑا تھا۔ کرم جان فجر کی نماز پڑھ کر کھرلی صاف کرتی۔ جب وہ چاٹی کے سامنے پیڑھی پہ بیٹھ کر، مدھانی کی ڈوریاں، ہاتھوں سے دائیں بائیں کھینچتی تو اُس کا تو انا جثہ فضا میں ہل چل مچا دیتا۔ اُس کے دل کے سمندر میں جوار بھاٹا آتا۔ وہ دُکھوں سے اپنا اندر کھنگال کر ٹھنڈی سانس لیتی۔

"اب جا، خدا تیرا بھلا کرے۔" ماسی بھاگ بھری آنگن میں آ کر بولی۔

کرم جان ہاتھ دھو کر اُٹھی اور اپنے گھر چلی گئی۔

دوسرے دن، ماسی بھاگ بھری، دن کا کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کر رہی تھی کہ کرم جان نے آ کر اُسے جگا دیا۔

ماسی بھاگ بھری نے کہا۔ "تو اِس وقت یہاں کیوں آئی ہے؟ بیٹی مجھے تیری عزّت کا خیال ہے۔ لوگ رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔"

ماسی بھاگ بھری نے دوسرے پلنگ پر نگاہ ڈالی تو سٹپٹا گئی۔ پلنگ خالی پڑا تھا۔

"میرا کہاں گیا۔ وہ تو اِس پلنگ پہ سو رہا تھا۔" ماسی بھاگ بھری نے اپنے آپ سے بات کی۔

"وہ شہر گیا ہے۔" کرم جان نے یہ کہہ کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

"تجھے یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"وہ مجھے بتا کر گیا ہے۔"

"تو نے اُس سے بات کی ہے؟"

"نہیں۔ اُس نے مجھ سے بات کی ہے۔"

"کہاں؟"

"ہمارے گھر۔"

"آنے دو اُسے۔ بے غیرت۔ کمینہ۔"

کرم جان نے گُتھل کے اندر سے طلائی جھومر اور سونے کی چھ چوڑیاں نکال کر پلنگ پر رکھ دیں۔"

ماسی بھاگ بھری غصے سے تھرّا اُٹھی۔

"اُس نے دیوار کے موکھے سے مجھے بلایا۔ میں نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ چھت سے کود کر ہمارے آنگن میں آ گیا۔ مجھے یہ گہنے دے کر کہنے لگا۔" میں شہر جا رہا ہوں۔ چھوہارے اور شکر پارے لینے۔ آج ہمارا نکاح . . . . ." کرم جان بات کرتے کرتے رُک گئی۔

"بکواس بند کر دو۔ اُس کی بوٹیاں نوچ نہ لوں تو کہنا۔ اِس گھر میں میری اجازت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ تو ایک بیوہ ہے۔ میرا بیٹا کنوارا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ میں یہ کبھی نہیں ہونے دوں گی۔" ماسی بھاگ بھری نہ ہر میں بجھے تیر چھوڑتی گئی۔ ہر تیر کرم جان کے سینے میں لگا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کہہ رہی تھیں "ماسی بھاگ بھری! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟" اُس نے ماسی بھاگ بھری کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی زخمی ہرنی شکاری کی طرف دیکھے۔ اُس نے باہر جانے کے لئے قدم اُٹھایا۔

"کرم جان!" ماسی بھاگ بھری کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ کرم جان کے قدم وہیں کے وہیں رُک گئے۔

"کرم جان! اِس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے؟

اگر تو راضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

کرم جان نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

"تو راضی ہے؟" ماسی بھاگ بھری نے اپنا سوال دوہرایا کرم جان نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کچھ بول تو سہی۔"

کرم جان کے لب نہ ہلے۔

ماسی بھاگ بھری نے اپنے دونوں بازو پھیلا کر کہا "اگر تو راضی ہے تو پھر آ اور میرے سینے سے لگ جا۔"

کرم جان اپنے بازو پھیلا کر ماسی بھاگ بھری کے سینے سے چمٹ گئی۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔ اُس کے آنسوؤں نے ماسی بھاگ بھری کا دوپٹا بھگو دیا۔ رُخصتی کے دن بھی وہ اِسی طرح روئی تھی مگر اُس رونے میں اور اِس رونے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

خیری مہری

آغا بابر

اُس کی ٹانگ میں درد کی ٹیس اٹھی۔ دو مریض اُس کے قریب آ بیٹھے اور ہمدردی سے بولے "رات آپ کو پیتھیڈین کا ٹیکہ لگا کر سلا دیا گیا تھا۔ کیونکہ آپ کو سخت درد ہو رہا تھا آپ کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ کیا آپ خود کار چلا رہے تھے؟"

اس نے اپنی پنڈلی پر بندھی پٹی کی طرف دیکھ کر کہا "مجھے معلوم ہے۔ ایکسرے کے بعد مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ پھر مجھے ٹیکہ لگا کر سلا دیا گیا۔ میں نے رات بھر اپنی ٹانگ کو اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیا۔"

"اچھا کیا۔"

"آپ کو کیا شکایت ہے۔" عثمان نے پوچھا۔

"میری ناک سے خون بہتا ہے تو رکتا نہیں۔"

دوسرا بولا "میرے مثانے میں پتھری ہے۔"

تیسرا بولا "میرا گردہ کام نہیں کرتا۔"

عثمان نے دیکھا اُس کا بیٹا فری فرش پر گدا بچھائے کمبل لپیٹے سویا پڑا تھا۔ عثمان نے سوچا اگر وہ کار کے حادثہ میں ہلاک ہو جاتا تو اکلوتے بیٹے فری کا کیا ہوتا۔ وہ گھر کا بوجھ کیسے اٹھاتا کچھ کرتا کراتا بھی نہیں اور اُس کے وہ دوست جن کی صحبت میں وہ صبح سے شام کر دیتا ہے اُس کے لئے کیا کر سکتے تھے۔ کیا ایسے بیٹے کو سبق دینے کا ایک طریقہ یہی ہے کہ باپ جان سے گزر جائے۔ مگر یہ تو بہت مہنگا نسخہ ہے۔

"فری۔ دن چڑھ آیا ہے۔ میں شیو کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے پانی کا مگ دو۔ صابن دو۔"

فری آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔

"میرا تولیہ نیچے گر گیا ہے۔ میں اٹھ نہیں سکتا۔"

مریض دیکھتے رہ گئے۔ عثمان نے برش سے صابن لگایا یہ جھاگ اڑائے اور سامنے آئینہ رکھے بغیر "منہ زبانی" چھت کی طرف منہ اٹھا کر آناً فاناً شیو بنا ڈالی۔

گورا چٹا اکہرے بدن کا آدمی ہوتا سوتا ساٹھ کے پیٹے میں تو ہوگا۔ حادثہ سے اترا ہوا چہرہ اڑا اڑا رنگ ماتھے کی ابھری ہوئیں رگیں مگر بھرتی بدن میں ایسے جیسے بلندیوں سے گڈی کٹ کر نیچے گرے اور گڈی والا کمال درجہ کی پھرتی سے اپنی کٹی ڈور یہ جلدی جلدی اکٹھا کرتا چلا جائے۔

کمرے میں آئے ہوئے ناشتے کے خالی ٹرے ابھی ہسپتال کا ملازم لے کر گیا ہی تھا کہ ڈاکٹر کا راؤنڈ شروع ہو گیا۔

"کار ایکسی ڈنٹ؟"

"جی۔"

"درد ہوتا ہے؟"

"اتنا نہیں۔"

"شام کو ایک اور ایکس رے۔ مشین یہاں لائی جائے گی۔"

حسین آنکھوں والی نرس نے کاپی میں کچھ نوٹ کر لیا۔ ڈاکٹر دوسرے بیڈ کی طرف گھوم گیا۔ وہ زخمی ٹانگ کو بڑے لاڈ سے ہلاتے بغیر تکیہ پر رکھے دن بھر کبھی پڑھتا کبھی اونگھتا رہا۔

شام کو اس کا بیڈ پہیوں پر پھسلتا کاری ڈور میں آیا جہاں ایکس رے کی مشین اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب اُس کی مضروب ٹانگ کو اٹھا کر مشین کے نیچے رکھا گیا تو اُس کی گردن کی نسیں اکڑ گئیں۔ درد کے مارے اُس کی چیخ نکل گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس کے لواحقین نے اُس کی طرف رحم اور ہمدردی سے دیکھا۔ بھلا کوئی کسی کا درد بانٹ سکتا ہے اُس نے جھٹ اپنا سارا درد گھونٹ گھونٹ کر کے اپنے حلق میں انڈیل لیا اور چہرے پر کرب کے آثار قطعاً پیدا نہ ہونے دیئے۔

رات کو اُس نے فری سے کہا: "میرا مثانہ پیشاب سے پھٹا جا رہا ہے۔ اٹھوں تو کیونکر؟"

"جمعدار سے کہہ کر بوتل منگاتا ہوں۔" فری نے کہا۔

"مگر مریضوں کی موجودگی میں میں نہیں کر سکوں گا۔"

"آپ کوشش تو کریں۔"

"ہو ہی نہیں سکتا، میں جانتا ہوں۔"

"تو پھر کیا ہو گا۔ کچھ تو کرنا پڑے گا۔"

جمعدار ایک سکرین اٹھا لایا جسے اُس نے بیڈ کے ساتھ لگا کر پردہ کر دیا اور خود منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ عثمان کمبل کے نیچے بوتل لے کر بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔

"نہیں آ رہا۔"

جمعدار بولا: "رات کو جب مریض سو جائیں گے۔ اُس وقت آ جائے گا۔ میری ڈیوٹی رات کی ہے۔ جب مریض سو جائیں تو کوشش کریں۔ میں ایک بجے کے قریب بوتل لاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

دو ہیٹروں سے کمرہ تپ گیا تھا۔ کمبل میں گرمی لگ رہی تھی۔ تینوں بستروں پر مریض بیہوش سوئے پڑے تھے۔ فری بیدار

کے ساتھ فرش پر گدے پر سو رہا تھا۔ جمعدار عثمانی کی کمر پر ہاتھ رکھے اپنا منہ موڑے کھڑا تھا۔

عثمان علی بولا "نہیں آ رہا۔"

جمعدار نے مایوسی سے کہا "پھر کوشش کریں۔"

عثمان علی نے سینماؤں کے وقفوں کا تصور کیا جس میں قوم شانہ بہ شانہ کھڑی موت رہی ہے۔ آخری قطرے کو مٹی کے ڈھیلے میں جذب کرنے کی ضد میں اڑا ہوا آئیڈیل مسلمان شلوار میں ہاتھ ڈالے جادہ پیما ہے۔ پھر اسے تصور میں بدرو پہ سٹرونگ کیریکٹر ازار بند کھولے قطار میں بیٹھے نظر آئے۔ عثمان نے اپنے آپ سے کہا اے ویک کیریکٹر مسلمان تو کہاں کا پردہ نشین ہے۔ اے حیادار ہوش کر تو سو پردوں میں ایک قطرے کا بھی گنہگار نہیں ہو رہا۔

وہ مجبور ہو کر عاجزی سے بولا "نہیں نکل رہا۔"

جمعدار نے اس کی کمر پر سے ہاتھ ہٹا کر کہا "میں بندوبست کرتا ہوں۔"

"اس نے واش بیسن کی ٹونٹی اتنی سی کھول دی کہ اس میں سے شرشر کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس آواز سے بچہ ضرور متاثر ہوتا ہے مگر عثمان پہ یہ صوتی اثر بھی بیکار گیا۔ اس نے کمبل میں سے خالی بوتل نکال کر جمعدار کے ہاتھ میں دے دی۔

جمعدار بولا "اس طرح اگر پیشاب نہ آئے تو پھر ڈاکٹر ٹیوب لگایا کرتے ہیں جس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

اگلے دن عثمان نے کہا "ڈاکٹر صاحب آج تیسرا دن ہے۔ اٹھ میں سکتا نہیں۔ کیا کروں بوتل میں پیشاب آتا نہیں۔

"اور تو کوئی طریقہ نہیں۔" ڈاکٹر یہ گیا وہ گیا۔

وہ اپنے گرد سکرین ڈلوا کر سارا دن تین مریضوں کے کمرے سے باہر نکل جانے کا انتظار کرنے لگا۔ جونہی موقع ملا اس نے ہاتھ بڑھا کر چارپائی کے نیچے سے بوتل اٹھائی اور کمبل کے بیچ چھپالی۔ اب تو یہاں کوئی پبلک نہیں۔ اگر پبلک آگئی تو۔ نہیں آتی۔ تمہاری طرف تھوڑا دیکھے گی۔ سکرین کی اوٹ ہے۔ مریض آخر مریض ہوتا ہے۔ اجازت جو نہیں اٹھنے کی۔ ذہنی ہوگا۔ میں نے کہا اب تو یونہی ہوگا۔ کرنا پڑے گا ——— آتا ہے یہ نہیں آتا۔

آج تیسرا دن ہے۔ مثانہ پھٹ رہا ہے۔ بارش کا پہلا قطرہ۔ ہاں بارش کا پہلا قطرہ۔ محسوس ہوا کہ بوتل سیراب ہو رہی ہے۔ آخر یہ ہو چکی۔ اب کوئی اندر آ جائے تو بھی نہیں رکوں گا۔ بوتل اگر اوور فلو کر جائے۔ بستر بھر بھی جائے۔ پروا نہیں۔ آفرین ہے بوتل بنانے والے پر کہ اتنا بول کھپ گیا۔ اس نے ہلکا ہو کر اطمینان کا سانس لیا تھا کہ ہسپتال کے دو ملازم اس کا بیڈ دوسرے کمرے میں لے جانے کو آن پہنچے۔

"آپ کو الگ کمرہ مل رہا ہے۔"

بیڈ غلام گردش میں اپنے پہیوں پر پھسلتا ہوا بارہ نمبر کمرے میں آ گیا۔

یہ کمرہ نسبتاً عمدہ اور صاف ستھرا تھا۔ اس میں ایک اور بیڈ پہ نوکیلی مونچھوں والا نوجوان لیٹا ہوا تھا جس کے پاس چند ملاقاتی بیٹھے ہوئے تھے۔

عثمان علی نے پوچھا: "آپ کو کیا تکلیف ہے"۔

"جیپ ایکسیڈنٹ میں ٹانگ فریکچر ہو گئی"۔

"تو پھر ہم دونوں ایک ہی کشتی میں ہوئے۔ میری بھی ٹانگ کی ہڈی فریکچر ہو گئی ہے۔ آپ کو کتنے دن ہو گئے؟"

"پلستر لگے تین ہفتے ہو چکے ہیں"۔

اتنے میں نرس کتابیں، گلدان، گلاس، چائے کی پیالی، شیو کا سامان اور پھلوں کے لفافے آئی جو عثمان نے اُس سے ایک ایک کر کے لئے۔ کچھ بائیں طرف بیڈ سائڈ ٹیبل میں کچھ دائیں طرف ڈریسنگ ٹیبل کے خانوں میں رکھ دیئے۔ فری کا گدا اور کمبل دیوار گیر الماری میں رکھوا دیا۔ نرس نے پھولوں والا گلدان ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا تو آئینہ میں اُسے اپنا آپ نظر آیا۔ اُس نے ہر بار اپنا سراپا دیکھ دیکھ کر سمپتھی کارڈ بھی وہیں سجا دیئے۔

چیزیں رکھ لینے کے بعد عثمان علی نے اپنے حادثہ کی بات شروع کی۔ نوجوان نے اپنا واقعہ بیان کر کے پوچھا: "کیا آپ کے پاس رات کو کوئی اپنا آدمی ہوتا ہے؟"

"میرا بیٹا میرے پاس سوتا ہے"۔

نوجوان بڑی اپنائیت سے بولا: "کیا ضرورت ہے۔ میرا ملازم میرے پاس ہوتا ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی"۔

"بہت بہت شکریہ۔ آپ اپنا تعارف تو کرائیے"۔

"میرا نام محسن ہے۔ بینک میں ملازم ہوں۔ والد زمینداری کرتے ہیں۔ گاؤں سے میرے لئے انہوں نے ایک ملازم بھیج رکھا ہے جو اِس وقت چائے لینے گیا ہے۔ ہسپتال میں جو چائے ملتی ہے پینے کے قابل نہیں ہوتی۔ اِس وقت فریدا الماری میں سے چائے کی پتی لے جاتا ہے اور باورچی خانہ سے چائے بنوا لاتا ہے"۔

اتنے میں فریدا چائے کا ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ رنگدار ملیشیا کی شلوار قمیص۔ سر پر اونی ٹوپی مگر پھر بھی چہرے سے پینڈو معلوم ہوتا تھا۔

محسن نے عثمان علی کی طرف اشارہ کر کے کہا: "ایک پیالی آپ بھی پئیں گے"۔

فریدا چائے کی پیالی میں چمچہ گھوٹنے کی طرح پھیر رہا تھا جیسے پیالی میں شکر نہیں پتھر کی کنکریاں ہیں جو گھلنے کا نام نہیں لیتیں۔ اُس نے چائے کی پیالی محسن کے سامنے رکھی پھر ٹرے کو اُٹھا کر عثمان علی کی طرف آیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے خانے میں سے پیالی نکالنے کے لئے عثمان علی پلنگ سے نیچے کو بہت ہی جھکا تو محسن نے کہا: "فریدے تو نکال دے پیالی"۔

عثمان بولا: "نہیں نہیں میں خود نکالوں گا"۔

یہ کہتے ہوئے وہ پیالی نکال بھی چکا۔ جب فریدا چائے دانی سے چائے ڈالنے لگا تو عثمان چائے دانی اُس کے ہاتھ سے لے کر بولا: "نہیں نہیں میں خود ڈالوں گا"۔

فریدے کو کچھ اچھا نہ لگا۔ پیالی خود نکالتا ہے۔ چائے خود ڈالتا ہے، یہ کیسا مریض ہے پوچھنے لگا: "آپ کو درد نہیں ہوتا"۔

"میں نے مضروب ٹانگ کو تکیہ پر اس طرح رکھ چھوڑا ہے کہ خود ہلتا ہوں مگر حرکت کی کوئی جنبش اُس تک نہیں پہنچنے دیتا۔"

اب چائے پینے کے بعد محسن نے خالی پیالی فریدے کو دی جس نے دھو کر اُسے الماری میں رکھ دیا۔ وہ انتظار کرنے لگا کہ اب عثمان علی بھی پیالی خالی کر کے اُسے دے جسے وہ صاف کر کے رکھ دے گا۔ مگر عثمان علی نے پھر پلنگ سے نیچے جھک کر اپنے ہاتھ کو لمبا کیا اور میز کا خانہ کھولا جہاں پانی سے بھرا مگ رکھا تھا۔ پھر پلنگ کے نیچے سے چلمچی کھینچی۔ پیالی کو تھوڑے سے پانی سے دھو کر میز کے خانہ میں رکھ دیا۔ چلمچی پھر پلنگ کے نیچے دھکیل دی اور اپنی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا۔ یہ عمل محسن اور فریدے نے دیکھا۔ دونوں کچھ بدمزہ سے ہو گئے۔

محسن بولا "فریدے سگرٹ پلواؤ۔ سگرٹ پئیں گے عثمان صاحب؟"

"میں سگرٹ نہیں پیتا۔ شکریہ۔"

فریدے نے الماری کھول کر سگرٹ کا پیکٹ نکالا۔ اس میں سے ایک سگرٹ لیا اور محسن کے ہونٹوں میں اڑس دیا۔ پھر دیا سلائی جلائی۔ محسن لوہے کے بنے ہوتے اونچے سہارے والے پلنگ پر لیٹے لیٹے دھواں اڑانے لگا۔

اب یہ عمل دیکھ کر عثمان علی بدمزہ ہو گیا۔

جب لوگوں کے سیڑھیاں چڑھنے کی آوازیں آنے لگیں تو محسن نے کہا "بھئی ملاقاتیوں کا وقت ہو گیا ہے اس سے پہلے کہ کوئی آ جائے مجھے ذرا غسل خانہ سے یورین بوٹل لا دو۔"

عثمان علی کتاب پڑھتا پڑھتا دیکھتا رہا۔ محسن نے بوتل کمبل کے نیچے رکھ لی۔ فارغ ہو کر فریدے کو دے دی۔ اُس نے غسل خانہ میں جا کر بوتل کو کھنگال کر رکھ دیا۔ عثمان علی نے محسن کی اِس بے جھجک پن سے متاثر ہو کر دل میں کہا کوئی بات نہیں ہم بھی اس جھجک پر قابو پا چکے ہیں،

دروازہ کھلا اور خاوند بیوی کا ایک جوڑا اندر داخل ہوا۔ انہوں نے پھلوں کا لفافہ فریدے کو اس اپنائیت سے دیا جیسے وہ محسن کے رشتہ دار ہوں اور کسی دوسرے شہر سے آئے ہوں پھر محسن انہیں بتاتا رہا کس طرح وہ شکار کو نکلے کس طرح جیپ اُلٹ گئی۔ کس طرح اُس کی دونوں ٹانگیں نیچے آ گئیں۔ پھر اُس نے اپریشن کا ذکر کیا پھر ٹانگ دکھائی جس پر پلستر بندھا تھا۔ پھر دوسری ٹانگ دکھائی جس پر مندمل ہو جانے والے زخموں کے نشان اور کھرنڈ سے تھے اُس کو ہسپتال میں آئے اٹھائیں دن ہو چکے تھے۔

مرد نے عثمان کی طرف دیکھ کر پوچھا "آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

"میری بھی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔"

"کیسے؟"

"کار کے حادثہ میں۔"

"اپریشن ہو چکا؟"

"جی نہیں۔ مجھے آئے ابھی تین دن ہوئے ہیں۔ شاید دو ایک دن میں ہو۔"

باہر چلنے والی سرد ہواؤں سے ہسپتال کے کمرے قلعہ کے بند دمدموں کی طرح محفوظ تھے۔ خواب آور گولیاں کھلا کر جب مریض سلا دیئے جاتے تو نرسیں گرم ہیٹر کے گرد بیٹھ کر چائے کے ساتھ ایک ایک سموسہ کھاتیں۔

رات ڈوبنے لگتی اور خاموشی مریض کو دبوچ لیتی۔ رات کو کبھی ٹرک کی آواز پہ آنکھ کھلتی۔ جیسے وہ کسی دلدل یا برف میں پھنس گیا ہو اور باہر نکلنے کے لئے جحت کر رہا ہو پھر زور سے گیس دی جاتی۔ ٹرک نکلتا جس کی آواز فاصلے نگل لیتے اور مریض پھر سے غنودگی میں ڈوب جاتا۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ کوری ڈور میں ملاقاتیوں کے آنے جانے کی آوازیں بڑھتی چلی گئیں عثمان نے کتاب کو تکان اور اکتاہٹ کے ساتھ اپنے سینے پر رکھ لیا اور دروازے کی جھری کی طرف دیکھنے لگا جس میں سے باہر چلتے پھرتے لوگ اُسے اچھے معلوم ہونے لگے۔ اپنی بیوی کی شکل دیکھ کر اُسے خوشی ہوئی۔ اس نے باتیں کرتے کرتے کہا "باہر چلتے پھرتے لوگ کتنے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ جامد ہو جانے پہ معلوم ہوتا ہے کہ حرکت کیا چیز ہے۔"

بیوی بولی "آپ کل ہی اچھے ہو جائیں گے۔"

"کل؟" عثمان علی ساتھی مریض کی طرف اشارہ کر کے بولا "اسے ایک مہینہ ہو گیا ہے ہسپتال میں۔"

اب کمروں میں تھوان آنے لگے۔

محسن نے فریدے سے پوچھا "آج کیا آیا ہے؟"

عثمان نے اپنے کھانے کی طرف دیکھ کر کہا "تین آلو۔ مرغی کا ایک ٹکڑا۔ ساگو دانہ اور حسب معمول دو ٹوسٹ۔"

چھری کانٹے کی کٹ کٹ ہو رہی تھی کہ نرس نے آ کر عثمان سے کہا "کل صبح آٹھ بجے آپ کا آپریشن ہے۔ کھانا کم کھائیے گا رات کو دوسری نرس آ کر آپ کو دوا دے گی۔"

عثمان علی نے اپنی بیوی سے کہا "فری کو صبح آٹھ بجے سے پہلے بھجوا دینا۔ دیر نہ ہو۔"

بھنگی جب چھ بجے اینما دے کر چلا گیا تو عثمان منہ پہ چادر لئے لیٹا رہا۔ پھر سائڈ ٹیبل کا خانہ کھول کر شیو کا سامان نکالا۔ فرش پر رکھے مگ میں سے پانی کی کٹوری سی بھری۔ ہاتھ پھیلا کر پلنگ کے فریم پہ سے تولیہ اٹھایا۔ چھوٹا شیشہ سامنے رکھ کر شیو بنا ڈالی محسن اور فریدا سوئے ہوئے تھے۔ عثمان علی نے پھر سامان دھو کر اپنی اپنی جگہ رکھ دیا۔ دراز میں سے ریشمی سکارف گردن کے گرد باندھا۔ قمیص کے کالر کو ٹھیک کیا۔ جب محسن آنکھیں ملتا ہوا اٹھا تو عثمان تیار ہو چکا تھا۔ اُس نے فریدے سے صرف پانی کا مگ بھروا کر آئندہ استعمال کے لئے اپنے سائڈ ٹیبل کے نچلے خانہ میں رکھ لیا۔ اتنے میں فری آ گیا۔ فریدا سیفٹی ریزر میں محسن کے لئے نیا بلیڈ لگا رہا تھا کہ ہسپتال کے دو آدمی عثمان کو سٹریچر پر ڈال کر لے گئے۔

آپریشن تھیٹر سے باہر سینئر سسٹر نے کہا "اگر آپ کے منہ میں کوئی مصنوعی دانت ہو تو جمع کرا دیجئے۔ آپ آپریشن تھیٹر میں مصنوعی دانت نہیں لے جا سکتے۔"

عثمان نے مسکرا کر کہا "ابھی تک تو خیریت ہے۔ منہ میں کوئی مصنوعی دانت نہیں ہے۔"

سسٹر بولی: "آپ گھڑی اندر نہیں لے جا سکتے۔"

عثمان نے کلائی پر سے گھڑی اتار کر فری کو دے دی۔

سسٹر نے کہا: "ریشمی سکارف کی آپریشن تھیٹر میں کیا ضرورت ہے؟"

عثمان نے سسٹر کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر کہا: "سسٹر جب عاشق مقتل میں جاتا ہے تو بن سنور کر جاتا ہے۔"

سسٹر شرما کر مسکرا دی۔ عثمان نے اپنا ریشمی سکارف بھی گردن پر سے کھول کر فری کے ہاتھ میں دے دیا۔

آپریشن تھیٹر کے سلائیڈنگ ڈور نے کھل کر سٹریچر کو اس طرح دبوچ لیا جس طرح مگرمچھ منہ کھول کر اپنے شکار کو دبوچ لیتا ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد عثمان کمرے میں لایا گیا۔ وہ زرد اور بیہوش تھا۔ ٹانگ پر پلستر بندھا تھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو اپنوں کی کچھ آوازیں اُسے سنائی دیں۔

اُس نے پوچھا: "کتنے بجے ہیں؟"

فری بولا: "پون بجا ہے۔"

اس کی بیوی نے کہا: "چائے کی ایک پیالی دوں آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

"اَنس تھیسیا سے بھوک مر گئی ہے۔ جی نہیں چاہتا۔"

اتنے میں وارڈ ڈاکٹر نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اُس نے عثمان کی نبض دیکھی حال پوچھا اور بولا: "مریض کو اب آرام کی ضرورت ہے۔ آپ اب جا سکتے ہیں۔"

آہستہ آہستہ اَنس تھیسیا کا اثر زائل ہو گیا۔ وہ اپنے کمانی دار پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی پلستر سے بندھی ٹانگ کو ایک تکیہ پر رکھ دیا گیا تھا۔

محسن نے کہا: "عثمان صاحب فرید آپ کو مالٹے کا رس نکال کر دے۔"

"جی نہیں۔ میرے پاس مالٹے ہیں۔"

عثمان نے جھک کر اپنا سائیڈ ٹیبل کھولا وہ مالٹے نکالے ایک پلیٹ ایک چھری۔ پھر پلنگ کی ریلنگ پر لٹکا ہوا تولیہ جب بازیگروں کی طرح پیچھے کو ہاتھ مار کر اٹھایا تو محسن اور فرید حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ کیا یہ آدمی سچ مچ آپریشن کرا کے آیا ہے۔

اُس نے تولیہ بچھا کر اُس پر پلیٹ رکھی۔ مالٹے چھیل چھیل کر رکھتا جاتا اور کھاتا جاتا۔ پھر دو ایک کیلے کھا کر بولا: "پیٹ میں کچھ گیا ہے تو آنکھیں کھلی ہیں۔"

محسن بولا: "آپ نے آپریشن کرایا ہے اس طرح ہلنے سے آپ کی ٹانگ کو ڈھلک پڑے گی۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ میں ہائے ہائے کروں۔ صبح جب مجھے آپریشن تھیٹر لے کر گئے تو بڑا لطیفہ ہوا۔ سینئر سسٹر مجھ سے کہنے لگی منہ میں مصنوعی دانت ہوں تو جمع کرا دیجئے۔ تھیٹر میں لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے کہا ابھی تک تو مصنوعی دانت کی

نوبت نہیں آئی بولی کلائی پر سے گھڑی اتار دیجئے۔" میں نے کہا یہ لیجئے۔ بولی ریشمی سکارف باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے کہا سسٹر تمھیں شاید معلوم نہیں کہ عاشق جب مقتل میں جاتا ہے تو سج کر جاتا ہے۔ وہ کچھ شرمائی کچھ مسکرائی اس کا بلش کرنا مجھے یاد رہے گا۔"

محسن مسکرا کر بولا "یہ سسٹر حباس ہوگی کٹے ہوئے بال موٹی موٹی آنکھیں۔"

"کچھ ایسی ہی چیز تھی۔"

"بہت فبتی ہے۔ اچھا کہا آپ نے۔"

یہ سنکر فریدے کے چہرے پہ رونق آگئی۔ وہ محسن کے کندھے دبا رہا تھا۔ بولا "آپ کے کندھے دبا دوں؟"

عثمان نے جواب دیا "نہیں فریدے مہربانی۔"

"آپ کا آپریشن ہوا ہے جی۔ مجھے کوئی کام بتائیں۔"

"اچھا پیشاب والی بوتل اٹھا لاؤ۔ اُسے صاف کر کے میرے پلنگ کے نیچے رکھ دیا کرو تاکہ تھیں بار بار کہنا نہ پڑے۔ وہاں سے میں خود اٹھا لیا کروں۔"

فریدا ایک ہاتھ میں بوتل دوسرے ہاتھ میں پان کی گلوری جتنا ٹائلٹ پیپر کا ٹکڑا لے آیا۔ عثمان نے بوتل لے لی اور کہا۔ "یہ کاغذ مجھے نہیں چاہیئے۔"

محسن بولا "آخری قطرے سے پاجامہ خراب ہو جاتا ہے۔"

عثمان نے جواب دیا "آخری قطرہ کیا؟ ہم نے تو ساری عمر پتلون پہنی اور کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ جب بٹن بند کرتے وقت قطرہ جا کر ٹخنے پہ گرتا ہے تو لطف آجاتا ہے۔ کیا آپ مجھ سے متفق نہیں؟"

یہ سن کر محسن اور فریدا دونوں ہنس دیئے۔

کچھ دیر بعد عثمان نے منہ پہ چادر کھینچ لی اور بولا "اب ذرا سو جانا چاہیئے۔"

کچھ رات کا جاگا کچھ آپریشن کی تھکن کچھ اَنس تھیسیا کا رد عمل عثمان ایک دم سے خراٹے لینے لگا۔ اس وقت آنکھ کھلی جب محسن نے آواز دے کر کہا "اُٹھئے عثمان صاحب چائے آگئی۔"

"کیا بہت سویا ہوں؟"

"بہت تو نہیں مگر خوب گہری نیند سوئے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ لا بھئی فریدے چائے کی پیالی۔ کل سے ہم بھی چائے کا ایک پیکٹ منگاتے ہیں۔"

چائے پیتے پیتے محسن نے کمر پہ کھجلا کر کہا "کسی نے بیک اٹنڈ نہیں کی۔ جاؤ کسی کو بلا کے لاؤ۔"

فریدے کے پیچھے پیچھے مسکراتی ہوئی نرس نے آکر محسن سے پوچھا "تین دن سے کسی نے back attend نہیں کی؟"

پھر میز پر سے پاؤڈر کا ڈبا اٹھا کر محسن کی کمر پہ چھڑک کر ملنے لگی۔ عثمان کی طرف آکر بولی "آپ کا آپریشن ہو گیا؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کی کمر بھی اٹنڈ کر دوں۔"

"کر دیجئے۔"

عثمان نے جو کمانی دار پلنگ کی کمانی کو اونچا کرکے بیٹھا ہوا تھا، سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور نرس پاؤڈر سے کمر ملنے لگی۔ عثمان سوچنے لگا کل کو ایک ڈبا پاؤڈر اور ایک پیکٹ چائے کا منگانا ہے۔ نرس کے جانے کے وقت اُس نے مٹھائی کے ڈبے کا ڈھکنا اٹھا کر کہا: "منہ میٹھا کرکے جائیے گا۔"

"جی نہیں شکریہ۔"

"آپ کا کام اور بڑھ گیا ہے۔ کمرے میں پہلے ایک مریض تھا اب دو ہو گئے ہیں۔ لے لیجئے نا۔ آپ کی مہربانیوں کا بدلہ ہم کس طرح چکا سکتے ہیں۔ لے بھی لیجئے نا۔"

نرس کے مٹھائی کی ایک ڈلی اٹھانے پر فریدے اور محسن دونوں کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے۔

محسن بولا۔ "آپ نے بہت اچھا کیا۔ خیال آنے کی بات ہے۔ مٹھائی کا ڈبا تو میرے پاس بھی تھا۔"

عثمان نے ڈبا آگے بڑھا کر کہا۔ "تو پھر اس خوشی میں آپ بھی ایک ایک مٹھائی اٹھا لیجئے۔"

دن رات اکٹھا رہنے سے وہ ایک دوسرے سے مانوس ہوتے گئے۔ ایک رات فریدے نے سوتے میں محسن سے پلنگ کو اپنا پاؤں مار دیا۔ محسن بلبلا کر جاگ اٹھا اور ہائے ہائے کرنے لگا۔ صبح فریدے نے بتایا وہ اس وقت خواب دیکھ رہا تھا کہ جنگل میں شکار کھیل رہا ہے۔ بندوق نہیں چلی اور اُسے بھیڑیوں نے گھیر لیا ہے۔ ایک بھیڑیا اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا ہے۔ فریدے نے اچھل کر اپنا پیر اُس کے منہ پر دے مارا۔ وہ پیر پلنگ کے پائے کو جا لگا۔

محسن نے ہنس کر کہا۔ "آئندہ ایسا شکار میرے پلنگ کے قریب مت کھیلنا۔"

فریدا مسکرا کر بولا۔ "جی کبھی نہیں۔"

ایک روز باتوں باتوں میں محسن نے بتایا کہ فریدے کو ہیر وارث شاہ کے کچھ بند یاد ہیں کچھ یوسف زلیخا کے کچھ سیف الملوک کے بول بھی آتے ہیں۔ وہ ایسی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔

"عثمان نے پوچھا۔" فریدے تم سے ایک سوال پوچھوں۔"

"جی مگر آسان ہو۔"

"بالکل آسان۔ یہ عاشق جو ہو گزرے ہیں۔ اِن میں سے سب سے بڑا عاشق، تمہارے خیال میں کونسا تھا؟"

"میاں مجنوں سب سے بڑا عاشق تھا۔"

"مجنوں تو باہر کا عاشق تھا۔ میں اپنے یہاں کے عاشقوں کی بات کرتا ہوں۔ رانجھا، مہینوال، پنّوں، مرزا جٹ۔ اِن میں سے تم سونے کا تمغہ کس کے سینے پر لگاؤ گے۔ یعنی تمہارے خیال میں گولڈ میڈل کا حقدار کون ہے؟"

"گولڈ میڈل کا حقدار، رانجھا ہے۔"

"رانجھا کیوں بھئی؟" محسن نے پوچھا۔

"رانجھا بہت بڑا عاشق تھا جی۔" فریدے نے بڑے اعتماد سے فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ اُسے بڑا عاشق نہیں مانتے۔ ویسے مہینوال پنّوں مرزا سبھی بڑے عاشق تھے۔"

عثمان نے کہا: "ایک کا نام لو۔"

فریدا بولا: "میاں رانجھا۔"

"واہ رانجھا بھی کوئی عاشق تھا!" جب عثمان نے یہ کہا تو فریدا بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "دیکھو عاشق کی عزت نفس ہوتی ہے۔ اُس کا وقار ہوتا ہے۔ اُس بلندی سے اُسے نیچے نہیں گرنا چاہیے۔ تخت ہزارے کا شہزادہ سات برس ہیر کی بھینسیں چرائے، اُن کو نہلائے۔ اُن کے گوبر کے اپلے تھاپے۔ حد ہوگئی۔ پھر بیوی اس کی جب کے پاس۔ بھٹی کلائی مروڑا اور لے جا گھر ہیر کو بیاہ کر لے گئے کھیڑے اور رانجھا منہ میں انگلی ڈالے کھڑا دیکھتا رہا اچھا نامرد عاشق تھا۔ پھر ہیر سسرال جا کر لسی بلوتی رہی۔ مکھن نکالتی رہی۔ پراٹھے پکاتی رہی۔ خاوند کے ساتھ سوتی رہی اور میاں صاحب بالناتھ جوگی کی چلمیں بھرتے رہے ایک دن اُس نے کہا مانگ کیا چاہتا ہے۔ بولے جوگ دیدو۔ فقیر ہو کر ٹھوٹھا ہاتھ میں پکڑ کر پھر ہیر کے دروازے پہ جا گئے۔ اندر سے رقیب کی بہن نکل آئی اور وہ بولی تو وہی بزدل ہے۔ اب فقیر کے بھیس میں پھر آن پہنچا۔ اس نے ہاتھ مار کر کہا۔ جا دفعہ ہو کیا میری بھابی کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ اچھا جنا تھا۔ اچھا مرد کا بچہ تھا میاں رانجھا۔ میں تو کبھی گولڈ میڈل نہ لگاؤں اس کے سینے پہ۔"

فریدے کا چہرا اتر گیا۔ اُس نے پوچھا۔ "تو کیا آپ مہینوال کو لگائیں گے؟"

"مہینوال؟ وہ بھی نہ تھا۔ کوئی اُس سے پوچھے تو مرد کی ذات ہے۔ اری بھئی تو خود دریا پار کر کے سوہنی کو ملنے کیوں نہیں جاتا۔ سوہنی کو دریا پار کرا کے اپنے پاس کیوں بلاتا ہے۔ ارے کمبخت عورت ذات سے سانپ مرواتا ہے۔"

فریدا بولا: "وہ اپنی بھینسیں جو چراتا تھا۔ اُنھیں چھوڑ کر کیسے جاتا۔"

عثمان اونچا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "ایک تو ہمیں اِن بھینسوں نے مارا۔ عاشق تو معشوق کی خاطر جائیداد بیچ دیتے ہیں مہینوال اپنی بھینسیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ یہ بھی کمال ہے۔ پھر اس مہینوال نے شادی شدہ عورت کو کیوں پھنسایا؟ یہاں پہ بھی اُس کے نمبر کاٹنے پڑیں گے۔ کیوں محسن کیا خیال ہے؟"

محسن مسکرا کر بولا۔ "بالکل کاٹنے پڑیں گے۔"

"میں تو سوہنی کے نمبر بھی کاٹوں گا۔" عثمان نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

فریدے نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

"وہ چٹوری بہت تھی۔ دریا پار کر کے آتے ہی کھانے کو کچھ مانگتی تھی۔"

محسن نے لقمہ دیا۔ "چیز برگر یا سینڈوچ؟"

عثمان بولا "چیز ہرگز نہیں کباب کھاتی تھی۔ ورنہ سنیئے محبوبہ کو آنا ہو تو عاشق ایک گھنٹہ پہلے وہاں آن بیٹھتا ہے۔ مگر مہینوال کو دیکھو ایک روز دیر سے پہنچا اور کبابوں کا قیمہ نہ لا سکا۔ چوہدری نے کہا مہینوال آج تم نے کباب نہیں کھلائے۔ مہینوال نے کہا ابھی لایا۔ جھاڑی کے پیچھے گیا چاقو مار کر اپنی ران پر سے گوشت کا پارچہ اتارا اور بھون کر لے آیا۔"

"مگر اتنی دیر سوہنی کیا کرتی رہی؟" محسن نے پوچھا۔

"کون آئس کریم کھاتی رہی۔ انگوٹھا چوستی رہی۔ اپنے کپڑے نچوڑتی رہی۔ محبت والی عورت کو کئی کام ہوتے ہیں۔ سوہنی کھانے کی اتنی کمانڈرہ تھی۔ بولی میرے سرتاج آج کباب کا ذائقہ کچھ اور سا ہے۔ واہ بھئی واہ ایسے عاشق کو سونے کا تمغہ!!! پنوں کا بھی یہ حال تھا۔ ٹھیک ہے کران کا شہزادہ۔ بھنبھور میں آیا۔ سسی کمہارن کو دل دے کر کیا خریدا۔ ہنڈیا اور وہیں کا ہو گیا۔ بھائیوں نے بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ پنوں آنے کا نام نہیں لیتا۔ حکم آیا بیہوش کر کے لے آؤ۔ بھائیوں نے نشہ پلا کر اونٹ پر ڈالا اور مکران کی طرف روانہ ہوئے۔ سسی کو معلوم ہوا روتی پیٹتی تھلوں میں ریت کے نیچے دب کر مر گئی۔ اُدھر پنوں کو ہوش آیا اونٹ سے چھلانگ مار کر بھنبھور کی طرف ڈبل مارچ کیا ریت کا طوفان آیا دب کر مر گیا۔ بس پنوں بھی محبوبانہ سی عاشق تھا۔ اصل عاشق تو مرزا جٹ تھا۔ یہ تبلی کمر یہ چوڑا سینہ۔ بچھو کی دم کی طرح اٹھی ہوئی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں۔ کندھے پر تیروں سے بھرا ترکش۔ نیچے ایسی گھوڑی کہ بیری بکی۔ صاحباں کی برات آئی ہوئی ہے۔ وہ دلہن بنی بیٹھی ہے۔ مرزا جٹ نے ایک عورت کو بیچ میں ڈالا اور کہا جا صاحباں سے کہہ مرزا آیا ہے۔ اس عورت نے جا کر صاحباں کے کان میں کہا۔ صاحباں بہلنے سے اٹھی۔ دیکھا قلعہ نما حویلی کی دیوار کے نیچے نڈر مرزا سینہ تانے کھڑا ہے مرزا نے اشارہ کیا۔ چھلانگ مار۔ وہ کود دی۔ مرزا نے یوں کیچ کیا۔ اپنے پیچھے گھوڑی بکی پر بٹھایا۔ ایڑ لگائی اور کہا۔ ہوا ہو جا۔ یہ وہ بکی تھی جس کے متعلق مرزا کہا کرتا تھا۔ بکی کولوں ڈرن فرشتے تے مرزے کولوں ڈرے خُدا۔ جب بہت دور نکل آیا۔ سمجھا اب خطرہ نہیں تو بنی سنوری صاحباں کو اتارا گھوڑی کو درخت کے ساتھ باندھا جس درخت کے نیچے چھاؤں تھی وہاں صاحباں کو لے کر بیٹھ گیا دونوں کے بدن آگ ہو رہے تھے۔ کلاوے میں لے کر کچھ جھٹکا پھٹکا۔ کمر سیدھی کرنے کو لیٹا ہی تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ صاحباں عورت ذات ایک ہی بھائی تھا شمیر۔ اور مرزا کا نشانہ ایسا کہ کیا کسی کا ہو گا۔ کبھی خطا ہو ہی نہیں سکتا۔ سمجھی بھائی مارا جائے گا۔ اس نے تیروں سے بھرا ترکش مرزا کے سرہانے سے اٹھا کر درخت کی اونچی شاخ سے لٹکا دیا۔ گھوڑوں کے سموں کی آوازیں سنائی دیں۔ مرزا کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو سامنے کھڑے تھے۔ مرزا نے کمان اٹھائی۔ تیر لینے کو پیچھے ہاتھ مارا مگر تیر کہاں۔ اُٹھا ترکش لینے کو مگر مخالفوں کے تیر کام کر چکے تھے۔ بکی سرپٹ بھاگی گھر پہنچی۔ صف ماتم بچھ گئی کہ عاشق مارا گیا۔ صرف مرزا جٹ کا سینہ اس قابل ہے اس پہ سونے کا تمغہ لگایا جائے۔ "He died with his boots on"

محسن اور فریدا متاثر ہو کر عثمان کا بیان سن رہے تھے۔ فریدے کی باہر کی سانس باہر اور اندر کی اندر تھی۔ اس نے لمبی سی سانس لی اور بولا "مگر ایک جگہ پہ اس کے نمبر کاٹنے پڑیں گے۔"

"کہاں؟"

"اس نے صاحباں سے ...."

فریدے کی اِس جرأت پر محسن نے نیم مسکراہٹ سے عثمان کی طرف دیکھا۔

عثمان بولا "صاحباں کو بھگا کر وہ مرغ چھولے کھلانے لایا تھا یا نماز پڑھانے۔ مرزا مرد بچہ تھا۔ زنخا نہیں تھا۔ گولڈ میڈل لگے گا تو مرزا کو لگے گا۔"

محسن جو عثمان کے اعضا کی پھرتی اور بیانیہ انداز سے متاثر ہوتا رہا تھا اب اُس کی حاضر دماغی کو محسوس کرتا ہوا جھک کر بولا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ عاشقوں میں سب سے بڑا عاشق مرزا تھا۔"

یہ سُن کر فریدے کا چہرا اتر گیا۔

اسی شام کو عثمان علی اپنی نواسیوں بیٹیوں اور بیوی کے درمیان بیٹھا ہوا بڑی آزردگی سے کہہ رہا تھا۔

"آٹھ دن سے فری مجھے دیکھنے نہیں آیا۔"

اس کی بیوی بولی "روز کہتا ہے آج ضرور جاؤں گا۔"

"میں جانتا ہوں اُس کا سارا وقت دوستوں میں گزرتا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"یہ کاغذ اُس کے کسی بھی دوست کو دے دینا۔ میرا پیغام سب کو پہنچ جائے گا۔"

اُس کی بیٹی سے کر پڑھنے لگی "ڈیر سلطان، قیوم، ساجد، مرتضیٰ اور رانا۔ ہسپتال میں مجھے سب ملنے آتے ہیں۔ مگر فری کو آئے آج آٹھ روز ہو گئے ہیں۔ جب آتا ہے کھڑا کھڑا چلا جاتا ہے۔ آتا ہے تو کہتا ہے باہر گاڑی میں میرے دوست انتظار کر رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں اچھا جاؤ۔ تم جانتے ہو یہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ کوئی کم عمر نہیں ہے بیس برس کا ہے میرا بھی جی چاہتا ہے وہ بھی کسی روز آ کر اپنی بہنوں اور اپنی ماں کے ساتھ میرے پاس آدھ گھنٹہ بیٹھے۔ بڑا مناسب ہو اگر آپ لوگ کسی روز اسے میرے پاس آدھ گھنٹہ بیٹھنے کی اجازت اور مشورہ دیں کیونکہ وہ دنیا کے سب مشوروں پر دوستوں کے مشورے کو فوقیت دیتا ہے۔"

سب مسکرانے لگے اور بولے "بہت اچھی تجویز ہے۔"

ملاقاتیوں کا وقت ختم ہونے کے بعد دروازہ کھلا اور سسٹر عباس دو جونیئر نرسوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ سسٹر عباس نے پہلے محسن کی خیریت پوچھی پھر عثمان سے مخاطب ہوئی۔ "آپ کیسے ہیں؟"

"اچھا ہوں۔"

"جس روز آپ کا آپریشن تھا میں ڈیوٹی پر تھی۔ آپ کا وہ مقتل میں سج کر جانے والا جملہ خوب تھا۔ میں نے بہت سسٹروں کو سنایا۔ آپ کو یاد ہے؟"

"کیوں نہیں یاد۔ آپ کا مالش کرنا بھی یاد ہے۔"

سسٹر عباس مسکرائی جس سے اُس کی تنچی ہوئی بھویں مزید تن گئیں گالوں پر سرخی آگئی اور چہرے کے گندمی رنگ میں ملائمت رچنے لگی۔

"آج آپ کیسے ۔"

"آج سے ہماری نائٹ ڈیوٹی شروع ہے۔"

"کتنے روز ہوتی ہے آپ کی نائٹ ڈیوٹی۔"

"ہر پندرہ روز کے بعد نیا سٹاف آتا ہے۔"

اُس کے جانے کے بعد عثمان نے کہا "محسن تم تو کہتے تھے یہ بڑی نک چڑھی ہے۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو۔"

اس نے کہا "فریدے ایک سگرٹ پلاؤ۔"

فریدے نے الماری سے ایک سگرٹ لاکر محسن کے ہونٹوں میں دے دیا۔ پھر دیا سلائی جلاکر سگرٹ کے قریب لے گیا۔

عثمان یہ دیکھ کر بولا "ہم بھی ہسپتال میں کتنے ٹھاٹھ سے رہ رہے ہیں۔"

گویا یہ محسن کے ساتھ اپنے موازنہ کی بات تھی جو عثمان اپنے دل میں محسوس کرتا رہتا تھا۔ بستر پر سے جھکا جھکا عثمان چلمچی میں خود منہ ہاتھ دھوتا تھا۔ ٹوتھ پیسٹ کرتا تھا۔ پھر شیو کا سامان دھوتا تھا۔ اِن کاموں میں کبھی دایاں کبھی بایاں دراز کھولتا۔ پانی کے مگ بھروا کر ہر وقت اپنے سائڈ ٹیبل کے نچلے خانے میں رکھے رکھتا۔ کسی کو بار بار تکلیف نہ دیتا تھا۔ دوسری طرف فریدا پہلے محسن کی گردن کے نیچے تولیہ بچھاتا پھر ٹوتھ پیسٹ لگا کر برش ہاتھ میں دیتا۔ جب تک محسن کلی کرتا، منہ ہاتھ دھوتا، فریدا چلمچی اٹھائے کھڑا رہتا۔ چائے پینی ہوتی تو فریدا چائے کی پیالی بنا کر دیتا۔ یہاں تک کہ سگرٹ پینا ہوتا تو فریدا اُس کے ہونٹوں میں اڑس دیتا اور ماچس بھی نہ جلانے دیتا۔ خود جلا کر دیتا۔ ایک دفعہ عثمان علی نے پوچھا "محسن تم فرش کو ہاتھ سے چھو سکتے ہو؟ دیکھو اس طرح جس طرح میں ہاتھ سے چھوتا ہوں"

محسن سے نہ ہو سکا۔ "تم تو ایک مہینہ پہلے سے ہسپتال میں داخل ہو۔ میں کر لیتا ہوں تم کیوں نہیں کر سکتے؟"

محسن کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

"تمہارے دونوں طرف سائڈ ٹیبل ہیں۔ ہاتھوں کو ہلایا کرو۔ کسی دراز کو کھولو کسی کو بند کرو۔ اس طرح ہاتھ پیر کھلیں گے۔"

"آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں" محسن نے جواب دیا۔

"فریدا اس وقت کمرے میں نہیں ہے۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ تم فریدے پر بڑا ڈی پینڈ کرتے ہو۔ اتنا کرنا نہیں چاہیے۔"

"آپ صحیح کہتے ہیں۔"

اگلے روز صبح صبح ڈاکٹر راؤنڈ پر آیا۔ اُس نے عثمان سے پوچھا "آپ ٹانگ اوپر اٹھا سکتے ہیں۔"

پلستر سے مڑھی ٹانگ عثمان نے اوپر اٹھا کر سیدھی کھڑی کر دی اور مذاقاً بولا "کہیں تو چھت کے ساتھ لگا دوں۔"

ڈاکٹر نے خوش ہو کر کہا "بہت کم جوان آدمی ایسا کر سکتے ہیں۔"

یہ جملہ شاید محسن کے لئے تھا۔ اُس سے مخاطب ہو کر بولا "آپ کر سکتے ہیں؟"

محسن بولا "جی ہاں۔"

" آپ عثمان صاحب کی نقل کرتے ہوں گے۔ آپ کے لئے بھی مشق کرنا بڑا ضروری ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر چلا گیا۔ محسن ٹانگ اُٹھا اُٹھا کر مشق کرنے لگا۔

رات کا سٹاف ڈیوٹی پر آتا تو سسٹر عباس کمرہ کمرہ پھر جاتی۔ ایک روز بولی: "آپ کو شاید کچھ دنوں تک ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے۔"

عثمان نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

بولی۔ "ڈاکٹر نے آپ کے لئے بیساکھیوں کا آرڈر دیا ہے۔ مطلب ہے اب آپ ٹھیک ہو گئے ہیں۔ کچھ ہفتے بیساکھیوں سے چلنا ہو گا پھر پلستر اتار دیا جائے گا۔"

اگلے روز واقعی ڈاکٹر نے کہہ دیا: "اب آپ کو بستر پر سے اٹھنے کی اجازت ہے۔ بیساکھیوں سے تھوڑا تھوڑا چلنے کی مشق کریں۔ یہ کام مشکل ہوتا ہے ذرا۔ آ جائے گا تو آپ گھر جا سکتے ہیں۔ پلستر کوئی ایک مہینہ اور رہے گا۔ پھر اتار دیا جائے گا۔"

محسن نے بیتابی سے پوچھا: "میرے متعلق ڈاکٹر صاحب؟"

"آپ کو کتنے روز ہو گئے؟"

"آج ایک مہینہ چوبیس دن ہو گئے۔ عثمان صاحب سے ایک مہینہ پہلے آیا تھا۔"

ڈاکٹر کھنکار کر بولا: "آپ بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ذرا ہاتھ پیر ہلایا کریں عثمان صاحب کی طرح مریض کی پروگریس ذرا تیز ہونی چاہیے۔"

اب عثمان علی دن میں دو مرتبہ بیساکھیوں سے چلنے کی مشق کرتا۔ صبح فزیو آتا۔ سہ پہر کو نو کر۔ سانس پھول جاتا۔ تکان ہو جاتی کمزوری محسوس ہونے لگتی۔ گرتا گرتا سنبھلتا۔ ایک ہفتے میں خود اعتمادی گرفت میں آ گئی اور پنجوں کی گرفت بیساکھیوں پر مضبوط ہوتی چلی گئی۔

ڈاکٹر نے ایک روز دیکھ کر کہا: "پرسوں آپ کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔"

عثمان علی لمبے لمبے ہاتھ کر کے سائڈ ٹیبلوں میں سے اپنی چیزیں اکٹھی کر رہا تھا۔ فرید بولا: "دعا کریں جی ہم بھی خیری مہری گھر جائیں۔"

عثمان نے ہمدردانہ جواب دیا: "تم بھی خیری مہری چلے جاؤ گے۔ مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ سب سے وڈا عاشق کون تھا؟"

فرید طوطے کی طرح بولا۔ "جی مرزا جٹ۔ اور کون۔"

عثمان نے زور سے ہنس کر محسن کی طرف دیکھا۔ محسن کے چہرے پر اوپری اوپری سی مسکراہٹ تھی۔ اُسے عجیب قسم کا احساس ہو رہا تھا جیسے کوئی گھلا مِلا انسان اُس کے وجود سے نکل کر الگ جا کھڑا ہوا ہو اور وہ دلدل میں پھنسا تنہا رہ گیا ہو۔

عثمان کے چلے جانے کے بعد محسن کو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں سے جینے کی تمنا رخصت ہو گئی۔ خالی کمرہ اُسے کاٹنے کو دوڑتا تھا وہ جیسے خود اپنا چور تھا خود اپنا مجرم تھا۔ بہت دیر اپنے سامنے رکھے خالی کاغذ کو دیکھتا رہا پھر اپنے باپ کو خط لکھنے لگا کہ

اتنے میں دروازہ کھلا اور سسٹر عباس داخل ہوئی۔ محسن کو اچھا لگا جیسے دلدل کے اس ویرانے میں کوئی آیا تو۔

سسٹر خالی بیڈ کی طرف دیکھ کر بولی "اوہو۔ آپ کا ساتھی چلا گیا۔ اداس تو نہیں ہوئے آپ؟"

"بہت ہوا ہوں سسٹر"

"آپ بھی ٹھیک ہو جائیں گے مگر دیکھئے نا ذرا مریض کو اپنی مدد آپ کرنی چاہیئے" یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔

محسن نے خط لکھتے لکھتے نرس کا یہ جملہ مضمون میں اس طرح اتار دیا کہ آپا جی آپ فریدے کو واپس بلوالیں۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔

کاناچور

سلیم اختر

خوش قسمتی کے کئی روپ ہیں کسی کو یہ چاندی کے چمچے کی صورت میں پیدائشی طور پر ملتی ہے تو کسی کو راہ چلتے میں گاہک کی طرح ان دو انتہاؤں کے درمیان خوش قسمتی کی کئی قسمیں، صورتیں اور انداز ملتے ہیں۔ مگر خاور کو خوش قسمتی ایک مکروہ صورت بڈھے کے روپ میں ملی تھی، شاید اسے مکروہ صورت بوڑھا کہنا قدرے مبالغہ ہو مثلاً بعض کے لئے وہ مکروہ صورت نہ ہو جیسے اس کی سیکرٹری جسے وہ مقررہ تنخواہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً تحائف بھی دیتا رہتا تھا اسی طرح اس کا بوڑھا ہونا بھی خاصہ مشکوک تھا یہ درست ہے کہ وہ پچاس سے کم نہ ہوگا۔ اسی طرح اس کے بال بھی غائب تھے، غائب کیا درمیان میں چٹیل میدان تھا جس کے کناروں پر اُگے بال سبزۂ بیگانہ کی مانند تھے۔ لیکن ہر عورت جانتی ہے کہ بڑھاپے کا عمر یا بالوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کی گواہی وہ تمام عورتیں دے سکتی تھیں جنھیں کسی نہ کسی طور بیگ صاحب کی کسوٹی بننے کا موقع ملا تھا اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ بیگ انٹرپرائزز کے یہ منیجنگ ڈائرکٹر لاکھوں کی آسامی تھے اور " لاکھوں کی تعداد کا صرف اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس سال انہوں نے ہیرا پھیری سے کوئی ڈیڑھ پونے دو لاکھ کا تو ٹیکس ہی بچایا تھا"۔ اب اگر چہرہ سیاہ ہو اور اس پر برص کے انوکھے منہ تک اپنا نقشہ پھیلا رکھا ہو تو اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے اور واقعی بیگ صاحب کو آج تک کسی طرح کا فرق پڑا بھی نہ تھا، جس طرح ہندوستان کے نقشہ کے نیچے لنکا ایک آنسو کی طرح اٹکا محسوس ہوتا ہے اسی طرح ان کے سر، آنکھوں اور گالوں پر پھیلے نقشے کے نیچے اور عین ہونٹوں پر برص نے جیسے ایک آنسو ٹپکا دیا تھا جس سے منہ کھول کر بات کرنے پر ان کے کھلتے اور بند ہوتے ہونٹ دیکھ کر کراہت کا احساس ہوتا تھا کوئی اور ہوتا تو شدید احساسِ کمتری کا شکار ہوتا لیکن وسیع کاروبار، بینک بیلنس اور اس سے لوگوں کو خریدنے کی استطاعت نے ان میں ہر طرح کا احساس ختم کر دیا تھا بھلا معمولی سے احساسِ کمتری کی کیا حیثیت تھی!

بیگ صاحب کے کئی کاروبار تھے جن میں سے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی بھی تھی۔ ذاتی طور پر انھیں اس کام کا تجربہ نہ تھا بلکہ امپورٹ اور ایکسپورٹ کے مقابلہ میں نفع بھی بہت کم تھا۔ اگر ساری دردسر کے بعد سال میں ساٹھ ستر ہزار یا چلو لاکھ کا بھی نفع ہو گیا تو ان کے معیار کے لحاظ سے یہ کچھ بھی نہ تھا البتہ فرنج بنیفیٹس میں جو کچھ شامل تھا وہ بطورِ نقدی نہیں بلکہ بصورت جنس تھا۔ جن طرحدار لڑکیوں کے چہرے اور کمریں لاکھوں کی اشیائے فروخت کرتی تھیں وہ ان کے سامنے بچھ جاتیں اور جب سے ان کی ایک دو ماڈلوں کو فلموں میں رول ملے تھے اس وقت سے تو ان کی کمپنی کی شہرت اور بھی پھیل گئی تھی اور کمپنی کی شہرت کے ساتھ ساتھ خود بیگ صاحب کی بھی! مختلف لڑکیوں نے اچھے بُرے اور تعریفی یا نفرت و کراہت اور یا پھر غصہ و خشونت سے ان کے

جس طرح تذکرے کئے گئے تھے انہوں نے مخصوص حلقوں میں ان کی شہرت پھیلا دی تھی ویسے ان کے بے تکلف دوست تو انہیں ہمیشہ ہی سے "سٹڈ" کہتے چلے آئے تھے۔

ان کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازم ہونے کی بنا پر خاور بیگ صاحب کے زریں کارناموں سے واقف تھا اس لئے اب وہ ان کے سامنے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا اس شخص میں دولت کے علاوہ اور بھی کوئی خصوصیت ہے۔ بظاہر تو وہ ایسی چارہ کول پینٹنگ تھا جسے آرٹسٹ ڈھنگ سے نہ بنا پایا تو جھنجھلاہٹ میں اس پر سرخ رنگ الٹ دیا۔

"ہوں"۔ وہ انہماک سے تصویر دیکھ رہے تھے اور وہ انہماک سے ان کے چہرے کو "بہت خوب"۔

"سر! تو پھر یہ آئیڈیا پسند آ گیا آپ کو؟"

"آئیڈیا؟" وہ جیسے چونک کر بولے "میں نے آئیڈیا پر تو غور نہیں کیا"

"پھر؟"

"ہاں بھئی! میں تو ماڈل کو دیکھ رہا تھا"

خاور کو دل بیٹھتا محسوس ہوا۔

"واہ وا! کیا چھاتیاں ہیں بیالیس انچ سے کم تو کیا ہوں گی"

خاور کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"واہ! اور کمر اور کولہے۔ واہ وا۔ کمر چونتیس سے زیادہ نہ ہو گی"۔

خاور کی سانسیں تیز سے تیز تر ہو رہی تھیں۔

"بائی گاڈ! ایسی عورت تو مرد کو چوتھے آسمان پر پہنچا دے ......"

"خاور کا حلق جیسے سوکھ گیا تھا۔

"پتہ نہیں کون خوش قسمت لوگ ہیں جنہیں خدا ایسی سیکسی عورتوں سے نوازتا ہے۔ مائی گاڈ ۴۲۔۲۴۔۴۴

"PERFECT FIGURE –

خاور کے اعصاب تنے ہوئے تاروں کی طرح تھے۔

"مائی گاڈ! مجھے اگر یہ مل جائے تو میں۔ میں ..." بیگ صاحب اس سے جو حسن سلوک کرنا چاہتے تھے اس کی وضاحت کے لئے کوئی موزوں لفظ نہ پا کر انہوں نے تصویر پر سے گردن اٹھائی تو خاور کی آنکھوں میں عجب کیفیت دیکھی، یہ غصہ کی چمک تھی یا دیوانگی کی۔ بیگ صاحب نے غور سے آنکھوں میں دیکھا تو ان دونوں ہی کا امتزاج نظر آیا پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتے خاور نے ان کے ہاتھ سے تصویر جھپٹی اور تقریباً چیخ کر بولا۔

"بیگ صاحب یہ میری بیوی ہے"

اور وہ جھٹ سے دروازہ بند ہو جانے کے بعد بھی بیگ صاحب کا منہ کھلا کا کھلا رہا۔ پھر انہوں نے منہ بند کیا پھر ہونٹوں

پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر ہنسنے تو بے حد سفید (مگر نقلی) دانت چمک اُٹھے اور اس کے بیدحلق سے فوارہ کی طرح قہقہے ابل رہے تھے۔

MYGOD! WHAT A FANASTIC SITUATION — MY GOD!!"

(۲)

"چائے پیو گے؟"

"میں نہیں پیتا۔"

"اوہو! کیا بات ہے۔"

"کچھ نہیں۔"

"تو پھر یہ منہ سجائے کیوں بیٹھے ہو۔"

وہ خاموشی سے پیٹھ موڑے بیٹھا رہا۔ آج ضرور دفتر میں کوئی بات ہوئی ہے کیونکہ ایک تو وہ جلدی گھر آ گیا تھا اور جب کا آیا تھا یوں ہی تنہا بیٹھا تھا یا تو کسی سے لڑ کر آیا تھا ورنہ اس سے لڑنے کو تیار تھا اس نے سوچا کیا میں نے کوئی ایسی حرکت کی ہے مگر مطمئن تھی کہ ایسی کوئی بات نہیں رات بھی ٹھیک ٹھاک گزری تھی، صبح بھی ٹھیک تھا مگر اب کیا ہو گیا اسے؟ وہ اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی، خاور کے جسم میں لرزش کی لہر دوڑ گئی مگر وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔

"اے جی"۔ وہ کھنکار کر بولی "یہ کیا لوریت پھیلا رکھی ہے۔"

وہ پیچھے سے اسے لپٹ گئی اور خاور کا تنا ہوا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے بھی اسے محسوس کیا اور بازوؤں کا گھیرا تنگ کر دیا۔

"مجھ سے ناراض ہو۔"

"نہیں!"

"میری کوئی بات بری لگی۔"

"نہیں تو۔"

"تو پھر کیا ہوا ہے۔"

وہ اٹھ کر اس کے سامنے بیٹھی تھی "اب بولو! کیا بات ہے۔"

"وہ۔ وہ۔۔۔۔" اس کے منہ سے الفاظ نکل رہے تھے "وہ حرامزادہ۔"

"کون؟"

"وہ۔ وہ تمہاری تعریف کر رہا تھا۔"

"کون تعریف کر رہا تھا۔"

"وہ — وہ کہتا تھا تمہاری چھاتیاں — تمہاری ....."

ایک دم اس کا ہاتھ حفاظتی انداز میں اپنی چھاتیوں پر آ گیا مگر کچھ نہ بولی۔ خاور خاموش ہو گیا پھر ایک طویل سانس لے کر قدرے پُرسکون لہجہ میں کہنے لگا۔

"میں آج بیگ صاحب کے پاس صابن کے اشتہار کی تصویر لے کر گیا تھا۔"

"میری تصویر؟"

"ہاں!"

"اوہ!"

"اس نے تمہاری تصویر بہت پسند کی۔"

"تو اس میں گرمی کی کیا بات ہے۔"

"تم سمجھتی نہیں ہو، اگر وہ عام طریقہ پر تمہاری خوبصورتی کی تعریف کرتا تو ٹھیک تھا مگر اس نے تو۔ اس نے تو ....."

وہ جھجک کر خاموش ہو گیا اور وہ سرخ چہرہ کئے جیسے منصفین کے فیصلہ کی منتظر تھی۔

کہنے لگا ..... کہنے لگا۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"بھئی! بڑی دلگیر باتیں اس نے کیں۔"

"پھر تم نے کیا کہا۔"

"میں نے اسے بتایا کہ یہ تصویر میری بیوی کی ہے لیکن میں اس قدر غصہ میں تھا کہ وہاں بیٹھ نہ سکا۔"

"تم سدا کے احمق ہو۔"

"کیا مطلب؟"

وہ بپھر کر بولا "اس حرامزادے کو تمہارے VITAL STATISTICS کی پیمائش کرنے دیتا؟"

"یہ میں کب کہہ رہی ہوں۔"

"تو پھر؟"

"تم خاموش رہتے۔"

"میں اتنا بھی بے غیرت نہیں ہوں کہ وہ میری بیوی کی چھاتیوں اور کولہوں کا قصیدہ پڑھتا اور میں سن کر بیٹھا مکرر ارشاد فرمائیے کہتا رہتا۔"

"اوہو! تم تو یوں ہی بھنّا جاتے ہو — میرا یہ مطلب نہ تھا۔"

"تو پھر کیا مطلب تھا۔"

" بات سنو تو مطلب سمجھو "

" کہو "

" تم ایک بات بھول گئے ہو کہ وہ تمہاری بیوی کی نہیں ایک ماڈل کی تعریف کر رہا تھا "

" کیا مطلب ؟ "

" کیا مطلب ؟ " وہ اس کی نقل اتارتے ہوئے بولی " اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے ؟ اسے کیا پتہ کہ یہ تصویر کس عورت کی ہے تمہاری بیوی کی ہے کہ کاسنے جور کی بیوی کی ــــ اس نے تو تصویر کو پروفیشنل آنکھ سے دیکھا اور تعریف کر دی "

" ہاں یہ بات تو ہے ــ مگر تم میری بیوی ہو "

" پھر وہی بات ؟ یہ تو تمھیں پتہ ہے کہ میں تمہاری بیوی ہوں اسے کیا پتہ ــــ اس کے لئے تو یہ محض ایک ماڈل تھی، ایک غیر عورت بلکہ ایک پروفیشنل عورت ــــ "

" ہوں "

" لہذا بے عزتی اس وقت ہوئی جب تم نے اسے یہ بتایا کہ میں تمہاری بیوی ہوں، اس سے پہلے میں اس کے لئے ایک بے نام جسم تھا، مس ایکس سمجھ لو لیکن تم اپنے جوش میں پھوٹ پڑے اور اب یہ مس ایکس مسز خاور بن گئی ــ یوں بے عزتی ہوئی "

" گویا وہ کہتا رہتا اور میں خاموش رہتا ! "

" بالکل "

" وہ تمہارے جسم کی تعریف کرتا رہتا اور میں سنتا رہتا "

"EXACTLY"

"BUT WHY?"

"BECAUSE ...." یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اسے بیڈ روم میں آنے کا اشارہ کیا جہاں وہ تمام وجوہات، سوالات اور BECAUSE کا زندہ جواب بنی کھڑی تھی ــــ اور اس دلیل کے سامنے وہ لاجواب تھا !

(۳)

خاور بیگ صاحب کی ایجنسی میں فوٹو گرافر تھا اور اسے یہ کام بے حد پسند تھا۔ دن بھر طرح دار عورتوں کی تصویریں اتارتا۔ انھیں ڈیولپ کرنا۔ ان کے پرنٹ نکالنا۔ انھیں انلارج کرنا، انھیں ری ٹچ کرنا اور ان میں رنگ بھرنا۔ الغرض ! وہ کام کے ہر مرحلے سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ خاص طور پر وہ لمحات اس کے لئے عجب تھرل کے ہوتے تھے جب ٹرے میں دھرا وائٹ پیپر آہستہ آہستہ کسی حسینہ میں تبدیل ہوتا دکھائی دیتا۔ یہ اس کے لئے کیمیاگر کا آخری لمحہ تھا۔ سونا بنتا ہے یا نہیں ــــ چنانچہ وہ بڑے اشتیاق سے ٹرے کو گھورتا رہتا اور آہستہ آہستہ گویا صدیوں کے وقفے میں تصویر جنم لیتی نظر آتی پہلے سیاہ بال پھر لباس کی تہہ داد شکنیں، ابھر جوتے، پھر آنکھیں ہونٹ اور ناک اور پھر باقی جسم، الغرض ! پانی میں سے تصویر یوں طلوع ہوتی جیسے

سمندر کی جھاگ سے وینس۔

اس کے لئے نفیسہ بھی ایسی ہی وینس تھی جو اگرچہ بحیرۂ روم کے شفاف اور منور جھاگ سے تو نہ ابھری لیکن منوڑا کے گندگی بھرے ساحل پر یقیناً ملی تھی، بالکل ایسے ہی جیسے ساحل پر سیپ مل جاتے ہیں کہ خود بھی وہ اس وقت سیپ چن رہی تھی۔

خاور اپنا پیشہ کا لئے غروب ہوتے سورج کی تصویریں اتار رہا تھا لوگوں کی بھیڑ سے ہٹ کر وہ ساحل کے خاموش حصہ کی طرف آنکلا اگرچہ دو تین تصویریں بنا لی تھیں مگر وہ مطمئن نہ تھا ادھر وقت بھاگا جا رہا تھا اور چند منٹوں بعد سورج نے سمندر کو چھونا تھا۔ چند لمحات کے لئے دنیا پر نگاہِ بازگشت ڈالنی تھی اور پھر رات بھر کے لئے ڈبکی لگا لینی تھی! اچانک اسے قدرے فاصلہ پر ایک لڑکی سیپ چنتی نظر آئی، تیز ہوا سے ہلتے بالوں نے چہرہ کا ہالہ کیا تھا، سمندر کی لہریں اس کے قریب آکر جھاگ میں منتشر ہو رہی تھیں اور ڈوبتے سورج نے اس کے ننگے بازوؤں کو سونا پہنا دیا تھا۔ عین اسی وقت سورج سمندر میں اتر گیا۔ اور خاور نے شٹر دبا دیا۔ کلک! جلدی سے نیا اینگل لیا۔ کلک — پھر لڑکی کی پشت کو کور کر کے سورج کو لیا۔ کلک — پھر ایک گھٹنہ ٹیک کر لڑکی کے اڑتے بالوں اور پانی سے باہر نکلے آدھے سورج کو لیا۔ کلک! سورج سونے کی ٹکیہ کی طرح منور تھا اور تاحدِ نگاہ سونا لہریں مار رہا تھا۔ جب ساحل پر آکر جھاگ کے موتی ٹوٹتے تو قطروں میں رنگوں کے آنچل لہرا جاتے۔ خاور کے لئے یہ تخلیقی سرشاری کے وہ لمحات تھے جب انسان تخلیق کار بن کر فطرت سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور خود میں خالق کی تخلیقی قوت محسوس کرتا ہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر لہروں پر سونا ابھی تک بکھرا تھا لڑکی نے پہلی مرتبہ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو اسے کیمرہ لیے پایا۔

"پلیز مس" خاور نے کیمرہ کا فوکس درست کیا۔

"آں؟" وہ حیرت سے بولی۔

کلک!

خاور نے بے اختیار ہو کر خوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ چند منٹوں میں اس نے بہترین تصاویر حاصل کر لی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا چلا کر اپنی خوشی کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور شاید یہی کرتا اور نہیں تو کم از کم دیوانہ وار لہروں ہی میں کود جاتا مگر اسے اس لڑکی کا احساس تھا جو اسے ابھی تک حیرت سے تک رہی تھی اور اب اس نے پہلی مرتبہ اسے ایک پروفیشنل آنکھ سے دیکھا تو اپنے اعصاب پر وہی گدگدی محسوس کی جو اینیتا ایکبرگ کی سب سے پہلی تصویر بنانے والے سویڈیش فوٹوگرافر نے محسوس کی ہوگی۔ آنکھوں کے کھلے لینز جسم کا ایک ایک زاویہ جذب کر رہے تھے اور دماغ کے اعصاب کو پیغام دینے والا ریٹینیا کلک کلک کر رہا تھا۔

"آئی ایم سوری" وہ بولا۔ "میں دراصل ایک فوٹوگرافر ہوں آپ کو جب اتنے خوبصورت پسِ منظر میں دیکھا تو گستاخی کر بیٹھا۔"

"سو آئی کین سی۔"

خاور نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر دیا "یقین کیجئے میرا ارادہ برا نہ تھا۔"

"اچھا؟" اس کی دائیں بھوں سوالیہ انداز میں اوپر کو اٹھتی گئی۔

"اگر آپ نے برا مانا ہے تو میں یہ تصویر ضائع کر دیتا ہوں۔"

"کیا آپ واقعی تصویر ضائع کر دیں گے۔"

"جی نہیں۔" وہ ایمانداری سے بولا۔ "یہ تصویر اتنی اچھی ہے کہ میں واقعی اسے ضائع نہ کر سکوں گا۔"

وہ ہنسی اور سیپیوں سے بھرا تھیلا اٹھا کر چل دی۔ وہ متوازن قدم اٹھا رہی تھی، کولہے کا خم اور کمر کے نیچے کی گولائیاں مل کر عجب انداز میں ہل رہے تھے، تیز ہوا سے شانوں پر بال اڑ رہے تھے۔ وہ مبہوت کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر کیمرہ اٹھا کر جاتی لڑکی کی ایک اور تصویر لے لی۔ پھر اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور وہیں گیلی ریت پر لیٹ گیا۔ تاریکی پھیل رہی تھی، لہروں کا شور عجیب پر آہنگ لے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اعصاب نشہ میں ڈوبے تھے اور جسم میں انجانی کپکپی تھی!

تصاویر اس کے اندازے سے بھی زیادہ خوبصورت آئی تھیں اس نے دراصل ایک فیشن میگزین کو ٹائیٹل کے لئے تصویر دینی تھی۔ یوں تو تمام تصویریں ہی خوب تھیں لیکن اس تصویر کو تو سب نے فن کار ہی کا شاہکار تسلیم کیا جس میں اس کے سر کا کلوز اَپ اور سمندر میں نصف ڈوبا سورج ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ کچھ اڑتی لٹیں سورج پر تھیں چہرہ تاریک تھا مگر پیشانی، ناک اور ہونٹ سونے میں رنگے تھے، پس منظر میں پگھلے سونے کی ایک بڑی سی لہر جھاگ کا تاج پہنے اڈتی آرہی تھی یہ بلاشبہ ایسی تصویر تھی جہاں فوٹوگرافی تخلیقی مصوری بن جاتی ہے۔ چنانچہ جب اس کی کلر ٹرانسپیرنسی میگزین کے ایڈیٹر نے دیکھی تو اس نے بھی بہت تعریف کی اور اگلے ہفتہ یہ تصویر تمام ملک کے شالوں پر سج رہی تھی۔

اس نے باقی تمام تصاویر کسی کو نہ دکھائیں اور ان کے انلارج کر کے اپنے کمرہ میں لگا دیئے۔ مگر یہ تصویریں اسے کیسے بھیجے؟ اپنی افراتفری میں اس کا پتہ لینا یاد نہ رہا تھا۔ بس اس کی طرف سے فون کا انتظار کرتا رہا اور پھر ایک دن جب فون آیا تو مارے گھبراہٹ کے اس کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی دو ہفتے کے انتظار کے بعد اس کی آواز سن رہا تھا لیکن ڈھنگ سے بات نہ ہو رہی تھی بڑی مشکل سے اس نے تصویریں دینے کے لئے ایک ریستوران میں شام کی چائے کے لئے اسے رضامند کیا۔

"میں اپنی بہن کے ساتھ آؤں گی۔" اس نے جیسے تنبیہہ کی۔

"آپ سارے ٹبّر کے ساتھ آجائیے" کہنے کے بعد احساس ہوا کہ کیا بے تکی بات کی تھی لیکن وہ ہنس دی۔

وہ بہن کے ساتھ تو نہیں البتہ ایک سہیلی کے ساتھ آئی مگر پون گھنٹے کے تکلیف دہ انتظار کے بعد! اور آج اسے پہلی مرتبہ احساس ہو رہا تھا کہ چوڑی دار پاجامہ کتنا قاتل ہو سکتا ہے اس نے تو کیر قوم کا لباس سمجھ کر اسے کبھی اہمیت ہی نہ دی تھی۔ خاور کی مانند وہ بھی خاصی جھجکی سی تھی البتہ سہیلی خوب چٹپک مٹک رہی تھی۔ رسمی باتوں اور چائے کے بعد جب اس نے فریم میں انلارج تصویریں پیش کیں تو دونوں لڑکیوں کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آرہا تھا۔

"کیسی ہیں؟" وہ اسے گم سم دیکھ کر بولا۔

اس نے پلکیں اٹھا کر دیکھا تو ان آنکھوں میں عجیب فوٹوگرافی نظر آئی جو اس کا جواب بھی تھی اور انعام بھی!

اس کے بعد وہ سہیلی کے بغیر آ کر ملی، پھر اس کے کنوارے فلیٹ میں بھی آگئی، پھر وہ ان کے گھر گیا اور بالآخر اُسے

وہ دلہن بنا کر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ تب ایک دن خاور نے اس سے کہا۔

"خوش قسمتی کے بھی کئی روپ ہیں مگر مجھے یہ سیکسی سوزن کے روپ میں ملی ہے۔"

وہ یہ سنکر خوشی سے کھل اٹھی وہ سوزن تھی یا نہیں، یہ تو الگ بات ہے لیکن اس کے سیکسی ہونے میں دونوں کو کوئی شبہ نہ تھا، بہت محبت کرنے والی، بہت محنت کرنے والی مگر رات کو بستر پہ مکمل طور سے خراج وصول کرنے والی عورت تھی۔ خاور اس کی تصویریں اتارتے اتارتے نہ تھکتا تھا۔ جب ہر لباس اور ہر پوز میں تصویریں بنا چکا تو پھر کم لباس اور بعد ازاں بے لباسی میں تصویریں بنا ڈالیں گو اس نے اخلاقاً انکار کیا مگر وہ اپنے جسم کی سب سے بڑی خود عاشق تھی، خاور سے بھی بڑھ کر اور یہ اس کی نرگسیت کی تسکین کا ایک خوبصورت انداز تھا۔ ان تصویروں کو ہمیشہ تالے میں رکھا جاتا اور جب دونوں موج میں آتے تو یہ خفیہ البم کھول بیٹھتے۔ کبھی یہ تصویریں تحریک کا باعث بنتیں تو کبھی ٹانک کا کام کرتیں۔

ایک دن جاڑے میں آ کر بولا "اگر یہ تصویریں "پلے بوائے" یا کسی ایسے ہی امریکی پرچے کو بھیج دوں تو ہزاروں ڈالر کی صورت میں زرِ مبادلہ کما سکتا ہوں۔"

وہ ہنس کر بولی "مگر اس زرِ مبادلہ کو ڈکلیئر نہ کرنا۔"

"ہاں" وہ ہنس کر بولا "پھر اسی طرح ہم سرمایہ دار بن جائیں گے۔"

"اور پھر تم اپنی ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول لینا۔"

"اپنی کیوں؟ بیگ صاحب کی ایجنسی ہی خرید لیں گے۔"

"میں اس ایجنسی کی فوٹو گرافر بنوں گی۔"

وہ خوب ہنسا "تم؟"

"ہاں۔"

"کیوں"

"میں میل ماڈلز کی تصویریں اتاروں گی۔"

"او کیتیا! ایک میل ماڈل کا تو کچومر نکال دیا ہے۔ اب باقیوں کا ستیاناس کرنا ہے۔"

"اور کیا" وہ دیسے ٹھکا کر بولی "کیونکہ کار نہیں ہے اس لئے ہر سال اس کا ماڈل بدلنے سے تو رہی۔ لہٰذا میل ماڈل ہی بدلنے چاہئیں۔"

اسی طرح چہلیں کرتے کرتے نفیسہ نے یہ فرمائش کی کہ اس کی بھی ایک خوبصورت سی تصویر کسی اشتہار میں آئے۔

"چھوڑو یار" وہ بولا "بیوی کو اشتہار نہیں بنایا جا سکتا۔"

"اس سے پہلے بھی تو تم نے سمندر والی تصویر کا کور بنوایا تھا۔"

"وہ اور بات تھی۔"

"کیا اور بات تھی ؟"

"اس وقت تم محض ایک لڑکی تھیں میں تمہارے نام تک سے بھی واقف نہ تھا۔ مگر اب تم میری بیوی ہو۔"

"بھئی کیا لغو سی بات کی ہے۔ کسی کو کیا پتہ کہ یہ تمہاری بیوی کی تصویر ہے جیسے اور ماڈلز کی چھپتی ہیں ویسے ہی یہ بھی چھپے گی۔"

"مگر . . . . ."

نفیسہ اس کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گئی "جان! میری قسم"۔ پھر بولی "چلو اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے تصویر کا معاوضہ نہ وصول کرنا۔"

نفیسہ کی نرگسیت تسکین کا یہ نیا انداز ترک کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ آئینہ میں اپنے جسم کی پرستش اور خاور کی پوجا سے ایک قدم آگے آنا چاہتی تھی۔ اب تک وہ اپنی آنکھوں سے خود ہی اپنے جسم کو خراج تحسین پیش کرتی آئی تھی۔ شادی سے پہلے کمرہ بند کر کے "تنہا تنہا!" شادی کے بعد خاور کے ہاتھوں نے آنکھوں کا کام کیا تھا مگر اب اسے ہزاروں آنکھوں کے آئینوں کی ضرورت تھی۔ لاتعداد مرد اس کی تصویر دیکھ کر خوابیدہ ہوسِ خریداری کی تحریک محسوس کریں گے یہ احساس ہی نشہ طاری کر دینے کو کافی تھا۔ اگرچہ خاور نے سختی سے انکار کر دیا تھا لیکن وہ بھی ٹرینڈ بیوی تھی اپنے خاوند کو ڈھب پر لانا جانتی تھی چنانچہ بیوی نے اس وقت جو طاری حبہ لوہا تپ رہا تھا۔

(۴)

وہ ساحل کی جگہ اور ریت پر لیٹی تھی بال بے ترتیب تھے پاؤں کے پاس ٹوٹتی لہر کا جھاگ دمک رہا تھا۔ آدھ کھلی آنکھوں میں جیسے کنوار پنے کے کچے سپنوں کا رنگ تھا۔ نیم وا ہونٹوں سے دو تین دانت نظر آ رہے تھے، وہ عجب بے خودی بلکہ خود سپردگی کے عالم میں لیٹی تھی یوں محسوس ہوتا گویا اس کی جنس نے جسم کے گرد ایک ہالہ بنا رکھا ہو ڈوبتے سورج کی ترچھی کرنوں نے اس کے جسم پر روشن دور سایوں کا عجب کھیل رچا یا تھا اس نے کھڑے ہو کر ایسے اینگل پر کیمرہ رکھا تھا کہ افقاً اور عموداً دونوں طرح سے جسم ابھر آیا تھا یوں کہ چھاتیوں میں سانس کی لرزش محسوس ہوتی تھی۔

ٹیبل لیمپ کی روشنی کے دائرہ میں نفیسہ جھک رہی تھی مگر خاور اس وقت شوہر کے برعکس پروفیشنل فوٹو گرافر تھا چنانچہ وہ تنقیدی نگاہ سے ایک ایک پہلو کا تجزیہ کر رہا تھا۔ چہرہ کو رِی ٹچنگ کی ضرورت نہ تھی اس لئے اسے بالکل نہ چھیڑا صرف ہونٹ سرخ کر دیتے، لباس پر چند ایسے شیڈ پیدا کئے کہ بے لباس کا احساس ہو۔ چھاتیوں کے نیچے شیڈ دے کر ان کی گولائیاں مزید نمایاں کر دیں پھر نپلس ابھاگر کرنے کو پنک رنگ میں برش ڈبویا مگر وہ فن کی خاطر اس حد تک جانے کو تیار نہ تھی، لیکن جو کچھ کیا یہ بھی بہت تھا۔

نفیسہ کے پاؤں کے پاس جب میچنگ رنگ کے موتیوں کے ہار کے ساتھ صابن کی تصویر چسپاں کر دی گئی تو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا گویا نفیسہ کو اس صابن سے نہانے کی ضرورت نہیں بلکہ صابن کو نفیسہ سے نہانے کی ضرورت ہے ــــ شاید اسی لئے تصویر دیکھی تو بیگ صاحب کو عملتا ہیئر چھو لینے کا احساس ہوا وہ کہہ رہے تھے۔

"خاور صاحب آکل کی بات کا مجھے بہت افسوس ہے۔"

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

" ایک لحاظ سے غلطی تمہاری بھی ہے "

" کیسے سر؟ "

" پہلی بات تو یہ کہ تمہیں اپنی بیوی سے ماڈلنگ نہ کرانی چاہیے تھی اور پھر اگر ایسا کیا تو مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا تاکہ میں کوئی ایسی ویسی بات نہ کرتا "

" سر! بات یہ ہے کہ میری بیوی ماڈلنگ نہیں کرتی، دراصل وہ بہت ۔ بہت ۔ فوٹو جینک ہے اس لئے ... اس لئے اس نے سوچا یعنی کہ میں نے سوچا ..... "

بیگ صاحب نے مسکرا کر بات کاٹی " کوئی بات نہیں " تمہاری وائف ۔ آئی مین ۔ تصویر بہت اچھی آئی ہے اور پارٹی یقیناً اسے پسند کرے گی "

" سر میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ تصویر نہ ہی استعمال کرتے تو ..... "

" نان سنس "

" سر! "

" میں تو فرم سے تمہاری اس ڈیووشن سے بہت متاثر ہوا ہوں چنانچہ آج صبح میں نے آفس سپرنٹنڈنٹ سے کہہ دیا ہے کہ کل کی تاریخ سے تمہاری پے میں ڈھائی سو کا اضافہ کر دے "

" تھینک یو سر! "

" تھینک یو سر نہیں، تھینک یو مسٹر خاور "

" نہیں سر ایسی تو کوئی بات نہیں میں آپ کا تابعدار ہوں "

" خاور رمائی بولئے! تم میں بہت ٹیلنٹ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم میں اپنے کام سے ڈیووشن ہے، تم اگر اس طرح محنت اور لگن سے کام کرتے رہے تو میں تمہیں کہیں سے کہیں پہنچا دوں گا "

" بڑی مہربانی سر "

بیگ صاحب بولے " مہربانی کی کوئی بات نہیں جب تم ہمارے لئے اتنا کچھ کرنے کو تیار ہو تو ہمیں بھی ہر طرح سے تمہاری قدر کرنی چاہیے رضوان صاحب امریکہ جانے کی سوچ رہے ہیں اگر ان کا جانا طے ہو گیا تو میں تمہیں ان کی جگہ جنرل منیجر بنا دوں گا " انھوں نے رک کر اپنے الفاظ کے اثرات اس کے چہرہ پر خوشی کی سرخی کی مانند پھیلتے دیکھے اور پھر بولے " اور اگر تم نے وہاں اپنی ورتھ ثابت کر دی تو کیا پتہ دو چار سال بعد تمہیں لاہور برانچ کا نگران بنا دیا جائے "

تو بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ خوش قسمتی ایک بدصورت بلکہ بہت بدمنظر شخص کے روپ میں مل جاتی ہے ۔

یہ خوشخبری سن کر نفیسہ برس پڑی۔

"اور تم نے جواب میں کیا کہا"

"کیا کہنا تھا شکریہ ادا کیا"

"شکریہ سے مراد نہیں، کیا اس خوشی میں تم نے انھیں دعوت کا کہا"

"نہیں تو"

"کیوں ۔؟"

"مجھے خیال ہی نہ آیا"

"یار! کمال کے آدمی ہو، آدمی بھی کیا تمہے فوٹو گرافر ہو"

"تم ٹھیک کہتی ہو" وہ شرمندگی سے بولا

وہ اسے بچہ کی طرح چمکار کر بولی۔ "کوئی بات نہیں اَب ڈنر کی دعوت دے آنا"

جب اس نے اگلے دن رات کے کھانے کے لئے کہا تو بیگ صاحب نے دعوت قبول کرتے ہوئے ہنس کر پوچھا۔

"ایمان سے کہنا یہ ڈنر کس کا آئیڈیا تھا۔"

"سر" وہ شرمسار ہو کر بولا۔ "میری وائف کا۔"

وہ ہنسے۔ "میں نے بھی یہی سوچا تھا ورنہ تم کل خود ہی کہتے۔"

"جی سر!" وہ فخر سے بولا "وہ بہت سمجھدار عورت ہے۔"

"یس، یس! اور خاصی پریکٹیکل بھی"

"یس سر!"

بیگ صاحب نہ صرف وقت سے نصف گھنٹہ پہلے پہنچے بلکہ نفیسہ کے لیے ایک خوبصورت میکسی بھی لے کر آئے۔

پھر جواب میں بیگ صاحب نے "جیس" میں ان سب کو مدعو کیا۔

پھر اس کے جواب میں نفیسہ نے ان کا ایک اور ڈنر کیا تو بیگ صاحب مگرمچھ کی کھال کا امپورٹڈ شولڈر بیگ لے کر آئے انھیں دعوتوں کے دوران خاور منیجر بنا دیا گیا ادھر جنرل منیجر کا جانا بھی طے ہی تھا اور خاور کو یقین تھا کہ سال کے اندر اندر اس کی تنخواہ چار صفروں والی ہو جائے گی۔

(۵)

خاور سیٹ کام کر رہا تھا کہ بیگ صاحب کا فون آیا وہ اسے گھر پر بلا رہے تھے۔ بیگ صاحب کو فارن ٹور سے واپس آئے ابھی چند ہی روز گزرے تھے اور وہ کام میں مصروف رہے تھے۔ خاور پہلی مرتبہ ان کے گھر آیا تھا سوسائٹی میں نہایت نفیس کوٹھی اور اندر سے ایسی آراستہ گویا کسی فلم کا سیٹ ہو۔ اس خوبصورت کوٹھی میں اگر کوئی بدصورتی تھی تو وہ خود بیگ صاحب ہی تھے

ان کی بیگم بھی چالیس سال سے کم نہ ہوں گی اور بس یوں ہی سی تھی۔

"خاور! مائی لوائے"۔ وہ اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

"میں نے جنرل منیجر سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا اور وہ تمہاری بہت تعریف کر تا تھا۔"

"سر! یہ ان کی عنایت ہے۔"

"YOUHAVEDONE WELL ! BOY!!"

"رضوان صاحب کا امریکہ جانے کو تو کچھ بن نہیں رہا۔"

"کوئی بات نہیں سر!"

"خاور میں تمہیں ہر لحاظ سے پوسٹ اپ کرنا چاہتا ہوں۔"

"تھینک یو سر!"

"ہم ایک نئی پوسٹ کریئیٹ کر رہے ہیں۔ ٹورنگ جاب، ایئرٹریول، فور سٹار ہوٹلز، ڈیل پے۔ لگژری، لگژری۔ INTERESTED؟"

خاور کا دل خوشی سے چھلانگیں لگا رہا تھا۔

"سر!..... سر..... ۔" اس کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی، حلق خشک ہو رہا تھا اور آنکھوں میں پانی!

بیگ صاحب اسے بغور دیکھتے رہے اور سگار کے کش لگاتے رہے۔ "THEN ITS DONE?"

"DONE, SIR"

جب دونوں نے ہاتھ ملایا تو خاور کانپ رہا تھا۔

کافی پیتے ہوئے بیگ صاحب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر بولے "خاور! میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں اور ہر لحاظ سے تمہیں پروموٹ کرنا چاہتا ہوں۔" خاور نے بولنے کے لئے منہ کھولا مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "بار بار تھینک یو نہ کہو۔ تم ایک نوجوان اور محنتی انسان ہو اور تمہیں زندگی میں آگے ہی جانا ہے۔" کچھ دیر تک وہ رک کر سگار پیتے رہے پھر جھک کر رازدارانہ لہجہ میں بولے:

"اب جو میں تم سے کہوں گا یہ بالکل ذاتی اور کونفیڈنشل ہے۔ NOT A WORD TO ANYONE" وہ انگلی ہلا کر بولے۔

"I UNDERSTAND, SIR"

"ہم چند دوستوں نے ایک خفیہ کلب بنا رکھی ہے۔ KEY CLUB۔"

"کی کلب؟"

"ہاں" وہ چابیاں ہلاتے بولے۔ "یہ چند بے تکلف دوستوں کا سرکل ہے۔ مہینہ میں ایک یا دو مرتبہ ہم سب ایک جگہ جمع ہوتے

ہیں۔" "JUST TOEAT AND DRINK AND - BE MERRY" وہ چٹکی بجا کر بولے۔ "کھانا پینا تو خیر ہوتا ہی ہے مگر اصل جام آخری چیز میں ہے۔ ہم بلو فلمیں دیکھتے ہیں۔ کبھی کوئی اچھا سا V.L.R ہاتھ آجاتا ہے تو کبھی زندہ ناچ۔"

انہوں نے آنکھ مار کر زندہ ناچ کی جیسے وضاحت کر دی۔ خاور دم سادھے سن رہا تھا۔ "مگر ایک وقت آیا کہ ہم سب اس سے بور ہو گئے تو ہم میں سے ایک نے۔ ان فیکٹ میں نے۔ بیویاں بدلنے کی تجویز پیش کی۔" خاور کو جھٹکا سا لگا۔ یہ بیگ صاحب اس کی توقع اور پھیلی افواہوں سے بھی زیادہ رنگیلے نکلے ہیں اور پھر اس نے سوچا مسز بیگ جس کسی کے حصے میں آئی ہوگی وہ تو بے چارہ گھاٹے ہی میں رہا ہوگا۔ بیگ صاحب بتا رہے تھے۔" اس خاص دن گھر میں صرف بیوی ہوتی ہے جسے تالہ میں بند کر کے آجاتے ہیں یہاں اپنے اپنے گھر کی چابیاں ایک باکس میں ڈال دیتے ہیں جس کے ہاتھ جس کی چابی آجائے۔ وہ اس رات وہاں کا مہمان ہوتا ہے۔"

" اور بیویاں ؟" وہ حیرت سے بولا۔

" THEY LOVEIT " وہ جوش سے بولے۔" دراصل ہم سب اتنے بے تکلّف دوست ہیں کہ آپس میں کسی قسم کا پردہ نہیں رہا۔"

" اس میں کون کون لوگ شامل ہیں۔"

بیگ صاحب نے جن چھ سات آدمیوں کے نام لئے ان میں سے رضوان کو چھوڑ کر باقی سب معروف بزنس میں تھے لاکھوں میں کھیلنے والے۔" ہم سب ایک کنبہ کی طرح ہیں ایک دوسرے کے ہر لحاظ سے کام آتے ہیں۔ گذشتہ دنوں مجھے کچھ کیش کی ضرورت تھی فوراً مجھے پچاس ہزار روپے مل گئے۔" وہ ایک دو لمحہ اسے دیکھتے رہے پھر بولے۔" رضوان بھی تمہاری طرح بہت جونیئر تھا لیکن اس میں ٹیلنٹ تھا سو اسے ہم نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔"

"ЗWANT YOU TO JOIN THI CLUB"

فلموں میں ایسے سین پر پس منظر کی موسیقی میں سازندوں کا ایک زوردار چھناکا ہوتا ہے لیکن خاموش کمرہ میں اگر چھناکا ہوا بھی تو اس کی گونج خاور کے دل تک محدود رہی۔ البتہ ان تالیوں میں واقعی گونج تھی جو کی کلب کے نئے ممبر کے اعزاز میں بجیں، رضوان نے خاور کو گلے لگا لیا۔ بیگ صاحب نے پیٹھ تھپتھپائی باقی ممبران نے نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا رات گئے تک کھانا پینا رہا۔ انہوں نے سویڈن سے منگوائی گئی تازہ ترین بلیو فلم بھی دیکھی مگر خاور عجب تناؤ کے عالم میں بیٹھا تھا حتیٰ کہ بلیو فلم بھی تسکین نہ ثابت ہو سکی۔

پھر بیگ صاحب نے ایک خوبصورت اور جڑاؤ جیولری باکس نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"NOW ! GENTEL MEN !"

وہ سات میز کے گرد گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ درمیان میں گول میز پر جیولری باکس چمک رہا تھا بیگ صاحب کی آواز گونجی۔

" ایک - دو - تین "

سب جھپٹا مار کر آگے بڑھے اور اگلے لمحے باکس خالی تھا اور خاور کا ہاتھ بھی! سب خوش ہو کر چابیوں کے ساتھ بندھے ٹیگ پر سے نام اور پتے پڑھ رہے تھے۔

" I GOT NAFEESA " بیگ صاحب خوش ہو کر چلائے پھر انہوں نے خاور کے خالی ہاتھ دیکھے اور اس کا لٹکا ہوا منہ — اور دیدے نچا کر بولے:

" THIS IS THE LAST SURPRISE " وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر بولے:

" بعض اوقات کسی کی بیوی فضلی کورس میں ہوتی ہے تو اس رات ایک چابی کم ہو جاتی ہے۔ جو چابی لینے سے رہ جائے وہ کانا چور بنتا ہے " اس پر سب نے کانا چور کانا چور کہہ کر قہقہے لگائے۔

رضوان صاحب بولے " کوئی بات نہیں یار "

" NEXT TIME YOU WILL BE LUCKY " دوسرے نے کہا اب سب کو جانے کی جلدی تھی اور وہ یہی ظاہر تھی۔ مگر ان سب کی کاریں ایک ہی راستہ پر کیوں جا رہی ہیں اس نے تعجب سے سوچا۔

اب ساری رات کہاں بسر کرے گھڑی دیکھی تو دس ہو رہے تھے چلو سینما میں چلتے ہیں۔ سڑک پہ چلتے چلتے اسے ایک فلم پوسٹر نظر آیا فلم تھی " THE KEY " اس میں صوفیہ لورین تھی۔ پوسٹر کے آگے کھڑا ہنستا رہا " دی کی " کی کلیپ۔ واہ! کیا اتفاق بلکہ حسنِ اتفاق ہے اور پھر پوسٹر پر لکھی عبارت پر اس کی نظریں جم گئیں۔

" TO THEE I WED WITH THIS KEY "

وہ ہنسا۔ کیا خوب لکھا ہے۔ چلو یہی فلم دیکھتے ہیں اور جب فلم دیکھ کر اور کئی گھنٹے ایک بار میں ضائع کر کے صبح چار بجے کے قریب گھر پہنچا تو سب کی کاریں ابھی تک وہیں موجود تھیں۔

سنگِ زیست

سائرہ ہاشمی

اس کی تقدیر کا اندھیرا اس کی آنکھوں میں اُتر آیا تھا۔ اور اِن بند آنکھوں کے پیچھے اُس سے اُن رنگوں اور بے چارگیوں کو بھی بند کر لیا تھا جن سے باہر اُسے بہت کم معلوم تھا۔ چیتھڑوں اور بوسیدہ چٹائیوں سے بنے ہوئے اُن جھونپڑیوں کے درمیان بیٹھی وہ اُداس ہو رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اچانک ہی دُکھنے لگی تھیں اور پھر یہ دُکھن دِنوں ہی اُس کو بے چین کئے رہی تھی اور اب وہ اپنے گرد پھیلی اور بکھری آوازوں سے اپنا ناطہ جوڑنے کی کوشش میں نڈھال ہو جاتی تھی۔ پُل کے اُوپر گزرتی موٹر گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور ہارن اُس کو تنبیہ لگتے کیونکہ ماں اور اُس کے بہن بھائی جب ہاتھوں میں کٹورے پکڑے بھیک مانگنے یا گندگی کے ڈھیروں پر سے چھیچھڑے اکٹھے کرنے چلے جاتے تو وہ یکدم اپنے آپ کو اکیلا پا کر خوفزدہ ہو جاتی اور اس کی آنکھوں کے پیچھے سورج کی روشنی کا آخری سایہ بھی مٹ جاتا۔ تب وہ آہستہ سے اُٹھتی اور سہج قدموں سے سڑک کے کنارے کھڑی ہو جاتی۔ وہ چند دن پیشتر ہی تو اُن سب کے ساتھ بھاگتی پھر رہی تھی......

ریلوے پھاٹک پر رُکی موٹر گاڑیوں کے پاس جا کر وہ بھیک مانگنے میں سب سے تیز تھی۔ اور جب وہ اُن گاڑیوں میں بیٹھی خوب صورت عورتوں کو دیکھتی تو اُس کی آنکھیں حیرانی سے پھیل جاتیں۔ وہ بھیک مانگنا بھول جاتی اور اُس چہرے کو تکے جاتی۔ اس کا دِل چاہتا کہ وہ آگے بڑھ کر اُس کے ملائم بالوں کو چھو لے۔ اُس کے رنگین کپڑوں کی ملائمت پر ہاتھ پھیرے کئی بار وہ تیز جاتی گاڑیوں کے ساتھ دُور تک بھاگتی چلی جاتی۔ اسے بھیک مانگنے کے سب طریقے ہی تو آتے تھے۔ اُسے رنگین چیزیں اچھی لگتی تھیں....

اُس نے اپنی جھونپڑی کے سامنے پھولوں کے چند پودے بھی رکھے تھے۔ اُسے ٹھنڈی ہواؤں میں بڑا مزہ آتا تھا.... اُس کا دل چاہتا وہ اپنے بازو پھیلائے کھلے میدان میں بھاگتی چلی جائے... کبھی چڑیا کی طرح اُوپر ہی اُوپر اُڑتی جائے......وہ اپنی بستی میں سب سے تیز اور لڑاکا تھی لیکن یہ اندھیرا.. اور یہ اکیلا پن..... وہ سڑک کے کنارے کھڑی آوازوں کے شور میں بھی اکیلی رہ گئی تھی.......

اُس کی آنکھیں ابھی تک درد کر رہی تھیں۔ درد میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ وہ بے بس سی ہو رہی تھی۔ وہ واپس آ گئی....اس نے اپنے گرد پھیلی چیتھڑوں سے اُٹھتی مانوس بُو کو سونگھا..... اور گھبرا کر موتی کو پکارنے لگی ... موتی ......موتی لیکن موتی بھی کہیں چلا گیا تھا... دوپہر میں لُو کے تیز بدبو سے بھرے ہوئے جھونکے اُس کے گرد چکر لگا رہے تھے..... جھونپڑیوں کے گرد چکر لگا رہے تھے ــــ وہ خوش نہیں تھی .... لیکن وہ خوش رہنا چاہتی تھی.... ساتھ کی جھونپڑی میں چوڑیوں کی جھنکار کے ساتھ ماسی کی مدھم مدھم ہنسی کی آواز بھی آ رہی تھی۔

ماسی کیا تم آگئی ہو ..... وہ اس سے پوچھنے لگی ..... اُسے ماسی کی چوڑیوں کی جھنکار بڑی اچھی لگی ..... اُسے رنگین چوڑیوں سے ہمیشہ سے پیار تھا ..... اُس نے اپنی کلائی میں پڑی چوڑیوں کو ہولے سے چھیڑا ــــ آگے بڑھ کر اور ٹٹول کر ماسی کی کلائی پکڑی .... اسے اندھوں کی طرح ٹٹولنا بُرا لگ رہا تھا۔ لیکن یہ اندھیرا تو عارضی تھا ..... وہ بھی سب لوگوں کی طرح پھر سب کچھ دیکھنے لگے گی .... گاڑیوں میں بیٹھی عورتوں کو دیکھے گی .... ان کے ساتھ ساتھ بھاگے گی۔

"ماسی کیا رنگ ہے تمہاری چوڑیوں کا بھلا ..... وہ ان پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"لال ہیں بالکل لال پورے پانچ روپے کی چڑھوائی ہیں میں نے ...." ماسی نے فخر سے جواب دیا۔

"کیا یہ گاڑی والی عورتوں جیسی ہیں"..... وہ پھر بولی۔

"ہاں بالکل ویسی ہیں ...."

"میں بھی ماں سے کہوں کی مجھے بھی نئی چوڑیاں چڑھوا دے۔" وہ اپنی بند آنکھوں کا سوچ کر رنجیدہ ہو گئی۔

"ماسی کیا پھاٹک پہ اب بھی گاڑیوں کی اتنی ہی بھیڑ ہوتی ہے؟" وہ بات کرنے کی کوشش میں بولی۔

"تو کیا تم سوچتی ہو تمہاری آنکھوں کے ساتھ گاڑیاں بھی غائب ہو جائیں ..... ماسی نے بے رحمی سے اپنا ہاتھ پرے کرتے ہوئے جواب دیا۔

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی ..... "میری آنکھیں ہمیشہ کو خراب نہیں ہیں گی"۔ وہ تیزی سے بولی اور ماسی کے پاس سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی .... "ماں کہتی تھی میں جلدی ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ ...... ماں میری آنکھیں بڑے ڈاکٹر کو دکھائے گی"...... وہ واپس آتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی ..... اُسے ماسی بُری بُری لگی ......" اور ماسی نے زور سے کہا تھا۔

"اندھی ہو گئی ہے لیکن مزاج ویسا ہی گرم ہے"۔

"تو میں اندھی ہو گئی ہوں ...." اُسے لگا جیسے اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا بھیک کا کٹورا چھن سے گر پڑا ہو۔ جیسے وہ کسی تیز جاتی گاڑی تلے آ کر کچلی گئی ہو۔ ... جیسے اُس کا گلا کسی نے زور سے دبا دیا ہو ..... اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے تنے اندھیرے سے وحشت ہونے لگی ..... اسے محسوس ہوا جیسے اس کا نچلا دھڑ پتھر کا ہو کر اُس کو زمین کے اندر گھسیٹ رہا ہو۔ اُس کے دل میں چبھ رہا ہو۔ اس کے گلے میں چبھ رہا ہو۔ اُس نے اپنی انگلیوں سے اپنی دونوں آنکھوں کو کھولنا چاہا۔ لیکن درد کی تیز لہر نے اس کے ذہن کو سُن کر دیا۔ اُس نے سہارے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیئے۔ لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا ....

"میں ماں سے کہوں گی .... میں کیوں اندھی ہونے لگی ..... اندھی ہو گی ماسی ..... خدا کرے اس کی ساری چوڑیاں ٹوٹ جائیں"۔

وہ نڈھال ہو کر چیتھڑوں کے ڈھیر پہ بیٹھ گئی ... اُس کا سارا وجود بھی خوف سے سن ہو گیا تھا ..... سورج کی تمازت دھوپ میں گھل کر اور بھی دہک رہی تھی اس نے اپنی پھٹی چنری کے پلو سے آنکھوں کو ٹٹول کر پونچھا .... لیکن اندھیرا کسی طور ختم نہیں ہو رہا تھا۔

" ماں "..... وہ پوری طاقت سے چلائی..... اور پھر اُس نے اپنا پسینے سے تر بتر چہرہ چیتھڑوں کے ڈھیر میں چھپا لیا۔

دھول۔ چیتھڑوں کی بدبو..... ہڈیوں کا ڈھیر۔ بکریوں کی مینگنیاں۔ رکھوالے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں۔ رحموں کے ٹرانزسٹر سے گائے جانے والے فلمی گیت... ماں کی جھڑکیاں اور تیز جاتی موٹر گاڑیوں کی پوں پوں۔ سب اُس کی بند آنکھوں کے سامنے بڑی ترتیب سے ایستادہ ہو گئے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ سب یادیں اندھیری رات میں ڈوبتی جا رہی تھیں..... وہ سالوں سے ماں کا ہاتھ پکڑے اپنے قدموں کی گنتی پوری کرتی مارکیٹ میں مخصوص جگہ پر جا بیٹھتی..... اور کوشش کرتی کہ زمانوں پہلے دیکھی ہوئی چیزوں کے رنگ اُسے بھولنے نہ پائیں..... لیکن سب کچھ دھندلاتا جا رہا تھا..... وہ سارا دن ہاتھ پھیلائے صدا لگائی ہوئی اپنے آپ کو بھی اجنبی لگتی..... جب سب طرف خاموشی ہوتی تو کئی بار چپ بیٹھی اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگتی..... اب ساری دنیا صرف آوازوں میں ڈھل رہی تھی۔ اُس کا ناطہ جسموں سے کٹ رہا تھا آوازیں.. صرف آوازیں.....

جب شام کو اُس کی ماں اُس کی پیسوں سے بوجھل جیب کو دیکھتی تو خوش ہو کر اُسے کون آئس کریم لے دیتی اور وہ کون کو دل ہی دل میں چاٹتے ہوئے کہتی..... اندھا ہونا کوئی خاص گھاٹے کی بات تو نہیں۔ بابو لوگ۔ خود ڈرائیو کرتی ہوئی بیگمیں۔ جینز پہنے ہوئے جوان لڑکیاں۔ ماں باپ سے بے قابو ہوتے ہوئے چھوٹے بچے۔ سب ہلکے قدموں سے چلتے ہوئے اُس کے تصور کی سکرین پر ابھرتے ڈوبتے رہتے۔ اُسے نہ جانے کیسے عادت پڑ گئی تھی کہ اُس کی جاگتی زندگی کے دس سال جو بے خبری ہی میں گزر گئے تھے پچھلے چار سالوں میں ذہن کی خوابیدہ تہوں سے ابھر کر اُس پاس ہی منڈلاتے رہتے..... سایوں کی مانند۔

مخصوص ہارنوں کے ذریعے وہ اُن لوگوں کو پہچانتی تھی جو اُسے خیرات دیتے تھے۔ سارا دن کے بعد جب وہ اپنی بستی میں جاتی تو وہ اپنے آپ کو اُس سے مانوس نہ کر پاتی۔ آوازیں بدل جاتیں اور مختلف بوئیں اُسے گھیر لیتیں۔ تب اُسے دن میں دیکھے گئے خوابوں سے ایک الگ ہی دُنیا کا احساس ہوتا۔ ہنڈیا سے اُٹھتی خوشبو بکریوں کے جسموں سے اُٹھتی بو..... فلمی گیتوں کی تیز آواز جو اُس کے ذہن کی سوچوں کو گڑبڑا دیتیں۔ وہ خاموش میٹھی گیتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگتی اور پھر اُس ہوا کا احساس کرنے لگتی جو اُس کے بالوں کو اٹھا رہی ہوتی یا اُس کے بوسیدہ دوپٹے کو اتارنے کی کوشش کرتی۔ تب اُسے ایک خواب سا یاد آ جاتا..... ایسا خواب جس میں رنگ ہوتے۔ گاڑیوں کے رنگ چوڑیوں کے رنگ..... خوبصورت چہروں کے رنگ..... خوبصورت بادلوں کے رنگ۔ رنگین کپڑوں کے رنگ..... اور جھونپڑیوں کے گرد پھیلی دھول کا رنگ وہ ہمیشہ کی طرح گھبرا کر اپنی آنکھیں ملنے لگتی۔

" ماں کیا آسمان پر تارے نکلے ہوئے ہیں؟" اُس کو نہ جانے آسمان اور اُس پر بکھرے ستارے آج پہلی بار کیوں یاد آ رہے تھے۔ اس کا دل اُس کے پہلو میں دکھ سا رہا تھا۔ اُس روز نفضلاں۔ شیداں۔ ننھی اور پھیا اُس کے پاس ہی بیٹھی آپس میں باتیں کر کے ہنس رہی تھیں۔ باتیں جن میں مختلف گاڑیوں اور سکوٹر والے بابوؤں کے نام تھے۔ جو اُن کی طرف دیکھ کر ہنستے تھے اور بہت ساری خیرات دیتے تھے۔ وہ سب اُس کی موجودگی سے لاپروا باتیں کئے جا رہی تھیں..... اور اُسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ زمین اتنی ہموار نہیں ہے جتنا وہ سمجھتی رہی ہے۔ دنیا اس روشنی کی جھلملاہٹ سے زیادہ روشن ہے۔ دنیا میں صرف آوازیں نہیں جسم بھی شامل ہیں۔

ایسے جسم جو اس بستی سے تعلق نہیں رکھتے۔ دنیا صرف چلتے قدموں کی دھمک۔ آوازوں اور تیز جاتی گاڑیوں سے پیدا زمین کے ارتعاش اور ہاتھ میں پکڑے کٹورے ہی کا نام نہیں۔ اس میں ہونٹوں پر آتی ذو معنی ہنسی بھی ہے جو صرف سہیلیوں کے ساتھ ہی ابھرتی ہے۔ ایسی باس جو فضلاں۔ رشیداں۔ نعمی اور بھیا کی باتوں سے نکل کر سب طرف پھیل رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی ان کا ساتھ دے...

... لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ ان جیسی نہیں ہے اس لئے وہ اُن جیسی باتیں نہیں کر سکتی۔

"وہ دِن کدھر چلے گئے ..... روشنی کیوں نظر نہیں آتی۔" اُسے لگا جیسے اس کی ٹانگیں بھی اس کے دھڑ سے علیحدہ ہو کر گر پڑی ہوں اور وہ ایک بے جان لوتھڑا ہو جو ہڈیوں کی طرح مردہ اور چیتھڑوں کی طرح گندہ اور بدبودار ہو۔

تب اُس نے ماں سے ستاروں کے بارے میں پوچھا تھا اور ماں نے کہا تھا۔

"تیرے لیے سب برابر ہیں۔ ستارے ہوں یا نہ ہوں۔"

"فرق پڑتا ہے ماں۔ فرق پڑتا ہے۔" وہ زور سے چلائی۔

"بتاؤ کیا ستارے ہیں؟ کیا ہمارے گھر میں دیا جلتا ہے؟" اور پھر وہ چارپائی پر اوندھی ہو کر زور زور سے رونے لگی۔

"بے چاری ناصراں" ... اس کی چاچی نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ساری جوانی کیسے گذارے گی۔" چاچی کا ہاتھ بدستور اس کے سر پہ رکھا تھا۔

"ماں لوگ بخشش میں صرف پیسے کیوں دیتے ہیں؟ اللہ کرے کوئی باؤ ایسا بھی ہو جو بخشیش میں مجھے دو آنکھیں دے دے تاکہ میں پھر دیکھنے لگوں۔"

وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "ماں کیا دیا جلتا ہے۔" اُس نے اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹا۔

کیا کرے گی دیئے کو؟ ماں کی آواز میں تعجب تھا۔

"تو بتا تو سہی۔" وہ ہاتھ آگے پھیلا کر اندازے سے جھونپڑی کی طرف چل پڑی۔ اب اس کے اندر بڑھنے کی ساری حسیں مر چکی تھیں ......

اس کی چھوٹی بہن نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جھونپڑی میں پڑے ہوئے دیئے کو جلا دیا۔

"نذیراں کیا میں بھی ماں کی طرح ہی لمبی ہوں۔" اس نے نذیراں کا ہاتھ زور سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"اگر تیری آنکھیں خراب نہ ہوتیں تو تو سب سے اچھی لگتی۔ سب کہتے ہیں تو پھر بھی اچھی لگتی ہے۔" نذیراں پیار سے بولی

"کیا تو سچ کہتی ہے؟" وہ شرما گئی تھی۔

"اللہ کی قسم۔" نذیراں کا دِل اُس کے لیے دُکھ رہا تھا۔ وہ کھڑی اسے دیکھنے لگی۔ "یہ تیرے سامنے ہی دِیا رکھا ہے۔ کیا کرے گی تو دیئے کا؟"... نذیراں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"تو جا جا کر روٹی کھا لے۔" وہ زمین پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔... اور اپنی آنکھوں کو دیئے کی سیدھ میں لے گئی ....

اُس کی بند آنکھوں کے پپوٹوں میں روشنی اور اندھیرے کی جھلملاہٹ اُتر آئی .....

ہاں .... دنیا میں ابھی بھی روشنی ہے۔ اجالا ہے .... اور وہ چپ چاپ دیئے کے سامنے جھکی آنسو بہاتی رہی —— سب گھر والے اُس کو شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"بے چاری کے دماغ پر اثر ہونے لگا ہے".... چاچی کی آواز میں بدستور پرانا درد تھا۔

اب وہ اپنی بستی کی سب سے زیادہ کمائی کرنے والی لڑکی تھی۔ اس کے باپ نے اپنی جھونپڑی پر نئی سرکیوں کی چھت ڈالی تھی دو دودھ دینے والی بکریاں خریدی تھیں۔ اب اُس کے باپ کا ریڈیو سب سے اونچی آواز سے بجتا رہتا۔ وہ سب کے درمیان بیٹھا بڑی معتبر آواز میں باتیں کرتا۔ اُن کی ہنڈیا میں پکتے گوشت کی خوشبو دور تک پھیل جاتی لیکن وہ اِن ساری خوشیوں کا باعث ہونے کا سبب بن کر بھی خوش نہیں تھی۔ اُس کے اندر سے اکیلے پن کی دھول کا مزہ اس کے منہ میں بھر جاتا اور اس کا دِل درد کرنے لگتا۔ ہولے ہولے جیسے کوئی اسے دبا رہا ہو۔ وہ گھبرا کر لیٹے سے اُٹھ کر بیٹھ جاتی اور چاہتی کہ اپنے سامنے تنی سیاہی کی چادر کو پھاڑ کر دور پھینک دے۔ اور سڑکوں پہ بھاگتی جاتے .... کسی کا ہاتھ پکڑے جو مضبوط اور طاقتور ہو۔ اپنی بستی کی دوسری لڑکیوں کی مانند۔ زندہ اور جاندار۔ لیکن کوئی ہاتھ اُس کی طرف نہ بڑھتا۔ شیراں۔ فضلاں۔ پھیا اور نتھی۔ سب کی شادیاں ہو چکی تھیں اور ان کے کرتوں اور جھگوں کے ساتھ بندھی ہوئی چاندی کی ننھی ننھی سی گھنٹیاں انوکھے سے راگ الاپتی ہوئی گئیں۔ اُن کی باتیں اور قہقہے .... وہ بھی اپنی بند آنکھوں سے خواب دیکھنے لگی۔ لیکن کوئی وجود بن نہیں پا رہا تھا۔ سب سوچیں آوازوں میں ڈھل جاتیں۔ مختلف آوازیں جو الگ الگ پہچان رکھ کر بھی سیاہی کے ایک بڑے سے الاؤ میں بھسم ہو جاتیں۔ اور وہ حیران بیٹھی رہتی۔ کیونکہ خوشبو۔ قہقہے۔ باتیں... گاڑیوں کے ہارن دوسروں کو دی ہوئی دعائیں۔ یہ سب وہ اجالا نہیں تھا جس کو پانے کی خواہش اُس کے دِل میں شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اُن پیسوں کو محسوس کر کے اپنے دِل کے اندر بڑے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتی ..... وہ جیب کے اندر ہی پیسوں کو مٹھی میں بھر لیتی لیکن خوشی کی ہلکی سی رمق بھی اُس کے اندر سے نہ ابھرتی۔ پھر وہ اپنی مٹھی کو ہولے سے کھول دیتی۔

"یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے"۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتی ... وہ قدموں کی آہٹ پہ چونک اٹھتی لیکن اس کا ہاتھ اُس کے پہلو میں لٹکا رہتا۔ وہ صدا دینا بھول جاتی پھر وہ چپ چاپ اپنے اندر کی آنکھوں کو بھی بند کر لیتی اور اندھیرے کی گہری کھائی میں ڈوبتی جاتی .....

"جوانیاں مانے ..... سوہنی جوانی دا صدقہ".... اس کی بستی کی کوئی اور عورت رقت بھری آواز میں کسی گاڑی یا سکوٹر والے مرد کو دعائیں دے رہی ہوتی .....

جوانی کیسی ہوتی ہے .... وہ سوچتی ... ویسے ہی بابو جو اُسے چھ سال پہلے نظر آتے تھے۔ لیکن تب اُسے جوانی کا مطلب ہی معلوم نہ تھا۔ اور آج وہ یاد کرنے پر بھی یاد نہیں کر سکتی تھی ... "مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں آ رہا" وہ اپنی آنکھیں زور زور سے کھولنے کی کوشش کرتی۔ انھیں بار بار ہتھیلی سے ملتی .... لیکن روشنی ..... وہ تو کہیں بھی نہ ہوتی ..... تب اُس کا جی چاہتا کہ وہ زور زور سے روئے ...... اپنی ماں کو پکارے لیکن وہ جانتی تھی کہ ماں شام سے پہلے کبھی نہیں آتی تھی ... وہ دِل ہی دِل میں ماں کو گالیاں

دینے لگی جس کی لاپرواہی نے اُسے روگی بنا دیا تھا۔

"یہ دنیا بڑی مطلبی ہے۔ ماں بھی باپ بھی اور سب دوسرے بھی.... انھیں میرے پیسوں سے مطلب ہے.... میرا دھیان کوئی بھی نہیں رکھتا۔ میں جو اتنا کماتی ہوں۔ ابّا چاہے تو میرا علاج کروا سکتا تھا..... لیکن پھر اُن کے لئے کمائے گا کون" یہ شک کا سپنولیا اُس کے ذہن میں رینگتا رہتا۔

اُس رات اُس نے اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے سے اُٹھ کر ماں سے پوچھا تھا..... وہ بے چین سی ہو رہی تھی......

"کیوں ماں میں بھلا دن میں کتنے روپے کما لیتی ہوں؟" اُس کو یہ سوال پوچھتے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔

اور ماں سے پہلے نذیراں نے جلدی سے کہا تھا "ناصراں ماں کہتی ہے اب ہمارے پاس بڑے روپے ہیں"۔

اُس کے دل میں ایک نئی امید جاگی تھی.....

"کیوں ماں نذیراں سچ بول رہی ہے؟" اس کی آواز میں تمنا کی ہلکی سی لرزش تھی۔

"بس ٹھیک ہے کر لے لیکن تو کیوں پوچھ رہی ہے؟" اس کا باپ غصے سے بولا۔ کیونکہ باپ کی جیب بھاری اور دل میلا جکٹ تھا۔

وہ اپنے اندر ڈھستی ہوئی ہمت کو اکٹھا کرنے کی کوشش میں چپ ہو گئی..... کچھ نہیں ابّا.... بس ایسے ہی پوچھا تھا۔

وہ جلدی سے لیٹ گئی۔ اور اپنوں کی خود غرضی کے تیز نوکیلے کانٹے اُس کے دل کو لہولہان کئے دے رہے تھے۔ زندگی کا پتھر اُس کے وجود سے بندھا اُسے ڈبو رہا تھا.....

"ابا میں چاہتی ہوں کہ تو میری آنکھوں کا علاج کروا دے"۔

اس کی زبان سے یہ الفاظ بے اختیار ہی پھسل گئے تھے..... وہ خوفزدہ ہو کر پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ لوگ کہتے ہیں میری آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ شہر میں بڑے بڑے ہسپتال ہیں مجھے ایک بیگم نے بتایا تھا" وہ بولتی رہنا چاہتی تھی مبادا اُس کا باپ اُسے ڈانٹے..... یا اپنے جواب سے مایوس کر دے۔

"ہوں..... ہوں....." اُس کا باپ حقے کا تیز کش لے کر بولا "تو تو علاج کروانا چاہتی ہے؟"

"ہاں ابّا"۔ اس کے اندر کی ہمت بالکل بجھ چکی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں اور اجالے کی تمنا جو برسوں سے اُس کے دل کے ساتھ ساتھ لگی ہمیشہ اس کی ساتھی رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے.... لیکن اُس کے لئے بڑا پیسہ چاہیے.. جب اتنا پیسہ اکٹھا ہو جائے گا تو میں تیرا علاج کروا دوں گا"۔ اُس کے باپ نے ٹرانزسٹر کی پوری آواز کھولتے ہوئے جواب دیا۔

فلمی گیت کی تیز آواز اُس کی ہمت کے کمزور سے بند کو اپنے تند ریلے میں بہالے گئی۔ گیت کا ساز آنسوؤں کے قطروں کی مانند اس کے دل کو بھگوتا جا رہا تھا۔ وہ اُسی شور کو سنتی اُن سب کے درمیان بیٹھی بے آواز روتی جا رہی تھی۔ لیکن اس کے اندر کا جہان تہہ و بالا ہو رہا تھا۔

"یہ مرد اور عورت.... یہ کیوں ایک دوسرے کو للکار رہے ہیں.... میرا مرد کون بنے گا..... کیا میں بھی کسی کے من

بھاؤں گی ۔۔۔۔ میرے دل کی پکار کون سنے گا ۔ میرا ہاتھ کون پکڑے گا ۔ میرے کرتے کے دامن میں کب موتی گیں گے؟ ۔۔۔" وہ اپنی نئی سوچوں پہ حیران ہو رہی تھی ۔

"کون اندھی راہ کا ساتھی ہو سکتا ہے؟" اُسے لگا جیسے وہ حیات کی لمبی اندھیری راہ پر نڈھال اکیلی ہی بھٹکتی پھر رہی ہو ۔ ماں باپ اور بہن بھائی سے دور ۔۔۔۔۔

تیز گرد آلود ہوا جھونپڑیوں کی بے بضاعت دیواروں کو ہلا رہی تھی ۔۔۔۔ اُس کے اندر بھی گرد بھر رہی تھی اور اس کے منہ میں بھی ۔۔۔

"یہ میری پروا کیوں کریں ۔ کمائی کا ذریعہ جو ہوں" اس کے دل میں دبا شک اُبھر رہا تھا ۔ "نذیراں کہتی ہے ہمارے پاس بڑے پیسے ہیں ۔۔۔۔ کہاں جاتے ہیں یہ پیسے ۔۔۔۔ میرا ہاتھ تو آگے پھیلے پھیلے تھک جاتا ہے ۔"

وہ ایک بار پھر رونے لگی ۔ ۔۔۔۔ بے بسی سے ۔۔۔

اور یہ بے بسی اس کے اندر نہ جانے کیسے کیسے گھاؤ کر دیتی اگر رحموں کا ہاتھ اُسے ایک نئی راہ پر نہ لے جاتا ۔ رحموں کا ٹرانزسٹر ہمیشہ کی طرح رات گئے تک بجتا رہتا ۔ اُسے لگتا رحموں خود یہ گیت اُس کے لیے گا رہا ہو ۔۔۔۔ تب اُس کے اندر کا جانور عجیب انداز سے چوکس اور چوکنا ہو کر ہر آہٹ پر اپنے ساتھی کا منتظر رہتا ۔ اُسے لگتا جیسے وہ آج سے آٹھ سال پہلے والی ناصراں ہو ۔ لیکن یہ اُس کے اندر کا چوکس جانور ۔ وہ دل ہی دل میں مسکرانے لگتی ۔ ۔۔۔۔ اب خیرات مانگتے اس کی آواز میں لوچ سا آ جاتا ۔۔۔۔ اپنے گرد پھیلی ہوئی آوازیں اُسے بڑی جاندار اور اچھی لگتیں ۔

ایک روز اُس نے رحموں سے پوچھا تھا ۔

"رحموں میں تجھے اچھی لگتی ہوں نا ۔ ماں کہتی ہے میرا رنگ سب سے گورا ہے اور میرے ہاتھ پاؤں بھی اچھے ہیں ۔ اور ماں میری مینڈھیاں بناتے بناتے تھک جاتی ہے" ۔۔۔۔ وہ بولے بولے سن رہی تھی اُس نے پل کے نیچے اندھیرے میں کھڑے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ رحموں کے سامنے پھیلا دیئے تھے ۔۔۔۔ "دیکھو رحموں ۔۔۔۔ میری انگلیاں کتنی لمبی لمبی سی ہیں ۔۔۔۔ اچھی ہیں نا"

اور رحموں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُس کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا ۔۔۔۔

"میں تیری آنکھیں ٹھیک کرواؤں گا ناصراں ۔ مجھ پر بھروسہ رکھ ۔ تو مجھے بڑی اچھی لگتی ہے ۔ بڑی ہی اچھی" ناصراں کے لیے یہ ہی بہت تھا ۔ اِن چند خوب صورت لفظوں نے اُس کے اندر اجالا کر ڈالا تھا جس کی چکاچوند میں اُسے باہر کا اندھیرا بھی پورا دکھائی نہ دیتا ۔ وہ ہر روز کچھ نہ کچھ پیسے اپنے پاس چھپا لیتی اور جب بھی موقع ملتا رحموں کو دے دیتی ۔ رحموں کہتا ۔

"مجھے تیری کمائی نہیں چاہیے ناصراں ۔ مجھے تو تو چاہیے" اور ناصراں کو لگتا جیسے اس کے سامنے تنے اندھیرے میں رنگ برنگ کی پھلجھڑیاں چھٹ رہی ہوں اور ٹھنڈک کا اَن چھوا ہاتھ اُس کے جسم پر آہستہ آہستہ پھسل رہا ہو ۔

"رحموں میں ہنڈیا پکانا جانتی ہوں ۔۔۔۔ اور میں ماں سے کہوں گی کہ مجھے کروشیا بھی سکھا دے پھر میں تیرے لئے بنیان بناؤں گی اور ریڈیو کا غلاف بھی بناؤں گی اور میں اپنی جھونپڑی کے سامنے بہت سارے پھول لگاؤں گی تو وہاں بیٹھا ہوا کتنا اچھا لگے گا" اُس نے اپنی انگلیوں سے رحموں کے منہ کو آہستہ سے ٹٹولا ۔ "تو میرے ساتھ خوش رہے گا نا رحموں ۔۔۔ لیکن میں تو اندھی ہوں ۔۔۔۔" وہ ہمیشہ کی طرح

خوفزدہ ہو کر بولی .... "پھر کیا ہے میں تو آنکھوں والا ہوں۔" رحموں ہولے سے ہنستا۔

"ناصراں کیا تو میرے ساتھ چلے گی ....؟" رحموں ایک دم بولا۔

"کہاں؟" ناصراں کا دل زور سے اُچھلا۔

"جہاں میں کہوں۔ پھر ہم دونوں نکاح پڑھوا لیں گے اور اپنا الگ گھر بسا لیں گے۔" رحموں اُس کے ہاتھ کو زور سے پکڑتے ہوئے بولا۔

ماں سے پوچھو نا ..... ناصراں کی آواز میں جذبات کی لرزش تھی۔

"تیرے ماں باپ تجھے کبھی نہیں بیاہیں گے۔ اگر تو چلی گئی تو انھیں چودھری کون کہے گا۔" رحموں طنز کرتے ہوئے بولا۔

"وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔" اس نے اپنے اندر کے شک کو دباتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ پیار کرتے تو تیری آنکھوں کا علاج نہ کرواتے۔"

"علاج کے لئے پیسے بھی تو ہوں۔" ناصراں کی آواز مدھم سی تھی۔

علاج کے لیے پیسے نہیں اور دارو پینے کے لئے پیسے ہیں۔

جوا کھیلنے کے لئے پیسے ہیں۔ سیروں گوشت پکانے کے لئے پیسے ہیں اور تو جو نینہ آندھی میں ہاتھ پھیلائے بیٹھی رہتی ہے۔ تیرے علاج کے لئے پیسے نہیں .... تو کچھ نہیں جانتی ناصراں۔ عقل بھی آنکھوں کے ساتھ ہی کام کرتی ہے۔"

وہ گلی کے اندھیرے میں کھڑی تھی .... اور سردیوں کی تیز ہوا ساں ساں کرتی اُن کے پاس سے گزر رہی تھی .... خودرَو پودوں کے بیچ میں سے گزر رہی تھی .... اُس کے دل کی اداس دنیا میں سے گزر رہی تھی۔ اور پھر اُس نے مایوسی کے اندھیرے میں کھڑے کھڑے ایک فیصلہ کر لیا۔ ایسا فیصلہ جس کی ہمت اُس میں اِس لمحے سے پہلے اور بعد میں نہیں ہو سکتی تھی۔ کوئی گہری دکھ کی لہر اُس کے دل سے اُٹھ کر اس کی آنتوں میں چل رہی تھی جیسے اُس کے اندر کوئی گہرا سا گڑھا کُھد گیا ہو اور وہ اس میں لڑھکنے ہی ہو۔

اُس نے ٹٹول کر رحموں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چل رحموں چل۔ میں تیرے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔"

"ناصراں سوچ لے تیرا باپ بڑا طوفان اُٹھائے گا۔ منہ سے چھنتا نوالہ برداشت سے باہر ہوتا ہے۔" رحموں خوش تھا۔

"اندھے پن کے اتنے لمبے برس میں نے صرف سوچ کر ہی تو گذارے ہیں۔ تیکھی اور نوکیلی سوچیں جنہوں نے میرے دل کے اندر ناسور بنا ڈالے ہیں۔ کسی کو مجھ سے پیار نہیں۔ سب پیسے کے پیارے ہیں۔ بارش آندھی اور بھری دوپہروں میں بھی ماں نے کبھی نہیں کہا کہ چل ایک دن آرام ہی کر لے۔ پھر میں اپنی راہ کیوں نہ لگوں کیوں ان کے لیے جان کھپاتی پھروں۔ تو چاہے مجھ سے جیسا سلوک کرے۔ تیرے منہ سے پیار کے دو بول تو سنے۔ دوسروں کو ہنستے بولتے سنتی ہوں تو میرا تن اور من مٹی کا ہو جاتا ہے۔ تیری میری کوئی سانجھ نہ ہو دو بولوں کی سانجھ تو ہو گی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے ....!"

ناصراں کی آواز میں ہمت اور حوصلہ تھا۔

اور پھر ناصراں نے رحموں کا ہاتھ پکڑا اور دِل کے اندھیرے سے نکل کر اُمید کی روشنی کے تعاقب میں چل پڑی۔ ایسی روشنی جو اس کی آنکھوں سے نکل کر سارے جہاں کو روشن بنا دے گی۔

"کیوں رحموں اوپر ستارے تو ہوں گے نا....."

اُس نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف کر کے پٹپٹائیں.... لیکن وہاں بدستور اندھیرا تھا۔ لیکن اس کے اندر امیدوں اور آرزوؤں کی دیپ مالا جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے لائنوں کو پار کرتے ہوئے ایک نئی بستی کو چل پڑے

ناصراں نے ماں باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا.... اور ان کی گالیاں اور دھمکیاں سننے کے باوجود وہ گھبرائی نہیں تھی وہ کیوں گھبراتی.... رحموں جو اُس کے ساتھ تھا.... دوسرے ناصراں صرف آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے ارادے کی آنکھوں میں تو بڑا یقین تھا۔

وہ رات کو ٹٹول کر رحموں کا ہاتھ پکڑ لیتی اور پھر اُس کے ہونٹوں تک ایک سوال آتے آتے رہ جاتا۔ وہ رحموں سے اپنے علاج کا پوچھنا چاہتی لیکن ایک انجانا سا خوف اُس کو گھیر لیتا.... وہ جانتی تھی اب صرف رحموں ہی اُس کا سہارا ہے اور وہ روشنی جو محبت کے روپ میں اُس کے دِل کے اندر پھوٹتی رہتی ہے.... لیکن وہ اِن خوشیوں کو پورا دیکھنا چاہتی تھی.... اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ.... لیکن بات کرنے پر رحموں نے بھی پیسوں کی کمی کا رونا رویا تھا..... پیسے اور روشنی..... کہاں سے آئیں گے یہ پیسے..... وہ دنوں اِسی ادھیڑ بن میں اُلجھی رہتی..... اور پھر ایک دن اُس نے کہا تھا.....

"رحموں تو مجھے مارکیٹ والی جگہ پہ چھوڑ آیا کر" اُس کے دل کے اندر آج بہت دنوں بعد پھر وہی درد اُٹھا تھا جس کا رشتہ اس کی آنکھوں کی روشنی سے تھا۔ اُس کی آواز میں پہلے جیسی امید نہیں تھی۔ آج پھر وہ آنکھوں سے کھو جانے کے ماتم میں مُبتلا تھی۔

"رحموں آنکھوں کے علاج کے لئے کتنے پیسے چاہئیں؟"

"یہی کوئی تین چار ہزار...." رحموں کی آواز کی بے تعلقی اس کو بری لگی تھی۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"یوں تو میری عمر ہی گذر جائے گی" وہ غمزدہ ہو کر بولی۔

"مجبوری ہے ناصراں میں اتنا پیسہ کہاں سے لاؤں" رحموں نے کڑوا سا دھواں اس کے منہ پہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"حیات اتنی لمبی کیوں ہے" وہ اُس رات بہت دِنوں بعد پھر رو رہی تھی اکیلی اور دکھی۔

اگلے روز رحموں اُسے مارکیٹ والی جگہ پہ چھوڑ آیا تھا....

"اللہ کی راہ پہ بابا۔ اندھی پہ رحم کرو" اُس کی آواز میں درد تھا اور آنسوؤں کی گُندھن بھی۔ وہ کئی مہینوں بعد اپنے اندر کی رنگین رُت سے باہر آئی تھی۔ ایسی رُت جہاں رحموں کی باتیں۔ اتنے خواب۔ ہونٹوں پہ گنگناتے ہوئے گیت اور ایسی خوشی تھی جو اُسے سرتا پا بھگوئے رکھتی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی یہ رُت بیت چکی تھی۔

"میں کئی جنموں بھی مانگتی رہوں تو وہ پیسہ میری ہتھیلی پر کبھی نہ رکھا جائے گا جو میری آنکھوں میں روشنی لا سکے۔" اس کی گالوں پر آنسو بہنے لگے۔ اُس کی آواز اس کے اندر ہی گھٹ گئی ..... اُس کا ہاتھ سامنے پھیلا ہوا تھا۔ خوشیوں کی بھیک مانگتا۔ روشنی کی بھیک مانگتا۔ لیکن وہ پھر بھی ناامید نہیں تھی۔

اب رحموں چرس کے سگریٹ پی کر سارا دن جھونپڑی میں بیٹھا تاش کھیلتا یا پوری آواز میں فلمی گیت سنتا رہتا۔ وہ جب رات کو ہاتھ تھامے اُسے واپس لاتا تو ایک بھی بات نہ کرتا۔ اُس کے ہاتھوں میں پہلے جیسی چاہت کی گرمی اور نرمی نہ ہوتی ..... اور وہ بھی اُس سے کوئی سوال نہ کرتی۔ حالانکہ اس کا دل چاہتا کہ وہ اس سے پہلے کی طرح باتیں کرے ..... اُس کی باتیں۔ جن میں اُس کی آنکھوں کے علاج کا بھی ذکر ہو ..... اُس کے جسم کی خوبصورتی کے نغمے بھی ہوں ..... اور اُس کے لبوں پہ وہ ہنسی بھی جو بچی اور اپنی اپنی سی لگتی تھی۔
لیکن اب تو صرف فلمی گیتوں کی آواز اور گہرا گہرا سا کڑوا دھواں ..... بچا کچھا سالن اور ٹھنڈی روٹی تھی ......

وہ راتوں کو اُٹھ کر بیٹھ جاتی ...... کہاں چلی گئی وہ روشنی ..... اُسے لگتا جیسے یہ اندھیرا اُسے نگل رہا ہو۔ پنجے نکالے اُس کی طرف بڑھ رہا ہو۔ کسی بڑے سے بھوت کی مانند اُس کو نوچ رہا ہو .....

یہ اندھیرے کی کاٹ اس کے زندہ وجود کو کاٹتی رہتی ..... اور وہ چپ چاپ جاگتی اپنی جھونپڑی کے گرد پھیلی آوازوں کو سنتے ہوئے اپنے درد کو بانٹنے کی کوشش کرتی ..... لیکن بے جان آوازیں اس کا درد بانٹ نہ سکیں۔

لیکن یہ درد اس ننھے سے وجود نے بانٹ لیا تھا جس کو اُس نے جنم دیا تھا۔ اس نے اُس وجود کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا ..... اور اُس کے چہرے پر پھولے ہوئے ہاتھ پھیرنے لگی۔

وہ اُسے چھوتی تو اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا اور پھر ایک سسکاری بھر کر چپ ہو جاتا۔ وہ چہروں کی پہچان بھول چکی تھی۔ ..... دوسرے چہرے تو دوسرے تھے لیکن یہ ننھا سا چہرہ تو اس کے وجود سے متعلق تھا۔

"اگر میں دیکھ سکتی ..... اگر میں دیکھ سکتی۔"

"کون ہوگا جو روشنی کے جہان کا راستہ دکھائے گا۔ ایسا راستہ جس پر میں اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر چل سکوں" ..... یہ سارا دکھ وہ اکیلی ہی برداشت کر رہی تھی ..... رحموں نے بھی اُس کو کمائی کا ذریعہ ہی سمجھا تھا .....

"مجھے بہت سارے پیسے اکٹھے کرنے چاہئیں تاکہ میں اپنی اندھی آنکھوں کی جوت واپس لا سکوں۔" کوئی اپنا نہیں ..... کوئی بھی نہیں۔" اس نے بہت دکھ سے صدا لگائی اکھیاں والیو۔ اکھیاں بڑی نیامت ......"

اکھیاں بڑی نیامت۔ اس کی آواز کی سچائی تڑپی ہوئی درد تھی وہ اپنے بیٹے کو اٹھائے اب آوازوں کے تعاقب میں چل پڑتی۔ کون آئس کریم کھاتے ہوئے لوگ۔ انگریزی بولتی ہوئی بیگمیں۔ دبی دبی ہنسی ہنستی ہوئی جوان لڑکیاں۔ تب اُسے لگتا جیسے وہ کوئی بھوت ہو جو روشنی اور اجالے کے تعاقب میں سرپٹ بھاگ رہی ہو۔ ایسا اجالا جو اس کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہو۔

"مجھے اپنے بچے کا چہرہ دیکھنا ہے ..... یہ خواہش ایک چیخ بن کر اُس کے اندر جگر کاٹتی رہتی ..... بھیک مانگتے ... خاموش بیٹھے۔ رات کو سوتے وہ اس چیخ کو بڑھتا محسوس کرتی۔

"مجھے اِس جاگتی دُنیا سے اپنا ناطہ دوبارہ جوڑنا ہے۔" اُس نے دِن بھر کی کمائی کو کس کر ایک پوٹلی میں باندھا اور اپنے نیفے میں اُڑس دیا اور اُس رات اُس نے رحموں کے ساتھ جانے سے اِنکار کر دیا۔

"نہیں رحموں۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ ..... میرا کوئی گھر نہیں۔ میں یہیں رہوں گی۔" جب رحموں نے اس کے کمزور جسم کو گھسیٹ کر لے جانا چاہا تو وہ زمین سے چمٹ گئی اور زور زور سے رونے لگی ..... لوگوں کے اکٹھا ہونے پر رحموں کو ناکام واپس جانا پڑا تھا۔ اُس نے کہا تھا۔

"رحموں میں نے تجھ سے کچھ لیا نہیں۔ دِیا ہی ہے اور جو کچھ دے چکی ہوں وہی غنیمت جان۔ اپنی راہ لے میں تیری باتوں اور تیرے بغیر بھی جی لوں گی۔ میں اندھی ہوں لیکن آنکھوں والوں کا سہارا ہوں۔ پھر میں کیوں ان کی آنکھوں کی لاٹھی پکڑوں۔ ..... میں اپنی راہ کو ٹٹول ٹٹول کر چلتی جاؤں گی۔ اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑے۔ تم واپس چلے جاؤ تیری میری کوئی سانجھ نہیں۔" اُسے وہاں بیٹھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ اپنی جھونپڑی ..... رحموں کے ریڈیو سے گائے جانے والے فلمی گیت ..... چولہے کی گرمی۔ اور بھی بہت سی باتیں جن میں اس کا حصہ تھا۔ بازار لوگوں کی آوازوں سے بھرا پڑا تھا۔ گاڑیوں کی آوازیں۔ بچوں کی آوازیں ..... شور جن میں انوکھی سی خوشی کی جھنکار تھی لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ وہ رحموں کو بھول جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنوں کی خود غرضیوں کو بھول جانا چاہتی تھی۔ آنسوؤں کے گرتے قطرے اس کی بند آنکھوں سے بہہ کر اُس کے چہرے کو بھگو رہے تھے ..... آنسو جیسے اُس کا دِل ریزہ ریزہ ہو کر باہر نکل رہا ہو۔

وہ بڑبڑا رہی تھی۔ "یہ دنیا بڑی مطلبی ہے۔ سارے رشتے مطلبی! اب اس کا کوئی بھی اپنا نہ تھا سوائے اپنے بچے کے!

اس رات وہ بہت مطمئن ہو کر ننگی زمین پر سو گئی ؛

کھلونے

جوگندر پال

نہیں، چھوٹے بابا، مجھے سردی نہیں لگ رہی ہے، نہیں، تمہارا یہ چھوٹا سا کوٹ مجھے کیسے پورا آئے گا، نہیں، چھوٹے بابا، میں لوہے کا بنا ہوا نہیں ہوں، لوہے اور لکڑی کے تو تمہارے کھلونے ہیں، ہاں، میں نے کب کہا کہ وہ دیکھنے میں پیارے نہیں ہوتے؟ ــــ ہاں بابا، ٹھیک ہے میں بڑا بھدا لگتا ہوں پر دیکھنے میں جو اتنے پیارے لگتے ہیں انھیں میری طرح اتنا کام نہیں کرنا پڑتا ــــ نہیں، مجھے سردی وردی بالکل نہیں لگتی۔ سردی کے بارے میں سوچنے لگوں تو یہ کام وام کون کرے؟ ــــ تمہارے لکڑی کے بندر کو یہاں پہاڑوں پہ پہنچتے ہی زکام ہو گیا تھا؟ یہ تو بڑے دکھ کی بات ہے چھوٹے بابا۔ اپنے سارے کھلونوں کو خوب لپیٹ کر رکھا کرو۔ ایک ایک اتنا قیمتی ہے۔ پردیس میں کسی کو کچھ ہو گیا تو یہاں گھر کے وہ سارے سکھ کہاں؟ ــــ میری بات چھوڑو چھوٹے بابا، میری قیمت ہی کیا ہے؟ ــــ نہیں، تنگ مت کرو۔ میں تمہارا گھوڑا نہیں ہوں بابا۔ تمہاری عمر اب جھوٹ موٹ کے گھوڑے پہ بیٹھنے کی نہیں رہی ــــ کیا۔ ا؟ ــــ تمہارے ڈیڈی کہتے ہیں، میں آدمی نہیں، گھوڑا ہوں؟ ٹھیک ہے، تمہارے ڈیڈی کہتے ہیں تو گھوڑا ہی ہوں گا ــــ آؤ مائی باپ، دیکھ کیا رہے ہو؟ چھلانگ لگا کر میری پیٹھ پر چڑھ جاؤ ــــ ار ــ رر ــ ٹھہرو، چھوٹے بابا، سنتے نہیں، بی بی جی بلا رہی ہیں۔ دیر ہو گئی تو تمہارے گھوڑے کو چابک مار مار کر ادھ موا کر دیں گی ــــ نہیں، میرے باپ، میں نے کب کہا کہ بی بی جی مجھے چابک مارتی ہیں؟ میں نے تو یونہی ایک بات کی ہے ــــ ہاں، میرے باپ، ٹھیک کہتے ہو، تم میرے باپ نہیں ہو۔ میں نے تو یونہی ایک بات کی ہے ــــ آیا بی بی جی ــ یہ لیجیے، آ گیا۔ چھوٹے بابا کا دل بہلا رہا تھا بی بی جی، اس لئے ذرا سی دیر ہو گئی ــــ نہیں، بی بی جی، میں تو آپ کی آواز سنتے ہی دوڑا چلا آتا ہوں ہاں بی بی جی، وہ کھڑکی میں نے ہی کھولی تھی۔ اس لئے کھولی تھی کہ یہاں سے پہاڑوں کا نظارہ دیکھ دیکھ کر آپ کا جی خوش ہو جائیگا ــــ نہیں، بی بی جی، نمونیا آپ کے دشمنوں کو ہو۔ لیجیے، میں کھڑکی بند کیے دیتا ہوں۔ میں نے تو سوچا تھا، ان ٹھنڈی ہواؤں کے لئے ہی آپ گھر کے سارے سکھ تیاگ کر اتنی دور آئی ہیں ــــ ہاں، بی بی جی، وہاں آپ گرمی سے بہت پریشان تھیں۔ ہاں، بی بی جی، گرمی ہو تو سکھ کا ہے کا؟ ــــ ہاں، بی بی جی، سردی بھی ہو تو سکھ کا ہے کا؟ نہیں بی بی جی، میری یہ قمیص اتنی پتلی نہیں ہے۔ اور ہو بھی، تو میری کھال کافی موٹی ہے۔ شاید بھگوان نے مجھے جانور بنانے کا طے کر کے بے خیالی میں آدمی بنا دیا ــــــــ نہیں، بی بی جی! جانوروں کو چارہ ملتا رہے تو اپنی موٹی کھال اوڑھ کر انھیں سردی لگتی ہے نہ گرمی ــ جنھیں سارا سارا دن اپنے ہاتھ پیر ہلانا پڑتے ہیں وہ بھی گرمی سردی سے دبک کر پڑے رہیں

تو اُن کے ہاتھ پیر کام کیسے کریں؟ گرمی یا سردی تو انھیں محسوس ہوتی ہے جنھیں صرف اپنا دماغ ہی چلائے جانا ہوتا ہے۔ میرا دماغ بھی میری کھال کی طرح بہت موٹا ہے اور جہاں ہے وہیں کا وہیں جما رہتا ہے۔ آپ جھڑک جھڑک کر سارے کام یاد نہ کرواتی رہیں تو سوچ سوچ کر باؤلا ہو جاؤں پر کچھ یاد ہی نہ آئے، کیا کرنا ہے۔ ــــ نہیں بی بی جی، آپ کی جھڑکیاں تو میں پھولوں کی طرح سمیٹتا ہوں ــــ ہاں، آپ ٹھیک کہتی ہیں، میں بڑا باتونی ہوں۔ جی بھر کے باتیں نہ کر لوں تو میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے ــــ آپ میری مانیں بی بی جی، ہمارے صاحب سے خوب باتیں کرد یا کریں۔ میں تو جب بھی دیکھتا ہوں، آپ ہی ساری باتیں کئے جاتی ہیں اور وہ بے چارے سر جھکا کر چُپ چاپ سنتے چلے جاتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے صاحب کا بلڈ پریشر اسی لئے ٹھیک ہونے میں نہیں آتا۔ ایک بار آپ چپ بیٹھی رہیں اور انھیں بولتا چلے جانے دیں۔ پھر دیکھیں، کیسے چٹکیوں میں ٹھیک ہو جاتے ہیں ــــ ہاں ہنسنا بڑا کٹھن ہے پر صاحب ہمارے کا یہی ایک علاج ہے۔ آپ تو انھیں گولیوں پہ گولیاں کھلائے اور اپنی اگلی پچھلی ساری باتیں سنائے چلی جاتی ہیں ــــ نہیں، بی بی جی، میں آپ پہ کوئی الزام نہیں دھر رہا ہوں، میں نے تو یونہی ایک بات کی ہے ــــ ــــ میں نے تو اپنی ہونے والی بیوی کو ــــ پچھلے بیس سال سے ہونے والی بیوی کو صاف بتا رکھا ہے کہ شادی پہ سینکڑوں اُٹھ اُٹھ جاتے ہیں، صاحب کی مہربانی سے وہ بندوبست بھی ہو جائے گا، پر پہلے میرے سامنے پورا آدھ گھنٹہ چپ چاپ بیٹھی میری باتیں سنتی رہو، تم نہیں بولو، بس میری سُنو ــــ آپ ہی بتائیے بی بی جی، مجھ غریب کو بلڈ پریشر ہو گیا تو اتنی موٹی بیماری کے لئے سینکڑوں ہزاروں کہاں سے لاؤں گا ــــ نہیں، بی بی جی، میں آپ کی بات نہیں کر رہا، میں نے تو یونہی ایک بات کی ہے ــــ آپ خواہ مخواہ خفا ہو رہی ہیں، اچھا، معاف کر دیجئے، آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا ــــ آیا، چھوٹے بابا ــــ آپ کو سردی لگ رہی ہے بی بی جی؟ آرام سے کمبل اوڑھ کر پڑی رہئیے۔ میں ابھی گرم پانی کی بوتل لاتا ہوں۔ میں نے تو وہیں آپ سے کہا تھا، یہاں گرمی ہے تو کیا؟ ایک ایک کمرے میں ائیر کنڈیشنر لگا ہوا ہے، سارے آرام ہیں ــــ ہاں بی بی جی، گرمی تو تھی ــــ ہاں، بی بی جی، گرمی سے آپ کا بُرا حال تھا ــــ ہاں۔ جی بی بی جی، مجھے مجھے کیا پتہ، گرمی سے بُرا حال کیسے ہوتا ہے۔ میں تو وہاں گرمی میں بھی بڑا خوش تھا ــــ آیا، چھوٹے بابا ــــ لو آ گیا۔ دو منٹ کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہوں تو اودھم مچانے لگتے ہو۔ یہ ہوٹل والے تمہارا شور سن کر کیا کہیں گے؟ ــــ کیا؟ تمہارے بندر کو بھوک نہیں لگتی؟ ــــ تو کیا ہوا؟ لکڑی کا ہی تو ہے، نہ کھانے سے مر تو نہیں جائے گا؟ ارے بابا، تمھیں کیسے سمجھاؤں؟ کھلونوں کو بھوک لگتی ہی نہیں۔ ــــ لگے تو سارے نخرے بھول کر سچ مچ کے لگیں۔ سچ مچ کر یونہی پڑا رہنے کے سوا انھیں اور کام ہی کیا ہے؟ ــــ چلو، تم اپنا دودھ پی لو۔ بیرا بے چارہ اِسے عین ٹائم پر رکھ گیا تھا، شاید ٹھنڈا ہو گیا ہو ــــ نہیں، ابھی ٹھیک ہے ــــ آؤ، پی لو ــــ کیا؟ ــــ جب تک تمہارا بندر نہیں پیئے گا تم بھی نہیں پیو گے؟ ــــ شاباش، چھوٹے بابا! تمہارا باپ مجھے اس لئے تنخواہ دیتا ہے کہ لکڑی کے بندروں کے حلق میں دودھ انڈیلتا رہوں ــــ اپنے باپ کی فکر کرو چھوٹے بابا۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں، صاحب کچھ بھی نہیں کھا پی رہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی نہیں تو بس ایک بھوک نہیں۔ کیا زمانہ آ گیا ہے! غریب سیدھا بھوک سے مرتا ہے اور امیر بھوک کی بھوک سے ــــ ارے بھئی، کچھ کھا لو، یہ تمہارے سامنے بھانت بھانت کے کھانے اس قدر سجا کر رکھے گئے ہیں ــــ دیکھو، پہلے

تو اِن کی ساری سجاوٹ کھا جانے کو جی چاہتا ہے ـــــ اور پھر مرغی کی یہ ٹانگ، ایک بار پلیٹ میں نظر بھر کے دیکھ لیں تو دماغ مرغابن کے بھوک سے اپنے دونوں پَر پھڑپھڑانے لگتا ہے ـــــ اور دہی میں گھُل مل کر بسے ہوئے مونگ کی دال کے یہ نمکین لڈو، جنھیں کھانے کے لئے آدمی کا پیٹ خود چل کر منہ میں آ جائے ـــــ اور نہ جانے کیا کیا؟ ـــــ پر نہیں ہمارا پیٹ خراب ہے! ایسے پیٹ کو جوتے مار مار کر بدن سے باہر نکال پھینکو۔ جو کام نہیں کرتا اُسے جان سے لگا کر رکھنے سے کیا فائدہ؟ ـــــ اچھا، اپنی بھوک مرگئی ہے تو ہزار بھوکے ہیں۔ انھیں کچھ دے دلا کے اُن سے تھوڑی بھوک مانگ لو۔ ارے مانگ کے تو دیکھو۔ تمہاری طرح نہیں۔ بڑے سخی لوگ ہیں۔ ایک بھوک ہی بھوک تو اُن کے پاس ہے، یہ بھی بڑی خوشی اور محبت سے جتنی چاہو گے تم سے بانٹ لیں گے ـــــ نہیں چھوٹے ابا، پہلے اپنا دودھ پیو پھر تمہارا گھوڑا بنوں گا ـــــ ارے ایں تو بھول ہی گیا۔ صاحب نے سونے سے پہلے کہا تھا کہ انھیں پورے چار بجے اٹھا دوں۔ چار بجے اُن کی دوا کا ٹائم تھا اور اِس وقت ساڑھے چار سے بھی اوپر ہونے کو آرہے ہیں ـــــ نہیں، چھوٹے بابا، ساری عمر تمہارا گھوڑا بن کے ہی رہنا ہے، اِس وقت میں صاحب کو جگانے جارہا ہوں۔ ہر وقت سوئے پڑے رہتے ہیں اور ذرا سی آنکھ کھل جاتی ہے تو جگانے کا آرڈر دے کر پھر سو جاتے ہیں۔ آپ چوبیس گھنٹے سوتے رہیے اور آپ کو بار بار جگانے کے لئے کوئی چوبیس گھنٹے جاگتا رہے۔ کوئی پوچھے ہر وقت سونا ہی تھا تو پیدا ہی کیوں ہوئے؟ اِس جینے سے تو نہ ہونے کی نیند ہزار درجے بہتر ہے۔ آدمی یہاں بھی، جو بھی ہوتا ہے اتنا ہلکا پھلکا ہوتا ہے کہ اُسے اپنے ہونے تک کی خبر نہیں ہوتی۔ اب ہو گئے ہو بھائی، تو بھاری بھاری بھیانک خوابوں میں دبکے پڑے رہنے سے یہ کیوں بہتر ہے کہ جو ہے اُسے آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اپنے اندر ہی اندر گندے خون کی نالیوں میں ہر دم بے ہوش پڑے رہو۔ اپنی آنکھیں کھول کر جتنا ہم اپنے آس پاس دیکھتے ہیں اُتنا ہی ہم ہوتے ہیں، زیادہ نہ کم۔

ـــــ صاحب! اٹھئے صاحب! ـــــ صاحب آپ کی دوا کا ٹائم بیت چکا ہے ـــــ اٹھئے! ـــــ کیا کروں؟ آدمیوں کی طرح جگاؤں تو آنکھیں نہیں کھولیں گے، جھنجھوڑوں تو خفا ہوں گے کہ آدمیت مجھے چھُوئی بھی نہیں، صرف آدمی کا چہرہ لے کے پیدا ہو گیا ہوں۔ مجھے اِس چہرے سے کرنا ہی کیا ہے؟ ـــــ یہ چہرہ لے لو بھگوان اور مجھے یہیں کہیں پہاڑی جنگل میں چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دو۔

ـــــ صاحب! ـــــ یہ کمرہ واقعی کتنا سرد ہے! باہر کی خنکی میں بھی زندہ لوگوں کی سانسوں سے حدت سی محسوس ہوتی ہے مگر یہاں خالی خولی سردی ہی سردی ہے ـــــ اُٹھئے صاحب! ـــــ نہیں صاحب، مَیں آپ کی نیند میں خلل نہیں ڈال رہا ہوں۔ آپ کا آرڈر تھا اِس لئے آپ کو جگا رہا ہوں۔ اُٹھئے، پہلے اپنی دوا پی لیجیے ـــــ دوا نہیں پئیں گے؟ ـــــ ہاں، فائدہ تو کچھ ہو نہیں رہا ـــــ آپ کو پیٹ کی گیس کی تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ رات دن تو آپ بستر پہ پڑے رہتے ہیں صاحب۔ گیس کی تکلیف تو ہوگی ہی ـــــ مَیں تو صبح اُٹھتے ہی سب سے پہلے پاخانہ کی طرف دوڑتا ہوں پچھلے روز کی ساری گندگی دھپ سے خارج ہو جاتی ہے تو بدن پرندوں کی طرح اڑنے لگتا ہے۔ آپ کا ٹائیلٹ تو اتنا صاف اور چمکدار ہے کہ ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی چاہیے ـــــ کوئی بات نہیں صاحب، حاجت نہیں ہو رہی تو بھی جائیے اور کم از کم پیٹ کی ہوا ہی نکال آئیے ـــــ ہاں صاحب! اپنے منہ پہ کنٹرول کرنے کی کوشش تو بہت کرتا ہوں لیکن آپ جانتے ہیں، یہی ایک بات میرے بس میں نہیں، اِدھر من میں کچھ آتا

ہے اُدھر منہ سے نکل جاتا ہے۔ مَیں تو آپ سے بھی کہتا ہوں کہ یہی کیا کریں۔ آپ کی ساری بیماریاں رفع ہو جائیں گی ——— نہیں صاحب، خفامت ہو جیئے، مَیں نے تو یونہی ایک بات کی ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کی دوا کام نہیں کر رہی تو اسے بھی کر لینے میں کیا ہرج ہے؟ آپ کا نمک حلال ہوں اس لئے کہہ رہا ہوں ——— ہاں، صاحب، سردی تو ہے پر نہیں ہے ——— نہیں، باہر بڑا خوشگوار موسم ہے۔ ذرا باہر نکل کر دیکھئے آپ کا جی خوش ہو جائے گا ——— نہیں؟ ——— وہ تصویر ہے۔ ہاں، کتنی اچھی تصویر ہے! برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں۔ اتنی پیاری ہیں کہ اڑتے ہوئے بادل چاروں طرف سے اکٹھا ہو ہو کر یہیں جمتے جا رہے ہیں۔ آپ کہیں تو سامنے کی کھڑکی کھول دوں؟ یہ کھڑکی آپ کے عین سامنے اسی طرح کی برف کی چوٹیوں پہ کھلتی ہے ——— نہیں؟ ——— یہ تصویر بھی اُلٹی کر دوں؟ ——— لیجئے، کر دی ——— آپ اپنی دوا پی ہی لیجیے صاحب ——— نہیں؟ ———

ہاں، یہاں سردی تو ہے ——— ہاں، وہاں اپنے گھر کی گرمی اس سردی سے اچھی تھی ——— ہاں صاحب، مَیں نے بیرے سے کہہ کے یہاں ہیٹر رکھوا لیا تھا۔ جلا دوں؟ ——— ہاں، صاحب! ائیر کنڈیشنر سے کمرہ بہتر گرم ہوتا ہے۔ اس ہیٹر سے ویسے تو نہ ہوگا لیکن جیسے بھی ہو ویسے تو ہوگا ——— لیجئے مَیں نے ہیٹر جلا دیا ہے۔ بیرے کے لیے گھنٹی بجاتا ہوں۔ آپ چائے پی لیجئے۔ ساتھ کچھ کھا بھی لیجیے۔ پیٹ بالکل خالی ہو تو ہوا سے پھول جاتا ہے اور بھوک نہیں لگتی مگر تھوڑا تھوڑا ہی کھائیں تو بھوک سے دم نکلنے کا احساس ہوتا ہے ——— آپ میری بات پر ہنسئے نہیں، صاحب، غریب آدمی اسی لئے بھوک سے مرتا ہے کہ زندگی بھر اُسے تھوڑا تھوڑا ہی کھانے کو ملتا ہے۔ آزمائی ہوئی بات ہے۔ آپ ذرا تجربے کے لیے یہ سمجھ کر تھوڑا سا کھائیے کہ پیٹ بھر آپ کے نصیب میں نہیں ——— ہاں، نصیب میں تو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی نہیں صاحب، پر آپ یہی سمجھ لیجئے کہ اور کھانے کو آپ کے پاس کچھ ہے ہی نہیں، پھر دیکھئے آپ ——— ہاں، صحیح ہے، آپ سمجھ کیسے لیں؟ تونگری میں تو صرف خواب ہی خواب میں فقیری کی خواہش ہوتی ہے، ہوش آتے ہی تونگر کی جان میں جان آتی ہے کہ سب کچھ جوں کا توں ہے ——— نہیں صاحب، مَیں نے تو یونہی ایک بات کی ہے ——— آپ ایسے کیجئے کہ سوتے سوتے ہی کچھ کھا لیا کریں۔ پیٹ میں کچھ جانا تو ضروری ہے ——— بیرا، صاحب کے لئے چائے لاؤ اور کھانے کے لئے ——— کیک کا ایک چھوٹا سا پیس لاؤ، ہاں بھائی، بہت چھوٹا پیس ——— ہاں صاحب ہیٹر گرم ہو چکا ہے مگر سردی ابھی تک ویسے ہی ہے۔ نہیں، صاحب، روم بدلنے کا کیا فائدہ ہے ——— آدمی اپنے خیال میں نیچے سے اُوپر اٹھتا چلا آتا ہے کہ قدرت کو اپنے بس میں کرے، مگر جوں جوں وہ اُوپر اٹھتا ہے "قدرت کا برتاؤ سرد مہری سے برف ہوتا چلا جاتا ہے" میرا تو یہ ماننا ہے صاحب، کہ آدمی ہمیشہ قدرت کے بس میں رہ کر ہی اپنی خوشیاں طلب کرے ——— ہاں، صاحب ہیٹر سے کچھ فرق نہیں پڑ رہا ——— آیا بڑے بابا ——— بڑے بابا کے کلب جانے کا ٹائم ہو گیا ہے صاحب۔ پوچھ کے آتا ہوں کہ انھیں کیا چاہیئے ——— آ گیا بڑے بابا ——— مجھ سے غلطی ہو گئی بڑے بابا ——— ہاں، آپ چھوٹے صاحب ہیں، بڑے بابا نہیں ——— ک ——— کیا ہے ——— یں میم صاحب کے میکے جا کے انھیں یہاں سے آ گئیں؟ ——— انہوں نے اتنی دور سے آپ کو فون کیا ہے، آپ ہی سے آ جائیے نا ——— نہیں، بڑے بابا ——— چھوٹے صاحب ——— مَیں نے تو یونہی ایک بات کی ہے ——— آپ جائیں گے تو میم صاحب خوش ہو جائیں گی ——— ہاں، آپ کیسے جائیں؟ ——— ہاں، نیچے گرمی تو بہت پڑ رہی ہوگی ——— ہاں، آپ کو کلب کے میچ بھی کھیلنا ہے ———

اچھا، آپ جب بھیجیں گے چلا جاؤں گا۔ بڑے بابا۔ چھوٹے صاحب، ایک بات کہوں؟ ۔۔۔ نہیں، اِس وقت آپ جلدی میں ہیں تو پھر کہہ لوں گا ۔۔۔ مَیں ۔۔۔ مجھے ۔۔۔ مَیں کئی سال سے اپنی ہونے والی لُگائی سے ٹال مٹول کر رہا ہوں۔ آپ ہنسے نہیں، بڑے بابا، چھوٹے بابا کی طرح آپ بھی میرے بازوؤں میں اونچے ہوئے ہیں ۔۔۔ مَیں ۔۔۔ مجھے اب ڈر لگنے لگا ہے کہ اُسے اور ٹالتا چلا گیا تو وہ ۔۔۔ نہیں، وہ ایسی ہے تو نہیں بڑے بابا، مگر ۔۔۔ ہاں، ہاں، چھوٹے صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں آپ کیا کریں ۔۔۔ آپ نے کرنا ہی کیا ہے؟ بس یہ کہہ دیجئے کہ مجھے پانچ سات سو روپے پیشگی مل جائے۔ شادی کے بعد بیشک ساری عمر میری تنخواہ سے کاٹتے رہیے۔ آپ کا ایک چاکر بڑھ جائے گا چھوٹے صاحب اور میرا کام ہو جائے گا۔ چار پیسے جوڑتا ہوں تو چھ کے خرچ کا حیلہ نکل آتا ہے۔ اسی طرح کٹتی چلی گئی تو وہ مورکھ بھی وچن نبھانے کے لیے کسی اور سے بیاہ نہ کرے گی اور ۔۔۔ اور ہماری ہونے والی اولاد بھی خواہ مخواہ ہمارے ساتھ مر جائے گی ۔۔۔ ہاں، رقم تو بڑی ہے مائی باپ، پر معاملہ بھی کتنا گھمبیر ہے ۔۔۔ ہاں، یہ آپ کے لیے یہ رقم کیا بڑی ہے؟ اس سے زیادہ تو آپ اس ہوٹل کو ایک دن کا کرایہ دے دیتے ہیں ۔۔۔ ہاں، آپ سوچ سمجھ کے جواب دیجئے۔ آپ نہ بھی کہہ دیں گے تو کٹ تو رہی ہے ۔۔۔ آیا صاحب ۔۔۔ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں، بڑے بابا۔ مَیں چلتا ہوں ۔۔۔ اُف ۔۔۔ یلے ۔۔۔ کہئے صاحب؟ ۔۔۔ آپ نے جس طرح کراہ کراہ کر مجھے بُلایا ہے مَیں تو اُس سے گھبرا گیا تھا کہ کہیں دشمنوں ۔۔۔ نہیں صاحب، ہوٹل کی بجلی کا فیوز نہیں اُڑا ۔۔۔ نہیں صاحب، آپ کے سرہانے ہیٹر تو بھرپور جل رہا ہے ۔۔۔ نہیں صاحب! بات یہ ہے آپ کے وجود کے اندر ہی بجلی کا فیوز اُڑا ہوا ہے ۔۔۔ آیا چھوٹے بابا۔

گلاب کی قلم

حفیظ احسن

جونہی سیٹھ حبیب ٹیکسی سے اتر کر کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوا لان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، سڑک والی دیوار کے ساتھ گیندے کی پوری کیاری روندی جا چکی تھی، سامنے والی روش کے ساتھ گلاب کی تازہ پھوٹی ہوئی قلمیں بھی پوری کی پوری اکھاڑ دی گئی تھیں۔ نصف درجن بچوں کے ہاتھوں میں گلاب کی قلمیں مسواکوں کی طرح نظر آ رہی تھیں کسی کے سر پہ گیندے کا پھول سجا ہوا تھا اور کوئی اپنی جیب میں گل کلغہ کے کچلے پھول اڑسے ہوئے تھا، ترشے ہوئے لان میں جابجا اکھیڑے جانے والے پودوں کی مرجھائی ہوئی شاخیں بکھری ہوئی تھیں، یہ تیسرا موقعہ تھا کہ ان کم بخت بچوں نے لان کی کیاریوں کا اس بیدردی سے ناس مارا تھا، یہ سارا فتنہ ساتھ والی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹرز کے خانساماں اور مالی کے بچوں کا تھا۔ ایسے شریر اور آوارہ بچے اس نے اپنی پوری زندگی میں کہیں نہیں دیکھے تھے، اس سارے ہنگامے کا چند منٹ بغور مشاہدہ کرنے کے بعد اسے یہ بات اچھی طرح محسوس ہو گئی تھی کہ پودوں کی تباہی کی اس لپاڈگی میں اس کا چھوٹا صاحبزادہ پیش پیش تھا، وہ بڑی زندہ دلی اور مسخرے پن سے اس مختصر سی جماعت کی کمان کر رہا تھا، حبیب کو معلوم تھا کہ وہ حد درجہ شریر اور توڑ پھوڑ کا عادی ہے لیکن حبیب نے کبھی اس کی شرارتوں پر سرزنش نہیں کی تھی اس کے خیال میں ان کمین لوگوں کے بچوں کی صحبت میں رہ کر اس کا چھوٹا لڑکا بگڑ گیا تھا۔ اس نے کئی بار ان بچوں کے والدین کو شکایت پہنچائی تھی۔ اور انھیں سختی سے اپنی کوٹھی میں داخل ہونے کی ممانعت کی تھی لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا، آج تو حد ہی ہو گئی۔ اس نے بیگم کو بھی کئی مرتبہ تاکید کی تھی کہ نوکر کے رخصتی ایام میں سہ پہر کے بعد اسی لان میں رہا کرے لیکن دوپہر کے فوراً بعد دھوپ لان سے رخصت ہو جاتی تھی اس لیے بیگم سہ پہر کے بعد عقبی لان میں چلی جاتی تھی۔ سب بچوں نے مل کر زوردار نعرہ لگایا، اس کے ساتھ ہی حبیب کے چھوٹے لڑکے کی نظر اپنے باپ پر پڑی اور وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ سب بچے بھی اس طرح خاموش ہو گئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، اس وقت وہ کیاریوں میں ایستادہ درمیانی قامت کے پودوں کی طرح نظر آ رہے تھے اپنے بیٹے کے ہمجولی خانساماں کے بیٹے کو اپنے بیٹے کے پیچھے جھاڑیوں کی طرف سرکتے ہوئے دیکھ کر حبیب کی آنکھوں سے شرارے برسنے لگے۔ اس کے خیال میں یہی آوارہ لڑکا شرارت کی جڑ تھا، اس نے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گلاب کی قلم چھین لی اس کا ہاتھ پوری مستعدی سے ہوا میں بلند ہوا تو سب بچے سمٹ کر اس کے بچے کے قریب کھسک آئے۔ عین اس وقت جبکہ گلاب چھڑی کا وار خانساماں کے بیٹے کے سر پہ پڑنے والا تھا وہ بالکل اچانک طور پہ ایک طویل جست بھر کے ایک طرف ہٹ گیا اور گلاب چھڑی کی ضرب اس کے ساتھ سہمی ہوئی اس کی چار پانچ سالہ بہن کے منہ پہ پڑی، وہ فوراً ہی گر پڑی۔ حبیب کے تو جیسے ہوش و حواس جاتے رہے تھے۔ اس نے تڑاتڑ سب بچوں پہ سونٹی برسانا شروع کر دی سب بچے سڑک کی طرف بھاگ گئے۔ ان کا صاحبزادہ بھی

کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف دوڑا ، تھوڑی دیر میں بیگم حبیب بھاگی ہوئی لان میں پہنچی تو خانساماں اور اس کی بیوی بھی وہاں پہنچ چکے تھے ، خانساماں کی بیوی نے منہ کے بل گری ہوئی بچی کو اٹھایا تو بے اختیار سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے ایک چیخ اس کے منہ سے نکل گئی " ہائے ـــ ہائے " بچی کا پپوٹا ، ابرو اور پیشانی کے زیریں حصے تک پھٹ گیا تھا اور اس سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا ۔ سیٹھ حبیب کی سانس پھول گئی تھی اور گلاب کی چھڑی اس کے ہاتھوں میں لرز رہی تھی ۔ خانساماں کی آنکھیں غصے اور صدمے سے تقریباً حلقوں سے باہر نکل آئیں ۔

" صاحب ان بچوں پر یہ ظلم کرتے ہوئے آپ کو خدا کا خوف نہیں محسوس ہوا ؟ "

" بکواس بند کرو ، میں نے کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ ان چیتھڑوں کو میری کوٹھی میں نہ آنے دیا کرو ، ادھر ان کیاریوں کی حالت دیکھتے ہو ـــ تم لوگ شرافت کی زبان نہیں سمجھتے ، ہاں ..... "

" لوگو میں لٹ گئی ، بچی کی تو آنکھ ہی پھوٹ گئی ہے شاید ! " خانساماں کی بیوی چیخی ، بیگم حبیب نے بڑھ کر بچی کو گود میں سمیٹ لیا اور اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے بلند آواز سے بولی " نہیں نہیں خدا کا شکر ہے صرف ابرو زخمی ہوا ہے ـــ آؤ میں اس کے دوائی لگاتی ہوں " پھر وہ اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی " آپ جائیے اندر " لیکن حبیب کا غصہ ابھی فرو نہیں ہوا تھا " آپ چھوڑ دیجئے اسے " وہ بولا بیگم اس کا منہ تکتی رہ گئی ۔

خانساماں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا ۔

" بچی کو اٹھاؤ اور چلتے بنو ـــ آئندہ اگر ادھر کوئی بچہ دکھائی دیا تو اٹھا کر سڑک پر پھینک دوں گا " حبیب چیخا ۔

" خدا کے خوف سے ڈرو ، دودھ پوت والے ہو " خانساماں نے بچی کو بیگم کی گود سے گھسیٹ لیا پھر اپنی آہ و زاری سے بلبلاتی ہوئی بیوی کی گود میں دیتا ہوا بولا " اٹھو چلو ـــ یہ بڑے لوگ ہیں ، پڑھے لکھے بڑے لوگ !! "

حبیب نے چند قدم آگے بڑھ کر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن بیگم اسے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی ۔

رات گئے تک گھر پر ایک سوگوار کیفیت طاری رہی ، حبیب اپنے کمرے میں چلا گیا اور شام کے کھانے سے پہلے باہر آیا تو اس پر ابھی تک سنگین قسم کی خاموشی طاری تھی اس لئے بیگم کو اس حادثے کے بارے میں کچھ کہنے سننے کی جرأت نہ ہوئی ، کھانا کھا کر وہ دوبارہ اپنے کمرے میں چلا گیا ۔ رات گئے تک اپنے کاروباری امور کی فائلوں سے سر کھپانا اس کا معمول تھا ۔

بیگم حبیب اپنے شوہر کی تیزی سے بدلتی ہوئی اس تشویش کیفیت کے بارے میں دیر تک سوچتی رہی ، آج تو اس پر وحشت دیوانگی کا دورہ سا پڑا تھا ، وہ جانتی تھی کہ پچھلے کچھ عرصے سے اس کے شوہر کا کاروبار تیزی سے تنزل اور خسارے کا شکار چلا آرہا تھا ، انھیں حال ہی میں صرف ایک آئٹم میں کئی لاکھ کا نقصان اٹھانا پڑا تھا ، اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے انھیں کافی ساری جائیداد کو فوری طور پر فروخت کرنا پڑا تھا ، لیکن ایسے حالات میں بھی کوئی یوں اپنے ہوش و حواس سے تو عاری نہیں ہو جاتا ، وہ اس تکلیف دہ حقیقت سے آگاہ تھی کہ اس کا شوہر غریبوں اور معاشرے کے نچلے طبقے کے لوگوں سے شدید نفرت کرتا ہے ، وہ خود کو اونچی سوسائٹی کا انتہائی مہذب اور مقدس فرد خیال کرتا ہے ، اس نے آج تک اپنے شوہر کو اپنے نوکروں تک

سے ڈھب کی انسانوں جیسی گفتگو کرتے نہیں دیکھا تھا، یہی نہیں وہ اپنے غریب اور کم حیثیت رشتہ داروں کی بھی صورت تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ وہ پچھلے دس بیس برس میں اپنی برادری سے مکمل طور پر کٹ گیا تھا، اسے غریب اور مفلوک الحال لوگوں سے نفرت تھی، خدا واسطے کی نفرت بیگم حسیب اپنے شوہر کے اس غیر انسانی اور ظالمانہ طرزِ عمل کو محسوس کر کے کانپ جاتی تھی لیکن دوسروں کے برعکس حسیب کا رویّہ اپنے گھر والوں کے ساتھ انتہائی محبت آمیز تھا، وہ اپنی بیوی اور بچوں سے حد درجہ محبت کرتا تھا، پچھلے پندرہ برس کی ازدواجی زندگی میں اس نے اپنی بیوی کو اُف تو کجا کبھی تم کہہ کر بھی مخاطب نہیں کیا تھا، گھریلو رویّے اور طرزِ عمل میں وہ حد درجہ شفیق اور غایت درجہ نارمل تھا۔

بیگم حسیب دن بھر انہی خیالوں میں غلطاں و پیچاں رہی، روبہ زوال کاروبار حسیب کا ذہنی عدم توازن اور کوٹھی میں تنہائی کی زندگی اس کے لئے سوہان رُوح بنتی جا رہی تھی، حسیب رات کو دیر سے گھر لوٹتا تھا، آج تو معمول سے بھی زیادہ دیر ہو گئی تھی، صبح سے بیگم کی طبیعت بےحد مکدر تھی، شام کو اس نے خانساماں کی بیوی کو بلا کر اُسے سو روپیہ اور کچھ کپڑے دیئے تھے، حسیب کے سلوک پر اس سے معافی مانگی تھی، تب جا کر اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا، لیکن اتنی رات گئے تک حسیب کے نہ آنے سے اس کا دل پھر خوف میں ڈوبا جا رہا تھا، انہی پریشان کن خیالوں میں جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

کال بیل کی آواز سن کر بیگم حسیب کی نیند سے بھری ہوئی آنکھیں اچانک طور پر اس طرح کشادہ ہوئیں جیسے کسی نے یک بیک ۵۰۰ کینڈل پاور کا بلب اس کے چہرے پر روشن کر دیا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر بستر سے اُٹھی۔ قریب کے تینوں پلنگوں پر سوئے ہوئے بچوں پر ایک نظر ڈالی۔ پھر کوٹھی کے فرنٹ والے برآمدے کی طرف پوری تیز رفتاری سے بڑھی، برآمدے سے ملحقہ ڈرائنگ روم کے دروازے کی چٹخنی کھولنے سے پیشتر اس نے مورچے کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہوئے حسیب کو دیکھ لیا تھا، اُس نے دروازہ کھولا تو یخ ہوا کا جھونکا اس کے گرم گرم چہرے پر برفانی لیپ کرتا ہوا کمرے میں گھس گیا، اس کے ساتھ ہی حسیب کمرے میں داخل ہوا۔ آج خلافِ توقع اس نے علیک سلیک بھی نہ کیا۔ بیگم کے چہرے پر پھیلی ہوئی استقبالیہ مسکراہٹ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو کی طرح آہستہ آہستہ مدھم ہوتی ہوئی اس کے چہرے کے اونگھتے ہوئے تاثر میں روپوش ہو گئی اور اس کی جگہ ایک تشویشناک تاثر نے لے لی حسیب نے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی اوور کوٹ اتارا پھر کرسی پر بیٹھ کر بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔ بیگم نے کپڑوں والی الماری سے اس کا سلیپنگ سوٹ اور گاؤن نکالا اور اس کے قریب پلنگ پر رکھ دیا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے!"

"ہوں۔" حسیب جرابیں اتار کر اپنے سفید گداز پیروں کو سہلانے لگا۔

"چپ چپ کیوں ہیں!" بیگم نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے آنکھیں جھپکائیں حسیب نے ہوائی چپل پہنی اور نظریں اٹھا کر سامنے کھڑی ہوئی بیگم کی طرف دیکھا۔

ایسی کوئی نئی وجہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی نئی بات، وہی کاروباری معاملات ہیں، کاروبار میں ایسے نشیب و فراز تو آتے ہی رہتے ہیں۔"

للہ تو پھر ان تفکرات کو اپنے اوپر اس طرح مسلط نہ کیجیے کہ اپنی صحت بدھ ہی گنوا بیٹھیں ۔" حبیب خاموش رہا۔

"کھانا تو نہیں کھا آئے آپ؟" بیگم نے سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "جی نہیں" حبیب اُٹھتے ہوئے بولا پھر سلیپنگ سوٹ اٹھا کر اپنے بیڈ کی پارٹیشن کے پیچھے چلا گیا۔ بیگم نے اسٹیل کی الماری پہ رکھا ہوا ہاٹ کیس اٹھایا جلدی جلدی تپائی پر پلیٹیں رکھیں۔ سالن سے بھرے ہوئے ایلومینیم کے کٹورے نکالے، روٹیاں نکالیں پھر پانی کا گلاس رکھتے ہوئے بولی اور اب جلدی سے کھا لیجیے ٹھنڈا ہو جائیگا۔"

حبیب نے آکر گاؤن پہنا اور خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔ بیگم بچوں کے لحاف اور توشکیں درست کرنے میں لگ گئی، جب تک اس نے دودھ کا گلاس حبیب کے بستر کی تپائی پر لا کر رکھا حبیب واش بیسن میں ہاتھ دھو کر بستر پہ بیٹھ کر سگریٹ سلگا چکا تھا، بیگم بھی اون کے گولے اور سلائیاں لے کر اپنے بستر پہ آ بیٹھی۔

"اور دن بھر کی کوئی خبر؟" حبیب نے پوچھا۔

"کوئی خاص خبر نہیں، سیٹھ لقمان کے یہاں سے ایک آدمی آیا تھا، وہ یہ خط دے گیا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے بیگم نے تکیے کے نیچے سے ایک مستطیل لفافہ نکال کر حبیب کی طرف بڑھا دیا، حبیب نے تپائی پر پڑا ہوا چشمہ اٹھایا کھلے لفافے میں سے خط نکال کر پڑھنے لگا، چند سطریں ہی پڑھی ہوں گی کہ اس کے چہرے پہ گہری سنجیدگی کی چھاپ لگ گئی، اس نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے تیرتی ہوئی نگاہیں بیگم کے چہرے پر ڈالیں، اس کی انگلیاں بڑی تیزی سے سلائیوں اور اون کے دھاگے سے الجھ الجھ کر الگ ہو رہی تھیں، شدتِ جذبات سے سیٹھ حبیب کا چہرہ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں آتشیں گولے کی طرح معلوم ہو رہا تھا، خط ختم ہونے تک اُس کی پیشانی پہ پسینے کی چھوٹی چھوٹی بوندیں نمودار ہو گئیں، یہ خط اس کے ایک کاروباری ہمعصر سیٹھ کی طرف سے تھا جن کے ساتھ ایک عرصے سے اس کے بڑے اچھے کاروباری مراسم تھے، سیٹھ حبیب لاکھوں کا مال ان کے ہاں سے اُٹھاتا تھا پچھلے کئی سالوں میں ان مراسم میں کسی قسم کا خلل نہ پڑا تھا، کیونکہ سیٹھ حبیب معاملے کا بڑا کھرا آدمی تھا، لیکن ایکا ایکی سلک کے سٹے میں اسے تقریباً آٹھ لاکھ کا خسارہ اٹھانا پڑا جس کی وجہ سے اُس کی کاروباری حالت زوال پذیر ہونے لگی، اس نے بھاری قرضے اٹھا کر اپنے کاروبار کو سنبھالا دینے کی بہت کوشش کی لیکن شاید قسمت کا پانسہ اس کے خلاف پلٹ چکا تھا۔ اپنی عمدہ کاروباری ساکھ کی بنا پر سال ڈیڑھ سال تک تو وہ بنکوں اور نجی سطح پر لئے ہوئے قرضہ جات کی بنا پر نئے کاروباری تجربات کے ذریعہ اپنی بگڑی بنانے کی مساعی میں زور شور سے مصروف رہا لیکن جب ہر کاروبار میں اوپر تلے خسارہ اور سونے کی مٹی بنتی چلی گئی تو اُسے ایک مقام پہ آکر رکنا پڑا جس کے نتیجے میں اُسے دو نو تعمیر شدہ عمارتیں اور چند پلاٹ فروخت کرنے پڑے، اس سے وہ ایک حد تک بڑے اور ضروری قرضوں سے سبکدوش تو ہو گیا تھا لیکن اپنی رہائشی کوٹھی کے علاوہ اس کی کل کائنات یہی جائیداد تھی جس سے اسے ہزاروں روپیہ ماہوار کی آمدنی بھی تھی، اس کے چلے جانے سے اسے اندرونی طور پر بہت صدمہ ہوا تھا، اپنی کاروباری صلاحیتوں پر اُسے ایک مدت سے جو غیر معمولی اور بھرپور اعتماد تھا، وہ جاتا رہا تھا، اور وہ خود کو قریب قریب کھوکھلا سا محسوس کرنے لگا تھا تاہم ابھی حالات اتنے دگرگوں نہیں تھے جو اس کے قابو سے ہی باہر ہوتے، شاک ایکس چینج کے بیوپاریوں میں ابھی وہ تین چار لاکھ روپے کا

مقروض تھا اور اتنی ہی مالیت کی کوٹھی ابھی محفوظ تھی، یوں کہنا چاہیے تقریباً محفوظ تھی صرف بنک میں ایک لاکھ کی رقم کے عوض رہن تھی، اور ابھی وہ اس پہ مزید دو تین لاکھ روپیہ قرض لے سکتا تھا یا اسے فروخت کر کے اپنے پورے واجبات ادا کر سکتا تھا۔

سیٹھ لقمان کا جو خط بیگم نے اسے دیا تھا، وہ اس کے لئے غور و فکر کی نئی اُفتاد کا باعث بن گیا تھا۔ سٹاک ایکس چینج کے سیٹھوں میں لقمان سیٹھ کی سب سے موٹی دو لاکھ کی رقم واجب الادا تھی، آخر وہ کب تک صبر کرتے۔ ایک سال کے بعد انہوں نے نہ صرف فوری ادائیگی کا مطالبہ کیا تھا بلکہ عدم ادائیگی کی صورت میں قانونی کارروائی کی دھمکی بھی دی تھی، سیٹھ لقمان نے خط میں ان کے مقفل رہنے والے دفتر کی طرف بھی بار بار توجہ دلائی تھی جس سے غالباً انھیں یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ اگر اُس کا کاروبار اس حد تک معطل نہ ہو گیا ہوتا تو شاید وہ یہ انتہائی اقدام کرنے سے گریز کرتے، بہر حال سیٹھ لقمان جو حسیب کا سب سے با اعتماد کاروباری سرپرست تھا اور اچھے کاروباری اصولوں کا آدمی تھا ان سے کنارہ کش ہو گیا تھا، یہ نیا صدمہ حسیب کے لیے قریب قریب ناقابل برداشت تھا، اور یہ خط پڑھ کر کچھ دیر کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی روشنی بھی اندھیرے کی چادر بن گئی، آج وہ اپنی بیگم کے سامنے بھی براہ راست اور روبرو اچھی خاصی خجالت کا شکار ہوا تھا اور بڑی سبکی محسوس کر رہا تھا۔ اپنی بیگم کے سامنے اُس نے ہمیشہ خود کو ایک عظیم کاروباری مدبر شخصیت کے طور پر پیش کیا تھا، اور اس کا یہ امیج نہ صرف اس کی بیگم بلکہ اس کے سسرالی اعزہ میں بھی ایک عرصہ سے برقرار تھا۔ دو سال پہلے تک اس کی تقدیر کے ہیر پھیر بھی نرالے تھے۔ مُنہ سے جو بات نکالتا تھا پوری ہو جاتی تھی۔ دو نئی بلڈنگز کھڑی ہو گئیں، کوٹھی بن گئی۔ کاروں، گاڑیوں کی ریل پیل ہو گئی اور سیٹھ حسیب کا شمار شہر کی سر آوردہ کاروباری شخصیات میں ہونے لگا تھا۔ یہ ایک اوسط درجے کے کاروباری انسان کے لئے معمولی کامیابی نہ تھی، اس کامیابی نے سیٹھ حسیب کی کاروباری خُو میں تو کوئی ایسی تبدیلی پیدا نہ کی لیکن ذاتی طور پر اس کی شخصیت نخوت اور غرور کا پیکر بن گئی، دولت کی ریل پیل نے اُسے صحت مندانہ وسیع النظری یا دردمندی کا احساس تو کیا بخشنا تھا وہ اُلٹا اپنے غریب رشتہ داروں اور دوستوں سے پرہیز کرنے لگا۔ اس کی برادری کے لوگ جو متوسط درجہ کے کاروباری لوگ تھے اُس کے رویّے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ اُس سے کٹتے چلے گئے، کیونکہ سیٹھ حسیب نے ان کی شادی غمی کے موقعوں پہ اپنی اور اپنے خاندان کی شرکت بند کر دی تھی، وہ اپنے گھر میں اعلانیہ ان سے نفرت کا اظہار کرنے لگا تھا اس کے برعکس وہ اونچے کاروباری لوگوں کی رفاقت میں، ان کی محفلوں۔ تفریحات اور ضروری رسومات کے اجتماعات میں شرکت کرنے میں بے حد فخر محسوس کرتا تھا۔ غیر ذات برادری کے سر آوردہ لوگوں کی دعوتوں، استقبالیوں میں شرکت کرنا اور انھیں اپنے یہاں مدعو کرنا اس کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا اور اچھے خوشحال دنوں میں اس نے اس رجحان کو بڑی اہمیت دے رکھی تھی؛ اس سے اُسے کسی قدر کاروباری فوائد بھی حاصل ہوتے تھے۔ لیکن بیگم حسیب اُس کے اس طرز فکر و عمل کو زیادہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھیں، وہ کھل کر اپنے شوہر کی طبیعت کے خلاف بات کرنے کی عادی نہ تھیں بلکہ وہ تقریباً تمام معاملات میں اُس سے مکمل اتفاق رائے رکھتی تھیں لیکن اپنے اعزہ اور برادری سے کٹ کر زندگی بسر کرنا اُسے عجیب سا لگتا تھا، ایک آدھ مرتبہ اس نے حسیب کو بلوغت کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے بچوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ کہا بھی تھا کہ آخر کار ہمیں ان بچوں کے رشتوں ناطوں کے لئے اپنے بھائی بندوں اور برادری کے لوگوں کی طرف ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ اس لئے ان سے اتنی دوری مناسب نہیں۔ لیکن سیٹھ حسیب نے بیگم کی اس بات کو درخورِ اعتنا نہ

سمجھا تھا اور ان لوگوں کی سماجی کم حیثیتی اور کاروباری پسماندگی کی مثالیں دے دے کر بیگم کو اپنی راست فکری کا یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ بیگم حبیب ایک خوش فطرت تعلیم یافتہ خاتون ہونے کے ناطے سے متوازن غور و فکر اور عادات و خصائل کی انسان تھی، اس کے نزدیک خوشحالی کا یہ مطلب نہ تھا کہ انسان اپنی اوقات کو فراموش کر دے، کبھی کبھی اُس کی طبیعت بہت چاہتی تھی کہ وہ اپنے سسرالی اور میکے کے غریب اعزہ کے گھرانوں میں جایا کرے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوا کرے، ان کی مناسب اور ضروری اخلاقی اور مالی امداد کیا کرے، لیکن حبیب کی طبیعت کے منفی رجحان کو دیکھ کر اُسے اس ثقافتی اور سماجی راہ و رسم کی ہمت نہ پڑتی تھی اور کبھی کبھی تو وہ اپنی امارت اور خوشحالی کو جاڑے کی چاندنی کی طرح سمجھتیں جس کا نظارہ کرنے والے تنگ و تاریک کمروں میں لحافوں میں دبکے خراٹے لے رہے ہوں۔ وہ تنہائی کی اس خوشحال زندگی کو جنگل میں ناچنے والے مور سے تشبیہ دیتی۔ وہ خفیہ طور پر کچھ مستحق خواتین اور کنبوں کی مدد کر دیا کرتی تھی، تاہم وہ اس حد تک بھی اپنے ثقافتی اور سماجی حلقے سے کٹ نہ سکتی تھی۔ اپنے سسرالی اعزہ میں چند ایک بڑی بڑی شادی بیاہ کی تقریبات میں اُس نے کچھ قباحتوں کے باوجود اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی بھرپور سعی کی تھی۔

پچھلے چند سالوں میں جبکہ اس کے شوہر کا کاروبار زوال و انحطاط کے مراحل سے دوچار تھا اُس نے خاص طور پر نوٹ کیا تھا کہ اس کے سسرالی رشتہ داروں کے کچھ کنبوں میں بڑے اچھے حالات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے اور وہ بتدریج کاروباری اور سماجی بہتری کے مراحل طے کر رہے تھے، وہ اس ترقی اور بہتری کو بنظر استحسان دیکھتی تھی، آخر قسمت، جد و جہد کشمکش اور ان کے خوشگوار نتائج کی حصولیابی پر کسی کا اجارہ تو نہیں۔ کبھی کبھی فراغت کے لمحوں میں برادری اور رشتہ داروں کے متعلق بھی گھر میں تذکرہ چل نکلتا تھا، حبیب اس گفتگو سے پرہیز کرتا اور اس کی باتوں سے تنگ نظری، غیر صحت مندانہ رشک اور تعصب کی بُو آتی، تو اُسے اپنے شوہر کے اس مریضانہ طرزِ عمل پر بڑی حیرت ہوتی، وہ برملا کہا کرتا تھا کہ وہ ماضی کے تاریک شکستہ کھنڈروں میں جھانکنے کے بجائے مستقبل کی کھلی فضاؤں میں پرواز کرنے کو ترجیح دیتا ہے، لیکن بیگم حبیب کو اپنی برادری کے حلقے میں نہ تو شکستہ اور تنگ و تاریک کھنڈر نظر آتے تھے، اور نہ ہی ان کے شوہر کی اس خود ساختہ ناپسندیدگی کی کوئی معقول توجیہ ہی پیش کی جا سکتی تھی، سوائے اس کے کہ وہ ماضی میں خود ایک کم حیثیت انسان تھے، ممکن ہے وہ اپنی اس محرومی کی زندگی کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں اور بہت زیادہ احساس کہتری کا شکار رہتے ہوں، اس وقت وہ اپنے آپ سے ہی نہیں اپنی برادری کے لوگوں سے بھی اسی پستی، پسماندگی اور کم حیثیتی کی بنا پر نفرت کرتے ہوں گے تو اپنے ماضی کی طرح ان لوگوں سے بھی ان کی نفرت برقرار رہی۔ لیکن یہ طرزِ فکر ہرگز ہرگز پسندیدہ اور صحت مندانہ نہیں تھا۔

حبیب کافی دیر تک خط پر نظریں جمائے بیٹھا رہا اور بیگم کی سلائیاں، اُس کے خیالات کے دھاگوں کی طرح اُن کے دھاگوں سے الجھتی رہیں، بیگم حبیب نے محسوس کیا کہ اُس کا چہرہ جو کچھ دیر پہلے خط کے پریشان کن مندرجات کی وجہ سے تمتما کر لال بھبھوکا ہو گیا تھا یکدم پیلا پڑ گیا۔ اُس نے پانی کا گلاس طلب کیا، بیگم حبیب پانی کا گلاس لائی۔ چند گھونٹ پی کر وہ تکیوں کے سہارے بستر پر نیم دراز ہو گیا، اس خط کے مندرجات میں اُسے اپنی رہی سہی عزت کا جنازہ اٹھتے نظر آ رہا تھا، ساری جائداد ہاتھ سے جا چکی

تھی، کاروباری دفاتر قرضخواہوں کے تقاضوں کے خوف سے مقفل پڑے تھے۔ سب ملازمین کو سبکدوش کیا جا چکا تھا، حتیٰ کہ دو ماہ پہلے کار بھی اونے پونے داموں بک گئی تھی، اب اس رہائش گاہ، آخری پونجی پر بھی پے در پے کاروباری ناکامیوں کے منحوس سائے پھیل رہے تھے، شاید تھوڑے دنوں تک سر چھپانے کی جگہ بھی نہ رہے گی۔ اب کیا ہو گا! —— اب کیا ہو گا! یہ سوال جیسے پھانسی کا پھندہ بن کر حسیب کی گردن میں اٹک گیا۔

"آپ نے خط پڑھ لیا؟" اس نے اچانک بیگم سے سوال کیا۔

"جی ——"

"پھر آپ کی کیا رائے ہے؟" بیگم مسکرا دی، پھر اپنے شوہر کی بے چارگی میں ڈوبی ہوئی صورت کو تکتے ہوئے بولی: "آپ نے سب حالات سے کبھی آگاہ ہی نہیں فرمایا —— تاہم اپنی تھوڑی بہت سوجھ بوجھ سے مجھے ایک حد تک اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے نازک ترین دور سے گذر رہے ہیں۔"

سیٹھ حسیب کے ہونٹ لرز اُٹھے، "میں نے اپنی خوشحالی کے علاوہ آپ کو اور بچوں کو کسی اور بات میں شریک کرنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔"

"یہی تو آپ کی بھول تھی، خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا، ہم حقائق کا سامنا کر کے پریشانی اور تفکرات کی اس مصنوعی زندگی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں، میں آپ کے ساتھ کرایے کے ایک معمولی مکان میں انتہائی خوشی سے زندگی کے دن کاٹنے کے لئے تیار ہوں، لیکن خدارا ہر قیمت پر اپنے ذہن سے ان الجھنوں اور پریشانیوں کو جھٹک دیں، ہمیں آپ کی زندگی اور صحت کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے، ہمیں اس اونچی سوسائٹی کی بھی ضرورت نہیں، آپ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر سکتے ہیں۔ میں آپ کے شانہ بشانہ زندگی کی جدوجہد میں حصہ لوں گی میں ملازمت کر کے بھی اپنے بچوں کا پیٹ پال سکتی ہوں۔"

"میرے جیتے جی تم ملازمت کرو گی!" سیٹھ حسیب کی آواز بھرا گئی۔

"ہاں، میں ملازمت کروں گی اور اگر ضرورت پڑی تو آپ کو بھی کرنا ہو گی، ان بچوں کے لئے ہم سب کچھ کریں گے، کل ہی آپ اس کوٹھی کی فروخت کا بندوبست کریں۔ ہم جلد از جلد اپنے قرضوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

ٹھکی ہوئی رات کے گونجتے ہوئے سناٹے میں بیگم حسیب نے گھڑی کی طرف دیکھا، کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک کے سوا ہر شے محو خواب تھی، حسیب کارنس کی طرف پہلو بدلے بے حس و حرکت لیٹا تھا، وہ مزید باتوں میں الجھ کر گھر پر چھائی ہوئی سوگوار کیفیت میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی مین لائٹ آف کر کے وہ اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔

ٹیبل لیمپ کی مدھم سبز روشنی میں حسیب اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کارنس پر بنے ہوئے نقش و نگار اور بیلوں کو دیکھ رہا تھا اس کارنس کی تزئین پر اس نے ایک بڑے آرٹسٹ سے کتنی محنت اور کاوش سے جدید آرٹ کے نمونے تخلیق کرائے تھے، اس کوٹھی کی آرائش پر اس نے کتنی فراخدلی سے روپیہ خرچ کیا تھا، وہ کیا جانتا تھا کہ شنگ ڈل وقت کسی خونخوار چیتے کی طرح اس کی خوشیوں کی تاک میں ہے اور یوں ایک ایک کر کے اس کی مسرتوں کو چبا ڈالے گا، جس اعلیٰ کاروباری طبقے میں اس نے اتنی

محنت، جدوجہد اور جفاکشی سے اپنے لئے اہم مقام پیدا کیا تھا، اس کی ہزار کوششوں کے باوجود اس سے چھن گیا تھا اور وہ بھری پُری دنیا میں لٹے ہوئے مسافر کی طرح تنہا اور بے یار و مددگار رہ گیا تھا، انہی خیالوں کی رو میں اس کا دھیان اپنے ماضی کی طرف پلٹ گیا، جب آج سے بارہ برس پیشتر وہ اپنے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کے ہمراہ ثمن بازار کی ایک تنگ سی صاف ستھری گلی میں رہتا تھا، ایک خوب صورت، صاف ستھرے چھوٹے سے مکان میں، جہاں صبح و شام اپنے پرائے کسی دہلیز، کسی نکڑ اور کسی چبوترے پر بیٹھے نظر آتے تھے، محفلیں جمتی تھیں، بے فکر پنے کی باتوں میں فلک شگاف قہقہے اڑتے تھے، میلاد، قوالیوں، درود و مولود کی تقاریب منعقد ہوتی تھیں، وہ ان ہنگاموں میں اپنی سرگرمی اور مستعدی سے حصہ تو نہیں لیتا تھا، لیکن آج ماضی کی ان باتوں، رونقوں اور ہنگاموں کا تصور کر کے وہ جیسے خود سے سوال کر رہا تھا کہ آخر وہ اس ماحول میں زندگی بسر کرنے کے باوجود اس کار زارِ حیات میں خود کو اجنبی کیوں محسوس کرتا تھا، شاید وہ اس گھٹی گھٹی کیفیت کو ناپسند کرتا تھا جو ان گلی کوچوں پر طاری رہتی تھی، جیسے ہر شے مصافحے کے ہاتھوں کی انگلیوں کی طرح ایک دوسرے میں پیوست تھی، گھروں کی دیواریں اور منڈیریں مشترکہ تھیں، ان کی گلیاں، چھتیں اور نالیاں مشترکہ تھیں، ان کی خوشیاں، افسردگیاں اور پریشانیاں مشترکہ تھیں، اُسے یاد آیا۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ خود کو شور و شغف اور بھیڑ بھاڑ سے الگ رکھتا تھا، وہ تنہائی پسند تھا، تنہائیوں میں اونچے اونچے خیالوں کی چوٹیاں سر کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

اُسے یاد آیا کہ اسے ثمن بازار کے اس کوچے اور اس کی گنجان آبادی سے بھی نفرت تھی، ان دنوں وہ کالج کا طالب علم تھا، اپنا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گذارنا اس کا محبوب مشغلہ تھا، محض اس لئے کہ اپنے کوچے میں اسے اپنے ہمسایوں اور رشتہ داروں کا سامنا کرنے کی قباحت سے دوچار نہ ہونا پڑے گھر میں بوڑھے باپ کے علاوہ کوئی تھا بھی نہیں والدہ ادھر ہندوستان میں ہی انتقال کر گئی تھیں۔ چند ایکڑ زمین کی واجبی سی آمدن سے ان کی گذر بسر ہو رہی تھی۔ وہ رات کو ہمیشہ دیر سے گھر آتا تھا، اس کے ہم عمر نوجوان جو اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے، اس کی طبیعت کے قنوطیت کو محسوس کر کے خود بخود اس کی صحبت سے الگ ہو گئے تھے، اس کا اُسے چنداں ملال نہ تھا، بلکہ وہ چاہتا بھی یہی تھا، وہ ایسا کیوں چاہتا تھا! اچانک اس نے اپنے خیالات کے دھارے کو روک کر جیسے خود سے سوال کیا، کیا وہ لوگ محبت، شرافت اور انسانیت کے معیار پر پورا نہیں اترتے تھے، ان کی زندگیاں گرمجوشی اور خلوص سے خالی تھیں! ـــــ نہیں ہرگز نہیں، حسیب کے ذہن سے جیسے برسوں کی جمی ہوئی کائی کی پرتیں اترتے لگیں، ان میں چاچا روشن تھا جس نے اس کی سرد مہری کے باوجود ہمیشہ محبت بھری مسکراہٹ سے اُسے بلایا تھا۔ وہ شام کو تقریباً روزانہ ان کے گھر آتا تھا، اور ان کے خانگی معاملات میں دلچسپی لیتا تھا چاچا روشن ان کی برادری کی بڑی محترم شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان میں تاجی تھا جس نے اس کے ساتھ دوستی پیدا کرنے کے لئے کس کس طرح اظہار خلوص نہ کیا تھا اور وہ بھی کتنے سارے لوگ تھے جو اپنی کھیلوں مشغلوں اور تفریحی سرگرمیوں میں اسے ہر قیمت پر شریک کرنے کے لئے بارہا کوشاں ہوتے تھے لیکن اس کی سرد مہری اور پیوست طبیعی کو دیکھ کر سب پیچھے ہٹ گئے، اس کی منجمد خاموشی نے جیسے سب کے چھکے چھڑا دیئے تھے، پھر جیسے وہ خود بھی ان لوگوں سے خائف رہنے لگا تھا، اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ

سب لوگ اسے ناپسند کر کے مسترد کر چکے ہیں اس لیئے ان میں سے کوئی بھی عقیقی اور سچی دوستی کا اہل نہیں تھا، کبھی کبھی مایوسی اور فرار کے لمحوں میں وہ سوچا کرتا تھا کہ شاید خود اس کی ذات ان قابل توجہ خصوصیات سے خوفناک حد تک تہی دامن ہے جو ایک فرد کو دوسروں کی نظروں میں محبوب اور پسندیدہ بناتی ہیں، لیکن پھر وہ خود ہی اپنے خیالات کی نفی کر دیتا، احساس برتری کی ایک زبردست لہر بے چارگی کے احساس سے بنے ہوئے ان گھروندوں کو مسمار کر دیتی اور وہ سوچتا، ان لوگوں میں سے کوئی بھی اس کی ذہنی سطح کا انسان نہیں تھا، ان لوگوں کی کاروباری اور تفریحی، سماجی اور معاشرتی مصروفیات میں اسے کوئی نئی بات نظر نہیں آتی تھی یہ لوگ گھڑے کی مچھلی کی طرح اپنے مخصوص، فرسودہ اور بیزار کن معمولات کے غلام تھے جس میں کوئی نئی بات نہیں تھی، وہ انھیں کولہو کے بیل کی طرح اپنے محدود دائرے میں برسوں سے چکر کاٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اس کے برعکس وہ معاشرے میں تعمیر اور ترقی کے بدلتے اور ابھرتے ہوئے رجحانات کا بنظر غائر مطالعہ کرتا تھا، ان کو اپنی صلاحیت اور قابلیت کے معیاروں پہ پرکھتا اور ان سے بھرپور استفادہ کرنے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا، اس کی نظریں بڑے بڑے کاروباری اداروں، بلند و بالا عمارتوں جدید پر رونق بازاروں، بڑی بڑی رنگین چمکیلی موٹروں پر جمی رہتی تھیں اور وہ سوسائٹی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے خوشیوں کے اس سمندر سے اپنے حصے کی مسرتیں اور خوش حالیاں حاصل کرنے کی زبردست آرزو اپنے دل و دماغ میں کروٹیں لیتے ہوئے محسوس کرتا تھا، ٹمن بازار کا وہ کوچہ اس کی منزل نہیں تھی، اور نہ ہی چاچا روشن کی وہ خالی خولی شفیق مسکراہٹ اور اس کی آمد و رفت کا وہ اکتا دینے والا معمول جو اس کے نزدیک بس تضیع اوقات کے مترادف تھا، نہ ہی اُسے تاجی کے خلوص بھرے رویئے کی ضرورت تھی جس کا حاصل محض قیمتی وقت کا بے مصرف تفریحی ضیاع تھا — تاجی — تاجی — تاجی ذہن میں اس نام کے تازہ ہوتے کے بعد جیسے اس کے خیالات نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور اس کی آنکھوں میں ایک خوبصورت صحت مند اور دراز قامت نوجوان کا شگفتہ چہرہ ابھر آیا۔ تاجی کا چہرہ، جو اُسے بہت چاہتا تھا، اس سے گہرے دوستانہ مراسم استوار کرنے کا بے حد آرزو مند تھا لیکن اس نے کبھی اس کے بے پایاں خلوص کی حوصلہ افزائی نہ کی تھی، آخر کیوں!— کیوں؟ شاید تاجی اس کے فلک بوس خیالوں کی بلندی تک رفاقت اور ہمسفری کی استعداد نہیں رکھتا تھا یا شاید وہ اُن تمام خوبیوں کا مالک تھا، اس سے کہیں پرکشش اور دلآویز شخصیت کا مالک تھا، اور وہ اس کی شخصیت کی غیر معمولی جاذبیت کو اپنی ذات پہ حاوی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا، یا شاید — اس لئے کہ اس کے جڑواں بھائی فیکی اور باپ حشمت سے وہ شدید نفرت کرتا تھا، فیکی اور اس کا باپ حشمت خان پاکستان بننے کے فوراً بعد کینیڈا چلے گئے تھے۔ لیکن وہ اس نفرت کی سزا تاجی کو کیوں دے رہا تھا! دفعتہً اس کے ذہن پر برسوں سے پڑے ہوئے دبیز پردوں میں سے ایک اور پردہ سرک گیا، ٹمن بازار کے اس کوچے سے ہی اس کی زندگی کا آغاز نہیں ہوا تھا، وہ جگہ تو شام پور کی پہاڑیوں کے نشیبی سبزہ زاروں میں گھرا ہوا وہ قصبہ تھی، جہاں اس کے شعور نے آنکھیں کھولی تھیں، پھر بچپن کے وہ دن دھلی دھلائی رنگین روشن تصویر کی طرح اس کی نظروں میں آگئے۔ وہ مناظر، وہ گنگناتی ہوئی ندیاں، چنار اور ڈھاک کے درختوں سے لدے ہوئے وہ جنگل، وہ تکیے اور چوپالیں، نقلوں اور قوالیوں کی وہ محفلیں، گندم، دھان، مکئی، کماد، سرسوں اور کپاس سے لہلہاتے ہوئے کھیت، قدرتی پانیوں سے

لبالب بھرے ہوئے تالاب، مچھلی، ہرن، مور، جنگلی مرغ کی شکاری مہمیں چشم زدن میں تیزی سے اُڑتے ہوئے خیالوں نے جیسے کسی بہت بڑی کُدال سے اس کے ذہن میں پھیلے ہوئے فالتو ملبے کو ہٹا کر دُور پھینک دیا۔ اب وہ اپنے بچپن کی کتنی واضح اور شفاف تصویر دیکھ رہا تھا، بارہ تیرہ برس کا ایک خوش شکل، صحت مند گول مٹول لڑکا اس کے سامنے کھڑا تھا، اسے یاد آیا کہ بچپن میں وہ کس قدر جوشیلا اور طاقتور تھا، ورزش اور کسرت کا عادی ہونے کی وجہ سے اس کے بازو، چھاتی اور پنڈلیوں کی مچھلیاں فولاد کی طرح سخت ہوتی تھیں، اپنے محلے کے تمام لڑکوں میں وہ سب سے زیادہ طاقتور، ہوشیار اور ذہین سمجھا جاتا تھا، وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا لیکن اُسے پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اسے تو لڑکوں کی منڈلیاں لگانے، دوڑوں کے مقابلے، تیراکی، فٹ بال اور ہاکی کے کھیل اور آم، امرود، انار کے باغوں میں تباہی پھیلانے کے سوا اور کوئی کام کا شغل ہی نظر نہیں آتا تھا، سکول کا باغیچہ ہو یا سبزیوں اور پھولوں کی کیاریاں وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ جہاں سے بھی ایک آدھ مرتبہ گذر جاتا لوگ اس کی چابکدستیوں کے کرشمے دیکھتے رہ جاتے، کوئی شام نہ تھی کہ گھر میں دو چار آدمی اس کی شکایت لے کر نہ پہنچتے ہوں گھر والے مار پیٹ کی آخری حدیں بھی پھلانگ کر دیکھ چکے تھے۔ لیکن چند روز امن سکون سے گذرنے کے بعد بات پھر وہیں جا پہنچتی۔ اُسے یاد آیا محلے کے لڑکوں پر اس کا رعب اب خاصی خولی نہیں پختہ اور آزمودہ تھا، جب کوئی لڑکا اس سے اختلاف رائے کی جرأت اور اس کی تسلیم شدہ بالادستی کو چیلنج کرنے کی کوشش کرتا تو وہ فوراً اسے کشتی کی دعوت دے دیتا۔ ایسی کشتیوں میں وہ ہمیشہ جیتتا تھا اور بہت سے لڑکوں کو پچھاڑ چکا تھا۔ اس کے شکست خوردہ حریف چند روز تک تو اس کی محفل سے غیر حاضر رہتے پھر اس کے ساتھیوں کی تضحیک و للکار سے خوفزدہ ہو کر از سرِ نو اس کی منڈلی میں شامل ہو جاتے، وہ بڑی وسعت قلبی سے انھیں دوبارہ خوش آمدید کہتا —— اس کے ذہن میں ایک ایک کر کے اپنے ان حریفوں کی صورتیں روشن ہوتی چلی گئیں جنھیں وہ پچھاڑ چکا تھا۔ ماکھی، رحمت، زُلفی بانکا —— اور تاجی —— نہیں "تاجی کا جڑواں بھائی فیکی —— فیکی جو اس کے بعد محلے کا سب سے زیادہ طاقتور لڑکا تھا وہ قد کاٹھ میں بھی اس سے کچھ ابھرا اونچا تھا ولیکن اس نے کنیر کے سوکھے" تالاب کی ریت میں اسے اس طرح رگیدا تھا کہ اس کا مُنہ، سر اور آنکھیں ریت میں لت پت ہو گئی تھیں اور وہ دمے کے مریض کی طرح ہونک رہا تھا، فیکی —— فیکی یہ نام اس کے ذہن کے گنبد میں ایک پُراسرار صدائے بازگشت کی طرح گونجنے لگا، فیکی وہ واحد لڑکا تھا جو اس سے شکست کھانے کے بعد پھر اس کی پارٹی میں شامل نہ ہوا تھا، وہ کھیلنے کے لئے دوسرے محلے میں جانے لگا، اس کا باپ حشمت برادری کا سب سے متمول آدمی تھا۔ فیکی کو اس بات کا بھی بڑا گھمنڈ تھا۔ "تاجی ان دنوں اپنے ننہال گیا ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنے لڑکپن کے زمانے کا سب سے زیادہ دل خراش منظر دیکھا۔ وہ میعادی بخار میں مبتلا ہو کر کئی ہفتے بستر پر دراز رہا، کوئی دوا کارگر نہیں ہو رہی تھی، اسے شہر بھی لے جایا گیا لیکن دھیمے جان توڑ بخار سے اسے کوئی دوا نجات نہ دلا سکی، بالآخر ڈیڑھ دو ماہ کے بعد جب وہ بستر سے اترا تو ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، بیماری کے بعد جب اس نے پہلی مرتبہ اپنی صورت دیکھی تو اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ شیشے میں اپنی صورت دیکھ رہا تھا۔ ان دوران میں اس کے ہمجولی منتشر ہو چکے تھے، پارٹی کی وحدت ختم ہو چکی تھی صحت یاب ہو کر جب وہ پہلی مرتبہ زرگروں کے کھیل کے خطّے میں آیا تو ماحول کی ہر شے بدل چکی تھی یا اسے بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی، کچھ لڑکوں نے اس

/

کی خیر خیریت دریافت بھی کی لیکن اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ لوگ اس پر ترس کھا رہے ہوں، پہلے اس کے مُنہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کے ہمجولیوں کے لئے تھانیدار کی جھڑک ڈپٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب اس کے بُلانے پہ کوئی اس کی رفاقت کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ چند دنوں بعد جب وہ ذرا اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل ہوا اور کھیلنے میں آیا تو یہ دیکھ کر اس کے غصے کی انتہا نہ رہی کہ اس کے بیشتر ساتھی فیکی کی معیت میں کچی اینٹوں کے چبوترے پر بیٹھے ہیں وہ لوگ جیسے اس کے منتظر ہی تھے۔ جونہی اس نے چبوترے پہ قدم دھرا، فیکی نے آنکھ میچ کر اشارہ کیا۔ سب لڑکے اُٹھ کر فیکی کے ساتھ چل پڑے اور کچھ دُور نیو بھرے پلاٹ کی تارکول لگی بنیادوں پر جا بیٹھے۔ فیکی نے اپنے دو ایک معتمد ساتھیوں کو آواز دی، لیکن اُسے کوئی جواب نہ ملا، غصے سے اس کا خون کھول اٹھا، خون تھا ہی کہاں بس بجلی کی سی ایک لہر تھی جو آناً فاناً اس کی رگ و پے میں دوڑ گئی۔

”کوئی بات نہیں ― کوئی پروا نہیں“ اس نے چلا کر کہا ”جلدی ہی سمجھ لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ گھر جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ اسے دھمک دھمک سب لڑکوں کے پلاٹ سے کودنے کی آواز آئی، وہ ٹھہر گیا۔ وہ اس کی طرف آ رہے تھے اور فیکی سب سے آگے تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، ”کیا کہا اوئے تُو نے۔ سمجھ لوں گا ― کیا سمجھے گا؟“

وہ چند ثانیے خاموش کھڑا فیکی کو تکتا رہا پھر بولا۔ ”میں نے تو شادے اور بالی کو کہا ہے۔ تجھے تو کچھ نہیں کہا۔“

”تو مجھے کہہ بھی کیا سکتا ہے، تیری کھال نہیں ادھیڑ دوں گا میں . . . .“

اُسے حلق میں اپنی سانس رکتے ہوئے محسوس ہونے لگی، دل کی دھڑکن تیز ہو کر کنپٹیوں کو چھُونے لگی، ”گیدڑ کے بچے، مجھے بیمار دیکھ کر زبان چلاتا ہے۔“ وہ آنکھیں پھاڑ کر چلایا۔ دوسرے لمحے فیکی نے اُسے گریبان سے پکڑ کر دو ایک زور کے ہوکنے دیئے پھر زور کا دھکا دے کر زمین پر اس طرح پٹخ دیا جیسے کوئی سونٹی پہ ہنگتے ہوئے کوڑے کو جھٹک دیتا ہے۔ ”جا کچھ دن مالش کر، دودھ لسّی پی پھر سمجھنا۔ بڑا آیا پہلوان کا پتر۔“ فیکی بولا۔ پہلو کے بل گرنے کی وجہ سے اس کے بازو پہ سخت چوٹ آئی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی کلائی میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں، وہ اپنے سُتے ہوئے چہرے اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے فیکی کو دیکھتا رہ گیا پھر شادے کی آواز آئی ”ہا سو ہا کشتی لڑو گے؟“

اس کے ساتھ ہی سب لڑکے بیک آواز قہقہہ مار کر ہنسنے لگے وہ زمین پر کسی زخمی نڈھال پرندے کی طرح پڑا تھا، فیکی کی سربراہی میں سب لڑکے قہقہے لگاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

اس بات کو کافی دن گذر گئے۔ ابھی اس کی توانائی اچھی طرح بحال نہ ہوئی تھی، تاہم کسی وقت اُسے ایسے محسوس ہوتا جیسے اس کے جسم کا رہا سہا خون جمع ہو کر اس کے چہرے اور کانوں میں کھولنے لگتا ہے، اسے اپنا چہرہ آگ کی طرح دہکتا ہوا محسوس ہوتا۔ اس حادثے کے بعد اس نے قریب قریب سب لڑکوں سے بول چال بند کر دی تھی، وہ دوسرے تیسرے روز زرگروں کے خطّے میں ضرور جاتا تھا، اکّا دکّا لڑکے کبھی اسے ملتے تھے لیکن اب اس کی طبیعت کسی سے بولنے کو نہ چاہتی تھی، بس اس کی نظریں فیکی کی متلاشی رہتی تھیں، اگرچہ ابھی وہ خود کو اس کے مقابلے کے لئے مکمل طور پہ تیار نہیں پاتا تھا، لیکن اس نے ٹھان رکھی تھی کہ اچھی طرح صحتیاب ہوتے ہی وہ سب سے پہلے فیکی کو اس کی کمینہ حرکت کا مزا چکھائے گا۔ زیادہ سے زیادہ لڑکوں کے سامنے اِس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے گا۔

انہی دنوں اُسے پتہ چلا کہ فیکی کا باپ حشمت جو اس کی برادری کا سب سے بڑا چوہدری تھا۔ شہر سے بھورے رنگ کا ریشمی بالوں اور لٹکتے ہوئے کانوں والا اعلیٰ نسل کا ایک کتا لایا ہے جو نوکروں کی طرح ان کا کام کرتا ہے۔ ان کی ہر بات سمجھتا ہے، جونہی چیز پھینکو اٹھا کرلے آتا ہے۔ ان کے کھلے محلے میں سب سے شاندار حویلی فیکی کے باپ کی تھی وہ جانتا تھا کہ فیکی کا باپ بڑا زمیندار ہے سب لوگ اس سے دبتے تھے؛ اور اس کی بہت عزت کرتے تھے، لیکن اس کی نظروں میں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ ہر کوئی اپنے گھر میں بڑا ہوتا ہے۔ وہ صرف جسمانی طاقت پر یقین رکھتا تھا اور کسی کی زورآوری یا کمزوری کو اسی پیمانے سے ناپتا تھا۔

پھر جیسے لڑکپن کی زندگی کے سوئے ہوئے مناظر پر پڑا ہوا وہ آخری پردہ بھی اُٹھ گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی، وہ ننہا کر ننگی چارپائی پر لیٹ گیا لیکن سخت گرمی کی وجہ سے اسے نیند نہ آسکی، جب اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تو وہ اُٹھ کر باہر چلا آیا اور زرگروں کے خطے میں گھنے شیشم کے درخت کے نیچے آبیٹھا۔ مشرق کی طرف جہاں خطے کی حدود ختم ہوتی تھیں گوجروں کے چند لڑکے اپنی بھینسیں اور بکریاں چرا رہے تھے، بنیادیں بھرے پلاٹ کے ساتھ دھریک کے درخت کے نیچے اس کے محلے کے آٹھ دس بچے کھیل رہے تھے، اُسے بیٹھے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے دھان کے پیلے پکے ہوئے کھیت کے عقب میں فیکی کا سراپا اُبھرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ خطے کی طرف آرہا تھا، اسے دیکھتے ہی وہ ایسے چوکس ہو کر بیٹھ گیا جیسے کوئی شکاری جانور اپنے شکار کو دیکھ کر کان کھڑے کر لیتا ہے، فیکی سیدھا لڑکوں کی منڈلی کے پاس پہنچا، وہ لوگ گیٹی شطرنج کھیل رہے تھے اور سب لڑکے ان کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ اس نے دیکھا فیکی نے آتے ہی اپنے بوٹوں سے زمین پر بنی ہوئی لکیری بساط اور گیٹیوں کو مسل ڈالا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بڑے زور سے بولا "چلو یار وہاں ٹاہلی کے نیچے چلتے ہیں۔" سب لڑکوں نے بے چون و چرا اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لڑکے درخت کے تنے سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے، فیکی ٹھیک اس کے بالکل قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس نے فیکی کے تیوروں سے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ آج پھر وہ فساد کی نیت سے آیا ہے، لیکن وہ اب پہلے ایسا مریل اور کمزور ماشو نہ تھا۔ اس کی صحت کافی حد تک لوٹ چکی تھی اور اس سے کہیں بڑھ کر اس کا حوصلہ جو اس کی کمزور جسمانی حالت میں بھی ماند نہ پڑا تھا، وہ چپکا بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد فیکی نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر پوری قوت سے ہوا میں اچھالتے ہوئے اپنے قریب بیٹھے ہوئے بالی سے کہا "بالی اس سے کہو یہاں سے اٹھ جائے، ہم یہاں گیٹی کھیلیں گے۔" بالی نے اشاروں ہی اشاروں میں یہ بات جو سب نے سنی تھی اس تک پہنچائی۔ لیکن وہ اب بھی خاموش رہا۔ فیکی دوبارہ بولا "بالی اس سے کہو بھلی منسو سے فوراً یہاں سے چلتا بنے نہیں تو میں اس کی وہ مرمت کروں گا کہ دو مہینوں کے لئے پھر چارپائی پر لیٹ جائے گا۔"

ایک لمحظے کے لئے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، اس کا رواں رواں جیسے آگ کی لپیٹ میں آگیا، پہلے تو اس نے سوچا کہ ابھی اس کی گردن کو بانہوں میں لے کر اس کا کڑاکا بلا دے لیکن اس نے ضبط کیا کہ پہل اس کی طرف سے ہونی چاہیے۔ وہ اب بھی خاموش رہا اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر فیکی نے گردن اس کی طرف موڑی "اوے تو سنتا نہیں۔ بیماری نے تیرے کان بھی بہرے کر دیئے ہیں کیا! — چل بھاگ یہاں سے۔"

"نہیں جاتا، یہ جگہ کسی کے باپ کی نہیں ہے، میں تو پہلے سے یہاں بیٹھا ہوں۔"

وہ اپنا جملہ ابھی مشکل ختم کر پایا تھا کہ نیکی نے اٹھ کر پوری قوت سے بُوٹ کی ٹھوکر اس کے گھٹنوں پر رسید کی، اس کے ساتھ ہی اس نے دو تین گھونسے تاک کر اس کے منہ پر مارنے کی بھرپور کوشش کی لیکن اس نے اپنے سر اور جسم کی پھرتیلی حرکتوں سے نیکی کے اولین شدید حملے کو بے اثر کر دیا۔ اٹھ کر اس نے اپنے سر کی پوری قوت سے نیکی کے سینے میں ٹکر ماری اور اسے چاروں شانے چت گرا دیا، نیکی سنبھل کر اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے گھونسوں اور مکوں سے اُسے اَدھ موا کر دیا۔ لیکن نیکی اب بھی پوری قوت سے مزاحمت کر رہا تھا، پھر اس نے گریبان سے پکڑ کر اُسے ٹاہلی کے موٹے تنے کے ساتھ لگا دیا۔ نیکی کی طاقت جواب دے چکی تھی اس لئے اب اس نے اونچی آواز میں اسے گالیاں دینا شروع کر دی تھیں۔ اس کے جواب میں اس نے اُسے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹ لیا اور اس کی چھاتی پر بیٹھ کر چشم زدن میں مکوں اور تھپڑوں سے اُسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ جب نیکی کے منہ اور ناک سے خون بہنے لگا اور اس میں اُٹھنے کی طاقت نہ رہی تو اس نے اُسے چھوڑ دیا۔ دونوں بُری طرح ہونک رہے تھے، اتنے میں اس کے آس پاس حلقہ بنائے ہوئے ہجوم میں جیسے بھگدڑ سی مچ گئی، کئی لڑکے دیکھتے ہی دیکھتے بھاگ گئے۔ اس نے ہجوم کی ایک طرف اٹھی ہوئی نگاہوں کی پیروی کی تو اُسے پتہ چلا کہ خطّے کی سہ کونی دیوار کے خالی حصے سے نیکی کا باپ گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا اس کے پیچھے پیچھے بھورا لمبے کانوں والا کتا بھی تھا۔

اپنے باپ کو دیکھ کر نیکی کراہتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گیا، ہجوم کے قریب آ کر حشمت چوہدری نے آنکھیں پھاڑ کر پہلے تو ہجوم کو دیکھا پھر گھوڑے سے اترا اور چلا کر پوچھا "اس کو کس نے مارا ہے؟" ہجوم پر خاموشی طاری تھی، حشمت کی نظریں کھڑے ہوئے لوگوں کے سروں سے پھسلتی ہوئی اس کی سانس چڑھی ہوئی چھاتی پر آ کر ٹھہر گئیں۔

"تم نے مارا ہے اسے؟" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چاندی کی موٹھ والی بید کی چھڑی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اتنے میں گھوڑے کے اگلے سموں کے قریب کھڑا ہوا کتا غرایا تو حشمت نے اسے جھڑکی دی "خاموش ٹائیگر!" کتا وہیں دبک گیا۔

"میں پوچھتا ہوں تم نے اسے مارا ہے!" حشمت نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

"ہاں میں نے اسے مارا ہے، اس نے خود ہی خواہ مخواہ مجھ سے لڑائی مول لی اور بُرا بھلا کہا — لڑائی میں بھی اس نے پہل کی۔" اس نے جرأت سے جواب دیا "ان لوگوں سے پوچھ لو قصور کس کا ہے!"

"پوچھنے کی ضرورت نہیں، تم نے پہلے بھی ایک دفعہ میرے لڑکے کو ایسی ہی بیدردی سے پیٹا تھا، میں پوچھتا ہوں حرامزادے! تو نے اس گاؤں کی بدمعاشی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، باپ تیرا بھوکوں مرتا ہے سالے ......" ایکا ایکی چوہدری پر طیش کا بھوت سوار ہو گیا اور اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے سفید سفید جھاگ کے بلبلے اُٹھنے لگے، اس نے چھڑی کی موٹھ کا پہلا بھرپور وار اس کے چہرے پر کیا جو اس کے ابرو کی بالائی جلد کو چیرتا چلا گیا۔ پھر اس نے چھڑی کے پے در پے واروں اور ضربوں سے اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی اور وہ زمین پر گر کر تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح تڑپنے لگا، اس پر بھی حشمت کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا

اور اس نے ٹھوکروں اور ٹھڈوں کا سلسلہ اس وقت تک بند نہ کیا جب تک کہ وہ خود تھک کر نڈھال نہیں ہو گیا، چند بزرگ قسم کے لوگوں نے جو اس دوران میں ہجوم میں آ شامل ہوئے تھے حشمت کو کھینچا تو وہ چیخ کر بولا "الگ ہو تم لوگ، میں آج اس کو بدمعاشی کا مزا چکھا کر رہوں گا۔" ہجوم اب حشمت کے گرد جمع ہو گیا تھا، نیم بیہوشی کی انہی ساعات میں اس نے اپنے زخموں سے چور جسم کی رہی سہی قوت کو مجتمع کیا، اس کے تیزی سے سوچتے ہوئے دماغ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ جو ہڑی آج اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ اٹھا اور پھر گرتا پڑتا ایک ان سوچی سمت کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، حشمت کا کتا بری طرح بھونکنے لگا، خوف کی ایک تازہ برقی رو اس کے ورد سے چھلنی جسم میں دوڑ گئی، اسے بس اتنا یاد تھا کہ خطے کی مسجد سے ملحقہ دیوار پھلانگ کر وہ گوجروں کے احاطے میں کودا اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

اچانک کمرے میں ایک گھٹی گھٹی سی چیخ کی آواز بلند ہوئی اور بیگم حبیب نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں، کمرے میں خاموشی طاری تھی، اس نے وحشت آگیں نظروں سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا لیکن کمرے کی ہر شے ساکن تھی، اس نے سوچا شاید خود اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے اور یہ چیخ کی آواز بھی اسی کی تھی لیکن ذہن پر زور دینے پر اسے معلوم ہوا کہ خواب کی معمولی سی تفصیل بھی اس کے دماغ میں محفوظ نہیں تھی، تو پھر یہ چیخ کس کی تھی! دفعتہً حبیب کے بستر میں کسمساہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ بیگم نے دیکھا حبیب نے کروٹ بدلی اور اس کا چہرہ ٹیبل لیمپ کی دھیمی سبز روشنی کی زد میں آ گیا۔ "اُف!....." بیگم اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے کرب کو تکتی رہ گئی۔ حبیب کے دونوں ہاتھ اپنے گلے میں پیوست تھے، وہ بڑبڑا رہا تھا "تاجی، کوڑیالے سانپ کے بھائی، تاجی او تاجی! — وہ — وہ — وہ تیرا باپ سب سے بڑا ناگ ہے تم سب زہریلے ناگ ہو، تیری ان ہنستی ہوئی نظروں میں بھی زہر ہے، تیرے قہقہوں سے زہر کی بارش ہو رہی ہے۔ تم — تم سب زہریلی زمین سے اُگے ہوئے آدم خور درخت ہو، میرے قریب نہ آؤ، دُور ہو جاؤ — میرے قریب نہ آؤ، نہیں تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا، تجھے ختم کر دوں گا۔ گلا گھونٹ دوں گا — گلا گھونٹ دوں گا۔" بیگم حبیب نے وحشت کے عالم میں دیکھا حبیب کی انگلیاں اپنے گلے میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں، پھر رُکی ہوئی سانس کے ایک دم خارج ہونے سے اس کے منہ سے ایسی آواز نکلی جیسے اس کا نرخرہ پھٹ گیا ہو، پھر وہی گھٹی گھٹی بھیانک چیخ کمرے کی سہمی ہوئی فضا میں گونج اٹھی، بیگم نے دیکھا، حبیب کا پسینے میں نہایا ہوا چہرہ ایک لمحے کے لئے ہر قسم کے تاثرات سے یکسر خالی ہو گیا، پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ بیگم کو اپنے اوپر جھکے ہوئے دیکھ کر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے ہونٹ کھلے تھے اور آنکھوں میں وحشت، پُراسرار تفکر اور محویت کے آثار عود کر آئے تھے، بیگم فوراً اس کے برابر بیٹھ گئی نرمی سے اس کے کندھوں کو سہلایا۔ "شاید آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے!" وہ کچھ دیر اجنبی نظروں سے بیگم کے چہرے کو تکتا رہا۔ "ہاں — شاید خواب ہی تھا — خواب ہی تھا۔"

"اُف آپ تو بالکل پسینے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔" بیگم نے اس کی گردن کا زیریں حصہ سہلاتے ہوئے کہا۔ حبیب خاموش رہا۔

"غلطی مجھ سے ہوئی، میں رات سوتے وقت آپ کو ویلیم دینا بھول گئی۔"

"کیا وقت ہوا ہے!" اس نے پوچھا۔

"پانچ بج رہے ہیں۔ صبح ہونے ہی والی ہے۔" بیگم نے جواب دیا۔ وہ بُری طرح سہم گئی تھی لیکن اس نے بڑے حوصلے

سے خود پر قابو پائے رکھا، اس نے سوچا اس وقت غیر ضروری گفتگو حبیب کو مزید پریشانی اور الجھن میں مبتلا کر دے گی اس لئے اس نے خاموشی کو ہی قرینِ مصلحت سمجھا "میں آپ کے لئے چائے بنا کر لائی ہوں" چائے اور مسکن دوا کی گولی نے اس کے مشتعل اعصاب کو خاصا سکون پہنچایا اور وہ تھوڑی ہی دیر میں دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

حبیب کافی دن چڑھے بیدار ہوا تو اس کا موڈ کوئی ایسا خراب نہیں تھا، بیگم نے ناشتے کی میز پر ہی اُسے آج گھر رہنے کے لئے رضامند کر لیا تھا، اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ حبیب کی بگڑتی ہوئی ذہنی کیفیت کے خطرناک حدود میں داخل ہونے سے پیشتر اس کی کاروباری پریشانیوں کا فوری حل ضروری تھا۔ عافیت اسی میں تھی کوٹھی بیچ کر اس کے بقایا جات بلا تاخیر ادا کر دیئے جائیں، صبح حبیب کے دوبارہ سونے کے بعد وہ ایک لمحے کے لئے بھی سکون سے نہ بیٹھ سکی تھی، رات خواب کی ہذیانی کیفیت میں حبیب نے جو باتیں کی تھیں، ان سے بیگم کو ایک حد تک اس نفرت کے پس منظر کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا تھا جو وہ اپنے رشتہ داروں کے بارے میں رکھتا تھا، تاجی کا نام اس کے لئے نیا نہ تھا۔ وہ اس کی بیوی اور بہنوں سے متعدد بار مل چکی تھی۔ برادری کے دو ایک شادیوں کے اجتماع جن میں وہ شریک ہو چکی تھی وہاں اس کی ملاقات برادری کی بیشتر خواتین سے ہو چکی تھی، اُسے یاد آیا کہ تاجی کے ایک بھائی کی شادی پر جو کسی بیرونی ملک میں اچھا خاصا بزنس مین تھا اس نے پانچ سو روپیہ اور دو سوٹ بھی بھیجے تھے۔ یہ سب کچھ وہ برادری کی ایک دور کی رشتہ دار معمر خاتون کی نصیحت اور ہدایت پر کرتی رہتی تھی جو اسے برادری کی اونچ نیچ اور رشتہ داریوں کے نشیب و فراز سے آگاہ رکھتی تھی۔ اس نے ان باتوں کا تذکرہ کبھی حبیب سے نہیں کیا تھا، حبیب کی رات کی باتوں سے اُسے گویا اس کے مقفل ماضی کی چابی ہاتھ آ گئی، وہ سمجھ گئی کہ حبیب کی تمام الجھنوں اور پریشانیوں کا تعلق گمشدہ ماضی کے ان لوگوں سے ہے جو ٹمن بازار کے اس کوچے میں رہتے ہیں جنھیں حبیب بزعم خویش اپنی لوحِ ذہن سے مٹا چکا تھا لیکن جو اس کے لاشعور کے آسمان کے نیچے ایک دنیا آباد کئے بیٹھے تھے۔ پے در پے ناکامیوں کا مارا خود اعتمادی سے تہی دامن حبیب بیگم کی کسی تجویز کو رد نہ کر سکا۔ انہوں نے حالات کے تفصیلی تجزیہ کے بعد فیصلہ کر لیا کہ کوٹھی کو فی الفور فروخت کر دیا جائے، چند دنوں میں ہی کوٹھی کی فروخت کا بندوبست ہو گیا کوٹھی کی مالیت قرضہ جات کی رقوم سے تیس چالیس ہزار کم نکلی تو انہوں نے غیر ضروری قیمتی فرنیچر، زیبائشی سامان اور نوادر وغیرہ بھی فروخت کر دیئے۔

آٹھ دس روز کے مختصر عرصے میں انہوں مصائب کے اس پہاڑ سے نجات حاصل کر لی تھی جو قرضوں کی شکل میں ان کے سر پر مسلط تھا، اب دونوں کافی سکون محسوس کر رہے تھے، دو روز بعد انہوں نے کوٹھی خالی کرنا تھی اور حبیب کو ابھی تک معلوم نہ تھا کہ اس کے بعد وہ کس جگہ منتقل ہوں گے یہ کام بیگم نے اپنے ذمہ لیا ہوا تھا۔

بیگم حبیب نے تمام ضروری سامان پیک کرا لیا، دو روز قبل ہی وہ ہر ایک چیز سمیٹ کر کوٹھی خالی کرنے کے لئے تیار تھی، حبیب جیسے چابی والا کھلونا بن گیا تھا وہ بے چون و چرا بیگم کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ پیہم ناکامیوں نے اس کے سوچنے سمجھنے اور تعمیری غور و فکر کی قوت جیسے سلب کر لی تھی، اس نے اپنی قسمت کی ڈور جیسے اپنی بیوی کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ سہ پہر کے بعد وہ لان کی دھوپ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ حبیب اچانک کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا، بیگم اس

کے استغراق کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں، کل ہم نے کوٹھی کا قبضہ دینا ہے، ابھی تک ہماری متبادل رہائش کا بندوبست نہیں ہوا۔"

"اس کا بندوبست میں نے کر لیا ہے۔ گھبرائیں نہیں۔"

"کہاں؟" حبیب الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی بیوی ان حالات میں جبکہ ہر معاملہ روزِ روشن کی طرح واضح طور پر طے پا رہا ہے اس سے کچھ باتیں چھپا کیوں رہی ہے،

لیکن اب وہ ذہنی کیفیت کے اس مقام پر کھڑا تھا جہاں اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت ایک بھیانک تعطل کا شکار تھی، اس نے نیم خوابیدہ آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا، بیگم بھی محسوس کر رہی تھی کہ حبیب کے چہرے پر دو ایک روز سے پسپائی اور کھوئی ہوئی افسردگی کی چھاپ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی شخصیت کا تمام تر مقناطیسی تدبر جس کا تانا بانا اس نے اپنے گرد بُن رکھا تھا ایک دم شکست و ریخت کا شکار ہو گیا تھا، سربراہ خاندان کی حیثیت سے اس کی ذہنی بالادستی کا خود ساختہ تصور سرنگوں ہو گیا تھا۔ اپنی عظمت کے جو غیر ضروری ستون اس نے گھر میں جا بجا نصب کر رکھے تھے گر چکے تھے۔ یہ سارا کچھ اس کے اپنے خیالات کا ہی پیدا کردہ تھا۔ اس کی ذہنی کیفیات کے مدوجزر اور عروج و زوال کا اثر اس کی بیگم کی سادگی اور خوش طبعی پر نہ پہلے کبھی تھا اور نہ ہی آج وہ حبیب کے لئے اپنے دل میں محبت اور احترام کی کمی محسوس کر رہی تھی۔

بیگم نے نوکر کو بلا کر ٹیکسی لانے کے لئے کہا۔ پھر حبیب سے بولی۔ "آپ اگر چاہیں تو کپڑے تبدیل کر لیں، ذرا باہر چلیں گے۔"

حبیب اُٹھ کر کوٹھی کے اندر چلا گیا، لباس تبدیل کر کے جب وہ باہر آیا تو بیگم ٹیکسی کے پاس اس کی منتظر کھڑی تھی۔

ٹیکسی صاف چمکیلی سڑک پہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی، حبیب نے دیکھا مغربی افق پر خاکستری رنگ کے چھدرے بادلوں کے اوپر مدھم روشنی کے ہالے میں سورج سہ پہر کی منزل طے کر کے شام کی حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ سڑک آمد و رفت اور شور و شغب سے تقریباً پاک تھی، خنک ہوا کے تھپیڑے اس کے چہرے کے بائیں رُخ، گردن اور کانوں پر پڑ رہے تھے، اس نے مفلر سے نصف سر اور کانوں کو ڈھانپ لیا اور ساتھ بیٹھی ہوئی بیگم کو دیکھا جو باہر تیزی سے گزرتے ہوئے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔

ٹیکسی سنسان سڑک سے ایک گنجان آبادی میں داخل ہوئی، وہاں سے ایک موڑ کاٹ کر ایک چھوٹی سڑک پہ جس کے آس پاس دو منزلہ، سہ منزلہ عمارتیں تھیں آہستگی سے بڑھنے لگی، اگلے چوک میں غیر معمولی بھیڑ کی وجہ سے جب ڈرائیور نے اچانک بریک لگائی اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اچھلا تو باہر بازار کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت اور تفکر کی گہری کیفیت لرزنے لگی، یہ چوک تو اس کا بہت اچھی طرح دیکھا بھالا تھا، اس نے چاروں طرف پھیلی ہوئی دکانوں کو دیکھا، ان میں بیشتر دکانوں تھڑوں، چبوتروں اور گلیوں کی نکڑوں میں اب کافی تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں لیکن اتنا بھی نہ تھا کہ وہ اس کو پہچان ہی نہ سکتا، موٹر چوک سے آگے بڑھی تو سامنے مسجد کا مینار دیکھ کر گویا اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی، یہ ٹمن بازار کا کوچہ سلیمان والا حصہ تھا جہاں آج سے بیس برس پہلے وہ رہا کرتا تھا۔ کوچے کے باہر اسے کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی، وہی پلے گراؤنڈ کی چھوٹی سی

باؤنڈری جس میں اب بھی بچے کھیل رہے تھے ، باہر فروٹ ، گوشت ، مرغی ، گھریلو پرندوں پان چھالیہ بیکری اور پروویژن کے سامان کی ننھی سی مارکیٹ ، کوچے کا منقش دروازہ اس کے سامنے تھا ، اس نے گردن موڑ کر اپنی بیگم کی طرف دیکھا جس کی نظریں باہر بھیڑ میں گم تھیں ، پھر ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی ۔ بیگم فوراً ہی ٹیکسی سے نیچے اتر گئی ، پرس کھول کر ٹیکسی والے کو کرایہ دیا ، اتنے میں وہ بھی اتر کر بیگم کے برابر کھڑا ہو گیا ، اس کی کھوئی ہوئی نظریں اس ہجوم میں کچھ تلاش کرنے لگیں یہ وہی جگہ تھی جہاں اس نے لڑکپن کی منزلیں طے کر کے جوانی کی حدود میں قدم رکھے تھے ، جہاں اس نے چڑھتی ہوئی جوانی کے بے شمار بھرے بھلے دن کاٹے تھے ۔ یہ وہی جگہ تھی جس کو مسترد کر کے وہ چلا گیا تھا لیکن آج جیسے اس مقام نے اپنے نرم نرم ہاتھوں سے اس کے پیروں کو پکڑ لیا تھا ، آج جیسے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی ایک ایک چیز محبت بھری مسکراہٹ سے اُسے تک رہی تھی ، اس کی طرف بڑھ رہی تھی ۔ بازار میں پھیلی ہوئی ان گنت چیزوں کی اجتماعی بُو جیسے اس کے انفاس میں گھس کر اس کے ذہن میں ماضی کی یادوں کے بجھے ہوئے چراغ ایک ایک کر کے روشن کرتی جا رہی تھی ۔

" آئیے چلیے ۔" اس کی بیگم کی آواز اس کے کانوں میں پڑی ۔ وہ چند ثانیے کھڑا اپنی بیوی کو متحیر نظروں سے تکتا رہا ، پھر اس کے قدم خود بخود اس کے ساتھ چلنے لگے ابھی وہ کوچے کے پہلے چند مکان ہی طے کر پائے تھے کہ ایک قدرے بلند لیکن پُر جوش آواز نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا ۔" آپ آ گئیں بھابی !" دونوں نے گردن موڑ کر دیکھا ایک چالیس بیالیس سالہ خوش پوش آدمی ان کی طرف بڑھ رہا تھا ، اس کے سر کے بال کنپٹیوں سے سفید ہو چکے تھے لیکن چہرے پر ابھی جوانی اور صحت کی تر و تازگی باقی تھی ، اس نے آ کر پہلے تو پیشانی تک ہاتھ لے جا کر بیگم حبیب کو آداب کہا پھر حبیب سے لپٹ گیا ۔" پہچانا مجھے ؟" اس نے حبیب کے سینے کو پوری گرمجوشی سے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا ۔ چند منٹ اس کی کمر کو تھپتھپاتا رہا ، کئی مرتبہ اس سے الگ ہو کر اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں ، پھر اس سے لپٹ لپٹ گیا ۔" نہیں پہچانا ؟" وہ بولا ، حبیب بس آنکھیں پھاڑے اُسے تکے جا رہا تھا ، پھر جیسے ایک دم اس کا چہرہ تیزی سے امڈ آنے والے جذبات کی وجہ سے سرخ ہو گیا ۔ اس نے اس انسان کے جسم سے اٹھنے والی گرم تیز فطری خوشبو پہچان لی تھی ،" تاجی !" وہ ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے سے لپٹ گئے ، حبیب کے ہونٹوں سے عجیب نا قابلِ فہم سے الفاظ نکل رہے تھے ۔ تاجی —" تاجی ، تم اچھے تو ہو —" تاجی تم کتنے اچھے ہو ۔"

چند منٹ بعد وہ تاجی کی آراستہ پیراستہ وسیع نشست گاہ میں بیٹھے تھے ، ان کے گرد برادری کے لوگوں کا ایک مختصر سا ہجوم بن گیا تھا ، ان میں کتنے شناسا چہروں کو اس نے کتنی مدت کے بعد دیکھا تھا ، ان میں شاوا تھا ، ماکھی تھا ، بالکا تھا رحمت تھا ، ان سب کو اس نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا تھا ، تاجی سے ملتے ہی جیسے اس کے ذہن کے دریچے پوری کشادگی کے ساتھ کھل گئے تھے ۔ ان لوگوں کی محبت اور گرمجوشی نے جیسے اُسے سر سے پاؤں تک ہلا کر رکھ دیا ۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ اس کوچے سے کبھی باہر نہ گیا تھا ، وہ ازل سے یہیں ان لوگوں کے درمیان تھا ، باہر صحن میں شور مچا ہوا تھا ۔

" ہاسو آیا ہے ۔" کیا سچ ہاسو آیا ہے ، کہاں ہے ہاسو ۔" پھر کچھ اور شور بلند ہوا ۔ ایک بوڑھی مگر توانا آواز بلند ہوئی ۔ " ہاسو آج کیسے راستہ بھول پڑا ۔" پھر کھٹاک کھٹاک چند آدمیوں کے اندر آنے کی آواز آئی ، حبیب نے دیکھا دو بوڑھے انسان چہروں

کی گنجلک جھریوں میں کانپتی ہوئی مسکراہٹیں لئے اُسے تک رہے تھے۔ اس نے روشن چاچا کو فوراً ہی پہچان لیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی گردن اس کی مہندی لگی داڑھی اور کنپٹیوں پر جھولتے ہوئے بالوں میں پھنس گئی۔ روشن چاچا کہہ رہا تھا "اپنوں کو اس طرح تو کوئی سنگ دل انسان بھی نہیں بھولتا جس طرح تم بھول گئے تھے، میرے بیٹے! آج مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے خاندان کے چھتنار کا کٹا ہوا ایک بڑا ٹہنا معجزانہ طور پر دوبارہ اس سے جڑ گیا ہے...... ادھر دیکھو، قدرت نے بچھڑے ہوئے بھائیوں کے ملاپ کے کیسے کیسے سامان پیدا کر دیئے ہیں ـــ فیکی آج ہی اتنی مدت کے بعد کینیڈا سے آیا ہے، اور یہ ہے حشمت جو تمہیں دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا......" اس سے آگے وہ کچھ نہ سن سکا۔ اس کی نظریں پہلے فیکی اور پھر اس رعشہ زدہ خمیدہ کمر بوڑھے پر پڑیں، پھر صاف ستھرا، گورا چٹا، خوش لباس صحت مند فیکی اس سے لپٹ گیا، اس کے جذبات آفریں قہقہوں سے جیسے کمرے میں طوفان سا آ گیا "ہاسو میرے بھائی ـــ ہاسو میرے دوست، میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں میں بچپن میں بھی تم سے اسی طرح محبت کرتا تھا، تمھیں رشک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی ـــ یہی وجہ تھی ـــ میں تمھیں بہت چاہتا ہوں، ہاسو میرے دوست، میرے بھائی ـــ میں تمھیں کتنا یاد کرتا تھا۔" پھر رعشہ زدہ بوڑھے نے اپنی چھڑی پھینک کر دونوں کانپتے ہوئے بازو اس طرح پھیلا دیئے جیسے اس کا انگ انگ محبت بھری آغوش کی پکار بن گیا ہو، اس نے بڑھ کر ہاسو کی پیشانی کو چوم لیا۔ ہاسو نے دیکھا کمرے کی وسعت محبت بھری باتوں، نظروں، اٹھتے ہوئے سچے جذبات سے معمور تھی، وہ سوچنے لگا ان لوگوں کو اس سے بچھڑنے کا کتنا دکھ تھا لیکن ان لوگوں نے اس سے، اپنی برادری، اپنے خاندان کے یک فرد سے محبت اور چاہت کا سلسلہ منقطع نہ کیا تھا، وہ جیسے اس محبت کو اپنے دلوں اور اپنے سینوں میں سٹور کرتے چلے آتے تھے اس لئے تو ان کی باتوں میں ان کے جذبوں اور ان کے اظہار میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔

باتوں اور قہقہوں کا سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا، وہ سوچ رہا تھا اس نے ایک دنیا کھو کر دوسری نئی دنیا پائی ہے - وہی پرانی دنیا جو اب اس کے لئے نئی دنیا بن گئی تھی، اس نے اس دنیا کو چھوڑا ہی کیوں تھا - یہ دنیا اس کے خون کے ذرے ذرے، جسم کے روئیں روئیں میں بسی ہوئی تھی، پھر روشن چاچا، فیکی اور تاجی اُسے اس مکان میں لے گئے جہاں اُسے دوسری صبح منتقل ہونا تھا۔ وہ اس مکان کے دروازے کے سامنے کھڑا حیرت ناک نظروں سے اس کے در و دیوار کو تک رہا تھا، اسے اپنی بصارت پہ یقین نہیں آ رہا تھا، یہ وہی مکان تھا جس بیس برس پہلے اس کی رہائش تھی، مکان کے رنگ روپ میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں تھی، وہ جیسے برسوں سے اس کے انتظار میں باہیں پھیلائے کھڑا تھا۔

بوڑھا حشمت اپنی کانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا "وقت کا ڈھلتا چڑھتا سایہ محبت اور پیار کے رشتوں کو اور مضبوط کر دیتا ہے، بددل اور مایوس نہ ہونا بیٹا، یہ دن تو یونہی بدلتے رہتے ہیں۔"

"آفرین ہے اس بچی پہ ـــ آفرین ہے اس بچی پہ جس نے ہاسو کے خونی رشتوں کی لاج رکھ لی۔" روشن چاچا بولا۔

"بھابی!" تاجی بولا "ہم کل صبح ٹرک لے کر آ جائیں گے، شام کو اس وقت آپ یہاں کھانا پکا رہی ہوں گی۔" خیالات کے سمندر میں غرق حبیب نے صحن کے اوپر پھیلے ہوئے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ پیپل کے گھنے درخت کے اوپر پورا چاند جگمگا

رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے ٹمٹماتے ستاروں کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔

صبح سورج گز بھر بلند ہوا ہوگا کہ فیلکی اور تاجی ایک ٹرک اور پک اَپ لے کر آ گئے سامان کی گٹھڑیاں اور پیکٹ تو پہلے ہی سے تیار پڑے تھے، ڈیڑھ دو گھنٹے میں ٹرک اور گاڑی میں سامان لد گیا، تاجی اور فیلکی بچوں کو بھی ہمراہ لے گئے۔ حسیب اور بیگم کوٹھی کے نئے مالک کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ آ گیا تو بیگم نے سابقہ نوکر کو بلا کر اُسے انعام کے طور پر کچھ رقم دی پھر اُسے ٹیکسی لانے کے لئے کہا۔ کوٹھی کا قبضہ دیا جا چکا تھا، وہ دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے گیٹ کی طرف بڑھے۔ ٹیکسی سڑک کے کنارے رک گئی۔ حسیب نے پلٹ کر خالی گھر کے در و دیوار پر نظریں ڈالیں۔ یکایک اس کے دل میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ دکھ اور کرب کے ایک سنگین احساس نے جیسے اس کے سینے پر منوں بوجھ لاد دیا۔ وہ گیٹ سے باہر نکلا، بیگم ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی، وہ گاڑی کی طرف کھلی سیٹ کی طرف بڑھا۔ اچانک اس کی نظریں ساتھ والی کوٹھی کے گیٹ کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے دیکھا پڑوس والی کوٹھی کے نوکروں کے کوارٹروں سے ایک چار پانچ سالہ بچی بھاگتی ہوئی آئی اور ستون کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ حسیب کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں جیسے لرزنے لگیں، اس کی پلکوں پر جیسے منوں بوجھ پڑ گیا۔ نظروں میں جیسے سوز و گداز کا سمندر اُمڈ آیا اس کی کانپتی ہوئی نظریں بچی کے چہرے پر گڑ گئیں۔ بچی نے اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے عجیب سے تاثرات کو دیکھ کر اپنا قدم پیچھے ہٹایا پھر ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی بیگم کو دیکھنے لگی۔ حسیب کا پورا جسم جیسے موم کی طرح نرم پڑ گیا۔ پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس نے بازو بچی کی طرف پھیلا دیئے۔

"ادھر آؤ بیٹا" دوسرے لمحے اس نے بڑھ کر بچی کو گود میں اٹھا لیا، اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ جذبات کے تھپیڑوں میں کانپنے لگی، اس نے اپنے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بچی کے ابرو پر پھیلے ہوئے زخم کو چوم لیا اور اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ہرا سمندر

مظہر الاسلام

یہ اس لڑکی کے باپ کی کہانی ہے۔ جو چوڑیاں توڑ کر بھائی، باپ اور سہیلیوں کا پیالہ نکالتی تھی۔ ہر جمعرات کو "کوکلا چھپاکی" کھیلتی تھی۔ اور ہرے سمندر کی مچھلی بن کر سہیلیوں کے سوالوں کے جواب دیتی تھی۔ یہ کہانی اس نے خود ہی مجھے سنائی تھی۔ اور آپ کو سنانے کو کہا تھا۔

اس بات کو زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ مجھے بوڑھے پیپل کے قریب ملی تھی۔ جہاں اس کا باپ اسے ایک سہمے سے بیے تنہا چھوڑ کر پتنگ لوٹنے چلا گیا تھا۔ اور یہ کہانی اسی لئے انتہائی مختصر ہے کہ یہ پتنگ لوٹنے کے لئے گئے ہوئے شخص کی واپسی کے عرصے میں سنائی گئی ہے۔ شاید یہ عرصہ پلک جھپکنے کے عرصے سے بھی کم اور پتنگ لوٹنے والے کی پوری زندگی سے بھی زیادہ تھا۔ مجھے لڑکی کا نام معلوم ہے اور نہ ہی اس کے باپ کا۔ البتہ میرا نام مظہرالاسلام ہے اور اس کہانی کو دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ میں نے اپنا نام بھی اسی لئے ظاہر کر دیا ہے کہ میں یہ فرض پورا کر رہا ہوں۔ آپ اس کہانی کو کوئی بھی نام دے لیں۔ کالی جمعرات کی کہانی سمجھ لیں یا باپ اور بیٹی کی لیکن فی الحال میں نے اس کہانی کا نام "ہرا سمندر" رکھا ہے۔ تو کہانی ہرا سمندر کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

"جب وہ گھر لوٹا تو رات کا پہلا پہر دم توڑ رہا تھا۔ گھر کے سب افراد کبھی کے سو چکے تھے۔ اس کی بیوی نے اٹھ کر اسے کھانا دیا اور پھر سو گئی۔ کھانا کھا کر وہ کتنی دیر یوں ہی ادھر ادھر تکتا رہا۔ ننھے کے دودھ کی بوتل پہلو کے بل پڑی اونگھ رہی تھی اور وقت کا تھکا ہوا بیل گھڑی کی سوئیوں کے آگے جتا ہوا تھا۔ کِلی کے ساتھ لٹکی شلواروں اور قمیصوں کے اندر اندھیرا سرسرا رہا تھا۔

صبح کا اخبار میز سے آدھا نیچے لٹکا ہوا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اخبار سبزی منڈی کا تھڑا ہے۔ جس پر لفظ گلے ادھ کچلے باسی ٹماٹروں، بینگنوں اور آلوؤں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ اس نے بو اور سڑاند سے بچنے کے لئے ایک ہاتھ سے ناک کو مضبوطی سے دبا لیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے اخبار کو کونے سے پکڑ لیا۔ جیسے مرے ہوئے چوہے کی دم کو چمٹے سے پکڑ رکھا ہو۔ باہر آ کر اس نے اخبار کوڑے والے ڈبے میں پھینک دیا۔

کمرے میں آ کر اس نے بتی بجھائی اور نیند کی ہتھیلیوں پر آنکھیں ملنے لگا۔ بتی بجھتے ہی شلواروں قمیصوں اور کتابوں کے پیچھے سرسراتا ہوا اندھیرا باہر نکل آیا اور گھڑی کے شیشے کو چاٹنے لگا۔ وہاں سے ہٹا تو گلاس میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گیا۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔

لیکن گلاس کی طرف دیکھ کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اچانک شڑ شڑ کی آواز پر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کی بیوی نل بند کرنا بھول گئی تھی۔ اٹھ کر وہ غسل خانہ میں گیا جلدی سے نل بند کیا اور بستر پر آ کر نیند کی چڑیا پہ ڈوریں پھینکنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بادل گرجا تو کچھ دیر کیلئے اس کی آنکھیں ساکت ہو گئیں اور کانوں میں حیرت ہوئے بھرنے لگی۔ اس نے سوچا۔ ابھی چند منٹ پہلے تو موسم بالکل صاف تھا پھر جاتے یہ بادل یکدم کہاں سے آ گئے۔ صبح اس کی بیوی نے کپڑے دھو کر چھت پر ڈالے تھے۔ اور شاید اسی لئے انھیں اتارنے کا خیال نہیں آیا کہ بارش کا کوئی امکان نہ تھا۔ خیال کا پہاڑ سر کرتے ہوئے وہ چھت پر پہنچا۔ اور کپڑے اکٹھے کر کے نیچے لے آیا۔

پھر وہ لیٹا ہی تھا کہ صحن میں پڑی خالی تھالی میں بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگیں اور ٹپ ٹپ ٹپا ٹپ، دھا دھن دھن تا میں بدل گئی۔ اُسے لگا جیسے اس نے جو اخبار ابھی کوڑے والے ڈبے میں پھینکا تھا۔ اس میں چھپے ہوئے اشتہار والی لڑکی نے گھنگرو باندھ لئے ہیں۔ وہ باہر کان لگائے کچھ دیر یوں ہی گم صم پڑا رہا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ بارش ہو رہی ہے۔ اس نے سوچا جب وہ گھر سے نکلا تھا۔ تو اس کا بیٹا صحن میں بیٹھا تختی لکھ رہا تھا شاید وہ اسے اندر رکھنا بھول گیا تھا۔ صحن میں آ کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ تختی اور کتاب کونے میں پڑی بھیگ رہی تھیں۔ کتاب نے مرغی کی طرح پر پھیلا رکھے تھے اور لفظوں کو اپنے پروں میں چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ کتاب اور تختی کو اٹھا کر برآمدے میں لے آیا اور میز پر رکھ دیا۔

منہ چھت کی طرف کئے وہ پھر لیٹا ہوا تھا۔ بتی بجھانا اس نے مناسب نہ سمجھا کیونکہ بتی بجھتے ہی اندھیرا ہر طرف چوکڑیاں بھرنے لگتا۔ دیواروں پر ناچتا کبھی اس کے بوٹ پہن لیتا کبھی سنگھار میز پر بیٹھ کر اس کی بیوی کی لپ اسٹک، کریم، پاؤڈر اور پرفیوم اپنے چہرے پر مل لیتا۔ وہاں سے ہٹتا تو گندے ہاتھ پھر گلاس میں ڈال دیتا۔

اس نے کمر سیدھی کی اور چاروں طرف دیکھا، اس کی نگاہیں بتی کے گرد منڈلانے لگیں۔ اس کے پلکیں جھپکنے کی آواز پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، اسے خیال آیا صحن میں پڑی چارپائی بھیگ رہی ہے۔ وہ اٹھ کر صحن کی طرف بڑھا اور چارپائی برآمدے میں رکھ کر پھر اپنے بستر پر آ گیا۔ اسے لگا جیسے وہ کسی کالج کا ہوسٹل ہے جس کی راہداریوں اور زینوں پہ کچی عمروں کے خیالات اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ پھر یک دم تیز آندھی چلی۔ اس کی کھڑکیاں اور دروازے زور زور سے بجنے لگے۔ بارش اور تیز ہو گئی ——— اسے "جیسے چھت ٹپک رہی ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے بستر کو ہاتھ سے ٹٹولنے لگا ——— بستر بالکل خشک تھا اور بارش کی بوندیں کدالوں کی طرح اس کے سر پہ لگ رہی ہیں۔ اچانک بکری کے ممیانے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، سامنے والوں کی بکری بارش میں بھیگ رہی تھی اور اس کی بھیگی ہوئی آواز سے خوف ٹپک رہا تھا۔ کتنے بے خبر لوگ ہیں وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور گھر سے باہر آ گیا۔

سارے مکان بارش سے بچنے کے لئے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔ سامنے والوں کی بکری کلہ تڑاتے کے لئے زور لگا رہی تھی لیکن کلہ بہت مضبوط تھا اور اسے توڑنا یا اکھیڑنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے کئی بار بکری والوں کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ بارش سے اس کے کپڑے بھیگ رہے تھے اور ان سے پانی ٹپک رہا تھا۔ بار بار دروازہ پیٹنے کے بعد

بھی جب اندر سے کوئی نہ نکلا تو اس نے بکری کو کلے سے کھول کر چھپر کے نیچے باندھ دیا۔ اتنے میں اس کی نظر ایک اور مکان پر پڑی جس کے چھت پر میلے کپڑے بھیگ رہے تھے۔ اس نے مکان کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے کسی نے اونچی آواز میں پوچھا کون ہے۔ اپنا نام بتائے بغیر وہ بولا۔ بارش ہو رہی ہے چھت پر کپڑے بھیگ رہے ہیں۔ انھیں اتار لیں۔ جملہ پورا کر کے وہ جلدی سے گھر کی طرف لپکا اور کمرے میں آ کر بھیگے ہوئے کپڑے اتارنے لگا۔

کپڑے بدل کر وہ بستر پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ سب بے خبر سو رہے تھے اور اندھیرا کتابوں کے پیچھے چھپا بیٹھا بتی بجھنے کا منتظر تھا۔ بارش لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہ بہت کچے مکان اس بارش میں بہہ جائیں گے۔ معاً اُسے اپنے محلہ کے حلوائی کے۔ بنچ کا خیال آیا جو اس کی دکان کے سامنے پڑا رہتا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ حلوائی کی دکان کے سامنے پہنچ گیا ہے اور اس کا بنچ اٹھا کر تھڑے پر رکھ رہا ہے۔ ایک دکان کے سامنے خالی بوریاں پڑی تھیں۔ اس نے انھیں اٹھا کر چھپر کے نیچے رکھ دیا۔ بازار سنسان پڑا تھا اور بارش کی گھما گھمی تھی۔ دکانوں کے دروازے بند تھے اور ان کے مالک گھروں میں سو رہے تھے اسے لگا جیسے سب دکانیں اندر سے ٹپک رہی ہیں۔ وہ ان کے مالکوں کو اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن اسے تو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ کس دکان کا مالک کون ہے۔ ایک خوب صورت پرندہ کھمبے پر سے اڑا اور پناہ کی تلاش میں چھپر تک آیا لیکن بیٹھنے کی جگہ نہ پا کر پھر لوٹ گیا۔ اس نے کوشش کر کے پرندے کو پھر کھمبے پر سے اڑایا تاکہ وہ محفوظ جگہ پہ بیٹھ جائے۔ پرندہ پھر اڑا چھپر کے نیچے بیٹھنے کے لئے دو تین چکر کاٹے مگر جگہ نہ پا کر ایک سائن پہ بیٹھ گیا۔

سائن دھندلا رہا تھا۔ اس پر لکھی ہوئی عبارت مٹ گئی تھی۔ دور سے گاڑی سٹارٹ کرنے کی آواز آ رہی تھی لیکن گاڑی سٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔

اچانک کوئی برتن لڑھکتا ہوا دور جا گرا اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس کی بیوی باورچی خانے کا دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی اور بلی اندر گھسی ہوئی تھی وہ اپنے بستر سے اٹھ کر باہر آیا اور باورچی خانے کا دروازہ مضبوطی سے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی رات خاصی ڈھل چکی تھی اور صبح ہونے کو تھی لیکن بارش اور بادلوں نے اندھیرے کو پناہ دے رکھی تھی۔ اس آنکھ لگ گئی۔ لیکن ابھی اسے سوئے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ بیٹے نے گھبراہٹ میں زور زور سے اسے ہلایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا کیا بات ہے۔

وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ کوئی نقب لگا کر گھر کا سب کچھ لے گیا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا "سب کچھ.... نقب....

بیٹا بولا..... ہاں نقب۔ دیکھئے آپ کی چارپائی کے نیچے کتنا بڑا موراہے۔

عنوان سے عاری

عائشہ صدیقی

جب سے میت لا کر رکھی گئی ہے، جیسے ایک دم زندگی کا ریلا گھر میں گھس آیا ہے۔ سارا گھر لوگوں سے بھر گیا ہے۔ آنگن میں لگے شہتوت کے درخت کے نیچے اینٹیں جوڑ کر چولہا بنایا گیا ہے جس پر پتیلے میں پانی چڑھا ہے۔ قریب ہی طباق میں بیری کی پتیاں رکھی ہیں جو ہوا کے چھیڑنے سے بار بار بکھر جاتی ہیں۔ پڑیا میں بندھے کافور کی مہک جیسے سیدھی بھیپھڑوں میں اتری جا رہی ہے۔ لوبان کا اینٹھتا ہوا دھواں گیلی آنکھوں میں تیرتا پھر رہا ہے۔

ابھی ابھی کھجور کی نم آلود ہری ہری چٹائیاں بھی بُن کر آئی ہیں۔ ایک بڑی سی چٹائی پر جذبات سے عاری بے حس چہرے لیے کچھ لوگ بیٹھے ہیں جن کے ہاتھ بڑی تیزی سے کورا کورا سفید کپڑا پھاڑ رہے ہیں۔ عورتیں ایک ایک کر کے آ رہی ہیں۔ بڑا دالان کھچا کھچ بھر گیا ہے۔ جب بھی کوئی رشتہ دار اندر آتا ہے گھٹی گھٹی آوازیں پھر چیخوں میں بدل جاتی ہیں۔ سسکیاں لیتی ہوئی چھوٹی بیگم پھر پچھاڑیں کھانے لگتی ہیں۔ ان کی دل دوز چیخوں سے جیسے آسمان پھٹا جاتا ہے۔ ہر آنکھ بھر آتی ہے۔ ہاں بس ایک بڑی سرکار ہیں جو سپاٹ چہرہ اور خشک جلتی ہوئی آنکھوں سے سب کو تک رہی ہیں۔ وہ تیر کی طرح دل میں اُتر جانے والی نظروں سے چھوٹی بیگم کو گھور رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں اتنی حیرانی ہے جیسے انھوں نے پہلی بار کسی کو بیوہ ہوتے دیکھا ہو۔ وہ بار بار چشمے کے شیشے صاف کر کے ایک ایک کو دیکھ رہی ہیں جیسے انھیں ان سب کے یوں اپنے گھر میں آ جانے پر حیرت ہو۔ اور واقعی اتنے دنوں بعد ان چہروں کو دیکھا ہے کہ پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے۔ انھیں تو شک ہو رہا ہے کہ یہ ان کا گھر ہے بھی یا نہیں۔ یہ حویلی جو آج یوں بھر گئی ہے تیس برس سے بھائیں بھائیں کر رہی ہے۔ اس کے لق و دق کمرے، ٹھنڈی صحنچیاں، اونچی اونچی شہ نشینیں اور لال لال اینٹوں والا صحن آدمیوں کی صورت کو ترس گیا۔ اسی بڑے دالان کے بیچوں بیچ جہاں میاں جان کا جنازہ رکھا ہے وہ دن بھر پلنگ ڈالے بیٹھی رہتی ہیں اور امرود پر جمع ہونے والے توتوں کو ہنکا ہنکا کر دن کاٹا کرتی ہیں کبھی کبھی تو توڑے ہوئے شہتوت کئی حصوں میں تقسیم کرنے میں ہی گھنٹوں گزر جاتے ہیں۔ سب کے الگ الگ حصے بانٹ کر وہ دریچے میں جا کھڑی ہوتی ہیں اور پچھواڑے باغ کو جانے والی پگ ڈنڈی کو آس لگائے تکتی رہتی ہیں۔ منّو گڑّو ہاتھ لگ جاتے ہیں تو جلدی سے ان کے لیے بنائے ہوئے پتوں کے دونے اٹھا لاتی ہیں وہ ایک، اور دو ایک شہتوت خود اپنے ہاتھ سے ان کے منھ میں بھی رکھ دیتی ہیں۔ مارے ممتا کے خود ہی انگنائی میں لگے پیڑوں کی ٹہنیاں نوچ کھسوٹ کر لے آتی ہیں لیکن وہ بھلا ہاتھ آتے ہیں ..... دھبڑ دھبڑ منہ پر دھول اڑاتے نکل جاتے ہیں اور وہ اس پہاڑ سی لمبی ویران دوپہر میں خاک چھانتی رہ جاتی ہیں۔ اب تو خیر اتنا بھی ہو گیا ہے کہ چھوٹی بیگم کے نانی پوتے کبھی بھولے بھٹکے گھس آتے ہیں ورنہ انھوں نے خود اپنے کانوں سے چھوٹی کو کہتے سُنا تھا۔

"دیکھو نیچے آنگن میں امرود تلے کھیلنے مت جانا۔ سنسان گھروں میں بھوتوں کا سایہ ہو جاتا ہے۔"

"منّو کبھی بھولے سے بھی اُمّاں بی کی دی ہوئی کوئی چیز نہ کھانا نہیں تو بیمار پڑ جاؤ گی۔"

"اے میں برابر کہتی ہوں اور آپ کے کان پہ جوں ہی نہیں رینگتی۔ مجھے تو ہول ہی سوار ہوتی ہے بچوں کو نیچے بھیجتے۔ اگر کوئی ٹونا ٹوٹکا کر وا دیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

روز ہی یہ آوازیں کانوں میں سیسا بن کر گھل جاتیں اور وہ سر جھٹک جھٹک کر جیسے انھیں کانوں سے نکالنے کی کوشش کرتیں جب ان کا شور بڑھ جاتا تو کانوں کو اس طرح دبا کر بیٹھ جاتیں، جیسے شدید تکلیف میں مبتلا ہوں اور جب اس اکیلے سنسان گھر میں شبراتی ان کا کام کرنے آتا اور انھیں اس طرح بے چینی سے کروٹیں بدلتا پاتا تو پریشان ہو جاتا۔

"میری مانیے تو بڑی سرکار شہر میں جا کر کان دکھائیے۔ یہ روز روز کا درد اچھا نہیں۔"

وہ مُسکرا کر اُسے دیکھا کرتیں اور وہ کراہ کر بس یہی جواب دے پاتیں۔

"نہیں شبراتی۔ میرے کانوں میں زہریلے کیڑے گھس گئے ہیں۔ یہ ہر وقت کلبلاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے میرے دماغ کو چھلنی کر دیا ہے۔ اب تو مر کر ہی ان سے پیچھا چھوٹے گا۔"

وہ پھر کانوں کو زور سے دبا لیتیں۔ جب بھی یہ درد اٹھتا وہ مُنّی گُگّو کے لیے توڑے ہوئے امرود اور شہتوت کسی اندھیرے کونے میں پھینک آتیں۔

ان کے لیے تلے ہوئے گرم گرم گلگلے نوچ کر بکری کے آگے ڈال دیتیں۔ اور جب بکری بھی ان کی گرمی سے تلملا کر منھ پیچھے کر لیتی تو وہ بلک بلک کر اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگتیں۔

"کھا لے۔ تو ہی کھا لے اِن میں زہر نہیں ہے۔"

کبھی روٹی پکاتے پکاتے آٹے کی چڑیا بگلے سینکنے لگتیں اور پھر ایک دم سب چولہے میں جھونک اور جلتی ہوئی لکڑیوں پر پانی ڈال، کبوتر کی سی لال لال آنکھوں سے شبراتی کو بے مقصد گھورتی ہوئی کسی اندھیرے کمرے میں پڑ رہتیں۔ دوپہر چمک چمک کر ماند پڑ جاتی اور گھر ایسے ہی سُونا پڑا رہتا جیسے جاڑوں میں آم کا باغ اور شام کے ڈوبتے سایوں میں جب وہ اپنا کھرا آلود چہرہ لیے باہر نکلتیں تو ان کی صورت دیکھ کر شبراتی کو یقین ہو جاتا۔

"چھوٹی بیگم سچ ہی کہتی ہیں، ضرور ان پر کسی کا سایہ ہے ورنہ بھلا اتنا سکھ، اتنی دھن دولت پا کر کہیں چہرے پر یوں قبرستان کا سا سناٹا ہوتا ہے۔"

سچ مچ انھیں کون سا آرام نہیں ملا تھا زندگی میں۔ دوسرے آنگنوں میں لگی کتنی ہی بیریاں پت جھڑ کی نذر ہو گئیں اور کوئی ڈھیلا نہ آیا اور ان پر جیسے ہی ہریالی چھائی ایسا پارس پتھر آ کر ٹکرایا کہ سونے میں پیلی ہو کر دودھ میں نہائی سفید حویلی میں آنی بنا کر اتار دی گئیں۔ کونا کونا جیسے جگمگا اٹھا۔ وہ جس طرف سے ہنستی ہوئی گزر جاتیں جیسے جھنکار سی گونج جاتی۔ پھول کھل کھل جاتے۔ لیکن خوشیوں کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے۔ آخر کہاں تک اکیلے قہقہے لگا کر اتنی بڑی حویلی کی رونق قائم رکھی جا سکتی تھی۔

ایک سال — دو سال — آٹھ طویل سال

وہ مسکراتے مسکراتے چونکنے لگیں۔ ہنستے ہنستے یکایک چُپ ہو جاتیں۔ شبّو میاں جب کچھ ڈھونڈتے ہوئے سے اندر آتے تو وہ جیسے چور بن جاتیں اور جب وہ وہی سرسری سطحی سی باتیں دُہرا دیتے۔

"کیا کر رہی تھیں؟"

"طبیعت ٹھیک ہے؟"

"بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں؟"

"فصل کا آیا ہوا اناج رکھوا دیا؟"

تو وہ بس سب کے جواب میں ایک ندامت آمیز خاموشی کا بوجھ سنبھالے کھڑی رہتیں۔ پھر یہ گفتگو اور مختصر ہوتی گئی ——

"آپ کو کوئی ضرورت تو نہیں ہے؟"

"کھانے پر میرا انتظار مت کیجیے گا، اِن دنوں میں بہت مصروف ہوں۔"

وہ بس منھ دیکھ کر چپ چاپ کھڑی رہ جاتیں۔ اپنی تنہائیوں کا علاج ڈھونڈھنے کے لئے انہوں نے نہ جانے کتنے چلتے کھینچے سکتنے مزاروں کی خاک چھانی۔ ملّا مولویوں کے آگے ناک رگڑی لیکن بدبختی کی منحوریت اتنی آسانی سے کب اُترتی ہے؟ اور پھر ایک دن وہ بھی آیا جب اس کی ضرورت ہی نہ رہ گئی۔ شبّو میاں دوسری دلہن بیاہ لائے۔ حویلی کا اوپری حصہ ان کے لئے آراستہ کر دیا گیا۔ باہری زینے کو ٹھیک کروا دیا گیا اور آنگن میں کھلنے والا زینے کا دروازہ مُنھ کھولے کھڑا رہ گیا۔

انھوں نے سُنا۔ ایک رنگ پانی کی لہر کی طرح منھ پہ آیا اور مِٹ گیا۔ انھوں نے لق و دق آراستہ کمروں میں وزنی تالے ڈلوا دیئے۔ نوکروں کی فوج اوپر چھوٹی بیگم کو بخش دی۔ شبراتی سے نہ رہا گیا۔

"یہ کیا کر رہی ہیں بڑی سرکار؟"

"ارے مجھ اکیلی کو جینے کے لیے اتنی بڑی گرہستی کی کیا ضرورت اور پھر کون سنبھالے گا یہ تام جھام۔"

وہ منع ہی کیا کرتا، لیکن اب وہ اپنا کھانا خود ہی پکاتیں۔ وقت کو آگے دھکیلنے کے لئے آخر کچھ تو کرنا ہی تھا۔ شبّو میاں تو اب اوپر ہی کھانا کھاتے تھے۔ وہ ان کی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز پکا کر ضرور رکھتیں جو اکثر رکھے رکھے سڑ جاتی۔ وہ خود کئی کئی وقت کھانا نہ کھاتیں۔ ہاں نمازیں بڑی پابندی سے پڑھنے لگی تھیں۔ دِن رات ٹھنڈے پانی میں ہاتھ بھیگ بھیگ کر کیو جاتے، پھٹ جاتے اور وہ کوئی دھیان نہ دیتیں۔

جس دن چھوٹی بیگم کے یہاں بیٹا ہُوا وہ دن بھر بے چین سی نظر آئیں۔ بار بار کچھ سوچ کر اُٹھتیں، آنگن میں ٹہلتیں اور پھر واپس اُکرُوں گُم سُم سی بیٹھ جاتیں۔ شام کو پھر وہ کچھ سوچ کر اُٹھیں، سامان کے کمرے کا زنگ آلود تالا کھلوایا اور صندوق میں بند وہ سارے کپڑے نکلے جو موہوم سی اُمید کے سہارے برسوں سینت کر رکھے گئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کُرتے، ٹوپیاں، پاجامے، رضائیاں۔ ایک ایک کپڑے کی سلوٹیں برابر کیں اور خوان میں رکھ کر صحن میں کھلنے والے زینے کا دروازہ تھام کر کچھ دیر خاموش کھڑی رہیں، پھر کلّو کو آواز دی اور جب

وہ یہ سارا سامان اوپر بچھوا کے پلٹیں تو اس طرح ہانپ رہی تھیں جیسے میلوں جلتی ریت پہ پیدل چل کر آئی ہوں اور پھر یہ تھکان ان کی ساری زندگی پر چھا گئی۔ گھنٹوں مُنھ لپیٹے پڑی رہتیں، کوئی کام شروع کرتیں، سارا سارا دن گزر جاتا اور سب کچھ اسی طرح بکھرا پڑا رہتا۔ لگتا تھا جیسے کوئی ڈور سلجھا رہی ہوں اور سِرا ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو کبھی کبھی تو یوں ہوتا کہ وہ کوئی چیز غور سے دیکھتیں اور سارا سارا منظر ہی جیسے دھندلا جاتا۔ بال اتنی تیزی سے چاندی کے لچھوں میں بدل رہے تھے جیسے انھیں دھوپ میں چمکا کر سفید کر رہی ہوں۔ برسوں سے انہوں نے نیا کپڑا نہیں پہنا تھا اور جتنے رنگین کپڑے تھے سب دُھل دُھل کر سفید ہو گئے تھے۔ وہ ململ کا دوپٹا جس میں بڑے اہتمام سے ابرق اور رنگ دیا جاتا تھا اب بغیر چنے اور رنگے ہوئے ہی اوڑھ لیا جاتا۔

صرف ایک اہتمام باقی رہ گیا تھا۔ دوپہر ڈھلتے ہی وہ صحن میں جھاڑو لگواتیں اور بڑے سے چوبی دروازے پر چھڑکاؤ کرواتیں مغرب کی نماز کے بعد شبو میاں عموماً اسی راستے سے اوپر جاتے تھے اور جاتے وقت کبھی دو گھڑی رُک کر بات بھی کر لیتے ویسے اب انھیں فرصت بھی کہاں تھی۔ چار بچے ہر وقت گھیرے رہتے تھے۔

دن رات کا چکّر اسی طرح چل رہا تھا۔ وہ گھسیٹ گھسیٹ کر صبح کو شام تک پہنچاتیں اور پھر اگلی شام کا انتظار کرنے لگتیں انھیں پتا ہی نہ چلتا تھا کہ وقت آگے بڑھ رہا ہے۔ وہی سورج روز نکلتا۔ کوئی نئی چمک جو دل کے اندھیرے کنوئیں میں اُجالا کر دے انھیں تو کہیں دِکھتی نہیں تھی۔ ہوا ویسے ہی جھکڑ کے چلتی تھی، کبھی تو تپتی سانسوں میں ٹھنڈک کی رمق نہیں دوڑتی تھی۔ کبھی کوئی بھولا بھٹکا عزیز آ جاتا تو انھیں جیسے شبہ ہونے لگتا کہ شاید کسی اور دنیا سے آیا ہے

اور آج یوں اچانک اتنے بہت سے لوگوں سے گھر بھر گیا تھا۔ ابھی ابھی بڑے اہتمام سے انہوں نے ڈیوڑھی میں ڈیوٹ پر دِیا روشن کروا کر رکھا یا تھا اور سفید چادر بستر پہ بچھوا کر بیٹھی ہی تھیں کہ ایک دم بہت سے لوگوں کی اجنبی چاپ آس پاس بکھر گئی۔ بارہ دری میں میاں کے دِل کی حرکت اچانک رُک گئی اور لوگ انھیں بستر پہ لِٹا گئے جو تیس برس سے شکنوں سے محروم تھا۔ سارے گھر میں کہرام مچ گیا جس وقت میت کے پاس لا کے چھوٹی بیگم کی دھانی بانکیں توڑی گئیں تو اپنے آپ ہی ان کی نظر اپنی برسوں سے سونی کلائیوں کی طرف چلی گئی۔ انھوں نے ہاتھوں کو ڈھک لینا چاہا اور سفید دوپٹا دامن پھیلا کر تیس برس کا حساب مانگنے لگا۔ وہ خالی خالی نظریں لیے ڈیوڑھی کے دروازے سے ٹک گئیں۔ مسجد کو جانے والا راستہ ان کی گود کی طرح سونا پڑا تھا۔ وہ اُدھر ہی تکتی رہیں اور پھر ہاتھ بڑھا کر ڈیوٹ پہ رکھے دِیے کی لَو کو چٹکی سے مسل دیا۔

شیخ صاحب

محمد طفیل

شیخ صاحب سے مُراد شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ہے۔ جو مہربان دوست تھے۔ مگر دُور چلے گئے۔ اللہ کے پیاروں میں شامل ہوگئے۔ آخر اللہ کو اتنے پیاروں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ عقدہ آج تک نہ کُھلا۔

عام لوگوں کی زندگی میں اور ادیبوں کی زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ عام لوگ اپنی طبعی عمر کے بعد مر ہی جاتے ہیں۔ مگر ادیب کی زندگی کا آغاز' اُن کی موت کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اِس اعتبار سے شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کتنے برس' تک زندہ رہیں گے۔ اس کے بارے میں' میں کوئی پیش گوئی نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو صرف ان کے بارے میں باتیں کرنی چاہتا ہوں۔

شیخ صاحب کا قد چھوٹا تھا۔ جسم بھی قدرے اکہرا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی، چہرے پہ سفید داڑھی' سر پہ ترکی ٹوپی، باتیں تیزی سے کرتے تھے۔ بس فرفر کی آواز آتی تھی اور کچھ پتے نہ پڑتا تھا۔ ابتدا میں تو میں بھی بڑا پریشان ہوا۔ بعد میں جملہ باتیں سمجھ لیتا تھا۔

ایک دن' شیخ صاحب تشریف لائے۔ ہم کسی معاملے میں مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ جن صاحب کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ شیخ صاحب کی آمد سے پہلے ہی میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے شیخ صاحب سے پوچھا "پھر آپ نے کیا سوچا؟"

شیخ صاحب گھبرائے۔ ایک طرف سرک کر' اور اُن صاحب کی طرف خفیہ اشارہ کرکے اور ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر مجھے چُپ رہنے کا مشورہ دیا۔

میں نے دوبارہ کہا "بتا دیجئے۔ کچھ فرق نہ پڑے گا۔"

شیخ صاحب نے سوچا "طفیل غلطی کر رہا ہے۔ لہٰذا یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے "میں ذرا لائبریری تک جا رہا ہوں۔ واپسی پر حاضر ہوں گا۔"

میں نے کہا "بہت اچھا!"

جب شیخ صاحب دوبارہ آئے۔ تو کہنے لگے "آپ عجیب آدمی ہیں۔ جن صاحب کے بارے میں' آپ میری رائے پوچھ رہے تھے۔ وہ تو موجود تھے اور آپ اُن کی موجودگی میں مجھ سے رائے طلب کر رہے تھے۔"

میں نے جواب میں کہا "میں نے سوچ لیا تھا کہ میں محتاط الفاظ میں گفتگو کروں گا اور آپ کی باتیں تو اُن کی سمجھ میں آنا ہی نہ تھیں۔ لہٰذا اُن کے سامنے گفتگو کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔

میری اِس رائے پر شیخ صاحب اس انداز میں ہنسے کہ متعلقہ صاحب اگر موجود بھی ہوتے تو معلوم نہ کر سکتے کہ شیخ صاحب

میری سادگی پہ ہنسے یا اپنی گفتگو کے کمال پر!

شیخ صاحب عمر کے اس حصے میں تھے کہ جب آنکھیں جواب دے جاتی ہیں۔ مگر شیخ صاحب کی بینائی میں بڑی جان تھی۔ وہ بڑے خوش خط تھے اور بڑا باریک باریک لکھتے تھے سطریں بالکل سیدھی جیسے کوئی فوجی کھڑا ہو۔

ایک دن مجھے کہنے لگے "میں آپ کو چاول کا ایک دانہ دینا چاہتا ہوں۔"

میرا جواب یہ تھا "کیا آپ مجھ سے دیگ کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

نہیں نہیں، ذرا رکو تو، یہ کہہ کر اُٹھے اور ایک چھوٹی سی ڈبیا اُٹھا لائے۔ کہنے لگے: دیکھو؟

"کیا دیکھوں؟"

"کہ اس ڈبیا کے اندر کیا ہے؟"

میں نے ڈبیا کھولی تو روئی کے اندر لپٹا ہوا چاول کا ایک دانہ پڑا تھا۔

میں نے کہا "یہ دانہ بڑا خوش قسمت ہے۔ اسے بڑے اہتمام سے رکھا گیا ہے۔ قصہ کیا ہے؟"

کہنے لگے "چاول کے اس دانہ پر پوری قل ھو اللہ لکھی ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے ایک چھوٹا سا شیشہ دیا اور کہا کہ "لو پڑھ لو۔"

میں نے شیشے کی مدد سے چاول کو دیکھا تو اُس پر بڑی مہارت سے پوری قل ھو اللہ لکھی ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ لوگ چاول کے دانے پر قل ھو اللہ اور چنے کے دانے پر الحمد شریف لکھ لیتے ہیں مگر دیکھا کبھی نہ تھا۔ میں نے استفسار کیا "یہ کس نے لکھا؟"

کہنے لگے "میں نے لکھا ہے اور آپ کی نذر ہے!"

مجھے اُس دن معلوم ہوا کہ چاول کا دانہ بھی کتنی اہمیت رکھتا ہے اور دانہ گندم کی جو اہمیت ہے۔ اُس کو تو ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

ہماری دوستی عجیب تھی۔ وہ بزرگ میں نوجوان (یہ قصہ ۱۹۵۱ء کا ہے) وہ ساٹھ کے پیٹے میں، میں نوجوانی کی دہلیز پر، وہ جید عالم، میں ادب کا ایک معمولی طالب علم، وہ اخلاق کا مجسمہ، میں تند خُو اور سرکش، وہ کٹر مذہبی، میں ترقی پسند ادب کا دلدادہ، غرض کوئی بھی قدر مشترک نہ تھی۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک تھے وہ ہر قسم کے مشورے بھی مجھ سے لیا کرتے تھے۔ میں جوانی کی ترنگ کی باتیں بھی اُن سے کر لیا کرتا تھا۔

ایک دن شیخ صاحب نے مجھ سے پوچھ ہی لیا "طفیل صاحب! یہ لڑکی آپ کے پاس بہت آتی ہے۔"

میرا جواب یہ تھا "جی اُس کی مرضی!"

غرض میرا اخلاق سنوارنے کی شیخ صاحب نے بڑی کوشش کی۔ اللہ ہی جانے وہ کس حد تک کامیاب ہوئے۔ یہ دکھ مجھے آج بھی ہے کہ جن دنوں میرا یارانہ سعادت حسن منٹو اور ممتاز مفتی کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ اُن دنوں میں بڈھوں میں گھر گیا۔ یہی وجہ

تھی کہ عین جوانی میں بھی میری سوچیں بوڑھی ہو گئیں ۔ حتیٰ کہ خود بوڑھا ہو گیا ۔

شیخ صاحب کا مجھ پہ ایک ایسا احسان ہے ، جسے میں زندگی بھر بھول نہ سکوں گا ۔ قصہ نقوش کی ادارت کا ہے ۔ ۱۹۵۱ء میں سید وقار عظیم نے مجھے بتایا کہ اب میں نقوش کی ادارت نہ کر سکوں گا ۔ کیونکہ یونیورسٹی نے اس سال اجازت نہیں دی ۔

ایک برس تک سید وقار عظیم نے نقوش کو سنوارا تھا ۔ ڈیڑھ دو برس تک ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی نے ، چنانچہ میں خاصا پریشان تھا ۔ شوق کو سو سو وسوسے لاحق ہوئے ۔ مگر دل ایک لحاظ سے مطمئن بھی تھا کہ چلو خسارے سے تو جان چھوٹی !

ایسے ہی عالم میں شیخ صاحب میرے پاس آئے ۔ آنکھوں سے میرے چہرے کا حال پڑھا ۔ پوچھا " خیر باشد " !

میرا جواب یہ تھا " خیر تو ہے ۔ مگر پریشان بہت ہوں " !

" یہ کیا معمہ ؟ "

" خیر اس لئے ہے کہ نقوش کے بند ہو جانے کا سامان ہو گیا ہے ۔ پریشان اس لئے ہوں کہ ابھی اِس شوق کو دفنانے کا ارادہ نہ تھا ۔

شیخ صاحب کا ارشاد ! " فکر والی کوئی بات نہیں ۔ کل اِس موضوع پر باتیں ہوں گی " ۔

دوسرے دن شیخ صاحب تشریف لائے ۔ میں نے دل میں گمان یہ کیا کہ کہیں گے " خاکسار کی خدمات حاضر ہیں ۔ مگر ان کا مشورہ یہ تھا " اب ادارتی فرائض کو خود سنبھالو " ۔

میں اس مشورے پر سناٹے میں آ گیا ۔ ایسا محسوس ہوا ، جیسے ایک پہاڑ کا بوجھ ، میرے سر پہ رکھ دیا گیا ہو ۔ میں نے ہڑبڑا کر اس منصب پہ فائز ادیبوں پہ نگاہ دوڑائی ۔ رتن ناتھ سرشار ، محمد حسین آزاد ، شبلی نعمانی ، ابو الکلام آزاد ، ظفر علی خان ، سر عبد القادر اور دیا نرائن نگم !

میں شیخ صاحب سے کہتا ہی رہا " یہ ممکن نہیں ، یہ ممکن نہیں " مگر اُن کا اصرار بڑھتا رہا ۔ یہی حل ہے ۔ یہی حل ہے ۔ بالآخر انہوں نے مجھے قلم کی رونہی پہ ڈال ہی دیا ۔ وہ دن اور آج کا دن کہ قلم کی چکی پیس رہا ہوں ۔ قلم کی اِس چکی میں جان و مال کا زیاں تو ہے مگر سکون کی دولت بہت ہے ۔ ہم فقیر پر بھی اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتے ہیں ۔

شیخ صاحب کی یادداشت اور حافظے کا بھی عجیب عالم تھا ۔ کتابوں کے حوالے ازبر ، عبارتیں ازبر ۔ شیخ صاحب کسی دوسرے شہر جا رہے تھے ۔ سوٹ کیس ہاتھ میں تھا کہ ایک شخص راستے میں مل گیا ۔ اُسے مولانا حالی کی لائبریری سے کسی کتاب کی ضرورت تھی ۔ اس نے کہا ۔ " شیخ صاحب مجھے یہ کتاب چاہیئے ۔ شیخ صاحب نے جواب دیا " اب تو میں باہر جا رہا ہوں واپسی پہ سہی ! وہ صاحب پیٹ گئے ۔ کہا " مجھے کتاب کی فوری طور پر ضرورت ہے " ۔

انہوں نے کہا " یہ بات ہے تو خواجہ صاحب سے جا کر کہیں کہ فلاں الماری اور فلاں شیلف میں وہ کتاب رکھی ہوئی ہے ۔ وہ آپ کو دے دیں گے " ۔

وہ شخص خواجہ سجاد حسین کے پاس پہنچا جو کہ مولانا حالی کے بیٹے تھے ۔ اُس نے جا کر کہا " مجھے یہ کتاب چاہیئے " ۔

خواجہ صاحب نے فرمایا "وہ نہیں ہے۔"

اُس شخص نے بتایا "فلاں الماری میں اور فلاں شیلف میں پڑی ہے۔"

خواجہ صاحب نے پوچھا "آپ کو کس نے بتایا؟"

"شیخ محمد اسمٰعیل نے!"

خواجہ صاحب بڑے بھنائے، جب شیخ صاحب واپس آئے۔ تو خواجہ صاحب نے کہا "شیخ صاحب آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ ہر شخص کو ہر بات بتا دیتے ہیں۔ کوئی پوچھے تو یہ بھی بتا دینا کہ مسلم ہائی اسکول کا خزانہ وہاں پڑا ہے۔"

شیخ صاحب نے جواب دیا "اگر مجھے معلوم ہوا اور کسی شخص نے پوچھ لیا۔ تو ضرور بتا دوں گا۔ جھوٹ ہرگز نہ بولوں گا۔"

شیخ صاحب میں حسِ مزاح بہت تھی۔ بڑھاپے میں تو اولاد بھی والدین سے بھاگتی ہے۔ مگر یہ ایسے بزرگ تھے۔ جن سے دُور بھاگنے یا ایرانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہمدرد و مشفق، پرائے دُکھ اپنانے والے، اپنے دوستوں کے ہی نہیں۔ بدخواہوں کے بھی کام آنے والے، کوئی بھی فرمائش کر دے۔ اُن کے بس میں ہوگا تو کر گزریں گے۔ چاہے اُن کا بھرکس ہی کیوں نہ نکل جائے!

بھرکس کا لفظ میں نے خاص طور پر استعمال کیا ہے۔ قصّہ سناتا ہوں۔ فیصلہ خود کرلیں کہ لفظ کا استعمال صحیح ہوا کہ نہیں، کیونکہ کسی بھی تحریر میں الفاظ کے چناؤ کا مسئلہ بڑا اہم ہوتا ہے۔ بلکہ تحریر میں اہم مسئلہ الفاظ کے انتخاب ہی کا ہوتا ہے۔ بہرحال یہ قصہ اُن دنوں کا ہے کہ جب میں خطوط نمبر مرتب کر رہا تھا۔

کبھی آپ نے نواب محسن الملک کا خط پڑھا ہے؟ سر سید احمد خاں کا خط؟ مولوی عنایت اللہ کا خط؟ مولانا عبدالماجد دریابادی کا خط؟ اگر آپ نے ان کے خطوط، ان کی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں پڑھے ہوں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایسے حضرات کے خطوط پڑھنا کتنے جان جوکھوں کا کام ہے۔

جب میں نے جملہ خطوط کو سامنے رکھا۔ انھیں پڑھنے لگا تو میں نے سر کو پیٹ لیا۔ معلوم ہوا کہ مفہوم کو تو ٹٹولا جا سکتا ہے۔ مگر لفظ بہ لفظ صحیح نہیں پڑھا جا سکتا۔ ایسے خطوط جنھیں پڑھنے کی ضرورت تھی۔ ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں تھے۔ سچ پوچھیں تو ہزاروں! میں نے اس دشواری کا ذکر، شیخ صاحب سے کر دیا۔ انہوں نے جھٹ کہا۔ ان میں سے سر سید کے خطوط میں پڑھ دوں گا۔ سر سید کا خط بظاہر صاف نظر آتا ہے۔ مگر الفاظ ٹیڑھے میڑھے اور ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک بڑے پلندے میں سے سر سید احمد خاں کے ۱۲۸ خطوط اٹھائے اور شیخ صاحب کے حوالے کر دیئے۔

دو چار دن کے بعد جا کر خیریت پوچھی تو معلوم ہوا کہ ایک دن میں چار پانچ خطوط سے زیادہ پڑھے ہی نہیں جا سکتے۔ کیونکہ بعض اوقات ایک لفظ کو بھی پڑھنے میں ایک ایک دو دو گھنٹے صرف ہو رہے ہیں۔

دس پندرہ دن کے بعد پھر احوال پوچھا۔ کہنے لگے۔ آپ خطوط کو جلد پڑھنے کے لئے کہتے ہیں۔ میں صبح خطوط کو لے کر بیٹھتا ہوں۔ رات کے گیارہ بجے تک پڑھتا رہتا ہوں۔ باہر کا آنا جانا موقوف کر رکھا ہے۔ پیشاب بھی آتا ہے تو اُسے کہتا ہوں ذرا ٹھہر! اس کے باوجود ابھی تک ساٹھ سے زیادہ خطوط نہیں پڑھ سکا۔ میں تو وعدہ کر کے پھنس گیا ہوں۔

چنانچہ وہ ایسا پھنسے، ایسا پھنسے کہ پورے تین ماہ تک خطوط پڑھتے رہے اور مجھے دعائیں دیتے رہے۔ کوئی اور ہوتا تو اس خدمت کو کبھی بھی بجا نہ لا سکتے تھے۔ کچھ ادب کی خدمت کا شوق لے ڈوبا۔ کچھ آپ کی محبت نے انجر پنجر ڈھیلا کر ڈالا۔ بہر حال میرا تو بھرکس نکل گیا۔

ہاں تو جب شیخ صاحب نے مجھ سے خطوط لئے تھے۔ تو کہا تھا کہ خطوط کا پڑھنا کونسا مشکل کام ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے کہا کہ خطوط کے پڑھنے میں میرا تو بھرکس نکل گیا تو میں نے اُن کا فقرہ ان پہ چپکایا کہ خطوط کا پڑھنا کون سا مشکل کام ہے۔ اس پر اتنا ہنسے، اتنا ہنسے کہ کہنے لگے کہ آج ساری کلفت دُور ہو گئی۔

میں نے اس پہ کہا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ آپ کی کلفت دُور ہو گئی۔ مگر یہ تو بتا دیجئے کہ کام کے دَوران آپ نے جس چیز کو رد کا تھا۔ اُسے بھی اذنِ عام دیا کہ نہیں؟ اس پر شیخ صاحب دیر تک ہنستے رہے اور یہ لطیفہ انہوں نے اپنے متعدد دوستوں کو سنایا۔

ایک لطیفہ اور بھی سنایا کرتے تھے۔ وہ یہ کہ شیخ صاحب شکر کا استعمال زیادہ کیا کرتے تھے۔ ہم ان سے پوچھتے چائے میں کتنی چینی؟ کہہ دیتے تین چار چمچے، ایسا ایک بار نہیں، کئی بار ہوا۔

ایک دن ہم شیخ صاحب کے گھر بیٹھے تھے۔ ان میں کچھ ایسے دوست بھی تھے۔ جن کا آرٹ ہی خوشامد تھا۔ چائے آئی۔ میں نے سوچا، چائے بنانے کی سعادت میں حاصل کر دوں۔ چنانچہ میں نے حسبِ عادت پوچھا۔ کتنی چینی؟ کہنے لگے ایک چمچہ!

میں نے کہا۔ "شیخ صاحب یہ کیا چکر ہے کہ جب آپ دوسروں کے گھر میں چائے پیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ڈال دو، چار پانچ چمچے، مگر اپنے گھر میں ایک چمچہ!

کہنے لگے (اور حاضرین کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر) کہ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چمچے جتنے بھی کم ہوں اچھا ہے۔

یہ بزرگ تھے۔ مگر پیارے بزرگ جب کہ ہر بزرگ پیار کے قابل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بزرگ پیار کے قابل ہوتا بھی ہے تو ہم اس سے پیار نہیں کرتے۔ کیونکہ ایک فاصلہ، ایک نسل بیچ میں آ کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ جب تک جئے۔ خوش طبعی سے جئے! یہی وجہ ہے کہ ان کے اور ہمارے درمیان نہ فاصلہ حائل ہوا اور نہ ایک نسل!

ایک بار میں نے شیخ صاحب سے شعرا کا مختصر سا تذکرہ لکھوایا تھا۔ جو کہ غزل نمبر کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔ جب شیخ صاحب مسودہ لائے اور میں نے مسودے کو اِدھر اُدھر سے جھانکا تو انہوں نے میری رائے پوچھی۔

میں نے کہا۔ "پچانوے فی صد جامع!"

میں نے پچانوے فی صد جامع کا لفظ اِس لئے استعمال کیا تھا کہ تحقیقی کاموں میں صد فی صد والا معاملہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی نہ کوئی پہلو دبا ہوا رہ جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی تسامح ہو جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی انکشاف ہوتا ہی رہتا ہے۔

مگر میرے "پچانوے فی صد جامع" والی بات پر، انہوں نے کہا۔ "ایک لطیفہ سُن لو۔"

میں نے کہا۔ "ارشاد!"

کہنے لگے۔ جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا تو امتحان میں ایک عنوان کے تحت مضمون لکھنے کے لیے کہا گیا۔ میرا اُس

موضوع پر اچھا خاصا مطالعہ تھا۔ میں نے خوب دلجمعی سے مضمون لکھا۔

میرے اُستاد نے اُس مضمون پہ مجھے شاباش دی۔ ساتھ ہی حوصلہ افزائی کے طور پہ یہ کہا کہ "اتنا اچھا مضمون تو شاید میں بھی نہ لکھ سکتا۔"

اس پر میں نے (یعنی شیخ صاحب نے) اُستادِ مکرم کی خدمت میں گزارش کی "اس کے باوجود سو میں سے بچانوے نمبر دیجیے۔"
میرے استاد کا جواب یہ تھا "پانچ نمبر اُستادی کے کاٹے ہیں۔"

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ شیخ صاحب نے طبیعت بڑی مفرح پائی تھی۔ ایک واقعہ اور سن لیجیے کہ پانی پت میں ایک دکان دار تھے۔ بڑے متین اور وضع دار، علمی ذوق بھی خاصا تھا۔ ادیب اور شاعر آتے جاتے، اُن کے ہاں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ نام ان کا شیخ محمد نوح تھا۔

ایک دن وہ خاصے پریشان تھے۔ شیخ صاحب نے پوچھا "خیریت تو ہے؟"
محمد نوح تُرت بولے۔ "بیٹے کی کرتوتوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ پھر تفصیل بتانا شروع کر دی۔ اُس نے یہ کیا۔ اُس نے وہ کیا۔ وُہ ایسا نکل گیا۔ وہ ویسا نکل گیا۔

شیخ صاحب چُپ چاپ سنتے رہے۔ بولے کچھ نہیں۔ بالآخر محمد نوح نے کہا۔ شیخ صاحب میں اپنی بپتا آپ کو سنا رہا ہوں اور آپ بول ہی نہیں رہے۔

شیخ صاحب نے چپکے سے کہہ دیا "میں کیا بولوں۔ وہ تو پسرِ نوح نکلا۔"

اگر کوئی شخص ان کے ہاں کوئی امانت رکھواتا تھا تو یہ بے حد پریشان ہوتے تھے۔ ان کا سوچنے کا انداز یہ تھا کہ عمرِ مستعار کا اعتبار کیا! مر گیا تو کیا ہوگا۔ احتیاطاً اپنے بیٹے کے نام، بہ طورِ وصیت یادداشتیں بھی لکھتے جاتے کہ فلاں فلاں شخص کی میرے پاس امانت ہے اور وہ فلاں فلاں جگہ رکھی ہے۔

اگر کوئی ہزار روپیہ دے گیا ہے، اور وہ شخص جب اُسے واپس لینے آئے گا تو اُسے سو سو کے بھی وہی نوٹ واپس ملیں گے دس دس کے بھی وہی اور پانچ پانچ کے بھی وہی، مطلب یہ کہ یہ اُس امانت کی ایک پوٹلی بنا لیتے تھے۔ پھر اُسے کسی جگہ احتیاط سے رکھ دیتے تھے۔ مطالبے پہ وہی رقم، جوں کی توں نکال کر دے دیتے تھے۔

کہا کرتے تھے کہ امانت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اصل چیز ہی واپس کی جائے۔ ہزار روپیہ واپس کرنا اُتنا اہم نہیں۔ جتنا کہ یہ ہزار کے نوٹ بھی وہی ہوں جو کہ بہ وقتِ امانت سپرد کیے گئے تھے۔

شیخ صاحب کے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ "میں نے جب بھی شیخ صاحب کو آزمایا، وہ دوستی کے پلڑے میں بہت بھاری نکلے۔ ان کے دوست کا کہنا ہے کہ مجھے اچانک خبر ملی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اتفاق کہ اُس وقت میرے پاس اتنی بھی رقم نہ تھی کہ گاؤں تک پہنچ سکتا۔ اِدھر اُدھر دوستوں پر نگاہ دوڑائی تو دل نے فیصلہ یہ کیا کہ شیخ صاحب کے پاس چلنا چاہیے۔ چنانچہ جب میں نے شیخ صاحب کو اس حادثہ کی اطلاع دی، ساتھ ہی اپنی ضرورت کا اظہار کیا تو رنجیدہ ہو گئے۔ چپکے سے

اُٹھے اور تین ۳ روپے لاکر مجھے دے دیئے اور کہا۔ اِس وقت گھر میں صرف اتنے ہی روپے تھے۔ ساتھ ہی یہ کہا کہ میں اِس لمحے یہ بھی سوچنا نہیں چاہتا کہ میری اپنی فوری ضرورتوں کا کیا بنے گا!

متحدہ ہندوستان میں مسلمان کی پہچان یہ بھی تھی کہ وہ ترکی ٹوپی پہنتا تھا۔ اُن دنوں ترکی ٹوپی کا رواج عام تھا آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ پھر ترکی ٹوپی پہننے والے خال خال رہ گئے۔ پاکستان بننے کے بعد تو ترکی ٹوپی عنقا ہی ہوگئی۔ مگر شیخ صاحب ترکی ٹوپی ہی پہنتے تھے۔ انہوں نے دو اور ترکی ٹوپی پہننے والوں سے بھی دوستی کر رکھی تھی۔ ایک میاں ایم اسلم سے دوسرے اشرف صبوحی سے۔ اِن تینوں میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ میرے نزدیک دوستی کا سبب ترکی ٹوپیاں! جب یہ تینوں اکٹھے باہر نکلتے تو یار کہتے، اصحاب ثلاثہ جا رہے ہیں۔

میاں ایم اسلم کو بھی دعوتیں کرنے کا شوق تھا۔ شیخ صاحب کو بھی لپکا، کبھی اُن کے ہاں دعوت کبھی اِن کے ہاں مزے میں، ہیں اور اشرف صبوحی تھے۔ جو اِن میں سے کسی کی دعوت کو رد نہ کرتے تھے۔ اگر کبھی ہمیں غیرت نے للکارا بھی، تو اُن کا خلوص لے ڈوبا، سارے کام چھوڑ دو مگر دعوت میں ضرور آنا، یہ فقرہ ایم اسلم کو بھی ازبر تھا اور یہ فقرہ شیخ صاحب کو بھی ازبر! بس ان بزرگوں کی دعوتوں میں ایک ذرا سا فرق ضرور تھا۔ ایم اسلم پیٹ کا بھی انتظام کرتے تھے اور ذہن کا بھی، یعنی کھاؤ بھی اور سنو بھی، شیخ صاحب کا انداز یہ تھا کہ بھئی میرے پاس تو خلوص ہی خلوص ہے اسے جس کھاتے میں بھی چاہو ڈال دو! میں خوش میرا خدا خوش!

شیخ صاحب بڑے وضعدار انسان تھے۔ جو وطیرہ پہلے دن رہا۔ اُسے آخر تک نبھایا۔ شیخ ہمارے ہاں عید کے دوسرے روز صبح آٹھ بجے کے قریب آیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ایک دو برس نہیں پورے اکیس ۲۱ برس تک نبھایا۔ آندھی ہو یا طوفان وہ ضرور پہنچیں گے!

ایک سال وہ نہ آئے۔ آٹھ بج گئے۔ نو بج گئے۔ دس بج گئے۔ ہم دونوں میاں بیوی پریشان، طے ہو رہا تھا کہ اُن کی خیریت پوچھنے کے لئے نکلیں کہ دروازے پر اُن کی چھڑی کی ٹک ٹک سنائی دی۔

ہماری جان میں جان آئی۔ دونوں نے بیک وقت کہا۔ "لیجئے شیخ صاحب تو آ گئے"۔

دیکھا تو ایک ہاتھ میں سوٹ کیس ہے ملتے ہی کہنے لگے کہ طفیل صاحب میں بڑا شرمندہ ہوں کہ وقت پر نہ پہنچ سکا۔ میں سیدھا اسٹیشن سے آپ کے ہاں آ رہا ہوں۔ آپ سے ملنے کے بعد گھر جاؤں گا۔ میں وقت پر ہی پہنچ جاتا۔ مگر گاڑی لیٹ ہوگئی۔

آخری دنوں میں ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ایسے ہی عالم میں عید آ گئی۔ انہوں نے اِس حالت میں بھی، اُٹھنے اور ہمارے ہاں پہنچنے کی سعی کی۔ اُٹھے اور گر گئے۔ ہمارے ہاں نہ پہنچ سکے۔

بارہ بجے کے قریب میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کیونکہ وہ تو اپنی تکلیف کی وجہ سے آ نہیں سکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آج میں حاضر نہ ہو سکا۔ اکیس برس پہلے کا عہد ٹوٹ گیا۔

اُن کے صاحبزادے پاس ہی کھڑے تھے۔ کہنے لگے۔ "آپ کی طرف جانے لگے تھے کہ گر گئے"۔

میں نے پوچھا "چوٹ تو نہیں آئی؟"

اُس وقت شیخ صاحب خاموش رہے۔ جب صاحبزادے چائے لانے کے لیے اُٹھے تو کہنے لگے۔ بڑی سخت چوٹ آئی ہے۔ مگر میں نے اپنے لڑکے کے سامنے یہ بات نہیں کہی۔ اس لئے کہ دوست کی خاطر، جو تکلیف پہنچے۔ اُسے تکلیف نہیں کہتے۔

اگر شیخ صاحب پر کوئی ذرا سی بھی مہربانی کر دیتا تھا تو وہ اُسے زندگی بھر نہ بھولتے تھے۔ اتنا شکر گزار ہوتے تھے کہ جس کی حد نہیں۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب کے زمانے میں پرائیڈ آف پرفارمنس کے طور پر ادیبوں اور شاعروں کو دس ہزار کا انعام ملا کرتا تھا۔ اس انعام کے حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے گھوڑے اور بڑے بڑے گھوڑے دوڑائے جاتے تھے۔ سفارشیں اور بڑی بڑی سفارشیں کرائی جاتی تھیں۔ یوں کئی لوگوں کی قلعی بھی کھلی!

اُس زمانے میں جو مرکزی سیکرٹری تعلیمات تھے۔ اُن کا نام تھا شیخ منظور الٰہی! میں اسلام آباد میں منظور الٰہی صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ منظور صاحب نے مجھے بتایا کہ اس بار حکومت آپ کو پرائیڈ آف پرفارمنس کا انعام دے رہی ہے سارے پراسس ہو چکے ہیں۔ وزیر تعلیم شمس الحق صاحب کے بھی دستخط ہو چکے ہیں۔

میں نے منظور صاحب کو چھیڑا۔ "یہ دوستی کا انعام ہے۔ یا ادبی خدمات کا؟"

منظور صاحب نے فرمایا۔ یہ میری رائے نہیں۔ سب کی رائے ہے اور یہ انعام آپ کی ادبی خدمات کے صلے میں ملے گا۔

ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں نامور سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام آ گئے۔ انہوں نے اسی موضوع پر بات کی اور منظور صاحب سے کہا کہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کی ادب کے سلسلے میں بڑی خدمات ہیں ایک سو سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں ضعیف العمر ہیں۔ اگر اس بار انھیں حسنِ کارکردگی کا انعام مل جائے تو بڑا کرم ہو۔

اس پر منظور صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں چُپ رہا۔

جب ڈاکٹر عبدالسلام اُٹھ کر چلے گئے تو میں نے بھی منظور صاحب سے کہا۔ "یہ انعام شیخ صاحب کو ہی ملنا چاہیے ضعیف بھی ہیں۔ خدمات بھی ہیں۔ ضرورت مند بھی ہیں۔"

منظور صاحب نے کہا۔ "اگر آپ نے اس بار یہ موقع ضائع کر دیا تو پھر یہ وقت ہاتھ نہ آئے گا۔"

میں نے کہا۔ "میری فکر نہ کریں۔ شیخ صاحب کو انعام دلوائیں۔" چنانچہ اُس سال حُسنِ کارکردگی کا انعام شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کو ملا۔

کسی طرح سے اس بات کی اطلاع شیخ اسمٰعیل صاحب تک بھی پہنچی۔ جب تک جئے۔ مجھے دعائیں دیتے رہے۔ انھیں انعام میں تو صرف دس ہزار روپے ملے تھے۔ مگر انہوں نے مجھے دعائیں لاکھوں لاکھ دیں۔ وہ اپنے آپ کو فائدے میں سمجھتے رہے اور میں اپنے آپ کو،

ایک موقع پر شیخ صاحب نے ایک تولیہ نما چیز دکھائی۔ پوچھا گیا۔ یہ کیا ہے؟ کہنے لگے غور سے دیکھئے۔ دیکھا تو چھوٹے چھوٹے دھاگوں سے، تولیہ نما چیز بنی ہوئی تھی۔ جو لمبائی اور چوڑائی میں ڈیڑھ گز اور ایک گز کے قریب ہوگی۔

کہنے لگے۔ "یہ میری والدہ کا کارنامہ ہے۔"

"کارنامہ؟"

"جی ہاں کارنامہ!"

بازار سے جو سودا سلف لایا جاتا تھا۔ اُن پڑیوں پر جو دھاگا، دکاندار باندھ کر دیتے تھے۔ اُسے میری والدہ اکٹھا کرتی رہیں۔ نہ جانے کتنے برس! جب اتنے سارے دھاگے جمع ہو گئے تو پھر والدہ نے انھیں مٹکے سے نکالا اور یہ تولیہ بنا دیا۔"

حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پہلے ایک ایک دھاگا اکٹھا کیا۔ پھر ایک ایک دھاگا جوڑا۔

ادب کی ریاضت کے باب میں شیخ صاحب نے جو کچھ بھی کیا۔ اُس پر مجھے تو حیرت نہیں ہوتی۔ یہی ناکہ سو سوا سو کے قریب کتابیں لکھیں۔ یہی ناکہ سینکڑوں مقالات ادق موضوعات پر لکھ ڈالے۔ حیرت اس لئے نہیں ہوتی کہ انھیں والدہ ایک رستہ دکھا گئی تھیں انہوں نے بھی جتنا کام کیا۔ وہ بھی ادب کی پڑیوں پر سے دھاگے ہی اکٹھا کرنے کا کام ہے۔

روزنِ دیوار سے

[کتاب اور صاحبِ کتاب پر تبصرہ]

محمد طفیل

عطاء الحق قاسمی فطین بھی ہے اور شریر بھی' اس لئے آدمی بھی ہے اور انسان بھی' یا امر اس کی فطانت کی دلیل ہو یا نہ ہو۔ اس کی شرارت کی دلیل ضرور ہے کہ اس نے آج اتنا بڑا مجمع اکٹھا کر لیا۔ اتنی خلقت یا تو میں نے میڈم نور جہاں کے فنکشن پر دیکھی تھی یا اس تقریب پر!

کسی کے بارے میں کلمۂ خیر کہنا اچھی بات ہے۔ مگر دیکھنا یہ بھی ہوتا ہے کہ کلمۂ خیر کس کے بارے میں کہنا ہوگا۔ اگر کسی کے بارے میں کلمۂ خیر کہنے کی گنجائش نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے؟

یہاں یہ مجھے ایک دو ایسے فقرے اور لکھنے چاہئیں جس سے اس امر کی وضاحت ہو کہ میں کہنا کیا چاہتا ہوں۔ مگر میں وہ ایک دو فقرے نہیں لکھ رہا۔ اس لئے کہ میں بھی نہیں چاہتا کہ میری بات کی وضاحت ہو۔ کون دشمنی مول لے۔ کون دوستی مول لے' دشمنی مول لینے کا محاورہ تو سب نے سنا ہوگا۔ دوستی مول لینے کی بات نہیں سنی ہوگی۔ میرے نزدیک دشمنی مول لینے سے زیادہ خطرناک دوستی مول لینا ہے۔ کیونکہ دشمن اپنے لئے خطرناک ہوتا ہے اور دوست دوسروں کے لئے!

عطاء الحق قاسمی نے اپنی کتاب "روزنِ دیوار سے" بڑے ٹھسّے کے ساتھ پیش کی ہے۔ اس ٹھسّے میں گھمنڈ بھی ہے اور اعتماد بھی' سلیقہ بھی ہے اور طرحداری بھی' اس کے باوصف میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔

"مولانا قطب الدین شیرازی مشہور ظریف بزرگ ہو گزرے ہیں۔ جن کے متعلق کئی لطیفے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی یہودی تاجر نے جو ان کا ہمسایہ تھا۔ اُن سے کہا۔ مولانا ہمارا مذہب کیوں قبول نہیں کرتے؟ مولانا نے جواب دیا۔ اِن دنوں میرا ہاتھ تنگ ہے۔ چالیس دن کا سامانِ خورد و نوش میرے ہاں بھجوا دو۔ یہ مدت ختم ہونے پر تمہارا دین قبول کر لوں گا۔ یہودی نے یہ بات مان لی اور چالیس دن کا آذوقہ ان کے ہاں بھجوا دیا۔

چالیس دن ختم ہوئے تو یہودی تاجر بہت سے یہودیوں کو ساتھ لے کر مولانا قطب الدین شیرازی کے ہاں پہنچا اور کہنے لگا۔ اب وعدہ پورا کیجیے۔ مولانا نے جواب دیا۔ میں چالیس سال سے مسلمانوں کا دیا کھا رہا ہوں۔ اور آج تک مسلمان نہیں ہوا۔ اگر تم نے سمجھ لیا کہ میں چالیس دن تمہارا دیا کھا کے یہودی ہو جاؤں گا تو سخت غلطی کی"۔ (حرف و حکایت)

یہی بات میں عطاء الحق قاسمی سے کہتا ہوں کہ ہم نے کم و بیش چالیس برس کے اخباری کالم پڑھ رکھے ہیں اور آج تک مسلمان نہیں ہوئے۔ ایکا ایکی عطاء الحق قاسمی کے کالم پڑھ کے کیسے مسلمان ہو جائیں گے؟ یہ ایک سوال ہے۔ ممکن ہے اس کا جواب مل جائے۔

یقین کر لیجیے، میں عطا کو نہیں جانتا۔ نہ جلوت میں دیکھا۔ نہ خلوت میں، نہ جمال میں دیکھا نہ جلال میں، نہ اچھے حال میں دیکھا نہ بُرے حال میں، جو کسی کو ایک حال میں دیکھتا ہے۔ وہ سبھی طرز کے مضامین لکھ سکتا ہے۔ خاکہ نہیں لکھ سکتا اور کسی کا یہ عجز ہو یا نہ ہو میرا تو صدفی صد!

میرے ان سے روابط کچھ تکلف کے سے انداز کے رہے۔ "سر! میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے حاضر ہوا ہوں۔ میرے پلاٹ کا مسئلہ ہے۔"

یہ عطا کی شرافت ہے کہ وہ مجھے تعظیم کے ساتھ بلاتے ہیں۔ ورنہ جو اتنا منہ زور صحافی ہو۔ وہ سَر وَر نہیں کہا کرتا۔ اُن کا لہجہ تحکمانہ ہوتا ہے۔ جیسے اپنے بھائی انتظار حسین کا، اگر انتظار مجھ سے بات کرتے تو کہتے، طفیل صاحب یہ بتایئے کہ میرے پلاٹ میں گھپلا کیا ہے؟

یا ایک اور موقع پر عطا نے مجھ سے کہا "سر! میں اپنے کالموں پر مشتمل کتاب چھپوانا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے کوئی مشورہ دیجیے" تاکہ آبرو بنی رہے۔"

کوئی اور کالم نویس ہوتا تو یہ کہتا "طفیل صاحب! اپنے اُن کالموں پر مشتمل اپنی کتاب چھپوا رہا ہوں کہ جن کی دھوم ہے کتاب چھپنے کی دیر ہے۔ بڑے بڑے کالم نویس گرد ہو جائیں گے۔ یہ لہجہ بھائی ابراہیم جلیس کا ہوتا۔

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ عطا حد درجہ مؤدب ہے۔ حد درجہ انکسار پسند ہے۔ حد درجہ جذباتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ان میں سے میری کسی بات کو تسلیم نہ کریں گے۔ نہ آپ انھیں مؤدب ماننے کے لئے تیار ہوں گے نہ انکسار پسند اور نہ ایک پیارا سا جذباتی انسان!

کہیں گے حد درجہ کا بدتمیز، حد درجہ کا تعلّی پسند، حد درجہ کا نٹ کھٹ، یہ باتیں بھی صحیح، جو میں نے عرض کیا۔ وہ بھی صحیح، اس کا رویہ، ہر شخص کے مزاج اور پھر اوصاف کے مطابق ہوتا ہے۔

باقی رہا میری نالائقیوں اور کوتاہیوں کے باوجود، مجھ سے کیوں تعظیم کے ساتھ پیش آتے ہیں؟ میں تو اسے ان کی ذاتی شرافت ہی کا نام دوں گا۔ آپ بے شک اسے ان کا کمال نہ گردانیں۔ خاندانی شرافت کا نام دے لیں۔ بہر حال جس کی جھولی میں جو کچھ ہوتا ہے۔ برآمد بھی وہی کچھ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ یہ اپنی جھولی کی طرف کم، دوسروں کی جھولیوں کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں۔

یہ اخبار نویس ہیں یا ادیب، میں اس کا آج تک فیصلہ نہ کر سکا۔ ویسے آج کی محفل میں اس کا فیصلہ ہو ہی جانا چاہیے۔ اگر آج یہاں اخبار نویس زیادہ ہیں تو یہ اخبار نویس اور اگر ادیب زیادہ ہیں تو یہ ادیب؟ یہ فیصلہ کچھ ویسا ہی فیصلہ ہے کہ ایک بار میں نے بہن خدیجہ مستور سے پوچھا تھا۔ بلبل مذکر ہے یا مونث؟ ان کا جواب یہ تھا۔ اگر سوال کرنے والا مرد ہو تو مذکر، عورت ہو تو مونث!

بہر حال ادیب عوام کے دلوں میں بستا ہے اور تاریخ کی کتابوں میں بولتا ہے۔ مگر صحافی خواص کے دلوں میں بستا ہے اور حکومت کے ایوانوں میں بولتا ہے۔ میں تو اسے اپنا اپنا منصب اور اپنی اپنی قسمت کہوں گا۔ آپ چاہیں تو اسے اپنی اپنی قسمت اور اپنا اپنا منصب کہہ لیں۔ بات یوں بھی ایک، ڈول بھی ایک کیونکہ چھاچھ کے ایک گلاس میں پانی کے دس گلاس ڈال دیجیے جب بھی چھاچھ ہی کہلائے گی۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں عطاالحق قاسمی کو نہیں جانتا۔ یہ جاننا بھی کیا جاننا ہوا کہ کہہ دوں۔ موٹے موٹے سے ناک نقشے والا عطاالحق قاسمی متجسس آنکھیں اور بیدار ذہن والا عطاالحق قاسمی ہنسنے اور ہنسانے والا قاسمی محبت کرنے اور لڑنے مرنے والا قاسمی بہرحال یہ شخص مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔ مجھے تو خوبصورت بھی نہیں لگتا، اگر کسی کو اچھا لگے ہے یا خوب صورت لگے ہے تو مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں بلکہ سبحان اللہ بہرحال وہ نظر کہ جسے عطا خوب صورت لگتے ہوں۔ وہ نظر کسی مجھ جیسے عام آدمی کی نہ ہوگی، بلکہ وہ کوئی خاص نظر ہوگی اور مجھے معلوم ہے کہ خاص نظریں ہیں ؟ ورنہ دنیا والوں کو کیا مصیبت کہ وہ بنیاد کے بغیر عمارت کھڑی کر دیں!

یقین کر لیجیے۔ میں نے ان کی کتاب بھی نہیں پڑھی۔ یہ الگ بات کہ گزشتہ چھ برسوں سے ان کے کالموں کو جھیلتا چلا آ رہا ہوں اگر پڑھنا نہیں چاہتا تو پڑھتا کیوں ہوں؟ اس کا جواب کیا دوں! اس کا جواب آدم کے پاس بھی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا۔ دانۂ گندم کے قریب نہ جانا، مگر وہ گیا۔ ان کے بھی کالموں میں ترغیب کا عنصر کچھ ایسا ہے کہ وقت ملے یا نہ ملے۔ وقت نکالنا پڑتا ہے۔ ان کا فن تلخ سے تلخ بات کو سلیقے سے کہنے کا فن ہے۔ ان کے بیشتر کالم سیاسی ہوتے ہیں۔ مگر وہ سیاسی لوگوں کو بھی سیاسی نہیں لگتے۔ ان کے کالم نہ ہوئے غزل کے شعر ہو گئے۔

ان کی کتاب میں ۶۱ کالم ہیں۔ جو ۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے۔ ۶۱ کالموں کے بارے میں جو حضرات باتیں کریں گے۔ انھیں لوگ نقاد کہیں گے۔ جو لوگ تین چار کالموں کی بات کریں گے۔ انھیں لوگ شرفا میں سے بتائیں گے۔ اس لئے کہ وہ خود بھی سوچتے ہیں۔ دوسروں کو بھی سوچنے کا موقع دیتے ہیں۔

ادب کے سفر میں کسی کو خوش یا کسی کو ناراض کرنے کا کوئی چلن نہیں۔ اگر کوئی کسی کو وقتی طور پر خوش کرے گا تو اس سے آنے والے لوگ ناراض بھی ہو سکتے ہیں اور اگر کوئی کسی کو وقتی طور پر ناراض کر سکتا ہے تو ہو سکتا ہے آنے والے لوگ بہت خوش ہوں ادب میں جن لوگوں کو امان ملے گی۔ وہ وہی لوگ ہوں گے۔ جو سچے ہوں گے۔ جو سچے اکھر لکھیں گے۔ جو سچے فقرے لکھیں گے۔ میرے نزدیک ایک ایسا ہی سچا فقرہ یہ ہے کہ ادب کے میدان میں بڑے گھپلے ہوئے اور دوسرا سچا فقرہ بھی یہ ہے کہ ادب کے میدان میں بڑے گھپلے ہوئے۔

اگر مجھے عطا سے محبت ہے۔ اس کے قلم کی جنبشوں سے لگاؤ ہے تو پھر مجھے تحسین و ستائش کے ماتھے پر ایک کالی بندیا لگانا ہی ہوگی۔ یہ مسئلہ جدا ہوگا کہ بندیا بھی خوبصورت دکھائی دے۔ ایسے میں نہ آپ کچھ کر سکیں گے نہ میں! بلکہ صرف صبر شکر!

میں نے ان کا ایک کالم ۹ ستمبر ۱۹۷۶ء کو پڑھا تھا۔ جو بین الاقوامی سیاست پر تھا۔ وہ براہ راست "جمع کا سوال" نہ تھا۔ یعنی دو اور دو چار والا کالم نہ تھا۔ بلکہ "تفریق کا سوال" تھا کہ فلاں فلاں ملک کہاں کھڑا ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں۔ وہ کالم بڑی رقم میں سے چھوٹی رقم کو تفریق کرنے کا تھا۔ اس کالم کا نام "طوطے ہی طوطے" تھا۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کو سارا کالم سنا دوں۔ مگر طوالت کے خوف سے صرف چند سطریں!

"میں نے تعجب سے ایک نظر طوطوں کو اور پھر ان کے مالک کو دیکھا۔ مالک ہنس رہا تھا۔ طوطے بھی ہنس رہے تھے۔ میں نے

اپنی حیرت پر قابو پالیا اور کہا۔ یہ طوطے ہم انسانوں کی باتیں سمجھتے ہیں اور ہم انسانوں کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ مالک نے بتایا۔ یہ طوطے معمولی طوطے نہیں۔ ذہین طوطے ہیں۔ ان میں سے کچھ سیاسی طوطے ہیں۔ کچھ ادبی اور صحافتی طوطے ہیں۔ انقلابی طوطے ہیں اور اسلام پسند طوطے ہیں۔ یہ سب دانا جانور ہیں! میں نے یہ سن کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ اگر یہ اتنے ہی دانا ہیں تو انہوں نے تمہاری غلامی کس طرح قبول کر لی؟ آقا نے جواب دیا: میں تو محض ان کا رکھوالا ہوں۔ یہ میرے غلام نہیں میں تو خود غلام ہوں۔ یہ دیکھو! یہ کہہ کر اس نے اپنی پشت پر سے کپڑا اٹھایا۔ جس پر غلامی کا داغ موجود تھا۔

"تم کس کے غلام ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں جس کا غلام ہوں۔ وہ آگے کسی کا غلام ہے اور یہ سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے"۔

بین الاقوامی سیاست پر، اس سے بہتر تبصرہ اور اس سے بہتر انداز میں لکھنا شاید کسی کے بھی بس کی بات نہ ہو۔ یہ کالم کہہ رہا ہے کہ لکھنے والے پر ایمان لے آؤ۔ مگر ہم نے پہلے کسی کو مانا ہے۔ جو ان کے قلم کا لوہا مانیں۔ اپنی جو رائے تھی۔ وہ عرض کر دی۔ مگر ایمان لے آئیں۔ یہ ناممکن! اپنا تشخص غارت ہو جائے گا۔

میرا کالم ہم نے ۲۴ر جون ۱۹۶۸ء کو پڑھا تھا۔ سفید پوشوں کا جو حال اس دور میں ہے۔ یہ کالم اس کی نشان دہی کرتا ہے۔ ہم جینا چاہتے ہیں مگر جی نہیں سکتے۔ ہم مرنا چاہتے ہیں۔ مر نہیں سکتے۔ کیونکہ ہمارے مسائل ہمیں زندہ رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر دنیا کو کسی طرح سے، ان کے مسائل سے چھٹکارا مل سکتا تو آدھی دنیا مرنے پر راضی ہو گئی ہوتی۔

دیکھئے دو سفید پوش باتیں کر رہے ہیں۔

"اوسط درجے کا مکان بھی تعمیر کیا جائے تو کم از کم ڈیڑھ لاکھ روپے لگتے ہیں"۔

"پھر تم نے کیا سوچا؟"

"ساٹھ ہزار روپے ہاؤس فنانس کارپوریشن والوں سے قرض لے لوں گا"۔

"اور باقی؟"

"تقریباً پندرہ ہزار روپے کی مالیت کے زیورات ہیں۔ کچھ قرض یہ زمین رہن رکھنے کی صورت میں مل جائے گا"۔

"دس ہزار یہ ہو گئے باقی؟"

"سکوٹر بیچ دوں گا"۔

میں نے سکوٹر کی حیثیت کذائی مدِنظر رکھی اور کہا۔ دو ہزار روپے — باقی؟"

اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں اور پھر اس نے چٹکی بجا کر کہا۔ کچھ رقم تم سے قرض لے لوں گا"۔

"ٹھیک ہے"۔ میں نے جواب دیا "سو روپیہ ہو گیا۔ باقی؟"

"تم ٹوٹل لگاؤ۔ اس نے بیزار ہو کر کہا۔ پہلے دیکھیں یہ رقم کتنی بنتی ہے؟"

بہتر ہزار ایک سو!"

"مزید کتنی رقم درکار ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ انتظام ہو جائے گا"۔ اس نے اچانک پُر اُمید ہو کر کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"میں لائف انشورنس کرا لوں گا۔"

"مگر اس سے مکان کیسے بنے گا؟"

"بن جائے گا۔ اس نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ انشورنس کرانے کے بعد میں خودکشی کر لوں گا۔ میں نہیں تو میرے بچے مکان میں رہیں گے۔"

اس گفتگو میں شریک تو دو آدمی ہیں کوئی سے دو شخص، مگر اس کی زد میں پورا ملک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آواز صرف دو آدمیوں کی نہیں۔ بلکہ کروڑوں انسانوں کی ہے۔

یہ کالم لکھ کر عطا نے کلیجہ پہ ہاتھ ڈالا ہے۔ پہلے جراحتیں کیا کچھ کم تھیں۔ جو اور کچوکے لگائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں قاسمی کی تحریروں کو پسند نہیں کر سکتا۔ پسند کروں گا۔ تو یہ زندہ درگور کر دے گا۔ یہ شخص خود امر ہو جائے گا مگر دوسروں کو مار ڈالے گا۔ سفاک کہیں کا!

یہ شخص رونے رلانے پر ہی قادر نہیں۔ رونے والوں کو ہنسانے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ یہ عجیب طرح کا آدمی ہے۔ اس کا کوئی ایک رُخ نہیں۔ ابھی کہہ رہا تھا۔ روؤ اور خوب روؤ، ابھی کہہ رہا ہے ہنسو اور خوب ہنسو!

ابھی عطا سفید پوشوں کا نوحہ پڑھ رہا تھا۔ ابھی وہ گدگدانے بھی لگا۔ سفید پوش کی تعریف وہ یوں بھی کرے گا "سفید پوش" وہ ہے۔ جو ماسی برکتے کے تندور سے کھانا کھا کے نکلے اور ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے باہر خلال کرتا پایا جائے۔"

عطا خود بھی ظالم ہے اور اس کا قلم بھی ظلم ڈھاتا ہے۔ وہ لمبے چوڑے مضامین باندھ کر اپنے مدعا تک نہیں پہنچتا۔ بلکہ وہ قاری کا ایک ہی وار میں دھڑن تختہ کر دیتا ہے۔ اس کا قلم اُسترے کی دھار نہیں بلکہ بلیڈ کی دھار ہے۔ دیکھئے وہ دو سطروں میں بات کر رہا ہے۔

"عینک ایک ایسی چیز ہے جو اگر بصیرت نہیں تو بصارت ضرور دیتی ہے اور موجودہ دور میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ انسان بصیرت کی بجائے بصارت سے کام کرے۔"

عطا کی کتاب (روزنِ دیوار سے) میں ایسے ایسے حکمت آمیز اور چودہ طبق روشن کرنے والے جملے بکھرے پڑے ہیں۔ یہ میرا قیاس ہے۔ چونکہ میرا اس کتاب کو سطر بہ سطر پڑھنے کا ارادہ نہیں، ارادہ ہے تو فرصت نہیں، فرصت ہو تو بھی ارادہ نہیں۔ کون آئندہ اس سے جُھک کے ملے! جو خورد ہو، وہ ادب میں بزرگ بن جائے۔ مجھے منظور نہیں!

غالب نے بھی اپنی "تاریخِ وفات" کہی تھی۔ مگر تاریخ گزرتی رہی اور وہ اس دنیا میں دندناتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کو ایک بار نہیں۔ دو تین بار اپنی "تاریخِ وفات" کہنی پڑی۔ سعادت حسن منٹو نے بھی اپنا کتبہ خود لکھا تھا۔ جو ان کی قبر پر موجود ہے۔

عطا نے بھی اپنے بارے میں خود ہی سب کچھ لکھ ڈالا ہے۔ واقعی بڑی خوبیاں تھیں اپنے یار میں! وہ دوستوں کا دشمن تھا اور دشمنوں کا دوست۔ یہ وصف پیغمبرانہ ہے۔ دشمنوں کے لئے دل میں کشادگی، اپنے لئے یا دوستوں کے لئے ضابطے کڑے ضابطے، اپنے بیٹے کے لئے حضرت عمر کا یہ

کہنا۔ لگا دو دُرّے، اس لئے کہ اس نے جرم کیا ہے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مرحوم عطاالحق قاسمی کے بارے میں بھی اپنے تاثرات کا اظہار کرتا۔ چونکہ وہ خود اپنے بارے میں لکھ گئے ہیں۔ اس لئے زیادہ مستند ان کا لکھا، ویسے میں اُن کا اپنے بارے میں لکھا ہوا کالم سامنے لانے کے بعد سوچوں گا کہ میں اَب کیا کروں۔ کیا لکھوں؟ فرما گئے ہیں:۔

"انھیں تصنع، بناوٹ، منافقت اور نظریاتی دھوکہ بازی سے شدید نفرت تھی اور ایسے لوگوں کو دیکھ کر ناک پر رومال رکھ لیتے تھے۔ چنانچہ انھیں اکثر اسی حالت میں پایا گیا۔ مرحوم کو دوسروں کے بارے میں کڑوی سے کڑوی سچی بات ان کے منہ پر بیان کرنے کا بہت شوق تھا اور یوں وہ بڑے حق گو تھے۔ تاہم اپنے بارے میں دوسروں کو ہمیشہ حُسنِ ظن سے کام لینے کی تلقین کرتے لیکن اس کے باوجود اگر کوئی ان کے بارے میں سچی بات کہہ دیتا تو گھنٹوں آزردہ رہتے کہ لوگوں میں کھرے کھوٹے کی پہچان نہیں رہی۔ مرحوم سکھوں کے شہر امرتسر میں پیدا ہوئے۔ اس کا اندازہ ان کی بعض عادات سے بھی ہوتا ہے مثلاً یہ کہ کسی انتہائی ناخوشگوار واقعہ سے دوچار ہونے کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے گھر واپس آجاتے تھے۔ لیکن کئی گھنٹے بعد اور بعض صورتوں میں کئی دنوں بعد اچانک انھیں خیال آتا تھا کہ اُس روز تو ان کی سخت توہین ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ پیچ و تاب کھانا شروع کر دیتے تھے۔ ان کی محبت اور نفرت بھی عجیب قسم کی تھی۔ کسی دوست کی غیر دوستانہ حرکت پر ان کی نفرت انتہائی شدید لیکن عارضی نوعیت کی ہوتی تھی۔ جبکہ ان کی محبت دھیمی دھیمی لیکن دائمی تھی۔ آخر عمر میں انہوں نے خلافِ عادت اس فیلڈ میں شدت اور پائیداری کا بیک وقت مظاہرہ کیا۔ جس کے نتیجے میں وہ ہر وقت دردناک اشعار پُرسوز لَے میں گاتے پائے گئے۔ حتیٰ کہ اسی عالم میں وفات پائی۔"

دیکھا آپ نے "مرحوم" نے اپنا نوحہ کس انداز اور کس شان سے لکھا۔ میں خوب صورت نثر کو بھی یہ زمرۂ نظم ہی سمجھتا ہوں۔ اسی لئے مندرجہ بالا سطور کو نوحہ کہا۔ بظاہر یہ سطریں بڑی مفرح ٹائپ کی ہیں۔ مگر بباطن مفہوم درد انگیز ہے جو شخص اپنے آپ پر ہنس سکتا ہو کیا آپ اسے معمولی آدمی سمجھتے ہیں؟ میرے نزدیک کسی بھی مصنف کے لیے مشکل ترین مرحلہ وہ مرحلہ ہوتا ہے کہ جب اُسے گفتگو اپنے بارے میں کرنا ہو۔ سو "مرحوم" اس مرحلے سے بھی سرخرو نکلے۔ اپنے بارے میں جو کچھ لکھا۔ سچ لکھا اور یہ بھی سچ ہی لکھا۔ حتیٰ کہ اسی عالم میں وفات پائی۔"

یہ کالم کہ جس میں عطا نے وفات پائی تھی۔ ۶ر جنوری ۱۹۷۶ء کو لکھا گیا تھا۔ مگر مجھے بذریعہ ٹیلی فون ۱۸ مئی ۱۹۷۸ء کو یہ کہا "طفیل صاحب میری کتاب کی تقریب ۲۶ر مئی ۱۹۷۸ء کو ہو رہی ہے۔ اس میں آپ بھی مضمون پڑھیں۔ میں نے جواب میں کہا:

"اصولاً مجھے کوئی عذر نہیں۔ بس معاملہ توفیق کا ہے۔"

کہنے لگے: "آپ کے لئے کیا مشکل ہے قلم پکڑیں اور گھسیٹ ڈالیں۔"

میں نے کہا: "اگر میں آپ کی طرح کا لکھنے والا ———"

اس کے باوجود عطا کا اصرار تھا کہ مضمون لکھوں۔ معاملہ ابھی تذبذب میں ہی تھا کہ ایک دن ڈاک میں اس تقریب کا دعوت نامہ آگیا۔ اس میں میرا نام چھپا ہوا تھا۔ یقین جانیے خاصا پریشان ہوا۔ لکھنا میرا مشغلہ سہی مگر میں "ہر ایرے غیرے" پر مضمون نہیں لکھتا نیل دیکھتا

ہوں تیل کی دھار دیکھتا ہوں۔

"ابھی میں تیل کی دھار کو، اپنے دماغ پہ محسوس کر ہی رہا تھا کہ پھر عطا کا ٹیلیفون آیا۔" اس نے بتایا۔ ہوسکتا ہے کہ تقریب کے صدر تشریف نہ لا سکیں۔

میں نے پوچھا "کیوں؟"

کہنے لگے "ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔"

اس پر میں نے کہا۔ "اور کراؤ تقریب!"

دوران گفتگو عطا نے یہ بھی بتایا کہ "زخم خوردہ تو میں بھی ہوں۔"

میں نے پوچھا "خیر باشد؟"

"آ ہا ہا ہا، دو چار دن ہوئے کہ میرے بہنوئی کا بھی انتقال ہوا ہے۔"

جواب میں میں نے کہا "خدا کے لیے اس تقریب کے ملتوی کرنے کا اعلان کر دو۔ ورنہ کسی دوسرے مضمون نگار کا بھی انتقال ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی مشورہ یہ بھی دیا "بطور صدقہ کرے دکرے دو!"

کہنے لگے "مضمون نگار بکرے ہی تو ہوتے ہیں۔"

عطا اٹھتے بیٹھتے مسکراتے رہتے ہیں، گفتگو ہر طرح کی کرتے ہیں۔ زنانہ مردانہ دونوں طرح کی، مگر ایک شائستگی کے دائرے میں، یہ غموں اور دکھوں کو اپنے اوپر وارد نہیں کرتے۔ بلکہ جھٹک دینا چاہتے ہیں۔ دکھوں میں مسکرانا بڑے حوصلے کی بات ہے صاحب!

ابنِ انشا کا جس دن انتقال ہوا۔ اُس دن عطا میرے پاس آتے کہنے لگے۔ "کوئی خبر سنی؟"

میں نے کہا "کیسی خبر؟"

کہنے لگے "آج صبح ریڈیو نے بتایا کہ ابنِ انشا کا انتقال ہو گیا ہے۔" اتنا سا فقرہ کہتے ہوئے بھی ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

مجھے معلوم تھا کہ عطا کی ابنِ انشا کے ساتھ دوستی نہ تھی۔ لمبی چوڑی ملاقاتیں بھی نہ تھیں۔ بس رسمی سے تعلقات تھے۔ مگر وہ روئے کیوں؟ اُن کی آواز گلوگیر کیوں ہوئی۔ معلوم ہوا دوستی اہلِ قلم کے لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اہمیت فن کی ہوتی ہے۔ اہمیت جوہرِ ہنر کی ہوتی ہے چنانچہ رائٹرز گلڈ نے بھی ابنِ انشا کے سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تاکہ خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔ عطا کو بھی مضمون پڑھنے کے لئے کہا۔

سارے مضمون نگار آ گئے۔ مگر عطاالحق قاسمی نہ پہنچے۔ جب تقریب ختم ہو گئی تو ان کی صورت نظر آئی۔ میں نے شکایت کی "جناب! وقت پر کیوں نہیں پہنچے؟" کہنے لگے۔

آ ہا ہا ہا! اباجی کے دانتوں میں سخت درد تھا۔ دو چار دن سے بیکل تھے۔ بالآخر آج دو دانت نکلوانے پڑے۔ دوسرے میرے بیٹے یاسر کو ۱۰۴ بخار تھا۔ اس لئے حاضر نہ ہوا۔ آ ہا ہا ہا!

اب آپ ہی بتائیں کہ ایسے ہنسوڑ پر کوئی مضمون کیا لکھے۔ بہنوئی کا انتقال ہو گیا تو آہاہاہا، والدِ گرامی کے دو دانت نکل گئے تو آہاہا!
بچے کو ۱۰۴ بخار ہے تو آہاہاہا!

یقین جانیے میں نے ایسا حوصلے والا شخص اور کوئی نہیں دیکھا کہ جو ایک ادیب کے انتقال کی خبر سُن کر رو سکتا ہو اور اپنے غزل پر ہنس سکتا ہو۔ حالانکہ اطلاع یہ ہے کہ لوگ دوسروں کے غموں پر ہنستے ہیں اور اپنے غموں پر روتے ہیں۔

عطا صرف دوسروں پر ہی فقرے چُست نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتا۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں کسی کو شرافت کی سند دی جا سکتی ہے۔

عطا نے مجھے ایک فوٹو گروپ دکھایا اور مجھ سے پوچھا "ان میں سے اس شخص کو جانتے ہیں؟"
وہ صاحب بڑی رعب دار مونچھیں لگائے کھڑے تھے۔ میں نے کہہ دیا "نہیں جانتا!"
کہنے لگے "یہ میں ہوں"
"اور یہ مونچھیں؟"
کہنے لگے۔ جب میں ادب اور صحافت کی طرف مڑا تو میں نے پہلا کام یہ کیا کہ مونچھیں منڈوا دیں"
"کیوں؟"
"وہ اس لئے کہ کہیں کوئی دوسرا نہ منڈوا دے"

جو شخص اتنے رکھ رکھاؤ اور اتنی سوجھ بوجھ کے ساتھ ادب کی طرف آیا ہو۔ وہ اب اس میدان سے ہٹے تو کیوں کر ہٹے۔ وہ تو ڈنکے بجاتے گا۔

کئی لوگ اپنی زبان سے اپنی مدح میں اتنا کچھ کہتے ہیں کہ اُن کی زبان کا اوپر والا حصہ خاصا گھسا ہوا ہوتا ہے۔ مگر یہ اپنی لیاقت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے۔ اپنی مدح میں کچھ نہیں کہتے۔ ایک پیارا سا طالب علمانہ رویّہ ہے (حالانکہ خود پروفیسر ہیں) جو لوگ اپنی ہمہ دانی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اُن کے بارے میں چراغ حسن حسرت نے ایک بڑا خوبصورت کالم لکھا تھا۔ اس میں سے چند سطریں!

"مولوی شفیع داؤدی مرحوم صرف نام کے مولوی تھے۔ یعنی عربی نہیں جانتے تھے۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں انہیں ولایت جانا پڑا۔ جہاں وہ علامہ اقبال کے ساتھ رہے اور انہی کے ساتھ واپس آئے۔ جہاز عدن کے قریب پہنچا تو مولوی صاحب عرشہ پر کھڑے سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پڑھ رہے تھے۔ اتفاقاً وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کے سمندر میں جا پڑی۔ عدن میں غوطہ خوروں کی کثرت ہے سمندر میں کوئی چیز پھینک دیجئے۔ یہ لوگ غوطہ مار کے نکال لائیں گے۔ مولوی صاحب نے چلا کے کہا۔ "یا شیخ ذالک کتاب لا ریب فیہ" ایک غوطہ خور ان کا مطلب سمجھ گیا اور رپورٹ نکال لایا۔"

عطا الحق قاسمی کے دو بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام یاسر ہے اور چھوٹے کا نام عمر۔ عمر بھی علی الترتیب تین اور چار سال ہے۔
عطا نے سوچا کہ ہم بچوں کو بجائے اس کے کہ سکھوں کے لطیفے سنائیں، جنوں اور پریوں کے قصے سنائیں بہتر یہ ہوگا کہ اساتذہ کے شعر یاد کروائیں۔ چنانچہ کبھی میر کا کوئی آسان سا شعر سنا دیا کبھی غالب کا!

ایک دن، انہوں نے اپنے بڑے بیٹے یاسر سے پوچھا "عمر کہاں ہے؟"
یاسر نے جواب دیا "ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے۔"
تھوڑی دیر کے بعد پھر پوچھا "کیا ابھی تک عمر سو رہا ہے؟"
تو یاسر نے جواب دیا "ابھی تک روتے روتے اٹھ گیا ہے۔"

بچے شعر یاد کرتے رہے۔ موقع بے موقع، کبھی بہ محل اور کبھی بے محل ان کا استعمال بھی کرتے رہے مگر ایک دن سہو ہو گئی۔ عطا اور ان کی بیگم کی، کہیں جلد پہنچنے کے سلسلے میں قدرے تلخ لہجے میں گفتگو شروع ہو گئی۔ ننھا یاسر یہ کہتے ہوئے کرے سے نکل گیا "شرم تم کو مگر نہیں آتی۔"

یہ تو طے ہے کہ آج کے بچے، پہلے بچوں سے زیادہ ذہین ہیں۔ مگر ایسے بقراط بچے ایسے سقراط بچے، جو معصومیت کے باوجود ایسے نکتہ شناس ہوں کہ کوئی نکتہ باقی نہ چھوڑیں۔ کم ہوں گے۔ میں تو اب ان کے گھر جاتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔ مبادا پوچھ لیں "نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا!"

غرض بچے بڑے ہو کر ہم بزرگوں کا کیا حال کریں گے۔ نہیں معلوم! اگر عطا کی آنکھ کی شرم باقی ہے۔ اگلے زمانے کی شرافت موجود ہے۔ حفظِ مراتب کا احساس باقی ہے۔ ہوا یوں کہ ایک تقریب میں عطا نے مضمون پڑھنا تھا۔ میرا نام بھی اس تقریب کے مضمون نگاروں میں شامل تھا۔ مگر عطا سے پہلے مجھے بلا لیا گیا۔ اس معمولی سی بات کو عطا نے محسوس کیا کہ مجھ سے پہلے طفیل کو مضمون نہیں پڑھنا چاہیئے۔ چنانچہ میری بجائے عطا سٹیج پر پہنچ گئے اور کہا کہ "پہلے میں مضمون پڑھوں گا۔"

بظاہر یہ چھوٹی سی بات ہے۔ مگر یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حاضرین نے تالیاں بجا کر عطا کے اس جذبے کی تعریف کی۔ میرے دل میں بھی ان کا مقام بڑھ گیا۔

قصہ مختصر! میں عطاالحق قاسمی پر، باوجود مداح ہونے کے مدلل مداحی قسم کا مضمون نہ پڑھ سکا۔ چونکہ قاسمی کا خیر خواہ ہوں اس لئے اس کے کان میں صرف دو جملے کہوں گا۔

پہلا جملہ! — تیری تحریر میں بانکپن ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہ سمجھنا۔
دوسرا جملہ! — تیری شخصیت میں موہنی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہ سوچنا۔

غالباً یہی دو جملے، بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان نے، چراغ حسن حسرت، مولانا عبدالمجید سالک اور حمید نظامی کے کان میں کہے تھے۔

رسولؐ نمبر
اقبالؒ نمبر
میرؔ نمبر
غالبؔ نمبر
شعر نمبر
نوادرات نمبر
انیسؔ نمبر
ادبی معرکے نمبر
زیرِ ترتیب ہیں۔ عنقریب پیش کئے جائیں گے۔


منظومات

یار کچھ بتا[ل] — یار کچھ نہ پوچھ

جوابِ اَبُو الاَثر		سوالِ مُنَوّر	
سانپ اور سنپولئیں تھیں گل و خار ـ کچھ نہ پوچھ آثارِ زہر بار کے اسرار ــــ کچھ نہ پوچھ	(۱)	دیکھی ہے تُو نے بزمِ گُل و خار ـ کچھ بتا! آثار کیا ہیں ـ صاحبِ اسرار ـ کچھ بتا!	(۱)
ٹھن ٹھن شکستِ ساغر و مینا تھی وقتِ نوش شاکئ ستم تھے ـ ساقی و میخوار ــ کچھ نہ پوچھ	(۲)	کیا میکدہ میں ساقی و مینا ہیں ٹھن گئی شاکی بہم ہیں ساقی و میخوار ـ کچھ بتا	(۲)
کیشِ صفا کے بول تو ہیں زر کے مول تول کیسی وفا ـ کہاں کے وفادار ــ کچھ نہ پوچھ	(۳)	اہلِ صفا ہیں کتنے صفاکیش ـ کچھ تو بول! اہلِ وفا ہیں کتنے وفادار ــ کچھ بتا	(۳)
جا ـ ڈھونڈ لا ـ غبارِ تمنّا کے "یار مار" مجھ کو بٹھا کے پاس ـ مرے یار ــ کچھ نہ پوچھ	(۴)	یاروں سے یار صدقۂ یاری ہیں دُور دُور آ پاس میرے بیٹھ ـ مرے یار ـ کچھ بتا	(۴)
کاکُل کُلاہ و گیسوئے برہم ـ سرشتِ زشت برباد زَن ہے شملۂ دستار ــ کچھ نہ پوچھ	(۵)	برہم ہیں آج کس لئے گیسو کُلاہ کے؟ کیوں بادِ زَن ہے شملۂ دستار ــ کچھ بتا	(۵)

[ل] مرزا محمد منوّر پروفیسر گورنمنٹ کالج ایسے نکتہ رس اور صاحب دل نے "کچھ بتا" ردیف رکھ کر ۱۸ عدد شعر ایک روزنامہ لاہور کے صفحے پر شائع کر دیئے تھے ـ مَیں نے ان کا مطالعہ کیا تھا ـ چونکہ کسی اور صاحب نظر نے ان سوالات کا جواب نہیں دیا ـ اس لئے میں نے جرأت کیجئے یا جسارت ہر شعر کے سامنے اپنی سمجھ کی بساط سے جواب شعر ہی میں نظم کر دیئے ہیں ـ (ابو الاثر)

یاں چارہ ساز کون ہے ۔ تیمار دار کون؟
(۶) نالاں ہے سب ہے کس لیے بیمار ۔ کچھ بتا!
ہر چارہ ساز سُلفہ ہے ۔ تیمار دار بھنگ
(۶) نالاں ہے کسی ترنگ میں بیمار ۔ کچھ نہ پوچھ

تلوار جس سے ہو گئے قوم و وطن دو نیم
(۷) کس ہاتھ میں ہے آج وہ تلوار ۔ کچھ بتا!
قوم و وطن ۔ قسائی نے جس سے کیے دو لخت
(۷) بند ہے دستِ زن میں وہ تلوار ۔ کچھ نہ پوچھ

اقرار ہے دمیدۂ اِنکار کس لیے؟
(۸) اخلاص کیوں نہیں سرِ پُرکار ۔ کچھ بتا!
اقرار میں چھپا کے رکھی تھی جو گندگی!
(۸) اس ڈھیر کی سڑاند ہے انکار ۔ کچھ نہ پوچھ

مفہوم سوز و تیزیٔ تکرار کا ہو ذکر!
(۹) معنیٔ گداز ۔ گرمیٔ گفتار ۔ کچھ بتا!
مفہوم ہو تو کیوں ہو یہ تکرارِ تند و تیز
(۹) زہراب جاں گداز ہے گفتار ۔ کچھ نہ پوچھ

کیا چاہنے لگی ہے قبا اہلِ جاہ کی؟
(۱۰) کیا مانگتا ہے جُبّہ ایثار کچھ بتا!
غنڈوں کی ہے پناہ قبا اہلِ جاہ کی!
(۱۰) جُبّہ ہے قُبّہ ۔ قبر ہے ایثار ۔ کچھ نہ پوچھ

کیا نذرِ مصلحت ہوئے اہلِ صلاح سب
(۱۱) سب مُصلح جو ہیں پیکرِ بیکار ۔ کچھ بتا!
جو مصلحت فساد سے حاصل کرے مفاد
(۱۱) اُس کی صلاح شاملِ بیکار ۔ کچھ نہ پوچھ

ہوتا ہے کیا ۔ سلامتِ کردار کا قوام!
(۱۲) ہوتی ہے کیا قیامتِ کردار ۔ کچھ بتا!
ہر جھوٹ سے سلامتِ کردار ہے قوام!
(۱۲) گھر لوٹ ہے قیامتِ کردار ۔ کچھ نہ پوچھ

---

۱۳) بیعت کریں تو کس کی کریں بے عیار لوگ
شیخِ شیوخ کون ہے ۔ معیار ۔ کچھ بتا!
(۱۳) شیخِ شیوخ ماسکوی سُرخ کوُخ ہے
بیعت کی بے عیاریِ معیار ۔ کچھ نہ پوچھ

---

(۱۴) کیا آجکل ہے نرخِ ضمیرِ منیرِ شہر
حالِ کسادِ گرمیٔ بازار ۔ کچھ بتا!
(۱۴) چل بہرِ سجدہ مسجد شاہی کی راہ پر
مجھ سے کساد و گرمیٔ بازار ۔ کچھ نہ پوچھ

---

(۱۵) اِرشادِ جنّ کا قولِ ملائک سے کم نہ تھا
کیوں اب ہے اُن کا ذکر بھی آزار ۔ کچھ بتا؟
(۱۵) ارشاد سے ہے قولِ ملائک اگر مراد؟
اِبلیس یا ہے آدمی آزار ۔ کچھ نہ پوچھ

---

۱۶) کچھ دُور باشِ مسند کی بات کر
کس حال میں ہیں صبر کے نادار ۔ کچھ بتا؟
(۱۶) کس بحر میں ہے مصرعِ اوّل ۔ یہ خود ہی دیکھ
مجھ سے غنی ہے صبر کہ نادار ۔ کچھ نہ پوچھ

---

(۱۷) مشہد میں ذوق وشوق کے اب سربکف ہے کون
بے جاں ہے کون ۔ کون ہے جاندار کچھ بتا؟
(۱۷) مشہد میں ذوق وشوق سے زائر ہیں زرطلب
بے جان ہے یہ بھیڑ، کہ جاندار ۔ کچھ نہ پوچھ

---

(۱۸) طوفاں بدوشِ سیلِ مصائب ہے تاک میں
محکم ہے کتنی عزم کی دیوار ، کچھ بتا؟
(۱۸) جو سیل تاک میں تھا ، وہ ہر سُو محیط ہے
ڈھائی تھی کس نے عزم کی دیوار ، کچھ نہ پوچھ

—(میری بھی رائے سُن)—

نعرے ہیں اور عوام ہیں ، اخبار ہیں قوام
رزقِ حرام عام ہے بیوپار ، کچھ نہ پوچھ

مختلف اشعار

فراق گورکھپوری

سہل نہیں ہے عشق و محبت ہوتی ہے تکلیف بہت   یارو میرے حال کو دیکھو اپنا تو نہ یہ حال کرو

میرے مقدر ہی میں غم تھا   تم بھی اُداس رہا کرتے ہو

ترغیبِ گناہ لمحہ لمحہ   اب رات جوان ہو گئی ہے

اے غمِ دوست تُو ملا مجھ کو   بعد مدّت ، مزاج کیسا ہے ؟

ہم بھی کہیں کچُھ تم بھی کہو کچُھ   کب سے ہم تم چُپ بیٹھے ہیں

زندگی نبض تو دیکھیں تیری   ہم بھی اک نسخۂ غم جانتے ہیں

تھوڑی بہت محبت سے کام نہیں چلتا اے دوست   یہ وہ معاملہ ہے جس میں یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں

در پہ میں نے روکا ہے مہماں کو یہ کہہ کر   جاتے وقت پُوچھو پاؤں آتے وقت مت پُوچھو

میں بس اک بار لاجواب ہُوا   جب یہ پوچھا کسی نے "کون ہو تُم"

احسان دانش

جو گزر رہی ہے دل پر کوئی ترجماں نہیں ہے
مرے دوستوں میں کوئی مرا چارہ خواں نہیں ہے

مرے شوق شب روی کا کوئی آسرا تو ہوتا
کوئی سبز فام تارا سرِ آسماں نہیں ہے

یہ یقین آرہا ہے مجھے اب قدم قدم پر
مری یہ زمیں نہیں ہے، مرا یہ جہاں نہیں ہے

مرے ہم خیال قدسی، مرا جبرئیل شاہد
ترے آستاں سے اونچا کوئی آسماں نہیں ہے

مہ و آفتاب کرنیں لیے ساتھ چل رہے ہیں
مرے سر پہ خار و خس کا کوئی سائباں نہیں ہے

ہیں قیادتِ جنوں میں مرے ساتھ صاف باطن
جو غلط قدم اُٹھائے مرا کارواں نہیں ہے

مرے سب حریف گلچیں، مرے گُل فروش دشمن
میں چمن کا ماتمی ہوں، غمِ آشیاں نہیں ہے

وہ گئے تو لے گئے ہیں مرے غم کی شعلگی بھی
مرے اشک جم گئے ہیں، مرا دل تپاں نہیں ہے

مجھے ایک دن اچانک یہ ملال مار دے گا
مرے قافلے میں اب تک کوئی راہداں نہیں ہے

مجھے کیا خرد سے خطرہ، میں جنوں کے شہر میں ہوں
مری وہ زمیں ہے جس پر کوئی آسماں نہیں ہے

جسے حق کے راستے میں ہوں عزیز جان و دل بھی
وہ طلب طلب نہیں ہے، وہ لہو جواں نہیں ہے

ترے بیکراں کرم نے مری تشنگی بجھا دی
کوئی فکر کوئی کوشش مری رائیگاں نہیں ہے

خد و خال سے سحر کر نہ اُتار ماہ و انجم!
یہ زمیں مری زمیں ہے، ترا آسماں نہیں ہے

مرے نام سے جو اکثر اُنھیں خط لکھے گئے ہیں
وہ مرا قلم نہیں ہے، وہ مری زباں نہیں ہے

کئی مشغلوں نے دانشؔ مجھے یہ خیال بخشا
یہ سحر ہے دوستوں کی، شبِ دوستاں نہیں ہے

○

احسان دانش

وہ نہیں تو ڈستا ہے بام و در کا سنّاٹا
اُف یہ دل کی ویرانی یہ نظر کا سنّاٹا

خوش خیال لوگوں کو بدگماں نہ کر ڈالے
کچھ اُدھر کی خاموشی، کچھ ادھر کا سنّاٹا

عشق ایک ہے لیکن مختلف طبائع ہیں
ایک ہو نہیں سکتا دشت و در کا سنّاٹا

کاش کوئی پڑھ سکتا، کاش کوئی سُن سکتا
شام کی شفق میں تھا رات بھر کا سنّاٹا

دوستی بڑی نازک چیز ہے زمانے میں
دے گیا ہے اِک لمحہ، عمر بھر کا سنّاٹا

اختتامِ محفل پر کیوں سفر میں ہو تاخیر
یاد کر رہا ہوگا، مرے گھر کا سنّاٹا

وہ ابھی ابھی شاید اس طرف سے گزرے ہیں
کس قدر معطّر ہے رہگزر کا سنّاٹا

گونجتی ہے کانوں میں اک اروپ جھینگر کی
نیم شب سے بڑھ کر ہے دوپہر کا سنّاٹا

رات بھر رہا میرا ہمقدم خاموشی سے
چاند پر بھی تھا طاری، کچھ سفر کا سنّاٹا

جن کی کھڑکیوں میں کل ماہتاب ہنستے تھے
اب اُنھیں مکانوں میں ہے کھنڈر کا سنّاٹا

دل کو کیسے سمجھاؤں بھولتا نہیں دانش
اِک سفر کی کچھ باتیں اِک سفر کا سنّاٹا

○

احسان دانش

کھُل کر جو برس چکا ہے بادل — سبزے پہ لہک رہی ہے مخمل
جب لقمہ لیا تو دِل بھر آیا — اس طرح بھی ہو رہا ہے رَن جَل
ہاتھوں میں غلط سپاس نامے — سینوں میں مقاصدوں کی دُلدل
آنکھوں میں سُلگ رہے ہیں آنسو — گالوں پہ ڈھلک رہا ہے کاجل
ہر اک کی الگ ہے فرد کردار — ہر شاخ میں ہے درخت کا پھل
ہر شخص خموشش و تیز رفتار — جیسے ہے تمام شہر پاگل
ثابت ہے یہ انقلاب نو سے — یہ خواب بھی ہو گیا مکمّل
اخبار میں امن کے ہیں چرچے — بستی میں مچی ہوئی ہے ہلچل
اس دَور کے صاحبانِ منصب — سونے کو سمجھ رہے ہیں پیتل
گردوں پہ جہاز اُڑ رہے ہیں — انسان زمین پر ہے پیدل
خشکی سے لبوں پہ پپڑیاں ہیں — اشکوں سے پلک پلک ہے بوجھل
کھیتوں میں تو خاک تشنہ لب ہے — دریا پہ برس رہا ہے بادل
شاید تری یاد کی ہے خوشبو — جیسے کہیں جل رہا ہو صندل

ہر زخم ہے اندمال دانشؔ
ہر شہد سے جھانکتا ہے حنظل

آمد

احسان دانش

لالہ و گل غم کے طاقوں میں سجانے آئے ہیں
اس زمینِ شور کو کُندن بنانے آئے ہیں

جُھکتے جُھکتے رات دن کمریں کمانیں بن گئیں
اب ہم ان سرکش مناروں کو جھکانے آئے ہیں

اہلِ ایواں سُن نہیں سکتے غریبوں کی پکار
اس سیاسی بے شعوری کو مٹانے آئے ہیں

اب یہاں کوئی گراں گوشی کے چکر میں نہیں
اس فضا سے دُھند کے پردے اُٹھانے آئے ہیں

حبس سے مر جاتے ہیں پودے، حبس سے جل جاتے ہیں پیڑ
ہم اُنھیں بے رنگ شعلوں کو بُجھانے آئے ہیں

ہو گیا ثابت غلط ہے دینِ فطرت سے فرار
ہم خدا کی بات بندوں کو بتانے آئے ہیں

غفلتوں نے دُور جا پھینکا تھا منزل سے ہمیں
قوم کو آدابِ خود سازی سکھانے آئے ہیں

شہد حنظل سے برآمد ہوگا، انگاروں سے پھول
دار پر ہنسنے کی ترکیبیں سکھانے آئے ہیں

قوم کو مدت میں آیا ہے شعورِ انقلاب
سب کو یہ احساس ہے ہوش اب ٹھکانے آئے ہیں

سب نہیں کارِ سیاست میں زبوں حال و خراب
وہ بھی ہیں جتنے ہیں جن کے کارخانے آئے ہیں

چلتی پھرتی قوتیں ہیں، ہم جنوں مندوں کے غول
ہم چٹانیں توڑ کر رستے بنانے آئے ہیں

اب ہمارے فرض میں شامل ہے ترغیبِ جہاد
شاہبازوں سے ممولوں کو لڑانے آئے ہیں

اب کوئی کھیتی نہ ہوگی خشک سالی کا شکار
اَبر کے بجرے ہواؤں پر چلانے آئے ہیں

رقص گاہیں پا چکیں تعلیم گاہوں میں جواز
ان سنہٹے سنگیں حصاروں کو گرانے آئے ہیں

ہم نقیبِ فکر و فن ہیں ہم امانت دارِ اَمن
اس کھنڈر کو اک نئی بستی بنانے آئے ہیں

ہم میں خونِ گرم کی لہریں ابھی ہیں تازہ دم
ہم خیال و فکر کو آگے بڑھانے آئے ہیں

پی گئی ہے جو ہماری نسلِ نو کی روشنی
اس اندھیری شب میں قندیلیں جلانے آئے ہیں

دانشؔ اپنے ان سیاسی دوستوں کو کیا کہوں
جب بھی آئے ہیں مجھے مجرم بنانے آئے ہیں

○

احمد ندیم قاسمی

طے کروں گا یہ اندھیرا میں اکیلا کیسے
میرے ہمراہ چلے گا مرا سایہ کیسے

میری آنکھوں کی چکاچوند بتا سکتی ہے
جس کو دیکھا ہی نہ جائے، اسے دیکھا کیسے

چاندنی اس سے لپٹ جائے، ہوائیں کھیلیں
کوئی رہ سکتا ہے دُنیا میں اُچھوتا کیسے

میں تو اُس وقت سے ڈرتا ہوں کہ وہ پوچھ نہ لے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے

یاد کے قصر ہیں، اُمید کی قندیلیں ہیں
میں نے آباد کیے درد کے صحرا کیسے

اس لیے صرف خدا سے ہے تخاطب میرا
میرے جذبات کو سمجھے گا فرشتہ کیسے

ذہن میں نت نئے بُت ڈھال کے یہ دیکھتا ہوں
بُت کدے کو وہ بنا لیتا ہے کعبہ کیسے

گر سمندر ہی سے دریاؤں کا رزق آتا ہے
اس کے سینے میں اُتر جاتے ہیں دریا کیسے

ٹوٹتی رات نے سُورج سے یہ سرگوشی کی
میں نہ ہوتی تو ترا نُور برستا کیسے

میں تو ہر سانس میں آ جاتا ہوں فردا کے قریب
پھر بھی فردا مجھے دے جاتا ہے دھوکا کیسے

تہ میں ڈوبے ہوئے ملّاح سے پوچھے کوئی
موجۂ بحر نے کشتی کو اُچھالا کیسے

لوگ جو خاکِ وطن بیچ کے کھا جاتے ہیں
اپنے ہی قتل کا کرتے ہیں تماشا کیسے

جو مرے دستِ مشقت کے ہیں محتاج ندیمؔ
چھین لیتے ہیں مرے مُنہ کا نوالا کیسے

ثبوتِ حق

احمد ندیم قاسمی

بہت حسین تھی !
مجھے خدا کی قسم، وہ لڑکی بہت حسین تھی !
وہ اپنے باطن کے حُسن سے اس قدر منوّر تھی
اتنی روشن تھی
اور پھر اتنی باخبر تھی
کہ اپنے ذہن وضمیر کے اس جمال کو
اپنے سیدھے سادے سے، بھولے بھالے سے، قدسیوں کے سے
خال وخد میں چھپائے رکھتی تھی
لیکن اس کی جمیل سوچوں سے جب شعاعیں سی پھُوٹتی تھیں
تو اس کی آنکھوں میں تارے سے جھلملانے لگتے تھے
اور سارے نقوش یوں جگمگانے لگتے تھے
جیسے سُورج کے نُورِ باطن سے
کائناتِ حیات زرپوش ہو رہی ہو !

خُدا، جو تخلیقِ حُسن کی انتہا پہ قادر ہے
وہ، جو اس انتہا پہ قادر ہے
وہ، جو باطن کا عکس ظاہر پہ ڈالتا ہے تو معجزوں کی نمود
ہوتی ہے

حُسن کارِ ازل بھی ہے
اور حُسن کارِ ابد بھی ہے
حُسن، اُس کی جُملہ صفات کا ایک ایسا عنواں ہے
جس کے ایک ایک حرف سے
وہ حسین ـــــ
وہ بے حساب حد تک حسین ـــــ
وہ حُسنِ جذبہ و آرزو کا اک شاہکار لڑکی
ثبوتِ حق بن کے جھانکتی تھی !

مختصر نظمیں

احمد ندیم قاسمی

ہم سفر

چاند کی سمت جب اُڑتا ہوں
تو ہر بار، عجب حادثہ ہو جاتا ہے
میرے گھر میں جو جلا کرتا ہے مٹی کا دیا
اپنی لَو سر پہ رکھے آتا ہے
اور کہتا ہے :
ترے ساتھ چلوں گا کہ سفر دُور کا ہے
اور تو راہ سے بھٹکا
تو میں بے آسرا رہ جاؤں گا !

قبر پر پھُول

اب کے بارش جو ہوئی
میں نے یہ دیکھا
کہ سرِ راہ جو اک قبر تھی
(شاید کسی دیوانے کی)
اُس پہ اک پھُول کھلا ہے
جو ہواؤں کے تھپیڑوں سے تڑپتا ہے
تو پاتال سے ہنسنے کی صدا آتی ہے !

کون گیا کون آیا

نہ جانے سیڑھیوں سے کون اُترا جا رہا ہے
اُس کی ہر ہر چاپ میں میلوں کی دُوری ہے!
مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے عالمِ سکرات میں
جو سانس آئی تھی
وہ واپس جا رہی ہے!

خواب

چاندنی نے رنگِ شب جب زرد کر ڈالا ——— تو میں
ایک ایسے شہر سے گزرا ——— جہاں
صرف دیواریں نمایاں تھیں
چھتیں معدوم تھیں!
اور گلیوں میں فقط سائے رواں تھے
جسم غائب تھے!!

○

احمد ندیم قاسمی

میں آپ اپنا جواب، اور آپ اپنی نظیر
خود اپنے شہر میں تنہا، خود اپنے گھر میں فقیر
گماں جلوس کا ہوتا ہے، جب بھی چلتا ہے
مرے جلو میں: مری حسرتوں کا جمِ غفیر
بکھر گیا ہوں کچھ اس طرح سطحِ عالم پر
کہ میری خاک ہی ہوئی ہے میری دامن گیر
تمام صحنِ چمن آگ کی لپیٹ میں ہے
کہ رنگِ گل بھی ہُوا اس صدی میں آتش گیر
میں پھیل جاؤں گا چاروں طرف، خلا کی طرح
ابھی وجود ہے میرا، فصیلِ جاں میں اسیر
کسی سے زیر نہ ہو پائے فکر و فن کے دیار
کہ مُلک فتح ہُوئے، پر ہوئے نہ دل تسخیر
میں لُٹ تو جاؤں کہ لُٹنا ہے مقتدر رہنا
مگر یہ میرا اثاثہ! مگر یہ میرا ضمیر!!
تمام زاویۂ ذہن کے کرشمے ہیں
کہ رُخ بدل کے جو دیکھا، بدل گئی تقدیر
کبھی تو پھُول کھلیں گے ضمیرِ آدم میں
اگر یہ سچ ہے کہ مٹّی ہے آدمی کا خمیر
فسادِ خلق کے ڈر سے، ندیمؔ اپنی غزل
نہ پڑھ سکا تو وہ دیوار پر ہوئی تحریر

○

آنند نرائن ملاؔ

اتفاقاً پسِ مدت جو وہ راہوں میں ملے
کتنی یادوں کے دیئے جل کے نگاہوں میں ملے

کہیں کتبے ہیں ستوں پر تو کہیں سنگ پہ نقش
قافلے کل کے ہر اک گام پہ راہوں میں ملے

تُو نے بھینچا ہے ہمیں یوں کہ سماتی نہیں سانس
زندگی کچھ تو سکوں بھی تری بانہوں میں ملے

ہم نے اقبالِ خطا کر ہی لیا، کیا کرتے
جتنے ساتھی تھے وہ دشمن کے گواہوں میں ملے

زیست ہے سب کی الگ پھر بھی ہے اک وحدتِ غم
اپنے شعلے بھی مجھے غیر کی آہوں میں ملے

کل تھے جب بام پہ بھولے سے نظر تک بھی نہ کی
آج کس رس سے پکارا جو وہ راہوں میں ملے

چمنِ دہر میں یہ گُل ہی تو ہے جانِ حیات
جو کسی دل میں کھلے اور نگاہوں میں ملے

نامۂ زیست سے اپنے نہیں ملاؔ میں خجل
چند بے لوث سے سجدے بھی گناہوں میں ملے

○

معین احسن جذبی

اے غیرتِ غم! آنکھ مری نم تو نہیں ہے!!
کوئی دلِ خوں گشتہ کا محرم تو نہیں ہے!!

رِستے ہُوئے زخموں کا ہو کچھ اور مُداوا
یہ حرفِ تسلّی کوئی مرہم تو نہیں ہے

جلتا تو ہے دل آج بھی اے تیرگیٔ دہر
اِک شمع کی لَو آج بھی مدھم تو نہیں ہے

خاموش ہیں کیوں نالہ کشانِ شبِ ہجراں
یہ تیرہ شبی آج بھی کچھ کم تو نہیں ہے

اُس بزم میں سب کچھ ہے مگر اے دلِ پُرشوق!
تیری سی طلب، تیرا سا عالم تو نہیں ہے

کچھ وہ بھی ہیں چُپ چاپ سے کچھ میں بھی ہوں خاموش
در پردہ کوئی رنجشِ باہم تو نہیں ہے

○

فضل احمد کریم فضلی

میں اُنھیں حالِ دلِ زار بتانے سے رہا
آہ کرنے سے رہا، اشک بہانے سے رہا
کیا خبر کیا کسی مجبور پہ گزری ہوگی
ورنہ یونہی کوئی گھر بار لٹانے سے رہا
اُن پہ مرنے کا طریقہ تو میں پہلے سیکھوں
یوں تو جینے کا سلیقہ مجھے آنے سے رہا
تنِ تنہا مجھے وہ بار اُٹھانا ہی پڑا
جس کو سمجھا تھا اکیلے، ہیں اُٹھانے سے رہا
اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی مجھے خود کھینی ہے
اور کوئی تو اسے پار لگانے سے رہا
کیا بتاؤں کہ دُکھے دل پہ گزرتی کیا ہے
اب کسی اور کا دل، میں تو دُکھانے سے رہا
غمِ دل کا مجھے خود ہنس کے اُڑانا ہے مذاق
اور تو کوئی، یہاں آکے ہنسانے سے رہا
اُس نگاہِ غلط انداز سے بچنا کیا
اور گھائل ہوا، جو دُور نشانے سے رہا
آؤ دیکھیں نہ تماشا کہیں چُھپ کر فضلی
سامنے میرے غزل، وہ مری گانے سے رہا

○

فضل احمد کریم فضلی

زندگی کی سنگ باری سے نہ گھبرا جاؤں میں
زخم کھاتا جاؤں، پھر بھی مُسکراتا جاؤں میں

حالِ دل تے بوجھ بن کر پیس ڈالا ہے مجھے
کاش سُنتا جائے کوئی اور کہتا جاؤں میں

راہ ناہموار بھی موسم ہے ژالہ بار بھی
تابکے اے دوست گر گر کر سنبھلتا جاؤں میں

تیرا ملنا یا نہ ملنا ہے تجھی پر منحصر
کام میرا یہ، ترے رستے پہ چلتا جاؤں میں

زندگی نعمت سے اب کُفرانِ نعمت بن نہ جائے
ڈر رہا ہوں، اپنے جینے سے نہ اُکتا جاؤں میں

پہلے تو جانے نہ دیتی تھی مری غیرت مجھے
اور اب حالِ زبوں لے کر وہاں کیا جاؤں میں

شوق سے مجھ کو بگاڑے جائے یہ دُنیا مگر
کاش ایسا ہو کہ اتنا ہی سنورتا جاؤں میں

امرِ حق ہوں اور امرِ حق دبا سکتا ہے کون
جتنا دبتا جاؤں، اُتنا ہی اُبھرتا جاؤں میں

یہ زمانہ! اس نے تو مجھ کو بدل کر رکھ دیا
اس کے بدلے کچھ زمانے کو بدلتا جاؤں میں

دل کی یہ خواہش کہ دُنیا بھر کا ساماں چاہیے
موت کا یہ حکم ہے، دُنیا سے تنہا جاؤں میں

جوش میں اس طرح آجائے ترا ابرِ کرم
پہلے قطرہ تھا، مگر اب بن کے دریا جاؤں میں

میں تمہارا تھا، مگر دُنیا کا بن کر رہ گیا
جب یہاں سے جاؤں، پھر ہو کر تمہارا جاؤں میں

جو بھی کہنا تھا مجھے اُس سے بہت کم کہہ سکا
پوچھنے والوں سے اتنی بات کہتا جاؤں میں

اس قدر نازک ہے دل مرا کہ فضلی ڈر یہ ہے
زندگی کی سنگ باری سے نہ گھبرا جاؤں میں

○

سیّد عبدالحمید عدم

ہے عقل یوں ہراس و گماں سے بھری ہُوئی
جیسے ہرن کی آنکھ - اَزل سے ڈری ہُوئی

جلنے تری نگاہ نے سمجھا تھا کیا اِسے ؟
دل خوں کی ایک بُوند تھی - وہ بھی مَری ہُوئی

ہے زیست اِک بسیط خلا جس کے اُس طرف
پھُولوں کے تخت پر ہے صُراحی دَھری ہُوئی

سَو بار آ کے عہدِ بہاراں گزر گیا
لیکن نہ میری شاخِ تمنّا ہری ہُوئی

پہلے ہی سازِ زیست میں، کب جان تھی کوئی ؟
پھر کیا ہوا جو اُس کی چھنک ہے مَری ہُوئی

دل میں تو خُوں کا ایک بھی قطرہ نہ تھا عدمؔ
ہے نوکِ خار کس کے لُہو سے بھری ہُوئی

○

سیّد عبدالحمید عدم

مَستی ضرورتوں کی جوانی کا نام ہے
مَے خواہشوں کے کھولتے پانی کا نام ہے

کیا موت خُوں کے جمنے سے ہوتی ہے واقعہ؟
کیا زندگی لہُو کی روانی کا نام ہے

دل جل گیا ہے سُن کے مرا آپ کی یہ بات
کیا پیار بھی دروغ بیانی کا نام ہے

لگتا ہے حُکم کرنا۔ اسی عمُر میں دُرست
فرماں روائی۔ عہدِ جوانی کا نام ہے

ہے زندگی مری مجھے صرف اِس لیے عزیز
یہ اِک پَری ادا کی نشانی کا نام ہے

ہے جس سکونِ دل کی تجھے اے عدؔم طلب
وہ تو کسی حسین کہانی کا نام ہے!

○

شان الحق حقی

گزر گئی سر سے موجِ طوفاں مگر نہ پائی نگاہِ ساحل
سفینہ گم ہو گیا تو اُبھرا اُفق پہ خطِ سیاہِ ساحل

کرشمہ تھا موجِ بے اماں کا ملی جو ہم کو پناہِ ساحل
نہ ہم نے مانگی امانِ منزل نہ ہم نے پکڑی تھی راہِ ساحل

اسی نظارے سے خوش ہیں نظریں کہ لگ رہی ہے ہری بھری سی
نہ جانے کس وقت ڈوب جائے ہے کشتِ حسرت گیاہِ ساحل

کنارِ دریا دمک رہے ہیں مثلِ شعلہ لپک رہے ہیں
فقط تھے دریا کے چند قطرے جو بن گئے مہر و ماہِ ساحل

ہیں ایک چھوٹا سا سنگریزہ مگر مجھے مانتے ہیں گویا
یہ شورِ بے زینہارِ دریا، یہ وسعتِ بے پناہِ ساحل

تمام آشوبِ شب سمٹ کر جب اُس کی زُلفوں میں آ گیا تھا
مری نگاہوں میں ہے ابھی تک وہ منظرِ صبحگاہِ ساحل

اُدھر وہی لُطف بے ارادہ اِدھر وہی بازوئے کشادہ
ابھی ہے موجِ گریز پا سے اُسی طرح رسم و راہِ ساحل

مرے سفینے کو تو بالآخر تھا یونہی ٹکرا کے ٹوٹ جانا
نہ اس میں کوئی خطا تھی دریا نہ اس میں کوئی گناہِ ساحل

وہی بلاؤں کے قہقہے تھے وہی ہواؤں کے زمزمے تھے
غرض کہ ہنگامِ شورِ طوفاں سُنی کسی نے نہ آہِ ساحل

ہمیں گوارا ہمیں پذیرا، پسند اپنی نصیب اپنا
بدل میں گوہر کے سنگریزے، صلے میں دریا کے چاہِ ساحل

فقط اِک احساس کا زیاں ہے وگرنہ سوداگراں تہیں ہے
بغیرِ تکلیفِ ناخدائی ملے اگر عزّ و جاہِ ساحل

میانِ طوفاں بھٹک گیا تھا کہ زورِ طوفاں نہ سہ سکا تھا
وہ کندۂ نابکارِ کشتی وہ لاشۂ زردِ سیاہِ ساحل

ہلال کیسا مگر یہ آندھی کبھی تو آخر تھمے گی حقّی،
کسے خبر تھی کہ جا رہے ہیں بشوقِ طوفاں براہِ ساحل

علی سردار جعفری

وہی حسنِ یار میں ہے ، وہی لالہ زار میں ہے
وہ جو کیفیت نشے کی مے خوشگوار میں ہے

یہ چمن کی آرزو ہے کوئی لوٹ لے چمن کو
یہ تمام رنگ و نکہت ترے اختیار میں ہے

ترے ہاتھ کی بلندی میں فروغ کہکشاں ہے
یہ ہجوم ماہ و انجم ترے انتظار میں ہے

شبِ ہجر میں تمنا کے چراغ جل رہے ہیں
وہ ہے انتظار جس کا ابھی رہگزار میں ہے

ابھی زندگی حسیں ہے ابھی ذکرِ موت کیسا
ابھی پھول کھل رہے ہیں ابھی تو کنار میں ہے

ابھی میکدہ جواں ہے ابھی موج میں ہے ساقی
ابھی جام رقص میں ہے ابھی مے بہار میں ہے

ترے لب کی شوخ رنگی ، بنی بیعتیں کی ضامن
تری آبروئے وعدہ مرے اعتبار میں ہے

وہی میرا شعر و نغمہ وہی میری فکر و حکمت
جو سرور و دردمندی دلِ بے قرار میں ہے

O

علی سردار جعفری

بُوئے گل لائی ہے، گلشن کی ہوا سے خُوش ہیں
ہم اسیرانِ قفس بادِ صبا سے خُوش ہیں

کل کہ دیکھیں گے ترے حُسنِ جفا کا انداز
آج کے دن تو ترے عہدِ وفا سے خوش ہیں

حکم تھا اُن کی نگاہوں کا تقاضا دل کا
ہم خطا کر کے بہت اپنی خطا سے خوش ہیں

کاش صدیوں کی غلاظت کو بہا لے جائے
عصرِ نو ہم ترے طوفانِ بلا سے خوش ہیں

اپنی بے باک نگاہوں میں سمایا نہ کوئی
اور وہ ہیں کہ ہر اِک تازہ خدا سے خوش ہیں

ہم کو آتا نہیں خوش رنگ بغاوت کا جلال
ورنہ سردار کے اندازِ نوا سے خوش ہیں

○

علی سردار جعفری

جلا کے لحن کی قندیل نُور بار چلو
لٹاتے دولتِ گُل صورتِ بہار چلو

وصال و ہجر کی راہوں میں روشنی ہوگی
دلوں میں لے کے چراغ جمالِ یار چلو

کہاں ہو میرے رفیقانِ حرف و صوت و صدا
سکوتِ شب سیہ رنگ شعلہ بار چلو

اُمیّدِ حور میں جنت پہ ریجھنے والو
بُلا رہے ہیں حسینانِ روزگار چلو

عدو کی تیغ ستم سے مقابلہ ہے ابھی
بھلا کے ظلم عزیزانِ کم عیار چلو

سوادِ منزلِ جاناں قریب ہے شاید
مثالِ بادِ صبا ہو کے بے قرار چلو

○

اختر انصاری

بطونِ زیست سے کٹ کر اُٹھا جو فرد تو کیا!
ہوا خلاؤں کے میدان کا بھی مرد تو کیا!

یہ کائنات ہے خود گردِ کاروانِ ازل
جمی ہوئی ہے ترے آئنے پہ گرد تو کیا!

پیمبروں کا لہو پی گئی ہے یہ دُنیا
تجھے ملا دلِ بیمار و رُوئے زرد تو کیا!

ہزار ہا کرۂ چرخ خشک و سرد ہوا
متاعِ جاں ہے لبِ خشک و آہِ سرد تو کیا!

ٹپک رہا ہے زمانے کی کہنیوں سے لہو
سجے ہیں ماتھے پہ رمّان و لاجورد تو کیا!

زمانہ خود بھی حریفِ نبردِ عشق نہیں
نہ ہو سکا میں اگر درخورِ نبرد تو کیا!

خلا میں گُم ہیں ستاروں کے قافلے لاکھوں
بھٹک گیا کوئی مجھ سا بھی شب نورد تو کیا!

نبردِ زیست کی رودادِ خوں تو ہم نے لکھی
اگر ہُوا کوئی شائستۂ نبرد تو کیا!

عبث وہ درد جو محسورِ ذات ہو اخترؔ
نہاں ہے دل میں ترے اِک جہانِ درد تو کیا

وقت کی بانہوں میں

اختر انصاری

شرابِ تلخیٔ ایام ابھی کچھ اور پی لینا!
ابھی کچھ روز اور اپنے جگر کے چاک سی لینا!
زمانے کے حوادث سے خراجِ دوستی لینا!
ابھی کچھ اور جی لینا! ابھی کچھ اور جی لینا!

ابھی کچھ اور قہرِ زندگی کا حق ادا کرنا
مئے سوزِ دروں کی سرخوشی کا حق ادا کرنا
رفیقانِ اَلم کی ہمرہی کا حق ادا کرنا
ابھی کچھ اور جی لینا! ابھی کچھ اور جی لینا!

عذابوں کا ہوں خوگر، راحتیں کیا راس آئیں گی
قتیلِ زہرِ غم کو عشرتیں کیا راس آئیں گی
مجھے خوابِ عدم کی لذتیں کیا راس آئیں گی
ابھی کچھ اور جی لینا! ابھی کچھ اور جی لینا!

کہاں سر پھوڑنے اپنا غم و آلام جائیں گے؟
کسے مامن بنائیں گے، کہاں ڈیرا جمائیں گے؟
...ست ڈھونڈیں گے اس دمساز کو لیکن نہ پائیں گے!
ابھی کچھ اور جی لینا، ابھی کچھ اور جی لینا!

پکاریں گے کسے حسرت زدہ خوابوں کے ویرانے؟
کسے اپنائیں گے خیامؔ اور حافظؔ کے میخانے؟
لہو کس دل کو رلوائیں گے سوزِ دل کے افسانے؟
ابھی کچھ اور جی لینا! ابھی کچھ اور جی لینا!

ڈسے گا تیرہ شاموں کا سکوتِ بیکراں کس کو؟
بنائے گا غمیں بے داغ صبحوں کا سماں کس کو؟
سنائے گی صبا سرگوشیوں میں "داستاں" کس کو؟
ابھی کچھ اور جی لینا! ابھی کچھ اور جی لینا!

ستم کس دل زدہ پر ڈھائیں گے راتوں کے سناٹے؟
کہاں ہمراز مجھ سا پائیں گے راتوں کے سناٹے؟
کلیجہ تھام کر رہ جائیں گے راتوں کے سناٹے
ابھی کچھ اور جی لینا، ابھی کچھ اور جی لینا!

رہا ہوں عمر بھر رسیا تحیّر کی شرابوں کا
تخیل کے فریبوں کا، تصوّر کے سرابوں کا
ابھی باقی ہے حق مجھ پہ جہاں بھر کے خرابوں کا
ابھی کچھ اور جی لینا! ابھی کچھ اور جی لینا!

ابھی دل کے تڑپنے میں مجھے آرام ملتا ہے
جہاں آنسو ٹپکتا ہے وہیں اک پھول کھلتا ہے
شگوفوں کے چٹکنے پر کلیجہ اب بھی ہلتا ہے
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

جفا دیدہ تمنّاؤں کے زخم اب بھی مہکتے ہیں!
جگر کے داغ اب بھی صورتِ گلخن دہکتے ہیں!
دبی آہوں کے شعلے مثلِ برگِ گُل لہکتے ہیں!
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

جگر کا خون اب بھی ہمدمی کرتا ہے پینے میں
مہک بھیگی ہوئی راتوں کی ہے دن کے پسینے میں
کہیں سے آ کے نشتر اب بھی اُتر جاتا ہے سینے میں
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

چلا کرتی ہیں تنہائی میں اب بھی یاد کی چھُریاں
دلِ حرماں زدہ کی بے زباں فریاد کی چھُریاں
ابھی پُرکار ہیں چرخِ ستم ایجاد کی چھُریاں
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

وہی ہر درد کو اپنا بنانے کی ہے خو اب تک
وہی ہر زخم کو دل میں بسانے کی ہے خو اب تک
وہی چوٹوں کو سینے سے لگانے کی ہے خو اب تک
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

بہت ارزاں ہے درد و داغ و سوز و ساز کی دولت
اسیروں کے لیے زنجیرِ بے آواز کی دولت
مجھی کو کیوں ملے بال و پرِ پرواز کی دولت
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

ابھی انسان خود صیاد، خود صیدِ زبوں بھی ہے
اسی سے پرچمِ تقدیرِ آدم سرنگوں بھی ہے
اسی عقدے کے حل کا منتظر مرا جنوں بھی ہے
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

بھرا ہے ساغرِ منعم میں مفلس کا لہو اب بھی
جبینوں کا عرق ہے جوئبارِ رنگ و بو اب بھی
خراشِ غم کو ہے زخمی دلوں کی جستجو اب بھی
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

سرودِ ماتمی سے گونجتے ہیں دشت و کو اب بھی
کیا جاتا ہے وقتِ صبح اشکوں سے وضو اب بھی
مرے نالوں سے وابستہ ہے غم کی آبرو اب بھی
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

ابھی شبنم مری شب ہائے غم کا منہ دُھلاتی ہے
مری مایوسیوں کو آس ابھی جھولا جھلاتی ہے
کوئی موعود شے اب بھی اشاروں سے بلاتی ہے
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

ابھی سوز و نشاط و شور و مستی سے چھلکتا ہوں
دھڑکتے دل کے پہلو میں پڑا خود بھی دھڑکتا ہوں
نہ جانے کون ہے وہ راہ جس کی اب بھی تکتا ہوں
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

مرا غم اب بھی اکثر گنگنا اُٹھتا ہے لہرا کے
پیام آیا ہی کرتے ہیں کسی انجانی دُنیا کے
ابھی وا ہیں دریچے میری جانب صبحِ فردا کے
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

ابھی کچھ کام لینا ہے فغانِ صبحگاہی سے
ابھی باقی ہے استخلاص جُرمِ بے گناہی سے
ابھی عہدہ برآ ہونا ہے تقدیرِ الٰہی سے
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

کسی دن کیا عجب کانٹا مرے دل کا نکل جائے
یہ مَر مَر کے بجیے جانے کی آفت سر سے ٹل جائے
بسر جو موت کی ہے زندگانی سے بدل جائے
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

جنونِ مرگ کی بھی داد ابھی پائی نہیں میں نے
ابھی تک درخورِ دل چوٹ بھی کھائی نہیں میں نے
ابھی لذت چکاں کوئی غزل گائی نہیں میں نے
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

غرض اب تک جو سچ پوچھو تو کام اپنا نہیں نکلا
بقدرِ استطاعت حوصلہ دل کا نہیں نکلا
لبِ دنداں کی حد تک بھی نہیں نکلا، نہیں نکلا
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

ابھی میرے دنوں میں روزِ آدینہ نہیں آیا
مری جھولی میں اب تک میرا روزینہ نہیں آیا
مجھے جینا نہیں آیا، مجھے جینا نہیں آیا
ابھی کچھ اور جی لیتا! ابھی کچھ اور جی لیتا!

○

جگن ناتھ آزاد

کبھی گذشتہ ہو دن رات یاد آتے ہیں
عجیب طرح کے حالات یاد آتے ہیں

لباسِ رنگ و نوا جو پہن کے آئے تھے
وہ سب فسون و طلسمات یاد آتے ہیں

نگاہِ شوق نے کھائے تھے جو فریب اُن پر
خود اپنے دل کے جوابات یاد آتے ہیں

کلی کلی کی خموشی نے شورِ دریا نے
دیئے تھے جتنے پیامات یاد آتے ہیں

ہمیں بُھلا تو نہ دو گے کسی نے پوچھا تھا
کچھ اس طرح کے سوالات یاد آتے ہیں

یہاں پہ رات یہاں دوپہر گزاری تھی
سفر میں کتنے مقامات یاد آتے ہیں

زباں پہ سچ کے سوا کچھ نہ تھا جب اے آزادؔ!
وہ نیم پختہ خیالات یاد آتے ہیں

○

کیوں نہ اس طرح سے نام اپنا اُچھالا جائے
ہر بڑے کام میں کچھ نقص نکالا جائے

میں تو چاہوں گا کہ اک بار تو اس طرح سے پی
لڑکھڑائے تو نہ پھر مجھ سے سنبھالا جائے

سچ زباں پر ہو تو سنتے ہی نہیں غور سے لوگ
جھوٹ ہی آج تو الفاظ میں ڈھالا جائے

اُس کی تعریف کریں سامنے اُس کے جا کر
اب کچھ اس طرح سے کام اپنا نکالا جائے

○

جگن ناتھ آزاد

کس متاعِ شوق کی ہم جستجو کرتے رہے
زندگی بھر زندگی کی آرزو کرتے رہے

جب حریفوں کی زباں تھی شعلہ گفتاری میں غرق
ہم تغزل کی زباں میں گفتگو کرتے رہے

اور ہوں گے جن کو ہوگا چاک دامانی پہ ناز
ہم جنوں میں چاکِ داماں کو رفو کرتے رہے

اصل میں ہم تھے تمہارے ساتھ محوِ گفتگو
جب خود اپنے آپ سے ہم گفتگو کرتے رہے

اے خردمندو! جنوں سے جب کہ ناواقف ہو تم
سوچتا ہوں کس طرح تم ہائے و ہو کرتے رہے

اُن کو اب نفع و ضرر کی بات کیا سمجھائیں ہم
وہ جو سودائے متاعِ آبرو کرتے رہے

پینے والوں کا جب اوروں کے لہو پر تھا مدار
ہم شریکِ جام خود اپنا لہو کرتے رہے

کوئی یہ آزاد سے پوچھے کہ اپنے دل سے دُور
تم کہاں جا کر تلاشِ رنگ و بُو کرتے رہے

جگن ناتھ آزاد

یوں تو ملنے کو جہاں میں ہمیں کیا کیا نہ ملا
جس کی نظروں کو تمنّا تھی وہ جلوہ نہ ملا

ہم کو بھی حرص کے مارے ہوئے دیکھیں کہ ہمیں
دیدۂ شوق ملا ، دیدۂ بینا نہ ملا

غم تو یہ ہے کہ گنوا بیٹھے ہم اپنا ہی سراغ
یہ نہیں غم کہ ترا نقشِ کفِ پا نہ ملا

ورنہ کیوں راہِ تمنّا میں قدم رُک جاتے
سر ملا سانحہ جو ملنا تھا وہ سودا نہ ملا

ہم نے جب بزم میں رودادِ حقیقت چھیڑی
اس کے ہر موڑ پہ یاروں کو اک افسانہ ملا

وہ جو دیروز کی خاشاک سے وابستہ رہا
وقت کی رو میں اُسے گوہرِ فردا نہ ملا

ہم میں اور قیس میں کچھ فرق نہ تھا، ہم کو مگر
یہ الگ بات کہ گلیاں ملیں صحرا نہ ملا

کیا کہوں میں کہ جہاں پھُول بھی تھے کانٹے بھی
کیا ملا اُس چمنستاں میں ہمیں کیا نہ ملا

میکدوں ہی میں اب آزادؔ کو ڈھونڈو یارو!
مسجدوں میں تو وہ اللہ کا بندہ نہ ملا

جگن ناتھ آزاد

عشق کی عمر کٹ گئی چند توہّمات میں
سحر تھا یا کوئی نھا راز حُسن کی بات بات میں

خامیِ فکر ہے ابھی اُن کے تصوّرات میں
وہ جو اُلجھ کے رہ گئے فرقِ صفات و ذات میں

شوق اگر ہے باحضور ایک ہی شمع کا ہے نُور
ایک ہی مے کا ہے سرور محفلِ شش جہات میں

اے کہ ہے ایک دن تری منزلِ آخری فنا
رنگِ ثبات بھر کے جا خاکۂ بے ثبات میں

میری مئے حیات میں کون سرور بن گیا
کون یہ نُور بن گیا میرے تخیّلات میں

یہ مری بات بات میں کس کے سخن کا سوز ہے
فکر ہے کس کی ضو فگن میرے تصوّرات میں

اپنی تلاش میں نکل اپنے ہی دل میں ڈُوب جا
کس کی ہے تجھ کو جستجو کعبہ و سومنات میں

لب پہ جب آگیا تو میں شعرِ لطیف بن گیا
درد کی طرح میں رہا سینۂ کائنات میں

جگن ناتھ آزاد

○

تو فرق کہتا ہے جس کو وہ گھر کی بات ہے
دیکھنے والے کے اندازِ نظر کی بات ہے

کس لیے حیراں ہے، اے دل! دیکھ کر پتھّر کا بُت
یہ نہیں بُت کی یہ دستِ باہنر کی بات ہے

میں نے ہر ذرّے میں دیکھی ہے ستاروں کی چمک
جس سے تم گزرے ہو یہ اُس رہگزر کی بات ہے

کیا کہا یہ ذکر میرے قلبِ مضطر کا نہیں
پھر یقیناً یہ کسی رقصِ شرر کی بات ہے

دلربائی منزلِ مقصود کی دیکھی تھی کب
یہ سفر اے بوالہوس عزمِ سفر کی بات ہے

کاش تجھ پہ راز یہ افشا ہو اے نقّادِ فن!
فن نہیں فکر و نظر کی فن خبر کی بات ہے

تجھ کو اے آزاد! آنکھیں ہیں میسّر، تو بتا
آج جو عالم ہے شب ہے یا سحر کی بات ہے

○

یہ عجب راز کا عالم ہے کہ تُو
پاس ہو کر بھی بہت دُور لگے

لوگ کہتے ہیں عیاں ہے ترا حُسن
تُو مجھے پردوں میں مستور لگے

دُور ہوں میں تو بہت پاس ہے تُو
پاس آؤں تو بہت دُور لگے

ہر بیاباں کا ہو سنّاٹا
مجھ کو اِک شور سے معمور لگے

اُرِنی، آج ہے ہر سانس مرا
تو مجھے اک شجرِ طور لگے

○

جگن ناتھ آزاد

سینوں میں ہے اب اُترنے والی
مچلی ہوئی وہ اُفق پہ لالی
دیکھ اُن کے خیال کی بلندی
کیا ہے جو ہے طبع لااُبالی
اے فکر پہ جان دینے والے
جذبے سے تری غزل ہے خالی
انساں کے خمیر میں نہاں ہے
ہر شان جلالی و جمالی
دُنیا تو جمال تھی سراپا
ہم ہی نے اُدھر نظر نہ ڈالی
دل ہے کہ بُھلا چکا ہے تجھ کو
آنکھیں ہیں کہ نیند سے ہیں خالی
دیکھا تو وہ تجھ سے مل رہی تھی
تصویر بنی تھی جو خیالی !
اقبال سے کہہ رہا ہے آزاد
دروازے پہ ہے کوئی سوالی

○

جگن ناتھ آزاد

پھر بھی کم تھا گرچہ تیری ذات سے پایا بہت
تو ہوا رخصت تو دل کو یہ خیال آیا بہت

سیم و زر کیا شے ہے یہ لعل و گہر کیا چیز ہیں
آنکھ بینا ہو تو علم و فن کا سرمایا بہت

کیا خبر کیا بات اُس کے کُفر میں پوشیدہ تھی
ایک کافر کیوں حرم والوں کو یاد آیا بہت

گھر سے اک ویرانیِ دل لے کے نکلا تھا مگر
کارواں یادوں کے ہیں دل میں بسا لایا بہت

بُت کدوں کا نُور ہی میرے لیے کافی نہ تھا
مسجدوں سے بھی تجلّی میں چُرا لایا بہت

اُس جگہ کھونے کا پانے کا عجب مفہوم ہے
ہم نے آ کر جس جگہ کھویا بہت پایا بہت

ابتدا یہ تھی کہ میں تھا اور دعوائے علم کا
انتہا یہ تھی کہ اس دعوے پہ شرمایا بہت

مُضطرب تُو بھی رہا مجھ سے جُدا ہو کر اگر
مجھ کو بھی اے دل تری یادوں نے تڑپایا بہت

ہائے وہ ہر لمحہ تجھ کو دیکھنے کی آرزو
دل مگر اس آرزو پر آج پچھتایا بہت

یوں تو اے آزادؔ تیرے شعر کے سو رنگ ہیں
مجھ کو لیکن یہ ترا لہجہ پسند آیا بہت

شعر و شاعر

(ایک سلسلۂ رباعیات)

محمد ہادی حسین

(۱)

گوشے کو نقاب کے ذرا تھام ابھی   بہتر ہے نہ ہو جلوہ ترا عام ابھی
آئینہ ابھی پیشِ نظر رہنے دے   باقی ہے عروسِ فن بہت کام ابھی

(۲)

ممکن ہو تو نالے کو ذرا تھام ابھی   لے ضبط سے اور بھی ذرا کام ابھی
کھلنے دے دہانِ زخم کو آپ ہی آپ   شاعر، ہے ترا داغِ جگر خام ابھی

(۳)

ہے لطف تو جب کہ بن کے اک پختہ ثمر   کاغذ پہ ٹپک پڑے ترا داغِ جگر
پکنے دے اسے اور، یہ نورس ہے ابھی   شاعر، اسے سینچ خوں کے چھینٹے دے کر

(۴)

یہ روشنیٔ طبع بلا ہے، اے دل   کیا کیجے، عطیۂ خدا ہے، اے دل
لیکن اسے پختہ کر کہ تیرا یہ جنوں   آشفتگیٔ جنوں نما ہے، اے دل

(۵)

ہے زخم وہاں بستہ ترا داغِ جگر　　　از بس کہ جراحت کا ہے وہ دست نگر
اس خامۂ کند سے بھلا کیا ہوگا؟　　　شاعر، تجھے درکار ہیں آلاتِ دگر

(۶)

تیاریٔ فن میں ہو چلی عمر بسر　　　اے مُو قلمِ سُست قدم، جلدی کر
خاکے نہ کہیں تیرے اُدھورے رہ جائیں　　　ایسا نہ ہو سُوکھ جائے خونابِ جگر

(۷)

پھر داغِ جگر مرا تپک اُٹھا ہے　　　خوں میری رگوں میں پھر بھڑک اُٹھا ہے
پھر فکرِ سخن کا شعلۂ جوّالہ　　　سر میں مرے یک بیک دہک اُٹھا ہے

(۸)

دُھندلا گئے ماحول کے پھر نقش و نگار　　　جیسے کوئی منظر ہو اُفق کے اُس پار
پھر فکرِ سخن نے اِک سُنہری سی گھٹا　　　یوں تان دی جیسے اِک قناتِ زرتار

(۹)

سیراب ترے خوں سے ترا داغِ جگر　　　کھینچتا ہے رگِ جاں سے یہ تیرا جوہر
رہ جائے پگھل کر نہ بدن کیوں تیرا؟　　　شاعر، ہے مثالِ شمع تو شعلہ بسر

(۱۰)

ہرگز نہیں اس کے خشک ہوتے ہوتے   بنتا ہے ندی یہ چشمہ ہوتے ہوتے
شاعر، ترے ناسورِ جگر کا رِسنا   گریہ نہیں تھم جائے جو روتے روتے

(۱۱)

جی بھر کے سرشکِ خونِ دل رو، شاعر   منّت کشِ تسکیں نہ کبھی ہو، شاعر
یہ اشک ہیں تخمِ جنسِ کمیابِ وفا   کشتِ دلِ انساں میں انھیں بو، شاعر

(۱۲)

ہے نوعِ بشر موردِ آلام ابھی   لیکن نہیں جنسِ دردِ دل عام ابھی
ہمدردیٔ نوع کے پیمبر، شاعر   باقی ہے ترے لیے بہت کام ابھی

(۱۳)

انسان کی زیست غم کا افسانہ ہے   تیرے حصّے میں اس کا دُہرانا ہے
جگ بیتی ہے تیری آپ بیتی، شاعر   تیری قسمت میں سب کا غم کھانا ہے

(۱۴)

ہر شخص کے دل میں چھُپ کے رہنے والا   ہر شخص کے دل کی بات کہنے والا
ہر شخص کے سُکھ کا تُو ہے ساجھی، شاعر   ہر شخص کے دُکھ کا تُو ہے سہنے والا

(۱۵)

انسان ہیں تمام بھائی بھائی، شاعر — کر دُور دِلوں سے یہ جُدائی، شاعر
آکاش سے تو جس کا سندیسہ لایا — اُس پیت کی ریت کی دُہائی، شاعر

(۱۶)

شاعر، ہیں ترے خُونِ جگر سے رنگیں — تہذیب کے گلزار کے گُلہائے حسیں
کرتی ہے کہانی دلِ بُلبل کی بیاں — نوکِ ہر خار کی زبانِ خُونیں

(۱۷)

دلشاد کُنِ جہاں تری شادیٔ دل — اِک جشن ہے، شاعر، تری آبادیٔ دل
سب کے لیے خارزارِ ہستی سے مفر — اِک وادیٔ گُل بکف تری وادیٔ دل

(۱۸)

تاریخ کے پیش پیش رہنے والے — اور اس حق کے لیے سزائیں سہنے والے
اک خالقِ اعصار ہے تو، اے شاعر — کہتے ہیں پیمبر تجھے کہنے والے

(۱۹)

شاعر، ہمہ گیر ہے تیرا ہر اندوہ — ہر حادثہ تیرا جشنِ مرگِ انبوہ
اِک موج کہ ہے بحر میں شیون جس سے — یا اِک پرِ کاہ جو ہلا دے دلِ کوہ

(۲۰)

جس بات سے پڑتے ہوں زباں پر چھالے
جس بات سے پڑجاتے ہوں جان کے لالے
جب دل کا تقاضا ہو تو، شاعر، وہ بات
کہہ جاتے ہیں سر پہ کھیل جانے والے

(۲۱)

ہے بزمِ جہاں کی شمع تیرا رُخِ زرد
اور آبروئے بشر ترے چہرے کی گرد
تو سینۂ دُنیا میں ہے دل، اے شاعر
ساری دُنیا کا تیرے حصّے میں ہے درد

(۲۲)

جو کچھ بھی ہے، شاعر، سرِ محفل رکھ دے
اپنی سب زندگی کا حاصل رکھ دے
کہتے ہیں یہ لوگ کچھ نہیں تیرے پاس
کاغذ پہ نکال کر ذرا دل رکھ دے

(۲۳)

جس شعر میں ہر دل کے لیے ہو پیغام
ہو جاتا ہے وہ زبان زدِ خاص و عام
کھُب جاتا ہے ہر کسی کے دل میں جا کر
پاتا ہے اسی لیے وہ نشتر کا نام

(۲۴)

جس میں نہ ہو کوئی ماورائی پیغام
وہ شعر نہیں گرچہ ہو منظوم کلام
جس نظم کے قالب میں ہو نشتر کی رُوح
کیا جانے اُسے دیتے ہیں کیوں شعر کا نام

(۲۵)

دُنیا میں فسانہائے ناگفتہ بھی ہیں جذبات دلِ بشر میں کچھ خفتہ بھی ہیں
شاعر، ابھی باقی ہیں اچھوتے موضوع ہاں بحرِ سخن میں دُرِ ناسُفتہ بھی ہیں

(۲۶)

شاعر، ترے خواب و آرزو کی تعبیر مُمکن ہی نہیں کہ ہو سکے شکل پذیر
عنقا کا تصوّر تو ہے موجود، مگر دیکھی ہے کبھی کسی نے اُس کی تصویر؟

(۲۷)

فرصت کی گھڑی ہو، کُنجِ تنہائی ہو دل پہ کوئی خاص کیفیت چھائی ہو
ہو جاتے ہیں شعر خود بخود موزوں جب ان چیزوں کی دستیاب یکجائی ہو

(۲۸)

کی تُو نے حرام نیند، اے فکرِ سخن! جاری رہے شب بھر ترے ناکام جتن
حاصل مرے رتجگے کا ہے لے دے کر یہ میرے دماغ کی دھڑکتی سی تھکن

(۲۹)

آکاش کے ساگر کی یہ پہنائیاں دیکھ اور اُس پہ یہ بدلیوں کی پرچھائیاں دیکھ
کرتا ہے یُونہی تیرا تخیّل، شاعر! بحرِ معنی کی سطح پیمائیاں، دیکھ

(۳۰)

کیا چیز ہے، کیا چیز، بیاں کی لذّت! پردہ دریٔ پردگیاں کی لذّت!
لیتا ہے زباں کی وہ زباں کے بوسے پوچھے کوئی شاعر سے زباں کی لذّت

(۳۱)

شاعر کی زباں ہے استعاروں کی زباں رمزوں کی، کنایوں کی، اشاروں کی زباں
رہتا ہے زمیں پہ بولتا ہے لیکن سُورج کی، چاند کی، ستاروں کی زباں

(۳۲)

دعوٰے ہے خدائی کا تری تابِ سُخن اک شہرکِ مجسّم تری خلّاقیٔ فن
ہر مُلک کا منصور ہے تو، اے شاعر! ہر دَور میں ہیں تیرے لیے دار و رسن

(۳۳)

جذبات کی منطق سے ہے یکسر غافل اُف! دل کے دلائل کا نہیں یہ قائل
یہ عالمِ اسباب ہے محض ایک دماغ شاعر! اسے کرنا ہے ادب خوردۂ دِل

(۳۴)

روشن تری پلکوں پہ ستاروں کے چراغ خورشید و قمر ترے جگر کے دو داغ
آئینۂ شش جہت ترا دل، شاعر! یہ گُنبدِ گردوں ترا فانوسِ دماغ

(۳۵)

کہتے ہیں کہ شاعری تو ہے آفاقی	اُس کو ہونا نہ چاہیے اخلاقی
آفاق میں کیا نہیں نظامِ اخلاق؟	آئی نہ مری سمجھ میں یہ دقت ائی

(۳۶)

یہ داغِ جگر کا نُور پارہ، شاعر!	یعنی ترا اشکِ مژہ آرا، شاعر!
اللہ اسے سدا درخشاں رکھے	یہ قسمتِ انساں کا جو تارا، شاعر!

(۳۷)

چھائی ہے ترے دماغ پر جو مستی	بن جاتی ہے اوج اُس کے دم سے پستی
رہتا ہے تو عرش کے قریب اے شاعر!	یکسر شبِ معراج ہے تیری ہستی

(۳۸)

اپنے کو سنوارتی ہے فطرت کی دُلہن	گھونگھٹ کی اوٹ میں چھُپ کر درپن
درپن کی اوٹ میں چھُپا بیٹھا ہے	شاعر کا تاک جھانک کرتا ہوا من

(۳۹)

گاہے وہ اک بلند سرگوشی ہے	گاہے وہ اک بلیغ خاموشی ہے
شاعر کا عیاں بھی ہے نہاں بھی ہے بیاں	گاہے وہ بیاں گاہے بیاں پوشی ہے

(۴۰)

تو اور کی گوں نہ آپ جو گا، شاعر! کیا کام کسی کا تجھ سے ہو گا، شاعر؟
دُنیا کو بدلنے کی تو کچھ فکر نہ کر دُنیا کو بتا جو تُو نے بھوگا، شاعر!

(۴۱)

اِک زاویۂ نظر سے تقلیدِ حیات اِک زاویۂ نظر سے تجدیدِ حیات
ہے شاعری کی یہ سب سے جامع تعریف تخلیق کے سلسلے میں تنقیدِ حیات

(۴۲)

شاعر! یہ ستائش کی تمنا کیسی؟ کارِ دل کے صلے کی پروا کیسی؟
اقلیمِ خیال کے شہنشاہِ غنی اُجرت کی یہ ذلّتِ تقاضا کیسی؟

(۴۳)

دُنیا میں پنپنے کی تمنا کیسی؟ اُس کے لیے سعیٔ جا و بے جا کیسی؟
دشمن ہے وہ جب نشاطِ کارِ دل کی شاعر! یہ نشاطِ کارِ دُنیا کیسی؟

(۴۴)

اُف! بزمِ سخن میں کیوں ہوا شامل میں زنہار نہیں ہوں زینتِ محفل میں
سب دادِ سخن لیتے رہے دیتے رہے بیٹھا رہا تھام کر بیاضِ دل میں

(۴۵)

اے دہر! مجھے مشقِ سخن کرنے دے — فن طُولِ امل ہے، کسبِ فن کرنے دے
فطرت نے بنایا ہے مجھے فن کے لیے — یہ وہم سہی، خوش مجھے من کرنے دے

(۴۶)

اے دہر، مجھے مشقِ سخن کرنے دے — یہ زیست ہے میری اس کا دم بھرنے دے
ہے میری بقا فن میں فنا ہو جانا — مرکر مجھے جینا ہے، مجھے مرنے دے

(۴۷)

ہر شعبۂ زندگی میں ناکام رہا — ہر دوڑ میں بے بہرۂ انعام رہا
حالات کی یہ ستم ظریفی دیکھو — دُنیائے سخن میں بھی میں گمنام رہا

(۴۸)

میرے سینے میں دل دھڑکتا ہے ابھی — مُرغِ بسمل پڑا پھڑکتا ہے ابھی
آنے کو بہارِ آخری ہے، لیکن — سُوکھا پتّا سا اک کھڑکتا ہے ابھی

(۴۹)

شاداب ہے میری شاعری کا گلزار — ہو جاتے ہیں گل ہے گاہے اب بھی اشعار
شاعر کے سدا بہار دل کو یکساں — پیری کی خزاں ہو کہ جوانی کی بہار

(۵۰)

نغمے ترے سب خموش ہو جائیں گے صحرا کی صدا ہیں، اُس میں کھو جائیں گے
وہ خواب جو تُو نے جاگتے میں دیکھے شاعر، ترے ساتھ وہ بھی سو جائیں گے

(۵۱)

اِک دشمنِ جاں کے عشق کا دم بھرنا اور اپنی بقا کی آرزوئیں کرنا
ہے تیری بقا فن میں فنا ہونے میں شاعر، ہے عجیب تیرا جینا مرنا

(۵۲)

شاعر، تری نالہ سنجئ نیم شبی تاروں بھرے آسماں کی ہے بے اَدبی
سمجھا ہے کہ بے سبب ہے تاروں کا سکوت اس عالمِ اسباب میں اور بے سببی

(۵۳)

احساس کے شانے کو جھنجھوڑ اے شاعر سوتا کسی جذبے کو نہ چھوڑ اے شاعر
انسان سے بے رُخی جہاں بھی دیکھے مُنہ آنے سے اُس کے مُنہ نہ موڑ اے شاعر

(۵۴)

یہ کون ہیں؟ شاعرانِ سرکاری ہیں ٹی۔وی اور ریڈیو کے درباری ہیں
سیتے ہیں جو روز اپنا کفن کاغذ سے وہ کون ہیں؟ شاعرانِ اخباری ہیں

(۵۵)

شاعر، نرا من ہے ایک نٹ کھٹ بالک لاڈوں کا بگاڑا ہُوا اِک بے پالک
جی بھر کے تو اس کے چونچلے مانا کر جی بھر کے مَلے گا تیرے مُنہ پر کالک

(۵۶)

یہ شاعری، الفاظ کی یہ شیشہ گری ہے پردگیانِ راز کی پردہ دری
ہر جامہ اُتار کر اُتر آتی ہے الفاظ کے شیشے میں معنی کی پری

(۵۷)

جب زندگی خود سے اجنبی ہو جائے یعنی فقط اِک بے سببی ہو جائے
لازم ہے کہ زندگی کی دیکھا دیکھی فن بھی فقط اِک بوالعجبی ہو جائے

ابنِ انشا

عبدالعزیز خالد

اے رہرو منازلِ دشتِ عجائبات
پسماندگاں کو دے کے شبِ غم کے رتجگے
اہلِ سخن کے سامنے تم نے کیا دراز
مقصود امتحانِ وفا تھا وگرنہ تم
کیا دان میں وہ دیتے کہ خالی تھے ان کے ہاتھ
انساں کی حدِّ وسع کا اس پر کرو قیاس
اب نامہ و پیام کو ترسیں گے عمر بھر

آزادِ تنگنائے سرا پردۂ حیات!
جا سوئے خوابگاہِ عدم میں رسان سے
دامانِ عمر بخششِ انفاس کے لیے
تھے بے نیاز کاہشِ نابود و بود سے
کرتے وہ کیا نثار کہ بے اختیار تھے
اپنی رضا نہ آئے نہ اپنی رضا چلے
کس مرحلے پہ ٹوٹے محبت کے سلسلے!

دی جان ملکِ غیر میں تم نے وطن سے دُور
رہ رہ کے یاد آئے وہ حسرت بھری نظر
دیکھا خفیف سا بھی نہ تم میں ہراسِ مرگ
ہیمنت ہو بسنت ہو تم تھے سدا بہار
میرو نظیر و برنس و تو کے قصیدہ گو
گرمِ سفر تعاقبِ ابنِ بطوطہ میں
جاکی دادہ ہوائے سیر کوچہ بتاں
تھی نثر میں شگفتہ تبسم کی کیفیت
جیسے وفورِ جذب میں مطرب اُڑائے تان
جیسے صدا فقیر کی، جوگی کی جیسے چُپ

واماندۂ شتابیٔ شبدیزِ زندگی
یہ پاک سرزمیں تمھیں کتنی عزیز تھی
تھی دل لگی وہی سکراتِ اجل میں بھی
آئی نہ گند مینہ جبیں پر شکن کبھی
جو بات تھی تمھاری وہ تھی الف لیلوی
آرام سے نہ بیٹھنے دے دل کی بے کلی
چرچے تمھارے ذوقِ سخن کے گلی گلی
شعروں میں ایک سوختگی و برشتگی
جیسے بچھڑ کے کُونج کوئی کوکتی ہُوئی
لہجے کے زیر و بم میں تھی وہ دل گرفتگی

پروانگی کی آن پہ آنے دیا نہ حرف
سنّاٹے کا پڑاؤ ہے دشتِ وصال ہیں

تقلیدِ میر سوختہ میں نام کر گئے
آوارگانِ بادیۂ ہجر کیا ہوئے؟

گم گشتہ کارواں کا کہاں سے ملے سراغ — ریگِ رواں نے نقشِ قدم تک مٹا دیے

شرمندہ تشنگاں سے نہ ہو موجۂ سراب — یغمائی زمانہ کا کس سے کریں گلہ ؟
اہلِ نظر پہ تہمتِ آسودگی ہے ظلم — کرتے ہیں اشکِ خوں سے حنابندئ مژہ
ناگفتہ حرفِ راز — فشارِ رگِ گلو — رُسوائے دہر اس سے بیاں میں جو آگیا

لے کس سے قیسِ عامری آشفتگی کی داد — صحرا تو ہے پہ محملِ لیلیٰ نہیں رہا
تیمار دارِ دل نہ ہوا حُسنِ شوخ و شنگ — اب اعتبارِ عرضِ تمنا نہیں رہا
باطل ہوا فسونِ شفاخانۂ فرنگ — قومِ مسیح میں دمِ عیسیٰ نہیں رہا
جس کی چمک میں رنگ فروغِ سحر کا تھا — اوجِ سپہرِ فن کا وہ تارا نہیں رہا
ہر سمت جس کو چاند نگر کی تھی جستجو — وہ نغمہ و نشاط کا جویا نہیں رہا
تا عمر ایلڈ ورڈ و کی جس کو رہی تلاش — وہ خواب و انقلاب کا شیدا نہیں رہا
میراں سے کسبِ فن کا جسے اعتراف تھا — تھا جو بھگت کبیر کا چیلا نہیں رہا
تھی جس کی زیست "ڈائری آوارہ گرد کی" — وہ دُردِ تہ پیالہ کا رسیا نہیں رہا
باتوں میں جس کی چاشنی ہزل و مزاح کی — وہ ہمدمِ عزیز وہ انشا نہیں رہا

ہر بات اس ہنسوڑ کی ہوتی ضلع جگت — وہ رکھ رکھاؤ لہجے کا، جملوں کی وہ بنت
اب آئے گا کہاں سے کوئی اس سا دوسرا — فطرت ہے اس معاملے میں تنگدل بہت
کس سے کہوں صعوبتِ اندوہِ بے حساب — اے داغ داغ پرتوِ نمناکِ ماہتاب!
لپٹوں گلے میں کس سے کروں کس سے تعزیت — اس پل کہاں کسی کو کسی بات کی سُرت
مجھ بینوا فقیر کی بس یہ ہے مقدرت — اس کے لیے ہوں طالبِ رضوان و مغفرت
ہر موئے تن زبان ہے ہر سانس ہے دُعا — تھا قدرتِ بیاں کا جو دعویٰ نہیں رہا
یارو مجھے معاف رکھو جوشِ اشک سے — اب مجھ میں ضبطِ گریہ کا یارا نہیں رہا

———

آخری پُوجا

ظہور نظر

پھر اُس نے ایک سوال کیا
پھر میں نے ایک جواب دیا
پھر اُس نے ایک شکایت کی
پھر ایک گلہ میں کر بیٹھا
پھر بات بڑھی
اور اُس نے مجھے ——— ،
سب مَردوں سا ، مکّار فریبی مَرد کہا
اور میں نے اُسے ——— ،
کم ظرف کہا ، بے مہر کہا ، بے درد کہا
پھر لفظوں میں بِس گھُلنے لگا
پھر آنکھوں سے شعلے برسے
پھر تُند ہوائیں چلنے لگیں
اور آن کی آن میں برسوں کے سنجوگ کی فصلیں جلنے لگیں
پھر ہر طعنہ تب پر آیا
پھر ہر شکوہ لب پر آیا

پھر سارے ستم گنوائے گئے
پھر سب احسان جتائے گئے
پھر ڈول کنوئیں میں ڈالا گیا
اور اِک اِک عیب نکالا گیا

جب سارے عیب نکال لیے
جب سارے کنوئیں کھنگال لیے
جب تُند ہوا ئیں گُند ہوئیں
اور دونوں کے کھلیانوں میں ــــ ، بھوبھل کے سوا
جلنے بجھنے، کہنے سُننے کو کچھ نہ بچا
پھر اُس مالا پر بحث ہُوئی
جو ہم دونوں کے ہاتھ میں تھی
جسے ہر موسم ــــــ ،
جسے ہر لمحہ ــــــ ،
ہم دونوں مِل کر چُنتے تھے
کبھی مَن پھوہار میں بھیگتے تھے
کبھی برہا آگ میں تپتے تھے
دُکھ ہو یا سُکھ ہو ــــ ، آشائیں
ہر سمے سندیسے دیتی تھیں
جو موتی بَن جب چُکتا تھا
اُس کی پوریں لے لیتی تھیں

یوں اِک اِک کر کے مالا کے
سب موتی آگے بڑھتے تھے
کبھی دھڑکن کے، کبھی سانسوں کے دریا رُک رُک کر چڑھتے تھے
وہ بولی ——،
چھوڑو یہ مالا !
یہ نرمل مالا میری ہے !!
میں بولا ——،
لیکن مالا کے یہ موتی تو مَیں لایا تھا !!
وہ بولی ——،
مانتی ہوں، لیکن ——،
اِن موتیوں میں، اِن جھوٹے پیار کے موتیوں میں
یہ دھاگا میں نے ڈالا تھا — !!!
اور پھر اُس نے اِک جھٹکے سے وہ کچّا دھاگا کھینچ لیا
سو اب کچھ اُس کی پوروں میں، کچھ میرے ہاتھ میں اُلجھا ہے
اور نرمل مالا کے موتی
دونوں کی جل تھل آنکھوں میں ——،
دونوں کے دلوں میں بکھرے ہیں
میں کہتا ہوں ——، یہ سچے ہیں !
وہ کہتی ہے ——، یہ جھوٹے تھے !!

○

ظہور نظر

نہ سو سکا ہوں نہ شب جاگ کر گزاری ہے
عجیب دن ہیں، سکوں ہے نہ بیقراری ہے

نہ آئے موسمِ گُل، موسمِ خزاں آئے
فضا پہ کچھ بھی نہ آنے کا خوف طاری ہے

شفق نہیں ہے یہ خُونِ سحر کے دھبّے ہیں
سپاہِ نُور اندھیرے سے جنگ ہاری ہے

سیاہ چہرۂ خورشید کرنے والے ہیں
نمودِ صبح پہ جن کی اجارہ داری ہے

(ق)

صدائیں مہر بہ لب ہیں ہوائیں حبس بہ پا
یہ کیسا ظُلم ہے، کیسی ستیزہ کاری ہے؟

یہ کس نے دار پہ کھینچا ہے رہگزاروں کو
یہ کس نے شہر کے دل میں چُھری اُتاری ہے

لبوں پہ بھی وہ چراغاں کریں تو بات بنے
دِلوں میں جن کے بپا جشنِ آہ و زاری ہے

یہ جان کر بھی کہ گزُرے گا قاتلوں کا جلوس
جُھکے کھڑے ہیں جنھیں پاسِ وضعداری ہے

ہیں وہ بھی موجۂ دہشت کی زد پہ، اُن کی بھی
وہی ہے صورتِ حالات، جو ہماری ہے

فرار کی ہے یہ صورت کہ آؤ سو جائیں
یہ رات جاگنے والوں پہ سخت بھاری ہے

ہجومِ غم تو بڑھے گا بہ طرفِ جاں جب تک
دل و جگر میں لہو کی سبیل جاری ہے

اُسی کی آنکھ نہیں چُپ ہوئی، کئی دن سے
مری نگاہ بھی عرضِ سخن سے عاری ہے

ہے سنگِ ترکِ تمنّا بھی مثلِ سنگِ وفا
اسے بھی چُوم کے اُٹھ جا کہ یہ بھی بھاری ہے

نصابِ عشق میں شامل سہی کتابِ وفا
مگر جناب یہ مضمون اختیاری ہے

ہے دل کو خوف کسی شب اسے بھی چھین نہ لو
کہ لُطفِ ہجر کی جاگیر بھی تمھاری ہے

کہو تو اور بھی کچھ دیر روک لیں اس کو
شبِ فراق سے اپنی پُرانی یاری ہے

غزل نظرؔ کی چھپی جب تو لوگ چیخ اُٹھے
کہ یہ غزل تو نہیں مرثیہ نگاری ہے

○

ظہور نظر

شکارِ گردشِ لیل و نہار وہ بھی تھے
سکوں ہمیں بھی نہ تھا بے قرار وہ بھی تھے

یہ اور بات کہ پہلے گیا ہمدم اپنا
وگرنہ ہجر میں لاچار و خوار وہ بھی تھے

ہماری بات نہ کر، ہم تو عاشقِ غم ہیں
جو دن بُرے تھے ہمیں سازگار وہ بھی تھے

(ق)

سزا قبول، مگر اتنا سوچ لو کہ یہاں
جو تم سے پہلے تھے بااختیار وہ بھی تھے

سوادِ شہر سے بھی خاک اُڑ گئی جن کی
کبھی تمھاری طرح شہریار وہ بھی تھے

———

وہ جن کے ہم تھے خطاوار، فردِ جرم کے بعد
لگی قطار تو ہم میں شمار وہ بھی تھے

تھے کل جو مسندِ قاتل پہ جلوہ فرما، آج
ہمارے ساتھ سرِ تختۂ دار وہ بھی تھے

وہی نہیں کہ جو آنسو چھلک کے بہہ نکلے
کیے جو ضبط، اُنھیں ناگوار وہ بھی تھے

ہمیں نہیں تھے مآلِ وفا پہ شرمندہ
ملی نظر تو کھلا، شرمسار وہ بھی تھے

آؤ دیکھیں تو سہی

فارغ بخاری

آؤ، دیکھیں تو سہی
حجلۂ گل کی پُراسرار فضا کیسی ہے
کس طرح موجِ صبا کلیوں کو سہلاتی ہے
کیسے شبنم صدفِ غنچہ میں در آتی ہے
برگِ صد رنگ کو آئینہ بنا جاتی ہے
کونپلوں میں زرِ گل کیسے جنم لیتا ہے
کیسے ہر پھول میں خوشبوؤں کا در کھلتا ہے
کس طرح سبز قباؤں سے شجر سجتے ہیں

آؤ دیکھیں تو سہی
رُت بدلتے ہی بدل جاتا ہے نقشہ کیسے
نہ وہ ہریالی ہے
نکہت ہے نہ وہ لالی ہے
مر گئے رنگ
مہک اُڑ گئی
ننگے اشجار بنے موسمِ گُل کا نوحہ

آؤ دیکھیں تو سہی
زرد پتّوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں سے پٹے گلشن کو
چھوڑ کر قافلے فصلِ گل کے
جانے کس دیس گئے
کس جگہ جا کے جگائیں گے یہ اب
لالہ و گُل کے دیے
کس جگہ مہکے ہوئے رنگوں کا ڈیرا ہوگا
طرب انگیز بہاروں کا بسیرا ہوگا

آؤ دیکھیں تو سہی
وہ جو اَن دیکھی رُتوں کے ہیں اسیر
عمر بھر دل میں ترازو ہے
خوشنما خوابوں کے تیر
غمِ حالات کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
روز و شب جلتے رہے
آبلہ پا چلتے رہے
اور خزاؤں کے سوا کچھ نہ ملا
ان کے جیون میں
کب ہری کونپلیں پھوٹیں گی
غنچے چٹکیں گے
بہاروں کے چراغاں ہوں گے
کب خزاں دیدہ چمن ان کے غزلخواں ہوں گے

○

فارغ بخاری

کرے گا کوئی بغاوت حیات سے کیسے
نکل سکے جائے کوئی کائنات سے کیسے

زبانیں شعلوں کی لہرائیں اشہر بھی نہ جلیں
لگائے آگ کوئی احتیاط سے کیسے

وفا کے مرحلے دشوار ہوتے جاتے ہیں
بجائے تالی کوئی ایک ہات سے کیسے

بدن سے قیمتی ملبوس کی سلائی ہے
چھپائے جسم کوئی پارچات سے کیسے

میں کیسے اپنی تباہی کا افتتاح کروں
یہ فیتہ کاٹے کوئی اپنے ہات سے کیسے

سحر کے گیتوں سے مُسُوج بنی ہے جس کی جبیں
رفاقت اُس نے نبھائی ہے رات سے کیسے

نشاطِ سنگ زنی کو ترس رہی ہے جبیں
بچھڑ گیا ہے یہ دُولہا برات سے کیسے

ہوا ہے پھر کسی طوفاں کا سامنا فارغ
بچائیں دل کو نئی واردات سے کیسے

○

فارغ بخاری

اب تو جس سمت نظر جاتی ہے
تیری صُورت ہی نظر آتی ہے

ٹُوٹ جاتا ہوں جو ٹُوٹے کوئی پیڑ
جیسے ہر جسم مرا ذاتی ہے

کچّے رستوں سے ہیں مانوس قدم
میرے اندر کوئی دیہاتی ہے

چاندنی ہو کہ ستاروں کی چمک
رات تو رات ہی کہلاتی ہے

کرب تخلیق کی لذّت مت پُوچھ
زندگی نشّے میں ڈھل جاتی ہے

اتنی دیواروں سے جانے کیسے
عمر بے تیشہ گزُر جاتی ہے

دستکوں سے نہ کھُلیں در فارغ
کیا یہ کم ہے کہ صدا آتی ہے

○

خلیل الرحمٰن اعظمی

میں غلامِ مصطفےٰؐ ہوں، میں ہوں شیدائے رسولؐ
میری نظروں میں بسا ہے رُوئے زیبائے رسولؐ

میری جاں اُس پر تصدق، اُس کے نامِ پاک پر
ہر بُنِ موُ سے نکلتی ہے صدا ہائے رسولؐ

آبِ رحمت لے کے آیا سارے عالم کے لیے
تشنہ لب جیسے بھی ہوں اُن کا ہے دریائے رسولؐ

یہ وہ گلشن ہے مقدّر میں نہیں جس کے خزاں
تا ابد تازہ رہیں گے یُونہی گُلہائے رسولؐ

گونجتی ہے جب کبھی کانوں میں آوازِ اذان
پھرنے لگتا ہے نگاہوں میں سراپائے رسولؐ

———

○

خلیل الرحمٰن اعظمی

تھکے ماندوں کو جب سے مِل گیا رستہ محمدؐ کا
رہا تا عُمر اُن کے سر پہ پھر سایہ محمدؐ کا

نگہبانی کیا کرتی ہے اُن کے نام کی برکت
سفر آساں ہے اُس کا جو ہو دلدادہ محمدؐ کا

پلاتا ہے بڑی شفقت سے اپنے تشنہ کاموں کو
بہت شیریں، بہت شفّاف ہے دریا محمدؐ کا

مجھے سرمست کر دیتی ہے اپنی بُوئے پیراہن
سجا رکھا ہے جب سے دل میں گلدستہ محمدؐ کا

بڑا خوش بخت ہے جس کو ملے اُس خاک کا ذرّہ
مبارک ہے جو دیکھے گُنبدِ خضریٰ محمدؐ کا

———

○

فضا ابن فیضی

ہم نے دیکھا نہ تھا موسم کوئی ایسا سر سبز
دل ہوا خوں تو ہوئی کشتِ تمنا سر سبز

دھیان سے اُس نے سُنیں آج ہماری باتیں
اک زمانے پہ ہوا حرفِ تقاضا سر سبز

کیا کہوں تجھ سے کہ یاد آئے ہیں چہرے کیا کیا
عکس در عکس رہا آئنہ اپنا سر سبز

زہرِ حالات کا اس طرح رگوں میں دوڑا
سر سے ہیں تا بہ قدم ہو گیا پورا سر سبز

پیرہن سبز تو اُس شعلہ بدن نے پہنا
بارے اب جا کے ہوا حرفِ تقاضا سر سبز

پھول راہوں میں کتر جاتی ہے رفتار اس کی
ہیں بہارِ رم آہو سے یہ صحرا سر سبز

جس کے دامن میں ترے قرب کی کلیاں چٹکیں
اب بھی ہے عمرِ گزشتہ کا وہ لمحا سر سبز

درد کی آنچ میں تپ کر نکھر آیا چہرا
زندگی میں تھا کوئی نقش کب اتنا سر سبز

کون سی پیاس میں جلتا ہے کوئی کیا جانے
موج در موج ہے، پھر بھی نہیں دریا سر سبز

ہر حقیقت ہے سُلگتے ہوئے خوابوں کی طرح
آج تک ہو نہ سکا دیدۂ بینا سر سبز

چاہیے عرضِ ہنر کا بھی سلیقہ یارو!
لفظ سر سبز نہ اسلوب نہ معنیٰ سر سبز

دُکھ اُٹھاؤ کہ ذرا لب کا تبسم نکھرے
تن جلاؤ کہ رہے ذہن کا پودا سر سبز

سوزِ احساس و بصیرت ہے بڑے کام کی چیز
شمع تو بجھ گئی پھر بھی رہا شعلا سر سبز

ورنہ یہ راہ تو پہلے نہ تھی اتنی گُل زار
ہم سفر تم ہو تو ہیں نقشِ کفِ پا سر سبز

یہ الگ بات کہ بے ذوق ہوں یوسف کی طرح
میری راتوں میں ہوا خوابِ زلیخا سر سبز

دے اب اوروں کو بھی یہ نیلمیں پیکر یا رب
میں ہی کیوں زہرِ سخن سے رہوں تنہا سر سبز

میں نے لکھا جو فضاؔ تذکرۂ عارض و لب
ہو گیا نخلِ قلم سارے کا سارا سر سبز

فضا ابن فیضی

چہرہ رکھتے ہیں ہم، پھر بھی خوش ہیں بہت توڑ کر آئینے
عکس کی معنویت سمجھتے بھی کیا، کم ہنر آئینے

جا کے کس دور کے دیس میں جا بسے، جو ادا فہم سے تھے
ہم نے پتھر خریدے ترے شہر میں بیچ کر آئینے

خال و خط کے ورق، لمحۂ رفتہ کب کا چُرا لے گیا
کیا چھپاتے ہیں اب، میری بے چہرگی کی خبر آئینے

کوئی تو اب حقائق کی دہلیز سے، اُن کو آواز دے
اپنے خوابوں میں گم ہیں بڑی دیر سے دیدہ ور آئینے

یہ تو قیدی ہیں دا کے، انھیں دل کشا سحر و افسوں کے ہیں
ہیں جو بدنام چہرے تو پھر کیا کریں، خوش گہر آئینے

وقت کی آنکھ سے کوئی خود کو بھلا، اب چھپائے گا کیا
ہم نے مانا کہ سب صورتیں معتبر ہیں، مگر آئینے

تیری میری طرف دیکھ لیتے ذرا اتنی فرصت نہ تھی
اپنی پرچھائیوں میں اُلجھے رہے، خود نگر آئینے

اُس کی آوارگی کو دُعائیں دو اے صاحبانِ جنوں!
جس کے نقشِ قدم نے بچھائے سرِ رہ گزر آئینے

کس کے چہرے پہ کتنی خراشیں ہیں، اب کون گنتا انھیں
سب کے ہاتھوں میں ہیں، پھر وہی منظرِ آشوب تر آئینے

تھیں جو معنی کی مانوس سی صورتیں، وہ کہاں کھو گئیں
دُھند میں لپٹے لپٹے ہیں الفاظ کے، معتبر آئینے

کیسے آشوبِ دانش پہ رکھتا نظر، میں کم آگاہ تھا
دے گیا مجھ کو آنکھوں کے بدلے کوئی بے بصر آئینے

عکس و تصویر سے ہٹ کے اب ڈھونڈتے، دوسرا مرحلہ
کیوں اسی موڑ پر آ کے ٹھہرے رہیں، عمر بھر آئینے

اپنی آواز کو نقش میں ڈھالنے کا ہُنر سیکھ لو
تم سے ملنے کو بھٹکے ہیں کیا کیا فضا عمر بھر آئینے

○

فضا ابن فیضی

سنبھالے پلکوں پہ قندیلِ جاں اکیلا ہوں
ہلاکِ گرمیِ لفظ و بیاں اکیلا ہوں

بڑا کٹھن ہے یہ ذہنی مطابقت کا سوال
ہزار رشتے ہیں گو درمیاں اکیلا ہوں

مرے حساب میں اپنا خسارہ بھی لکھ دو
کہ میں ہی شہر میں صاحبِ زیاں اکیلا ہوں

یہ میری ذات ہے دراصل مصر کا بازار
وہیں ہے وقت کا میلا، جہاں اکیلا ہوں

دیارِ عمر میں آباد ہوں کھنڈر کی طرح
کہوں یہ کس سے مکاں در مکاں اکیلا ہوں

مزاجِ محفلِ احباب وہ نہیں کہ جو تھا
شریک ہوتے ہوئے بھی یہاں اکیلا ہوں

ز لفظ تا بہ معانی، جو فاصلے ہیں، نہ پوچھ
کہ جیسے میں سرِ دشتِ تپاں اکیلا ہوں

ورق ورق کسے فرصت کہ اب پڑھے مجھ سے
قدم قدم ہنرِ رائگاں اکیلا ہوں

ترے نگر میں کہاں کوئی منفرد ایسا
بہ ایں وسیلۂ نام و نشاں اکیلا ہوں

ملے گا مجھ سے مرے پس روانِ رہ کو سراغ
ملال کیا، جو پسِ کارواں اکیلا ہوں

نہ مل سکی مری آواز سے کوئی آواز
میں اپنے دور کا افسانہ خواں اکیلا ہوں

فضا ابنِ فیضی

خلوص دے کے، سزاوار نفرتوں کا ہُوا
نہ پوچھ! حشر جو پچھلی رفاقتوں کا ہُوا

ہنسے تو پڑگئیں چہرے پہ کچھ خراشیں اور
شِکار، خندۂ لب کِن جراحتوں کا ہُوا

پڑے ہیں آبلہ پائی سمیت منزل پر
غبارِ آنکھ سے اوجھل مسافتوں کا ہُوا

ہم اپنے ہی سحر و شام کے ہیں زندانی
ہُوا نہ آدمی، خمیازہ ساعتوں کا ہُوا

کسی کھنڈر ہی میں اب جائے عافیت ڈھونڈیں
تمام شہر تو مقتل بصیرتوں کا ہُوا

بلا سے ہم ہُوئے رُسوا، یہ کم نہیں لوگو!
کہ ہم سے نام تو سر سبز تہمتوں کا ہُوا

کھو گے کیا جو تمہارا وہ حال پوچھے گا
کہ پارہ پارہ گریباں حکایتوں کا ہُوا

پرانے لفظوں سے نئے تیور نئے تلاش کیے
یہ تجربہ بھی تقاضا روایتوں کا ہُوا

مجھے بھی اپنی طرح پابہ گِل بنا کے ہیں چُپ
میں ہم سفر یہ کہاں سرد قامتوں کا ہُوا

وہ خونِ دل ہی سہی، کچھ قلم سے ٹپکا تو
چلو، نزول تو ہم پر بھی رحمتوں کا ہُوا

حصارِ حرف و ہنر توڑ کر نکل جاؤں
کہاں پہنچ کے خیال اپنی وسعتوں کا ہُوا

چلا تھا میں کہ نئی آگہی پہ کچھ لکھوں
تمام سلسلہ برہم عبارتوں کا ہُوا

تو ایک لفظ ہے، معنی پہ خود دلالت کر
رہا بکھر کے جو خوگر وضاحتوں کا ہُوا

بڑا ہنر ہے سلیقے سے بات کہنا بھی
فضاؔ کے بعد ہی اتمام حجتوں کا ہُوا

دُکھ

صدیق کلیم

ایک جنگل ہے گھنیرا۔ گہرا
اُلجھی شاخوں کے رگ و پے میں لرزتے پتّے
ہر طرف دُور تلک تیز ہوا چیختی ہے
آبشار آتے ہیں شائیں شائیں
اور شعلوں کے سمندر بن کر
سانپ لہریں ہیں زباں کھولتی ہیں
اک پُر اسرار خموشی کی ہر اک سمت پکار
ہر طرف دُور بھی نزدیک بھی اُوپر نیچے
ایک گمبھیر۔ اندھیرا صحرا !

اندھیارا

صدیق کلیم

اندھیارا اور خاموشی مل جاتے ہیں
درد بہت بڑھ جاتا ہے
دُنیا پر وحشت چھا جاتی ہے
کہنے کو باتیں ہیں، بامعنی بھی بے معنی بھی
جب بات کا مطلب اُڑ جائے
الفاظ پریشاں ہو جائیں
کیا جانے! کیا کہنا؟ کس سے کہنا کیا ہے؟

پتھر پتھر ٹھوکر لگتی ہے
رشتہ غائب ہو جاتا ہے
اپنے سے یا اور کسی سے
بندھن کیسا؟
گمبھیر اُداسی چھا جاتی ہے
تنہا تنہا سب کی راہیں
اپنی اپنی سب کی بولی
محرومی ہر صورت سب کی محرومی ہے
ساون کا منظر
ہر جانب ہرا! ہرا ہے!

صدیق کلیم

گیت خوشی کا گاؤ

پیار کی منزل دُور ہے پیارے
رگ رگ جاگے خُون کا دھارا
جب تک آس ہے باقی
ساز پر رقص سناؤ
گیت خوشی کا گاؤ

اُونچا اُونچا اُڑنے والو
پگلے پن سے حاصل کیا ہے ؟
دیکھو نیچے نیچے دیکھو
جلدی جلدی آؤ
گیت خوشی کا گاؤ

ناحق درد لبادہ اوڑھے
کب کب دُکھ کا تحفہ دوگے ؟
دل خُوں ہو جائے گا
جو بھی ہے لے آؤ
گیت خوشی کا گاؤ

ہاتھ پہ رکھ کر جان کو اپنی
قدم قدم پر شعلہ جاگے
یہ گلزار بناؤ
آؤ آؤ آؤ
گیت خوشی کا گاؤ

اجنبی راہگزر

صدیق کلیم

اجنبی راہ گزر سوچتی ہے
کوئی دروازہ کھلے
ہر طرف درد کے لمبے سائے
راستے پھیل گئے دُور گئے
دھڑکنیں تیز ہوئیں اور بھی تیز
اجنبی راہ گزر سوچتی ہے
کوئی محبوب نظارہ اُبھرے
اور مجبور فقیروں کی طرح
ہر قدم چلتی ہے دستک دستک
ہر نفس ہر اک راہ ہر اک سمت میں بھاگی لیکن
جس طرح وصل کا ہر لمحہ جُدائی کا سفر
اجنبی راہ گزر سوچتی ہے
شاید اب ایسا مقام آجائے
ہر قدم آپ ہر اک راہ گزر ہو منزل
خود بخود درد کا ہر لمحہ ہو لُطف
اجنبی راہ گزر سوچتی ہے
در بدر خاک بسر سوچتی ہے!

○

شاعر لکھنوی

اپنی طلب کا نام ڈبونے کیوں جائیں میخانے تک
تشنہ لبی کا اِک دریا ہے شیشے سے پیمانے تک

حُسن و عشق کا سوزِ تعلق سمتوں کا پابند نہیں
اکثر تو خود شمع کا شعلہ بڑھ کے گیا پروانے تک

راہِ طلب کے پیچ و خم کا اندازہ آسان نہیں
اہلِ خرد کیا چیز ہیں رستہ بھول گئے دیوانے تک

ساقی کو یہ خوش فہمی تھی، ہم تک موج نہ آئے گی
پیاس کا جب پیمانہ چھلکا ڈوب گئے میخانے تک

مٹی سے جب پھول کھلائے کارِ جنوں کی محنت نے
شہر کچھ اس انداز سے پھیلے جا پہنچے ویرانے تک

زعمِ ہُنر کا رنگ سلامت سب کو خبر ہو جائے گی
کتنے چہرے ہم نے تراشے، ہاتھ قلم ہو جانے تک

اُس غربت کی دھوپ میں شاعرؔ اپنوں کا سایہ بھی نہ تھا
جس غربت کی دھوپ میں ہم کو یاد آئے بیگانے تک

O

شاعر لکھنوی

حَبس طاری ہے مسلسل کیسا
اب کے برسا ہے یہ بادل کیسا

جس سے احساس کی صدیاں گزریں
تھا جُدائی کا وہ اِک پل کیسا

لے کے نذرانۂ جاں کون آیا
جشن سا ہے سرِ مقتل کیسا

تیری توصیف سے خالی ہو اگر
لفظ ہو جاتا ہے مہمل کیسا

وہی دن رات محبّت کا جنوں
دل بھی کم بخت ہے پاگل کیسا

اُس نے تو لب ابھی کھولے بھی نہیں
شورِ نغمہ ہے مسلسل کیسا

اُن کے آنے کی خبر سے شاعرؔ
دل ہوا جاتا ہے بوجھل کیسا

⊙

شاعر لکھنوی

خواب سے آنکھ وہ مل کر جاگے
کتنے سوئے ہوئے منظر جاگے

کس کی خاطر ہے پریشاں تری زُلف
ہم اسی فکر میں شب بھر جاگے

تشنگی نے جو نچوڑا دامن
کروٹیں لے کے سمندر جاگے

سیکڑوں رنگ ہیں آنکھوں میں مگر
ذہن میں ایک ہی پیکر جاگے

خواب کا جشن منانے کے لیے
لوگ، سنتے ہیں کہ گھر گھر جاگے

ہم نے کاغذ پہ لکھّا نام ترا
حرف و معنی کے مقدّر جاگے

ان کو بیدار نہ کہیے شاعؔر
لوگ جو خواب کے اندر جاگے

O

شاعر لکھنوی

صحرا کی بے آب زمیں پر ایک چمن تیار کیا
اپنے لہو سے سینچ کے ہم نے مٹی کو گلزار کیا

یوں ہم اپنے گھر سے نکلے گھر ہم کو تکتا ہی رہا
ہم نے ادا بھیگی آنکھوں سے قرضِ در و دیوار کیا

کتنی آنکھیں شوقِ سراپا کتنے بکھرے حرفِ سوال
جانے پھر کیا سوچ کے ہم نے خود کو ترا بیمار کیا

تم نہ کہو تاریخ کہے گی ہم ہیں کس معیار کے لوگ
پتھر کھائے پھول تراشے، راہوں کو ہموار کیا

شعلے لپکے جب بھی ہم کو برکھا رت کی یاد آئی
آنکھیں برسیں جب بھی ہم نے ذکرِ لب و رخسار کیا

ایک ہی رُخ تک اپنا مزاجِ ذوقِ وفا محدود نہیں
رنگ دیا میخانے کو بھی مقتل سے بھی پیار کیا

رسمِ محبت شاعرؔ ہم کو چلتی ہوئی تلوار بنی
جس کو بنایا ہم نے اپنا اس نے ہمیں پردار کیا

○

امّید فاضلی

وہ خواب ہی سہی پیشِ نظر تو اب بھی ہے
بچھڑنے والا شریکِ سفر تو اب بھی ہے

زباں بُریدہ سہی ہیں، خزاں گزیدہ سہی
ہرا بھرا میرا زخمِ ہُنر تو اب بھی ہے

سُنا تھا ہم نے کہ موسم بدل گئے ہیں مگر
زمیں سے فاصلۂ ابرِ تر تو اب بھی ہے

ہماری در بدری پر نہ جائیے کہ ہمیں
شعورِ سایۂ دیوار و در تو اب بھی ہے

ہوس کے دَور میں ممنونِ یادِ یار ہیں ہم
کہ یادِ یار دلوں کی سپر تو اب بھی ہے

کہانیاں ہیں اگر معتبر تو پھر اِک شخص
کہانیوں کی طرح معتبر تو اب بھی ہے

ہزار کھینچ لے سُورج حصارِ ابر مگر
کرن کرن پہ گرفتِ نظر تو اب بھی ہے

سمندروں سے زمینوں کو خوف کیا کہ امّید
نمو پذیر زمینِ ہُنر تو اب بھی ہے

مگر یہ کون بدلتی ہوئی رُتوں سے کہے
شجر میں سایہ نہیں ہے شجر تو اب بھی ہے

○

اُمّید فاضلی

اِک ایسا مرحلۂ رہ گزر بھی آتا ہے — کوئی فصیلِ اَنا سے اُتر بھی آتا ہے
تری تلاش میں جانے کہاں بھٹک جاؤں — سفر میں دشت بھی آتا ہے گھر بھی آتا ہے
تلاش سائے کی لائی جو دشت سے تو کھلا — عذاب صورتِ دیوار و دَر بھی آتا ہے
سکوں تو جب ہو کہ میں چھاؤں صحن میں دیکھوں — نظر تو ویسے گلی کا شجر بھی آتا ہے
بدن کی خاک سمیٹے ہوئے ہو کیا توگو — سفر میں لمحۂ ترکِ سفر بھی آتا ہے
دلوں کو زخم نہ دو حرفِ ناملایم سے — یہ تیر وہ ہے کہ جو لوٹ کر بھی آتا ہے
میں شہر میں کسے الزامِ ناشناسی دوں — یہ حرف خود مرے کردار پر بھی آتا ہے
نظر یہ کس سے ملی ناگہاں کہ یاد آیا — اسی گلی میں کہیں میرا گھر بھی آتا ہے
ہوا کے رُخ پہ نظر طائرانِ خُوش پرواز — قفس کا سایہ پسِ بال و پر بھی آتا ہے
میں حرف حرف میں اُترا ہوں روشنی کی طرح — سو کائنات کا چہرہ نظر بھی آتا ہے
لہو سے حرف تراشیں جو میری طرح اُمّید — اُنھیں کے حصّہ میں زخمِ ہُنر بھی آتا ہے

رضا ہمدانی

○

ہر ایک گھر کا دریچہ کھُلا ہے میرے لیے
تمام شہر ہی دامن کشا ہے میرے لیے

ہر ایک ترشے ہوئے جسم میں ہے آنچ تری
ہر ایک بُت کدہ آتشکدہ ہے میرے لیے

بلائے جاں ہیں یہ گہرائیاں سمندر کی
عذاب، عشرتِ قطرہ بنا ہے میرے لیے

میں ایک کھیل سمجھتا تھا دردِ اُلفت کو
تمام عمر کا اب، رتجگا ہے میرے لیے

بھگو بھگو گیے بادل کسی کی زُلفوں کا
ستم ظریف یہ کالی گھٹا ہے میرے لیے

○

پھُولوں کی ہنسی لُوٹ کے مغرور ہیں کانٹے
گلشن میں مگر صورتِ ناسُور ہیں کانٹے

اس دَور میں وہ حادثے ٹوٹے ہیں چمن پر
مہجور یہاں پھُول ہیں، مسرور ہیں کانٹے

ہم پھُول سے چہروں کے تصوّر میں رواں ہیں
ہر چند ہر اک راہ میں مستور ہیں کانٹے

ہر زخم گوارا ہے تری راہ طلب میں
گو پھُول میسّر نہیں، منظور ہیں کانٹے

حاصل نہ ہوا کچھ بھی اُنھیں صحبتِ گل سے
عقرب کی طرح ڈسنے پہ مجبور ہیں کانٹے

○

بشیر بدر

(خاں صاحب کی زمین میں)

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

گفتگو اُن سے روز ہوتی ہے
مدّتوں سامنا نہیں ہوتا

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں
کیا کریں۔ حوصلہ نہیں ہوتا

رات کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

○

بشیر بدر

فن اگر روح و دل کی ریاضت نہ ہو
ایسی مسجد ہے جس میں عبادت نہ ہو

چھپروں پر دیے رکھ گئی ہے ہوا
تاکہ پھر روشنی کی شکایت نہ ہو

تیری آنکھوں میں ایسا سنور جاؤں میں
عمر بھر آئینوں کی ضرورت نہ ہو

دن تو نکلا، خریدا ہوا آدمی
اے خدا رات بھی، سب کو عورت نہ ہو

کس کو نیلام کرتے ہو بازار میں
یہ کسی گھر کے مندر کی مورت نہ ہو

دل نوازی کے فن جاننا چاہیے
حُسن چاہے بہت خوبصورت نہ ہو

دل کے کاغذ جلا روشنی کر کے جا
جانے والے اگر تجھ کو زحمت نہ ہو

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جس کے چہرے پہ غم کی عبارت نہ ہو

○

بشیر بدر

تمام آگ ہے دل ، راہ خار و خس کی نہیں
یہی گلی ہے جہاں سلطنت ہوس کی نہیں

بس ایک شام کی لذّت بہت غنیمت جان
عظیم پاک محبّت ہر اک کے بس کی نہیں

اُتار دے مری آنکھوں سے آنسوؤں کے غلاف
چمک ضرور ہے ان میں مگر ہوس کی نہیں

تھا ایک شخص ہر اک شخص اس پہ عاشق تھا
یہ بات کل کی ہے دو چار دس برس کی نہیں

وہ سب کے سامنے بانہوں میں آ کے کھو جانا
فرشتوں جیسی یہ معصومیت ہوس کی نہیں

نصاب دل کا ، کہاں رکھ دیا کلاسوں میں
غزل کی آگ ہے یہ کاغذوں کے بس کی نہیں

O

بشیر بدر

سیاہیوں کے بنے حرف حرف دھوتے ہیں
یہ لوگ رات میں کاغذ کہاں بھگوتے ہیں

کسی کی راہ میں دہلیز پر دیے نہ رکھو
کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

چراغ پانی میں موجوں سے پوچھتے ہوں گے
وہ کون لوگ ہیں جو کشتیاں ڈبوتے ہیں

اُنھیں میں کھیلنے آتی ہیں بے ریا رُوحیں
وہ گھر جو لال ہری دفتیوں کے ہوتے ہیں

قدیم قصبوں میں کیسا سکون ہوتا ہے
تھکے تھکائے ہمارے بزرگ سوتے ہیں

چمکتی ہے کہیں صدیوں میں آنسوؤں سے زمیں
غزل کے شعر کہاں روز روز ہوتے ہیں

○

صہبا اختر

غالب کے طرف دار رہے ہے، غالب و صہبا — اپنے ہی پرستار رہے، غالب و صہبا
آسان نہیں سحرِ معانی سے گزرنا — دشوار تھے، دشوار رہے، غالب و صہبا
ہاں شیفتہ و حالی و مجروح کی صورت — فن کاروں کے فن کار رہے، غالب و صہبا
منت کشِ دربار تھے یہ کہنا غلط ہے — ہاں رونقِ دربار رہے، غالب و صہبا
ہم نام نہ ہم عمر نہ ہم عصر ہیں لیکن — اشعار ہیں ہم کار رہے، غالب و صہبا
کیا نیشِ یگانہ سے شکایت ہو کہ تا عمر — دلدادۂ آزار رہے ، غالب و صہبا
ہر دَور میں کچھ نام بدل جاتے ہیں لیکن — ہر دَور کا پندار رہے، غالب و صہبا
یہ اوّل و آخر ہیں فقط نام کا دھوکہ — یک دائرۂ پرکار رہے، غالب و صہبا
ہرچند اَنا بعدِ اَنا ایک ہے لیکن — آئینۂ تکرار رہے، غالب و صہبا
دانش کو سمجھتا ہے فقط صاحبِ دانش — احمق پہ سدا بار رہے ، غالب و صہبا

ہرچند زمانہ بھی ہوا بیچ میں حائل
آپس میں مگر یار رہے غالب و صہبا

○

صہبا اختر

گو خاک ہوں، غبار نہیں اُس کی راہ کا
مارا ہوا ہوں میں دلِ غفلت پناہ کا

ملتے ہیں صبح و شام تو آتا ہے یہ خیال
شاید اُسے بھی یاد ہو وعدہ نباہ کا

اپنوں کو ناقبول ہو غیروں کو ناپسند
اندھوں کے درمیان ہو مجرم نگاہ کا

میرا رقیب بھی ہے تجلّی کشِ حبیب
میری لُغت میں لفظ نہیں روسیاہ کا

ہر ماہ وش نے مجھ کو دُعا دی شبِ وصال
مجھ کو بہت ثواب ملا ہر گناہ کا

فطرت کا یہ مذاق ہے اس مفلسی کے ساتھ
دل مجھ کو دے دیا ہے کسی کج کلاہ کا

مجھ سا حقیر بندۂ دُنیا ہوا تو کیا
غالب سا شاہِ فن تھا نمک خوار شاہ کا

محفل میں جا کے شعر کی صہبا کروں تو کیا
میں سُن چکا ہوں شور بہت واہ واہ کا

حکایت شب

پرتو روہیلہ

".... چنانچہ سرِ شام ہم سب کسی خاندان فرنگی سے بہر ملاقات نکلے
یہاں میرا "ہم سب" سے مطلب ہے وہ دوسرے ہم وطن اور پڑوسی کہ جو ملک افرنگ کی اس بڑی
جامعہ میں احصول زر علم و دانش کو آئے ہوئے تھے
"کسی" سے یہ مطلب ہے ہم کو خبر تک نہیں تھی کہ ہم سب کہاں جا رہے ہیں
کہاں کس کو کس شخص کی میزبانی ملے گی
بہر حال یہ طائفہ اجنبی مہمانوں کا اک درمیانے سے گھر میزبانوں ہی کی رہنمائی میں پہونچا
وہاں ہم سے پہلے بھی کچھ لوگ موجود تھے
روایاتِ بیگانگیٔ فرنگی میں بستہ
طنابوں میں برفیلے ٹھٹھرے ہوئے یخ زدہ موسموں کی مقیّد
مگر جن کے چہروں پہ ان کی معیشت کے رسمی شگوفے کھلے تھے
تعارف کی اک مختصر تیز ٹھنڈی سی گردان
سوا آخری نام کے آخری حرف کی ڈوبتی چند لہریں
سوا آخری ہاتھ کے کھردرے چند ریزے
مرے حافظے میں تو کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا
چنانچہ تعارف کے سنگین فرشوں کو اک بار پھر سے کریدا تو دیکھا
سطح سخت تھی اور ناخن بڑے نرم تھے
اس اثنا میں اک خانم میزبان دونوں ہاتھوں میں سینی اُٹھائے

نبیذ مصفّا و گلرنگ کے کچھ بلوریں پیالے سجائے
بصد ناز و انداز آئیں . . . . .
ابھی اس نبیذ مصفّا کے دو چار چکر ہوئے تھے
کہ بوسیدہ رسموں کی اُونچی فصیلیں
تعصّب کے تاریک زنداں
تکلّف کی چکنی منڈیریں
تصنع کی پُرخار باڑھیں
سراسر یہ سب گر گئیں اور سب اجنبی ہم وطن بن گئے "

تفاوتِ راہ

حسین کافوری انگلیوں میں سفید سگرٹ لیے
وہ لڑکی گھڑی گھڑی اپنے شنگرفی نرم ہونٹوں سے یوں لگاتی
کہ جیسے جیون کے موم رس کو وہ گھونٹ بھر بھر کے پی رہی ہو
مگر طلب کا، وصال لب کا
ہر لمحہ تیز گام و گریز پا تھا
سیاہ ایڑی زمیں پر اس کو بے حسی سے کچل رہی تھی

برہا

پرتو روہیلہ

لکھتے لکھتے برسیں بیتیں پتر نہ پورا ہوئے
مجھ برہن کو ساجن ہی سے اب تو ملا دے کوئے

من کی بات نہ باہر آئے شبدوں کا اندھیر
لکھ لکھ اتنے کاگد پھاڑے چرنوں لگ گئے ڈھیر

یوں لگتا ہے جب سے ساجن مجھ کو گئے ہو بھول
ہیں وہ اپھاگن ٹہنی جس سے سوکھ کر ہیں سب پھول

ساجن برہ کی لو ایسی ہر، ہر بادل مرجھائے
اس کے ملن کا ساون ایسا سوکھے من ہریائے

برہا کے ان کالے کوسوں رستوں کا پردیس
ساجن پھر بھی باد پون میں مہکیں تیرے سندیس

پیتم برہا نے تو لگائے من میں گہرے گھاؤ
اب تو ملن کا مرہم تم ہی اپنے ہاتھ لگاؤ

تری یاد کے کانٹے زہر پھوڑیں من کے چھالے
آنکھیں پیتم ایسی برسیں جیسے دو پرنالے

کہنے لاگوں جب سکھیوں سے میں برہا کی بات
من سے ہوکیں اٹھیں ساجن آنکھوں ہو برسات

من میں میرے آگ جلے اور آنکھوں نیر بہاؤں
کیسا روگ لگا ہے مجھ کو ویدو کیا بتلاؤں

بجلی بن کر بیت گیا وہ پریت ملن کا ویلا
پھر جیون کی کالی راتوں ہونگے سندھ کا بیلا

بابا سے یہ کہنا میری پکّی قبر بنائیں
ساجن تو پردیس گئے ہیں نا جانے کب آئیں

بالم پیت کی جیتی بازی آنکھوں آنکھوں ہاری
ہاتھ سے سکھیو پانسہ پلٹے برہا نیچ جواری

تم بن ٹکڑے ہو کر ساجن بکھروں میں ہر آن
چھاتی اندر من نا ٹھہرے انگ نہ ٹھہریں پران

دید سیانے آنگن بیٹھے میلہ پینٹھ لگائے
جس کارن من گھُن لاگا وہ منموہن کب آئے

پھوڑوں دونوں نیناں سکھیو کاٹوں کارے کیس
سجیون کٹیا آگ لگاؤں پیتم گئے پردیس

ریتوں کے اس جلتے بن سے جوگی کو کیا لینا
سجیون کے ان کالے کوسوں پیتم یاد جیینا

برہا تو نے دھیان دلایا تیرا بڑا احسان
پیت کی مایا میرے گلے میں کیوں پھرتی ہلکان

بسری پیار نگریا او جھل ہو گئے پیت کے کھیت
اُوپر دُکھ کا سُورج چمکے نیچے بھاگ کی ریت

برہ کا راجہ پیت نگر میں اپنی بنائے حویلی
رو رو بیٹھی اینٹیں تھاپے مجھ جیسی البیلی

ارمانوں کے چھپر اُڑا کر لے گئی برہا آندھی
ساجن نگری چھوڑ چلی میں بے بس بھاگ کی باندھی

کس نگری میں نکلے ساجن تیرے مُکھ کا چاند
تیرا رستہ تکتے تکتے آشا ہو گئی ماند

ساجن جب سے گئے ہیں سکھیو چھوڑ کے اپنا گاؤں
جی چاہے ہر پردیسی کے جا جا پیر دُھلاؤں

پھول ہی توڑے نا کوئی اس کی چھاؤں میں ستائے
ہیں وہ رُوپ کا بُوٹا ساجن جنگل میں مرجھائے

کیسے کرم کے لچھن لوگو کیسی بھاگ کی ریک
ہیں مالن اب گھر گھر مانگوں پھولوں کی بھیک

جھُوٹی بات تھکن کی کارن سکھیو چل نا پاؤں
ساجن گاؤں رہا ہے پیچھے کیسے پاؤں اُٹھاؤں

تم بن ٹکڑے ہو کر ساجن بکھروں میں ہر آن
چھاتی اندر من نا ٹھہرے انگ نہ ٹھہریں پران

○

بیگم ممتاز مرزا

خوش نامیاں ہماری سرِ دار تک گئیں
رسوائیاں بھی کوچہ و بازار تک گئیں

تنہائیوں نے فاصلے سارے مٹا دیے
پرچھائیاں میری نئی دیوار تک گئیں

وہ احترامِ غم تھا کہ لب تک نہ ہل سکے
نظریں اُٹھیں تو سرحدِ دیوار تک گئیں

تم نے جلایا میرا نشیمن یہ غم نہیں
چنگاریاں اُڑیں، گل و گلزار تک گئیں

غرقاب ہونے والوں کو کچھ تو ملی مدد
ساحل سے کچھ صدائیں تو منجدھار تک گئیں

○

بیگم ممتاز مرزا

سوادِ شام کے منظر بڑے سہانے لگے
زمیں کے سارے پڑوسی دیے جلانے لگے

زباں پہ حرفِ غزل، دل میں درد، آنکھ میں اشک
عجب نہیں مجھے اپنے پہ رشک آنے لگے

مری حیات کی تاریک و تیرہ راہوں میں
کسی کے نقشِ قدم روشنی دکھانے لگے

ہمیں بھی اپنی وفاؤں کی داد ملنے لگی
خوشا کہ سنگِ ملامت اِدھر بھی آنے لگے

شکست شوق کو عنوانِ آرزو کیسے
بھلانا چاہا تو وہ اور یاد آنے لگے

○

بیگم ممتاز مرزا

دل کو صحرائے تمنا سے گزر جانے دو
آج ذرّوں کی طرح مجھ کو بکھر جانے دو

آج ہر زہر کو رگ رگ میں اُتر جانے دو
جو مرے دل پہ گزرتی ہے گزر جانے دو

میں محبت ہوں حدوں میں نہ کرو قید مجھے
روشنی بن کے فضاؤں میں بکھر جانے دو

آج کی شب مری پلکوں کے بجھاؤ نہ چراغ
سب ستارے مرے دامن میں بکھر جانے دو

وہ رہ و رسم نہ وہ ربط نہ عہد و پیماں
اب سسکتے ہوئے ہر خواب کو مر جانے دو

آخرش گل کا مقدّر ہے پریشاں ہونا
دو گھڑی تو رخِ گیتی کو سنور جانے دو

زخم تازہ نہ کرو بیتے دنوں کے ممتازؔ
دھندلی یادوں کے تصوّر کو بکھر جانے دو

جمیل ملک

ڈُوبا ہوا ہوں درد کی گہرائیوں میں بھی
میں خندہ زن ہوں کھوکھلی دانائیوں میں بھی

عُریاں ہے سارا شہر، چلی یوں ہوس کی لہر
تجھ کو چھپا رہا ہوں میں تنہائیوں میں بھی

کیسے تھے لوگ جن کی زبانوں میں نُور تھا
اب تو تمام جھُوٹ ہے سچائیوں میں بھی

اب نیک نامیوں میں بھی کوئی مزا نہیں
پہلے تو ایک لُطف تھا رُسوائیوں میں بھی

وہ دَور ہے کسی کو کسی کی خبر نہیں
اب کتنی غیریت ہے شناسائیوں میں بھی

رنگین ساعتوں میں کہاں وہ ملاحتیں!
پرچھائیوں کا جال ہے رعنائیوں میں بھی

ہم جن کے واسطے تھے تماشا بنے ہوئے
دیکھا تو وہ نہیں تھے تماشائیوں میں بھی

میں ہی تھا وہ جو اپنے ہی تیشے سے مرگیا
میں ہی تھا شہر بھر کے بلوائیوں میں بھی

کیا دَور ہے کہ جس میں صدا بھی سکوت ہے
تنہائیاں ہیں انجمن آرائیوں میں بھی

وہ پیار دو کہ جس کی چمک ماند ہی نہ ہو
ہوتا ہے یہ خلوص تو ہرجائیوں میں بھی

ساز وصدا کے شور میں گُم ہوگیا جمیلؔ
کس کس کے دل کا درد تھا شہنائیوں میں بھی!

○

جمیل ملک

گُل پیرہن رہے کہ دریدہ قبا رہے
جس حال میں رہے ترا نقشِ بقا رہے

ہم تو تمام عُمر تری ہی ادا رہے
یہ کیا ہوا کہ پھر بھی ہمیں بے وفا رہے

چاہی جو تُو نے بات وہی بات ہم نے کی
تیری زباں بنے، ترے دل کی صدا رہے

تو ساتھ ساتھ تھا تو خدائی بھی ساتھ تھی
اپنی رفاقتوں کے نشاں جا بجا رہے

تجھ کو بھلا کے بھی نہ تجھے ہم بھلا سکے
ناآشنا وہ تھے کہ جہاں آشنا رہے

سب دیکھتے تھے پھر بھی کوئی دیکھتا نہ تھا
سب کے لیے رسا تھے مگر نارسا رہے

لب پر ہو شکوہ ریز تبسّم بجھا ہُوا
دل میں مگر کسی کی محبّت سوا رہے

تصویر کی طرح تری صُورت ہو رُوبرو
تصویر بن کے کوئی تجھے دیکھتا رہے

دل تنگ ہو تو وسعتِ عالم بھی تنگ تر
دُنیا بہت کُھلی ہے اگر دل میں جا رہے

لگتے ہی آنکھ رات کے ہنگامے سو گئے
جاگے تھے جتنی دیر قیامت بپا رہے

پھولوں نے جا کے سیج سجائی تمام رات
کانٹے چمن کے سب مرے دامن میں آ رہے

یہ جشنِ ناخُدا ہے کہ موجوں کا رقص ہے
کشتی ہو غرقِ آب مگر ناخدا رہے!!

کہنے کو ایک لفظ مرے پاس ہے جمیلؔ
جب سے اُڑے وہ بات مرے پاس کیا رہے

○

جمیل ملک

رستے میں لُٹ گیا ہے تو کیا قافلہ تو ہے — یارو نئے سفر کا ابھی حوصلہ تو ہے
واماندگی سے اُٹھ نہیں سکتا تو کیا ہُوا — منزل سے آشنا نہ سہی نقشِ پا تو ہے
ہاتھوں میں ہاتھ لے کے یہاں سے گزر چلیں — قدموں میں پُل صراط سہی، راستا تو ہے
مانگے کی روشنی تو کوئی روشنی نہیں — اس دورِ مستعار میں اپنا دیا تو ہے
یہ کیا ضرور ہے میں کہوں اور تُو سُنے — جو میرا حال ہے وہ تجھے بھی پتا تو ہے
اپنی شکائتیں نہ سہی تیرا غم سہی — اظہارِ داستاں کا کوئی سلسلہ تو ہے
ہم سے کوئی تعلقِ خاطر تو ہے اُسے — وہ یارِ باوفا نہ سہی، بے وفا تو ہے
وہ آئے یا نہ آئے، ملاقات ہو نہ ہو — رنگِ سحر کے پاس خرامِ صبا تو ہے
پاؤں کی چاپ سے مری دھڑکن ہے ہمنوا — اس دشتِ ہول میں کوئی نغمہ سرا تو ہے
سُورج ہمارے گھر نہیں آیا تو کیا ہُوا — دو چار آنگنوں میں اُجالا ہوا تو ہے
کانٹا نکل بھی جائے گا جب وقت آئے گا — کانٹے کے دل میں بھی کوئی کانٹا چُبھا تو ہے
مَیں ریزہ ریزہ اُڑتا پھروں گا ہوا کے ساتھ — صدیوں میں جھانک کر بھی مجھے دیکھنا تو ہے

آشوبِ آگہی کی شبِ بے کنار میں
تیرے لیے جمیلؔ کوئی سوچتا تو ہے

جمیل ملک

ہر گھر کے آس پاس سمندر لگا مجھے
کتنا مہیب شہر کا منظر لگا مجھے!

خلقت بہت تھی، پھر بھی کوئی بولتا نہ تھا
سنسان راستوں سے بہت ڈر لگا مجھے

قاتل کا ہاتھ آج خدا کے ہے رو برو
دستِ دعا بھی خون کا ساغر لگا مجھے

یوں ریزہ ریزہ ہوں کہ کوئی بھی ہوا نہ تھا
یوں تو تری نگاہ کا کنکر لگا مجھے

بیٹھے بٹھلائے کوچۂ قاتل میں لے گیا
معصوم دل بھی کتنا ستمگر لگا مجھے

کس کس نے چٹکیوں میں اُڑایا ہے میرا دل!
چاہے تو تُو بھی آخری ٹھوکر لگا مجھے

گلچیں پلٹ کے سب ترے کوچے سے آئے ہیں
بھولوں کے راستے میں ترا گھر لگا مجھے

وہ جاگتا رہا تو قیامت بپا رہی
وہ سو گیا تو اور بھی کافر لگا مجھے

دیکھا جب آنکھ بھر کے اُسے، ڈوبتا گیا
عالم تمام عالمِ دیگر لگا مجھے

اُس کی خموشیوں میں نہاں کتنا شور تھا
مجھ سے سوا وہ درد کا خوگر لگا مجھے

جس آئینے میں بھی ترا پیکر سما گیا
اُس آئینے میں اپنا ہی جوہر لگا مجھے

یا مرے دل سے حسرتِ پرواز چھین لے
یا مرے پاس آ کے نئے پر لگا مجھے

ساحل پہ جو کھڑا تھا تماشا بنا ہوا
وہ گہرے پانیوں کا شناور لگا مجھے

سوچا تو چُور چُور تھے شیشے کے گھر تمام
دیکھا تو ہاتھ ہاتھ میں پتھر لگا مجھے

آنکھوں سے گرد جھاڑ کے دیکھا تو دوستو
کوتاہ قد بھی اپنے برابر لگا مجھے

تاریکیوں میں نُور کا ہالا بھی تھا کہیں
وحشتِ خیال، اپنا مقدر لگا مجھے

چھیڑی کچھ اس طرح سے جمیلؔ اس نے یہ غزل
ہر ایک شعر قندِ مکرر لگا مجھے

○

اقبال ساجد

ہر کسی کو یوں بھلا کب مسترد کرتا ہوں میں
تو ہے خوش قسمت اگر تجھ سے حَسد کرتا ہوں میں

بغض بھی سینے میں رکھتا ہوں امانت کی طرح
نفرتیں کرنے پہ جب آؤں تو حد کرتا ہوں میں

کوئی اپنے آپ کو منوانے والا بھی تو ہو
ماننے میں کب کسی سے ردّ و کد کرتا ہوں میں

کچھ شعوری سطح پر کچھ لاشعوری طور پر
کارِ فکر و فن میں اب سب کی مدد کرتا ہوں میں

دُوسروں کے واسطے لکھا ہُوا لگتا ہے جھُوٹ
اپنی سچائی کو اکثر آپ ردّ کرتا ہوں میں

میرے جذبوں سے بچاؤ نیک دل لوگو مجھے
روز و شب ان بدمعاشوں کی مدد کرتا ہوں میں

رنگ پر آئی ہوئی ہے اب جنوں خیزی مری
روز و شب توہینِ اربابِ خرد کرتا ہوں میں

طوق گردن میں پہنتا ہوں لہو کی دھار کا ——
خلق کو حیران ساجد زد بہ زد کرتا ہوں میں

○

اقبال ساجد

نکلی برہنہ سوچ تو شہرت بہت ہُوئی
لوگوں کو میرے فن سے محبّت بہت ہُوئی

جس کے لیے کیا تھا تماشہ وہی نہ تھا
ہونے کو جمع شہر میں خلقت بہت ہُوئی

اب کے برس بھی تازہ اُجالوں کے ہاتھ سے
چسپاں فصیلِ وقت پہ ظُلمت بہت ہُوئی

ہر ایک پھُول درد کے موسم نے ڈس لیا
جذبوں کی فصل پھر سے اکارت بہت ہُوئی

یادوں نے ایک دم مرا گھیراؤ کر لیا
کل رات شہرِ دل میں بغاوت بہت ہُوئی

جس دم اُدب کی دار پہ کھینچا گیا مجھے
شرمندہ فیصلے پہ عدالت بہت ہُوئی

میرے لہو میں ڈُوب کر اعزاز پا لیا
مُلکِ سخن میں لفظ کی عزّت بہت ہُوئی

میں میرؔ کی طرح نہ خدائے سخن بنا
ہونے کو یوں تو میری عبادت بہت ہُوئی

ساجدؔ اُدب میں اور کرنسی تو نہ چلا
افراط کی شکار یہ جدّت بہت ہوئی

○

اقبال ساجد

پتہ کیسے چلے دُنیا کو قصرِ دل کے جلنے کا
دُھوئیں کو راستہ ملتا نہیں باہر نکلنے کا

بتا پھولوں کی مسند سے اُتر کر تجھ پہ کیا گزری
مرا کیا میں تو عادی ہوگیا کانٹوں پہ چلنے کا

مرے گھر سے زیادہ دُور صحرا بھی نہیں لیکن
اُداسی نام ہی لیتی نہیں باہر نکلنے کا

چڑھے گا زہر خوشبو کا اُسے آہستہ آہستہ
کبھی بُھگتے گا وہ خمیازہ پھولوں کے مسلنے کا

مسلسل جاگنے کے بعد خواہش رُوٹھ جاتی ہے
چلن سیکھا ہے بچّے کی طرح اس نے مچلنے کا

زرِ دل دے کے پہنچا تھا متاعِ جاں بھی کھو بیٹھا
دیا اُس نے نہ موقع بھی کفِ افسوس ملنے کا

خُوشی سے کون کرتا ہے غموں کی پرورش ساجد
کسے ہے شوق لوگو درد کے سانچے میں ڈھلنے کا

O

محسنِ احسان

سائے کی اُمید تھی تاریکیاں پھیلا گیا
جو شجر پھُوٹا زمیں سے بیج ہی کو کھا گیا

کیا گلہ تجھ سے کہ گلشن کا مقدّر ہے یہی
ابر گھِر کر جب بھی آیا آگ ہی برسا گیا

اب کناروں سے نہ مانگے قطرے قطرے کا حساب
کیوں سمندر کی طرف بہتا ہوا دریا گیا

میری سیرابی بھی میری تشنگی سے کم نہ تھی
میں مثالِ ابر آیا، صورتِ صحرا گیا

حُسن کے ہمراہ چلتا تھا جلوسِ تشنگاں
عشق تنہا دہر میں آیا تھا اور تنہا گیا

محسنؔ احساں بھی کسی بادل کا ٹکڑا ہے کہ جو
ایک لمحے کے لیے آیا، گھِرا، برسا، گیا

⊙

محسن احسان

روشنیاں بدن بدن تیرے مرے لہو سے ہیں
لمس کی ساری لذّتیں جسم کی ہاؤ ہو سے ہیں

قربت روز روز میں رنجشیں اتنی بڑھ گئیں
وہ بھی گریز پا سے ہیں، ہم بھی بہانہ جُو سے ہیں

ڈر ہے کہ شامِ ہجر میں دل کا دیا بُجھا نہ دیں
اب کے ہوا کی سازشیں شعلۂ آرزو سے ہیں

جتنے خزاں کے ڈھنگ ہیں، جتنے فضا میں رنگ ہیں
میرے ہی خار و خس سے ہیں میرے ہی رنگ و بُو سے ہیں

میری متاعِ زندگی خواہشِ زخم ہی تو ہے
میرے جنوں کے سلسلے لذّتِ جستجو سے ہیں

خُوش ہیں کہ لوٹ آئے ہیں سارے مسافرانِ غم
گرچہ یہ سُرخ رو نہیں، پھر بھی یہ سُرخ رو سے ہیں

جس کے کمالِ طنز سے شہر سراپا زخم ہے
اس کو سبھی شکائتیں محسنؔ تندخُو سے ہیں

⊙

محسن احسان

سرشکِ خوں سرِ مژگاں کبھی پروئے نہ تھے
ہم اتنا ہنسنے کے بعد اس طرح سے روئے نہ تھے

ستم یہ ہے کہ وہ خورشید کاٹنے آئے
تمام عمر ستارے جنھوں نے بوئے نہ تھے

اب آپ اپنی تمنّاؤں سے ہوں شرمندہ
یہ داغ وہ ہیں جو میں نے لہو سے دھوئے نہ تھے

بہے وہ اشک کہ غرقاب ہوگئیں آنکھیں
سفینے اس طرح ہم نے کبھی ڈبوئے نہ تھے

چراغ لاؤ کوئی آفتاب ہی ڈھونڈیں،
ہم اس قدر کبھی تاریکیوں میں کھوئے نہ تھے

اک آہِ سرد کے بعد آنکھیں موند لیں محسنؔ
یہ کیا ہُوا کبھی ٹھنڈی ہوا میں سوئے نہ تھے

O

محسن احسان

عقل کہتی ہے کوئی ڈھونڈ مفر کی صُورت
دل یہ کہتا ہے بدل جائے گی گھر کی صُورت

کون، رستے میں انھیں چھوڑ کے جا سکتا ہے
خواہشیں ہوتی ہیں سامانِ سفر کی صُورت

آدمی تاش کے پتے ہیں ترے ہاتھوں میں
اے خُدا، تُو بھی تو ہے شعبدہ گر کی صُورت

میری تر دامنیٔ چشم پہ یوں طنز نہ کر
میں صدف ہوں تو مرا دل ہے گہر کی صُورت

اپنی ہی ذات کا اِک دائرہ بُن رکھا ہے
اپنی گردش میں ہیں ہم لوگ بھنور کی صُورت

جانے کس سَمت یہ شوریدہ سری لے جائے
زد میں آندھی کی ہوں ٹوٹے ہوئے پَر کی صُورت

کون آیا سرِ صحرائے محبّت محسنؔ
ذرہ ذرہ مہک اُٹھا گُلِ تر کی صورت

o

حناطر غزنوی

انساں ہوں گھر گیا ہوں زمیں کے خداؤں میں
اب بستیاں بساؤں گا جاکر خلاؤں میں

یادوں کے نقش کندہ ہیں ناموں کے روپ میں
ہم نے بھی دن گزارے درختوں کی چھاؤں میں

دوڑا رگوں میں خون کی طرح شورِ شہر کا
خاموشیوں نے چھین لیا چین گاؤں میں

یوں تو رواں ہیں میرے تعاقب میں منزلیں
بس کن میں ٹھوکروں کو لپیٹے ہوں پاؤں میں

وہ آکے چل دیے میں خیالوں میں گم رہا
قدموں کی چاپ دب گئی دل کی صداؤں میں

سر رکھ کے سو گیا ہوں غموں کی صلیب پر
شاید کہ خواب لے اُڑیں ہنستی فضاؤں میں

ایک ایک کرکے لوگ نکل آئے دھوپ میں
جلنے لگے تھے جیسے سبھی گھر کی چھاؤں میں

صحرا کی پیاس لے کے چلا جن کے ساتھ ساتھ
پانی کی ایک بوند نہ تھی اُن گھٹاؤں میں

جلتے گلاب ہیں نہ ذرا سی بھی آنچ تھی
ہم تو جلے ہیں ہجر کی ٹھنڈی ہواؤں میں

○

خاطر غزنوی

وا چشمِ تماشا لبِ اظہار سلا ہے
کوئی پسِ دیوار مجھے دیکھ رہا ہے

مٹی تو مری مر بھی چکی زندہ صدا ہے
میں چپ ہوں مگر درد مرا بول رہا ہے

اشکوں کا ہجوم آج جسے ڈھونڈ رہا ہے
وہ درد کے دریا میں کہیں ڈوب گیا ہے

کیا زہر سا ہر سمت فضاؤں میں گھلا ہے
جو چہرہ بھی دیکھو وہی اُترا سا ہوا ہے

اب خون کے اشکوں سے چمن سینچنا ہو گا
بھیگے ہوئے موسم نے یہ پیغام دیا ہے

وا ہونٹوں سے کیا بولوں کہ آنکھیں تو سلی ہیں
صحراؤں میں یاروں نے مجھے چھوڑ دیا ہے

گزری ہوئی کل کے ہوئے سکّے سبھی کھوٹے
جو آج کا سکّہ ہے وہی قبلہ نما ہے

کب دہلا ہے آفاتِ زمانہ سے مرا دِل
طوفانوں کو آنا ہے تو دروازہ کھلا ہے

لوگوں نے سورج کی چکا چوند کو پوجا
میں نے تو ترے سائے کو بھی سجدہ کیا ہے

○

شاذ تمکنت

چشمِ پُرآب میں کچھ یوں ترا پیکر اُترے
جس طرح چاند سمندر میں کُھلے سر اُترے
زخم کی طرح یہ سنّاٹا لہو دیتا ہے
کوئی بوٹے، کبھی آواز کا نشتر اُترے
مدّتیں گزُریں تجھے کھو بھی چکے، رو بھی چکے
لیکن اک بوجھ سا دل پر ہے یہ کیونکر اُترے
وہ نہ دیکھیں نہ سہی، ہم تو نظر رکھتے ہیں
کہ ہر اک دوست کے ساغر میں برابر اُترے
میں تو بس کانپ کے رہ جاتا ہوں، جانے کیا ہو
گر کبھی آیتِ غم کوہِ گراں پر اُترے
اس نزاکت سے ترے جی سے اُتر جاؤں گا
جس طرح تیرے بدن سے ترا زیور اُترے
شاذ اس دور کے صحرا میں ہیں یوں شعر کے پھول
جیسے اُمّت ہی نہ ہو اور پیمبر اُترے

———

دردِ مُشترک

شاذ تمکنت

تمھاری ننھّی سی معصوم کتنی سیدھی ہے
وہ میرے مُنّے سے اس بات پر اُلجھتی رہی
"تُو کوئی کھیل ہو، آخر بگاڑتا کیوں ہے
بنا بنا کے لگن سے گھروندے مٹّی کے
مُجھے چڑانے کی خاطر اُجاڑتا کیوں ہے"
خُدا کرے کہ تمھیں کوئی بات یاد نہ ہو
کچھ اس طرح کی شکایت تُمھیں بھی مجُھ سے تھی

○

نور بجنوری

سنگِ دشنام کو گوھر جانا
ہم نے دشمن کو بھی دلبر جانا

ننگِ اُلفت ہی رہا پروانہ
اس کو آتا ہے فقط مر جانا

پُوچھ لینا در و دیوار کا حال
اے بگولو! جو مرے گھر جانا

سر قلم کرتے رہے ظُلم کے ہاتھ
یار لوگوں نے مقدر جانا

کم نگاہی نے ڈبویا ہم کو
ایک قطرے کو سمندر جانا

تیشہ بردار کو فرہاد کہا
آئینہ گر کو سکندر جانا

ہم حقیقت میں تھے کہسار مگر
خود کو ذرّوں سے بھی کمتر جانا

میوزیم

احمد ظفر

جاگتا ہوں تو ستارے مری آنکھوں میں اُتر جاتے ہیں
نیند آتی ہے تو مہتاب سا چہرہ تیرا
آئنہ مجھ کو دکھاتا ہے کئی چہروں کا
دیکھتے دیکھتے خوابوں میں کئی خواب بکھر جاتے ہیں
وقت کی گلیوں میں آوارہ لیے پھرتا ہے احساسِ جمال
ہیں سفینے کی طرح دیکھتا رہتا ہوں تجھے
چاندنی میرا کفن تیری قبا بنتی ہے
موجِ احساس میں روحوں کا سفر جاری ہے
ہم جو زندہ تھے، جو زندہ ہیں نہ زندہ ہوں گے

ایک لمحہ کسی رعنائی کا پیکر تھا کبھی
میرے خوابوں کا لہو مجھ سے لیے جاتا ہے
ایک لمحے نے تراشا ہے مجھے جام کی صورت، تجھ کو
سرِ بازار دکھایا ہے کہ تو مینا بدوش
آئنہ خانے میں نیلام کی تصویر دکھائی دی ہے
رقص لمحوں کا وہی فن خریداری ہے

آج سرمایۂ افلاس وہ فن کار جنھیں
کھیت میں اُگتی ہوئی بھوک دکھائی دی تھی
سرِ فہرست ہیں میخانوں میں ایوانوں میں
عظمتِ فن کی قسم کھاتے رہے ہیں برسوں
گردشِ جام میں کیوں جام سرِ شام سمجھتے ہیں مجھے
کیوں ترے جسم کے پتھر کو سمجھتے ہیں کہ تو مینا بدوش
ان کی آغوش میں چپ چاپ چلی جائے گی

ہم تو روحیں ہیں جنھیں چاند کفن دوز سیے -
جاتا ہے
ہم سرِ دست جو پتھر بھی ہیں شہکار بھی ہیں
ٹوٹ جاتے ہیں بکھر جاتے ہیں مر جاتے ہیں
کس لیے حسرتِ بیداد کو سینے سے لگایا تھا کبھی

کائناتِ ذات کا مسافر

احمد ظفر

آئنہ رقص میں حسرت کی شناسائی کا
کتنے چُپ چاپ خرابوں میں لیے جاتا ہے
ہر طرف نرخ زرہ چہروں کی آوازیں ہیں
میری آواز کہاں تھی میری آواز کہاں ؟
مدفنِ وقت سے کب کوئی صدا آئی ہے ؟

ایک لمحہ وہی لمحہ مری تنہائی کا !
زخم پر زخم مرے دل کو دیے جاتا ہے
پھُول کے ہاتھ میں ہے رات کے ماتم کا چراغ
کبھی بُجھتا کبھی جلتا ہے، سُلگتا ہے کبھی
سانس سے جسم کا ناطہ مری رُسوائی ہے

ہمسفر کون ہوا لالہ صحرائی کا ؟
پردۂ رازِ ازل چاک کیے جاتا ہے
سر ہتھیلی پہ سجائے ہُوئے چلتے رہنا!
زندہ رہنے کے لیے رسم رہے گی کب تک !
درد دریا ہے وہی درد کی گہرائی ہے

O

احمد ظفر

زہر کو مے نہ کہوں، مے کو گوارا نہ کہوں
روشنی مانگ گئے ہیں خود کو ستارہ نہ کہوں

اپنی پلکوں پہ لیے پھرتا ہوں چاہت کے سراب
دل کے صحرا کو سمندر کا کنارہ نہ کہوں

ہجر کے پھول ہیں وہ چہرۂ زریں دیکھوں
وصل کے خواب کو ملنے کا اشارہ نہ کہوں

مرتے مرتے بھی یہ تحریر امانت میری
موت کے بعد بھی جینے کو خسارہ نہ کہوں

اپنی تکمیل کے ہر نقش میں دیکھوں اس کو
عرصۂ دہر کو حسرت کا نظارہ نہ کہوں

حشر سے پہلے مرے حشر کی تصویر نہ بن
حرفِ آخر کسی طور دوبارہ نہ کہوں

زندگی جس کی مرے دم سے عبارت ہو ظفرؔ
کیوں کہے کوئی اسے جان سے پیارا نہ کہوں

○

احمد ظفر

یوں زمانے میں مرا جسم بکھر جائے گا
مرے انجام سے ہر پھول نکھر جائے گا

جام خالی ہے صراحی سے لہو بہتا ہے
آج کی رات وہ مہتاب کدھر جائے گا

سیلِ گریہ مری آنکھوں سے کہہ جاتا ہے
بستیاں روئیں تو دریا بھی اُتر جائے گا

تو کوئی ابرِ گہر بار سمندر کے لیے
دل کے صحرا سے جو چپ چاپ گزر جائے گا

آج یہ زُلفِ پریشاں ہے زمانے کے لیے
کل یہی دَور کسی طور سنْور جائے گا

تیری ہر بات پہ مر جاتا ہوں مرتا بھی نہیں
کہ میری موت میں انساں کوئی مر جائے گا

اشک موتی سے بکھر جائیں گے راہوں میں جہاں
سُوئے منزل بھی مرا دیدۂ تر جائے گا

میں مکیں ہوں نہ مکاں شہرِ محبّت کا ظفرؔ
دل مسافر نہ کسی غیر کے گھر جائے گا

دُعا

امجد اسلام امجد

مولا۔ اس بستی کی آنکھیں کب تک سپنے دیکھیں
ایسا بھی اک سُورج جس میں چہرے اپنے دیکھیں

مولا اس نگری کے باسی بھوکے اور کنگال
اُن کے بھائی محلوں والے مالک اور دلّال

رُت آئے رُت جائے مولا، خالی اپنے ہاتھ
ہر موسم میں پچھلی رُت کے زخم چلے ہیں ساتھ
اِن زخموں کی خوشبو میں ہیں جینے کے ارمان
سات کروڑ انسان
اس بستی کی خاک ہمارے ہونے کی پہچان
ہستی کا سامان!

تیرے عرشوں سے اب ہم پر دُشمن بھیجے یا کال
مولا۔ ہم بے نام پرندے، کیسے چھوڑیں ڈال

○

امجد اسلام امجد

جب بھی آنکھوں میں ترے وصل کا لمحہ چمکا
چشمِ بے آب کی دہلیز پہ دریا چمکا

فصلِ گُل آئی، کُھلے باغ میں خوشبو کے علم
دل کے ساحل پہ ترے نام کا تارا چمکا

عکس بے نقش ہوئے، آئنے دُھندلانے لگے
درد کا چاند سرِ بامِ تمنا چمکا

رنگ آزاد ہوئے گُل کی گرہ کھلتے ہی
ایک لمحے میں عجب باغ کا چہرا چمکا

پیرہن میں بھی ترا حُسن نہ تھا حشر سے کم
جب کُھلے بندِ قبا اور ہی نقشا چمکا

دل کی دیوار پہ اُڑتے رہے ملبوس کے رنگ
دیر تک ان میں تری یاد کا سایا چمکا

رُوح کی آنکھ چکا چوند ہوئی جاتی ہے
کس کی آہٹ کا مرے کان میں نغمہ چمکا

لہریں اُٹھ اُٹھ کے مگر اس کا بدن چومتی تھیں
وہ جو پانی میں گیا خوب ہی دریا چمکا

ہجر پنپا نہ ترا وصل ہمیں راس آیا
کسی میدان میں تارا نہ ہمارا چمکا

جیسے بارش سے دُھلے صحنِ گلستاں امجدؔ
آنکھ جب خشک ہوئی اور وہ چہرا چمکا

O

عطا شاد

یک لمحہ سہی، عمر کا ارمان ہی رہ جائے
اس خلوتِ یخ میں کوئی مہمان ہی رہ جائے

قربت میں شبِ گرم کا موسم ہے ترا جسم
یہ خطۂ جاں وقفِ زمستاں ہی رہ جائے

مجھ شاخِ برہنہ پہ سجا، برف کی کلیاں
پت جھڑ پہ ترے حُسن کا احسان ہی رہ جائے

برفاگ* کے آشوب میں جم جاتی ہیں سوچیں
اس کربِ قیامت میں ترا دھیان ہی رہ جائے

تجھ بن تو سُنائی نہ دے، سورج کی صدا بھی
دل دشت ہوا بستہ ہے، سنسان ہی رہ جائے

مرمر کی سلوں میں تو گھٹے آگ کا دم بھی
یہ قریۂ جاناں ہے، یہاں جان ہی رہ جائے

سوچوں تو شعاعوں سے تراشوں ترا پیکر
چھو لوں تو وہی برف کا انسان ہی رہ جائے

یہ شام یہ چاندی کا برستا ہُوا جھرنا
کوئی تری زُلفوں میں پریشان ہی رہ جائے

صورت سے وہ گل برف، سہی پھر بھی عطا شاد
تاثیر میں وہ مُشک کی پہچان ہی رہ جائے

* برف آگ

O

عطا شاد

ہو، خونِ دل کہ چراغاں، جلے چراغ کہ پھول
عطا کرو، کوئی صدمہ، جگر کے داغ کہ پھول

ہوئی ہے جب سے وہ خوشبو کی روشنی رخصت
میں سوچ میں ہوں صبا سے جلا ہے باغ کہ پھول

ہزار جسم ہو، تم صد ہزار سوچوں کا
طلب، نگاہ کہ نغمہ، جنوں، دماغ کہ پھول

یہ کس کی زلف کا ماحول ہے، نقطہ پہ محیط
دمک رہا ہے، شبِ ماہ ہیں، ایاغ کہ پھول

عطاؔ طلب میں بگولوں کی دھول ہے دُنیا
سراب ہے سر صحرا، ملے سراغ کہ پھول

○

عطا شاد

میں زخم زخم رہوں، رُوح کے خرابوں سے
تُو جسم جسم دہکتا رہے، گلابوں سے

میں چُوم چُوم لوں، ایک ایک حرف صورتِ دل
کلامِ پاک چنوں، حُسن کی کتابوں سے

کسی کی چال نے نشّے کا رس کشید کیا
کسی کا جسم تراشا گیا، شرابوں سے

صبا کا ہاتھ ہے، اور ہے، ترے گداز کا لمس
میں جاگتا ہی رہوں، گرم گرم خوابوں سے

قدم قدم ہے، چکا چوند چاہتوں کا چراغ
میں شہرِ آئینہ جلتا ہوں، آفتابوں سے

عطا بدن کی وہ کروٹ بھی نیم شب کیا تھی
تمام عمر اُجلتا ہوں انقلابوں سے

○

عطا شاد

دلوں کے در د جگا، خواہشوں کے خواب سجا
بلا کشانِ نظر کے لیے، سراب سجا

مہک رہا ہے، کسی کا بدن سرِ مہتاب
مرے خیال کی ٹہنی پہ کیا گلاب سجا

کوئی کہیں تو سُنے تیرے عرضِ حال کا حبس
ہوا کی رحل پہ آواز کی کتاب سجا

وہ کیا طلب تھی، ترے جسم کے اُجالے کی
میں بجھ گیا، تو مرا خانۂ خراب سجا

تمام شب تھا، ترا ہجر تیرا آئینہ گر
تمام شب مرے پہلو میں آفتاب سجا

نہ تُو ہے، اور نہ میں ہوں، نہ وصل ہے نہ فراق
سجا شراب سجا، جا بجا شراب سجا

عطا یہ آنکھ دھنک منزلوں کی چاہ میں تھی
چھٹا جو اَبر گھنی تیرگی کا باب سجا

رضی اختر شوق

نہ فاصلے کوئی رکھنا نہ قربتیں رکھنا
بس اب بقدرِ غزل اس سے نسبتیں رکھنا

یہ کس تعلقِ خاطر کا دے رہا ہے سراغ
کبھی کبھی ترا مجھ سے شکایتیں رکھنا

میں اپنے سچ کو چھپاؤں تو رُوح شور مچائے
عذاب ہوگیا مبدا سماعتیں رکھنا

فضائے شہر میں اب کے بڑی کدورت ہے
بہت سنبھال کے اپنی محبتیں رکھنا

ہم اہلِ فن کو گُم نامیاں نہیں راس بُہت
ہوا ہے باعثِ رُسوائی شہرتیں رکھنا

قصیدہ خوانی کرو اور موج اُڑاؤ کہ شوقؔ
تمام کارِ زیاں ہے صداقتیں رکھنا

O

رضی اختر شوق

آوارگانِ شوق سب ہی گھر کے ہو گئے
اِک ہم ہی ہیں کہ کوچۂ دلبر کے ہو گئے

پھر یوں ہوا کہ تجھ سے بچھڑنا پڑا ہمیں
پھر یوں لگا کہ شہر سمندر کے ہو گئے

کچھ دائرے تغیرِ دُنیا کے ساتھ ساتھ
ایسے کھنچے کہ ایک ہی محور کے ہو گئے

اس شہر کی ہوا میں ہے ایسا بھی اِک فسوں
جس جس کو چھو گئی سب ہی پتھّر کے ہو گئے

سُورج ڈھلا ہی تھا کہ وہ سائے بڑھے کہ شوقؔ
کم قامتانِ شہر برابر کے ہو گئے

○

رضی اختر شوق

رنگ اب یوں تری تصویر میں بھرتا جاؤں
تجھ پہ رنگ آئے میں جاں سے بھی گزرتا جاؤں

وہ دیا ہوں کہ ہواؤں سے بھی ڈرتا جاؤں
فرطِ پندار سے پھر رقص بھی کرتا جاؤں

عجب آشوب دیا میرے خدا نے مجھ کو
اِک تمنّائے مسیحائی میں مرتا جاؤں

مجھکو جھٹلاتی رہیں وہ مری منکر آنکھیں
اور میں صورتِ خورشید اُبھرتا جاؤں

میرے چہرہ پہ نہ جاؤ کہ مرا حُسن ہے یہ
اپنے لکھے ہوئے لفظوں میں نکھرتا جاؤں

الٰہی تنہائی کا عالم ہے کہ ہر شخص کے پاس
اِک پذیرائی کی حسرت میں ٹھہرتا جاؤں

شوق شاعر بھی ہوں اندیشۂ جاں بھی ہے مجھے
رُوح میں شور کروں لفظ میں ڈرتا جاؤں

○

رضی اختر شوق

اب سفر ہو تو کوئی خواب نما لے جائے
کوئی آئے مجھے پلکوں پہ اُٹھا لے جائے

خود میں گھوموں، کبھی اوروں کے لیے لہراؤں
اس سے پہلے کہ ہوا میرا دیا لے جائے

ہائے وہ آنکھ کہ جو حرف سجھاتی تھی کبھی
اب سرِ کوئے غزل کون بُلا لے جائے

اُس نے چاہا بھی تو کس طرف سے چاہا مجھ کو
جیسے سینے میں کوئی حرفِ دُعا لے جائے

زندگی بھر کا سفر ہوگئی چاہت تیری
اب جہاں تک ترے قدموں کی صدا لے جائے

دل کو دھڑکا ہے کہ شمعیں ہی بجھی تھیں پہلے
اب کے آندھی مرا خیمہ نہ اُڑا لے جائے

شوق دریاؤں کا پندار نہیں تم جیسا
یہ جو بپھرے تو بھرا شہر بہا لے جائے

سراج منیر

وہی ستارہ جو بجھ گیا ہم سفر تھا میرا
اسی کی سمت ایک سبز ساحل پہ گھر تھا میرا

میں اس زمیں پر بریدہ بازو سسک رہا ہوں
جو اُڑ رہا تھا ہوا میں وہ ایک پَر تھا میرا

وہ ہاتھ میرے جنھوں نے تلوار سونت لی تھی
جو خاک و خوں میں لتھڑ گیا تھا وہ سر تھا میرا

زمیں یہاں سے وہاں تلک سبز ہو رہی تھی
مگر جو بے برگ و بر کھڑا تھا شجر تھا میرا

وہاں کے گھر تو فنا نے خاموش کر دیے تھے
عجیب سنسان بستیوں سے گزر تھا میرا

○

سراج مُنیر

دل سے اب تو نقشِ یادِ رفتگاں بھی مٹ گیا
اس خرابے سے بالآخر یہ نشاں بھی مٹ گیا

کس قدر خاموش تھا میداں سرِ شامِ شکست
مرحبا کے ساتھ شورِ الاماں بھی مٹ گیا

پہلے تو سایہ فگن تھا خاک ہو جانے کا خوف
پھر دلوں سے رنجِ عمرِ رائیگاں بھی مٹ گیا

ٹوٹتا جاتا ہے اب تاراجِ خوابوں کا طلسم
آنکھ سے عکسِ نگارِ مہرباں بھی مٹ گیا

زندگی اور موت میں اک فرق تھا ہم سے منیرؔ
مٹ گئے ہم، فرق ان کے درمیاں بھی مٹ گیا

باغوں میں آئے گی کب بہار ؟

یحییٰ امجد

نوحے لکھتے لکھتے یہ دل تھک جاتا ہے
بکھرے ہوئے ہیں سب دل والے
ہم متوالے تنہا ہیں
روشنیوں کے بیٹے تاریکی میں آکر چمکیں
ہم راہوں میں تیار ملیں گے
جو یلغار یہاں بھی ہو گی
ہم اپنے خوں کے فواروں کو عام کریں گے
ایک چراغاں کوچۂ رسوائی میں
اِک بالائے بام کریں گے !
اُن روزوں میں یہ دل تھک کر سو بھی چکے تو
ہم خوش ہوں گے
بادل کے تکیے پہ بہت آرام کریں گے !

بحث تو اپنی ہے ہی نہیں ...

بحث تو اپنی ہے ہی نہیں طاقت والوں سے
سارے دعوے اُن کے الگ ہیں اپنی دلیلیں الگ سی ہیں
وہ کہتے ہیں اُن کا قہر قیامت بن کر کڑکے گا
ہم کہتے ہیں موت کا کھیل ہمیں جی جان سے پیارا ہے
اور اس کھیل کے ہوتے ہوئے
بستی میں اُجیارا ہے !

یحییٰ امجد

شب کے سب اسرار تمھارے

طاقت ساری آپ کے بس میں
ساری ذہانت آپ کی ہے
ہم مجبور نہتّے سارے
پھر بھی ہمارے
ساتھ ہیں سب تاریخ کے دھارے
شب کے سب اسرار تمھارے
صُبح کا نُور ہمارا ہے
گمُ رستوں پر خُون کے چھینٹے
راہ دکھاتے تارے ہیں !

جسم اور سایے

شہرت اور عزّت کے زینے پر چڑھتے فن کار
کا سایہ ذلّت کے پاتال میں اُترا جاتا ہے !

روتے شہروں، دیہاتوں کو چھوڑ کے
چوروں کی منڈلی سے مِل کر
اِتراتے، بَل کھاتے ہو
کبھی ذرا تاریخ کا آئینہ بھی دیکھو !
دیکھو تو کیا شرماتے ہو ؟

خُدا گواہ

یحییٰ امجد

(والد مرحوم کی یاد میں —!)

خُدا گواہ دل اک لمحہ بھی نہیں غافل
تمھاری یاد بھی باقی ہے، دُکھ بھی باقی ہے
وہ شامِ غم بھی اُسی طرح دل پہ قائم ہے
وہ روزِ سخت بھی سینے میں درد بن کر ہے :
— جب ایک حملۂ دل تُم پہ ظُلم کرتا تھا
عظیم شہر کے مرکز میں اِک اُداس سا گھر
علاج سے محروم
تمھارے دُکھ میں تڑپنے کو دیکھ کر چُپ تھا
تو سارے شاہی محلّات شورِ عیش میں تھے

مجھے تو فلسفۂ صبر بھی گوارا ہے
(اگرچہ اصل میں یہ قاتلوں کی منطق ہے)
مگر یہ فلسفہ اس دل کو کون سمجھائے
جو تیری یاد کے غم کو خُدا سمجھتا ہے

اگر گئے ہوئے اک لمحہ مُڑ کے آ سکتے
فنا کے بعد دوبارہ حیات اگر ہوتی
تو میں ضرور لپٹ کر تمھارے سینے سے
تمام قصۂ غم آنسوؤں میں برساتا
مگر مجھے تو خبر ہے کہ یہ نہیں ممکن
اسی لیے مرے دل میں الم بھی باقی ہے
تری جہادِ مسلسل سی زندگی کی کتاب
مری حیات کے اِک اک ورق پہ لکھّی ہے
جو تُو نے راہ میں چھوڑا تھا پرچمِ تگ و دو
حریف کچھ بھی کہیں، آج میرے ہاتھ میں ہے
قرارِ خاطرِ محزوں اگر کوئی شے ہے
تو بس اسی کا خیال !

○

حسن رضوی

سُنا ہے شہر میں پھر آج اس کا چرچا ہے
ہر ایک شخص کی آنکھوں میں خُون اُترا ہے

شجر شجر نے اُٹھائے ہیں ہاتھ میں پتّھر!
ہر ایک شاخ کے چہرے کا رنگ بدلا ہے

سنائی دیتی نہیں ہیں بہت سی آوازیں
نا جانے کیا کوئی اِک دُوسرے سے کہتا ہے

ستم تو یہ ہے کہ چہرے بھی سب کے ایک ہوئے
ہر ایک شخص ہے سچّا، ہر ایک جھُوٹا ہے

لہو میں ڈوبے کبوتر فضا میں اُڑتے ہیں
نہ جانے دُور سے کس نے ہمیں پکارا ہے

وہ تپتی ریت کا صحرا ہوں میں حسن رضوی
کہ جس کے ساتھ ہی دریائے نیل بہتا ہے

○

حسن رضوی

اُسی کی چاندنی اب کھل رہی ہے سینے میں
وہ میرا چاند جو نکلا تھا اس مہینے میں

فضا میں چاروں طرف خوشبوؤں کے بادل تھے
عجب مہک تھی ترے جسم کے پسینے میں

ہوا کا بھیس بدل کر اُسے تلاش کروں
وہ بادباں جو مرے ساتھ تھا سفینے میں

نہ جانے کون دِوانہ اِدھر بھی آ نکلے
سجائی ہم نے لطف کی سبیل زینے میں

ہم اپنے شہر میں کاغذ کے گھر بنا کے رہیں
یہی ہے فرق ہمارے تمہارے جینے میں

زمین بانجھ میں دیکھوں تو ایسے لگتا ہے
کہ جیسے سانپ چھپا ہے کسی دفینے میں

حسنؔ کے لفظوں کو کرنوں کی بھیک مل جاتے
کمی نہیں مرے مولا ترے خزینے میں

○

رفعت سلطان

زندگی وقفِ انتظار نہ کر — اب کسی کا بھی اعتبار نہ کر
لوگ تیرا مذاق اُڑائیں گے — اپنی آنکھوں کو اشکبار نہ کر
خوشدلی وقت کی ضرورت ہے — ذکرِ آلامِ روزگار نہ کر
زندہ رہ عزم و اعتماد کے ساتھ — شکوۂ جبر و اختیار نہ کر
تجھ پہ لازم ہے احترامِ قلم — شاعری وقفِ شہریار نہ کر
اب تری عافیت اسی میں ہے — دوستوں کا بھی اعتبار نہ کر
غور سے دیکھ زرد چہرے بھی — صرف نظّارۂ بہار نہ کر
آرزوئیں فریب دیتی ہیں — آرزوؤں کو بے کنار نہ کر

نااُمیدی گناہ ہے رفعتؔ
اپنے دل کو گناہگار نہ کر

○

رفعت سلطان

تُو مجھے وہ نظر عطا کر دے
خاک کو بھی جو کیمیا کر دے

میں نہ اپنے لیے دُعا مانگوں
میرے حق میں یہی دُعا کر دے

اُس کو کس نام سے پکاریں ہم
زہر سی شئے جو مُسکرا کر دے

بے حسی موت سے بھی بدتر ہے
تُو مجھے درد آشنا کر دے

میرے مسلک میں مانگنا ہے حرام
جو بھی دے، خود مجھے بلا کر دے

سوچ کر یہ خموش بیٹھا ہوں
تُو نہ توہینِ التجا کر دے

میرے گھر کا چراغ گُل کر کے
کیا خبر اور کیا ہَوا کر دے

دل بے مُدّعا ہے مجھے رفعتؔ
شاید اک روز اولیاء کر دے

○

کسریٰ منہاس

کچھ کہا بھی نہیں ہے زباں سے — بات پہنچی وہ اُن تک کہاں سے
جو کہے دیدۂ خونچکاں سے — وہ الگ تو نہیں داستاں سے
آنکھوں آنکھوں میں سمجھا گئے وہ — رہ گئے تھے جو پہلو بیاں سے
برق اب اور کیا ڈھونڈتی ہے — اُٹھ رہا ہے دُھواں آشیاں سے
مِٹ گئے ہیں جو راہِ طلب میں — کیا غرض ان کو نام و نشاں سے
داغ کہتے ہیں میری جبیں کے — ربط گہرا تھا اُس آستاں سے
کچھ سمجھ کر ہی اہلِ چمن اب — بدگماں ہو گئے باغباں سے
ہے بدلنے کو شاید زمانہ — آ رہے ہیں وہ نظرِ مہرباں سے
اور بھی کچھ ہیں منزل کی راہیں — رُخ بدل کر چلو کارواں سے
کر گئیں آشیاں کتنے روشن — ٹوٹ کر بجلیاں آسماں سے
غم زدہ ہو گئے وہ بھی سُن کر — چند ٹکڑے مری داستاں سے

ہم قفس پُوچھتے کیا ہیں کسریٰ
بے نیازِ غمِ آشیاں سے

ناصر شہزاد

○

حسرتِ عہدِ وفا باقی ہے
تیری آنکھوں میں حیا باقی ہے

بات میں کہنہ روایات کا لُطف
ہاتھ پہ رنگِ حنا باقی ہے

ابھی حاصل نہیں ظالم کو دوام
ابھی دُنیا میں خدا باقی ہے

بُجھ گیا، گِر کے خُنک آب میں چاند
سطحِ دریا پہ صدا باقی ہے

گوپیاں ہی کسی گوکل میں نہیں
بَنسیوں میں تو نوا باقی ہے

پاؤں کے نیچے سرکتی ہوئی خاک
سر میں مسند کی ہوا باقی ہے

بیچ میں رات، بچن، بیتے مِلن
اوٹ میں جلتا دیا باقی ہے

دیکھ یہ چاند، ندی، پھُول.. نہ جا
رُت میں رس، شب میں نشہ باقی ہے

○

دھیان کس سرسوتی کا لاگا
مَن میں سنگیت کا جادو جاگا

مانیئوں بیٹھی ہُوئی دُلہن کا
لڑکیاں آئیں بٹھانے آگا

جیونوں، جنموں کے سنجوگ ہیں دیکھ
دِل کے بندھن نہیں کچّا دھاگا

"پریتما لوٹے پپیہے نے کہا"
"کاہن آئے، کہیں بولا کاگا"

لج لگے ہائے ری مت پوچھ سکھی
رات کیوں وہ مرے پیچھے بھاگا

ناصر شہزاد

بیتے کئی جنم، کٹیں صدیاں، برس گئے
جگ جیونوں سے بن ترے نیناں ترس گئے

باغوں میں باس، رنگ جزیروں کے آس پاس
جھونکے ہُوا کے ہو کے ترے ساتھ مس گئے

سوچا تو سامنے تھے، نظر کے سجن سکھی
دیکھا تو پاؤں لاج سے مٹی میں دھنس گئے

اِن برجیوں میں بکھرے ہیں مجبور واقعے
قلعے یہ، جن کی شمعوں پہ چہرے جُھلس گئے

زر کی ہوس بڑھی تو لگی کھیتیوں کو کھاد
گندم سے اُٹھتی خوشبوئیں، گنے سے رس گئے

بھونرے نے اُس کو دیکھا، کہا آ کنول مُکھی
جگنو دراز زُلف کے گھونگھر میں پھنس گئے

چنتا چتا سمان ہے سنجوگ جوگ کی
بھوڑی* میں بھولے پی، ہری ہرنے میں بس گئے

بنسی تھی اک عجب، بجی رستوں رُتوں کے بیچ
سپنوں کو سیج، نیند کو دو نین ڈس گئے

ٹک چُھپ کے وہ ملن، ندی، باغیچے، پھُول، ہم
دن دڑشنوں کے بن کے کہیں خار دھُس گئے

* گدڑی

○

تاج سعید

بند دریچوں کے کمرے سے پروا یوں ٹکرائی ہے
جیسے دل کے آنگن میں دکھیا نے تان لگائی ہے

پیڑوں کی خاموشی سے بھی دل میرا گھبراتا ہے
صحرا کی ویرانی دیکھ کے آنکھ میری بھر آئی ہے

دل کے صحرا میں یادوں کے جھکڑ ایسے چلتے ہیں
جیسے نین جھروکا بھی اُس پریتم کی انگنائی ہے

اپنے دل میں یادوں نے زخموں کے پھول کھلائے ہیں
جسم کی اس دیوار کے اندر کس نے نقب لگائی ہے

پتّا پتّا شاخ سے ٹوٹے، دروازوں پر وحشت سی!
یارو پریم کتھا میں کس نے درد کی تان ملائی ہے

دریا دریا ناؤ بہے تو گوری گیت پروتی جائے
اُن گیتوں کی تان امر ہے، جن کا رنگ جدائی ہے

پنچھی کی چہکار ہمیشہ جنگل کو گرماتی ہے!
خلقِ خدا نے اپنے دل میں بس یہی یاد بسائی ہے

قدم قدم دُکھ درد کے سائے، شہر ہوئے ویرانے بھی
کس نے دیس کے پھولوں پر اب ہجر کی راکھ اُڑائی ہے

○

تاج سعید

جی میں آتا ہے کہ چل کر جنگلوں میں جا رہیں
نت نئے موسم کے بھی ہمراہ وابستہ رہیں

آتی جاتی رُت کو دیکھیں اپنے چشم وگوش سے
موسموں کے وار سہہ کر بھی یونہی زندہ رہیں

پھُول پھل پودے پرندے ہمدم و دمساز ہوں
ان میں بستے ہی بھلے لیکن نہ یوں تنہا رہیں

شہر کے دیوار و در ہر اک سے ہیں ناآشنا
شہر میں رہتے ہوئے کیونکر نہ بیگانہ رہیں

بے مروّت ہے زمانہ اس کا شکوہ کیوں کریں
اپنے اندر کے مکیں کا بن کے ہمسایہ رہیں

جسم کے اندر غموں کی آندھیاں چلتی رہیں
ظاہری صورت میں سب چہرے تر و تازہ رہیں

دیکھتے ہی جس کو سب محرومیاں کافور ہوں
دل میں طوفاں سے اُٹھیں چہرے مگر سادہ رہیں

مسئلہ یہ بھی تو ہے اس عہد کا اے جانِ جاں
کیوں نچھاور جاں کریں کس کے لیے زندہ رہیں

اُڑتے لمحوں کو اگر قابو میں کرنا ہے سعید
بھاگنے کو ہر گھڑی ہر وقت آمادہ رہیں

O

سرفراز قریشی

یہ کوہسار کے بادل فلک کے ہمسائے
بجز ہوا اُنھیں زنجیر کون پہنائے

بنا ہے دیدۂ انجم تراش خود پردہ
نگارِ صبح ستاروں میں کیا نظر آئے

ترے تبسمِ پنہاں کی موج کیا کہنا
ہزار رنگ کے آنچل فضا میں لہرائے

حیات ریت کا ساحل نہیں بجا، لیکن
یہ بحرِ غم کے تھپیڑے، یہ دُود کے سائے

اس ایک سال میں رونا پڑا ہے کس کس کو
اس ایک سال میں کیا کیا نہ چاند گہنائے

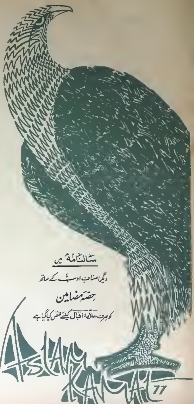
نہ جانے دن کے اُجالوں پہ آج کیا گزری
لہو میں ڈوب کے اُبھرے ہیں شام کے سائے

لبوں کو سی لے پر ایسے میں کیا کرے کوئی
جہاں نگاہ سراپا سوال بن جائے

بدل رہے ہیں خس و خار سبز پیراہن
عجب نہیں مرے صحرا میں بھی بہار آئے

ہے جوئبار میں شاخوں کا عکس یوں جیسے
شبِ بہار میں گلیوں کے رینگتے سائے

تری عطا، تری بندہ نوازیوں کے طفیل
ہر اک مقام پہ ہم سرفراز کہلائے


سالنامہ میں
دیگر اصنافِ ادب کے ساتھ
حصّۂ مضامین
کو صرف علامہ اقبال کیلئے مختص کیا گیا ہے
Aslam Kamal 77

اقبال کا جشنِ صد سالہ

قدرت اللہ شہاب

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم ایک ایسے سال سے گذر رہے ہیں، جس میں عالم اسلام کے ایک بطل جلیل علامہ اقبال کا صد سالہ یوم پیدائش پاکستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی شایان شان طور پر منایا جا رہا ہے۔

اس ایک سال میں علامہ اقبال کی زندگی، شاعری اور فلسفے پر اتنا کچھ لکھا، پڑھا اور بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بعد میرے جیسے کم علم اور کوتاہ عمل بندہ ناچیز کے لئے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ ہاں اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ اس سارے سال کی گہما گہمی، محفل آرائی، قلم کاری اور شعلہ بیانی کے بعد قوم کا انفرادی اور اجتماعی شعور کیا کیا دیرپا اثرات قبول کرتا ہے؟ علامہ اقبال کا سال منانے کا مقصد اقبال کی عزت افزائی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نام اور کلام اور پیغام کو سربلندی کی ان حدود میں پہنچا دیا ہے جہاں انسان کی کوشش نہ اسے بڑھا سکتی ہے نہ گھٹا سکتی ہے۔ ایسی تقریبات سے اگر کسی کو شرف حاصل ہوتا ہے تو وہ خود ہمیں کو ہے۔ لیکن شرف بڑائے شرف بے معنی رہے گا اگر اس کے دامن میں اس گوہر مقصود کی تھوڑی بہت جھلک نہ ہو جو اقبال کے سارے کلام اور پیغام کا نچوڑ تھا۔ اگر یہ تقریبات نشستند و گفتند و برخاستند تک ہی محدود ہو کے رہ گئیں تو یہ ولولہ انگیز سال بھی یوں ہی نکل جائے گا جیسے سنگلاخ چٹان پر پانی کا ریلا گذرتا ہے اور اپنے پیچھے گھاس کا ایک تنکا بھی سرسبز نہیں کرتا۔ اس کے بعد مزید ایک سو برس کون انتظار کرے گا کہ ایسا ہی مبارک سال ہمیں دوبارہ نصیب ہو۔ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک!

یوں تو علامہ اقبال کے کلام میں دینی، دنیاوی، روحانی، مادی، سیاسی، سماجی، اخلاقی اور آفاقی قدروں کے بے شمار پہلو ہیں۔ لیکن آج کے ماحول میں اگر اقبال کی یاد خلوص نیت سے ہمیں ایک اور صرف ایک سوال کا جواب ڈھونڈنے کی طرف مائل کر دے، تو یہ اس سال سعید کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ یہ سوال یوں تو ابجد کی طرح بالکل سیدھا اور سادہ ہے لیکن ہمارے پیچ در پیچ معاشرے نے اس میں سمندروں جیسی اتھاہ گہرائی پیدا کر رکھی ہے۔ جواب دینے پر آئیے تو ایک طفل مکتب بھی اس کا جواب بڑی آسانی سے بنوک زبان دے سکتا ہے لیکن سوچ میں پڑ جائیے، تو بڑے بڑے اہل علم و فن، ارباب عقل و دانش، صاحب تجارت و ثقافت و سیاست و ذکاوت سالہا سال اس کے گرداب میں ڈبکیاں کھاتے رہتے ہیں۔ کم از کم پاکستان میں تو ہم تیس برس سے اس گرداب میں ڈبکیاں ہی ڈبکیاں کھا رہے ہیں۔ وہ سادگی و پرکاری کا سوال جس کے سمندر کو علامہ اقبال نے ایک لافانی مصرع کے کوزے میں بند کر دیا ہے، یہ ہے۔

تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

اگر قیامِ پاکستان کے وقت علامہ اقبال بقیدِ حیات ہوتے تو شاید وہ بانگِ درا سے اپنے اس مصرع کو حذف کر دیتے۔ کیونکہ دولت خداداد میں اللہ کے فضل و کرم سے ہم سب کلمہ گو مسلمان ہیں۔ صرف ہم ہی نہیں، بلکہ ہم نے تو ایک عظیم مملکت کو کلمہ طیبہ کی پکار پر حاصل کیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جب بُرا وقت آیا، تو اگر کچھ ٹوٹا تو فقط پاکستان ٹوٹا۔ اور ہماری کلمہ گوئی پر خدا کبھی آنچ نہ آئی۔

پورے تیس برس سے ہم امورِ سلطنت میں سازش، نظم و نسق میں ظلم و ستم، خدمت میں خیانت، سیاست میں رقابت، ثقافت میں کثافت، بیج میں جھوٹ، دودھ میں پانی، آٹے میں ریت، مرچوں میں پسی ہوئی اینٹوں، ہلدی میں گل زرد، چائے کی پتی میں سڑے ہوئے چمڑے کا برادہ، نمک میں کنکر، معاشیات میں طبقاتی کشمکش، قومی یک جہتی میں علاقائی عصبیت اور منصب میں ذاتی مصلحتوں کی ملاوٹ کرنے میں بڑی تن دہی سے مصروف ہیں۔ لیکن اس سے نہ ہمارے ایمان میں لغزش آئی ہے، نہ ہمارے مسلمان ہونے پر کوئی ضرب پڑی ہے۔ ہمارے یقینِ محکم کی مضبوط چٹان پر نہ شرابِ ناب کے پے در پے ریلوں نے کوئی چھینٹے اڑائے ہیں، نہ چنگ و رباب نے اسے غافل کیا ہے، نہ رقص و سرود نے اسے صراطِ مستقیم سے بھٹکایا ہے۔ ہم جوں کے توں مسلمان کے مسلمان ہی ہیں۔ نماز پڑھیں نہ پڑھیں، نماز کی تلقین ضرور کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیں نہ دیں، زکوٰۃ دینے کی نیت نیک رکھتے ہیں۔ دنیا میں کسی جگہ ایسے مسلمان نہیں بستے، جو ہماری طرح صبح و شام، دن رات، ماہ بماہ، سال بسال اس قدر بلند آواز سے اسلام، اسلام، اسلام کا نعرہ لگاتے ہوں۔ یہ تو ٹھہری ہماری مسلمانی۔ باقی رہا پاکستان۔ پاکستان کا حال بھی ماشاء اللہ بُرا نہیں۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے، کہ ملک اکثر بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں، پھیلتے بھی رہتے ہیں، سکڑتے بھی رہتے ہیں۔ اب اگر پاکستان بھی پہلے سے نصف رہ گیا ہے، تو اس جرمِ عظیم کو بھی ہم نے تاریخی عمل کا نام دینا شروع کر دیا ہے۔ اس سے نہ ہماری حب الوطنی پر کوئی حرف آتا ہے۔ نہ ہماری غیرت چیلنج ہوتی ہے۔ نہ ہمارے جذبۂ ایمان کا کچھ بگڑتا ہے۔

ہمارے ان کارناموں کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ اگر ان سب کو ایک ایک کر کے گنوانے بیٹھیں تو قصہ بہت طولانی ہو جائے گا۔ لیکن ابھی تو ـــــ

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اگر ہمارے ماضی کے کارناموں کا سلسلہ لامتناہی ہے، تو ہمارے مستقبل کے عزائم، دعووں اور منصوبوں کی لسٹ بھی کچھ کم طویل نہیں۔ ان سب پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر بے اختیار علامہ اقبال کا یہ ارشاد یاد آتا ہے۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں کہ یہ چار سو بدل جائے

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

آج کے پاکستان میں ہماری سب سے بڑی ضرورت اپنے آپ کو بدلنے کی، اپنے چار سو ماحول کو بدلنے کی اور اپنی آرزوئیں بدلنے کی ہے۔ افراد میں ذاتی طور پر اس تبدیلی کے بغیر نہ جماعتوں میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے، نہ قوم میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے، نہ ماحول میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے۔

انسان کے لئے اپنے انفرادی وجود میں تبدیلی پیدا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ سوچ دبا کر کھٹ سے بجلی کا بلب روشن کرنا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ کرنٹ آ رہی ہو۔ اس کرنٹ کو پیدا کرنے والی مشین ہر اچھے اور برے، نیم اچھے اور نیم برے انسان کے اپنے سینے میں لگی ہوئی ہے۔ وہ اس کا دل ہے۔ اگر یہ کمپیوٹر ایک رخ پر چلے تو انسان احسن التقویم کا درجہ پاتا ہے دوسرے رخ پر چلے تو وہ اسفل السافلین بن جاتا ہے۔ اس عجیب و غریب مشین کو صراط مستقیم پر گامزن رکھنے کے لئے ہمیں دو چیزیں عنایت ہوئی ہیں۔ ایک نماز۔ دوسرے قرآن حکیم۔

ایک بار ایک لاابالی قسم کے آزاد منش نوجوان طالب علم نے علامہ اقبال سے کہا کہ نماز پڑھنا فرض تو ضرور ہے۔ لیکن اکثر اوقات نماز میں نہ حضوری حاصل ہوتی ہے۔ نہ خضوع و خشوع میسر آتا ہے۔ ایسی بے کیف و بے سرور نماز بار بار پڑھنے سے کیا فائدہ؟

علامہ اقبال نے پوچھا، کیا تم کبھی کسی گانے بجانے کی محفل میں شریک ہوتے ہو؟
نوجوان نے تسلیم کیا کہ وہ کئی بار رقص و سرود کی محفلوں میں بیٹھ چکا ہے۔

علامہ اقبال نے فرمایا کہ تم نے دیکھا ہوگا کہ گانا شروع ہونے سے پہلے سازندے بڑی دیر تک ٹوں ٹاں کر کے ساز ملاتے رہتے ہیں۔ کبھی سارنگی والا تار ڈھیلے کرتا یا کستا ہے۔ کبھی طبلے والا طبلے کو آزماتا ہے۔ شائقین کے لئے یہ مرحلہ بڑا بے کیف اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بغیر موسیقی کا تال اور سر ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ نماز بھی ایسی ہی ڈرل ہے۔ اس امید پر کہ شاید کبھی دل کا سر کسی سرمدی تان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ یوں بھی فرض تو صرف نماز کا پڑھنا ہے۔ دل کا لگنا فرض نہیں۔

اسی طرح ایک بار علوم مشرقی کے ایک غیر ملکی عالم نے علامہ اقبال سے سوال کیا کہ کیا آپ واقعی یہ مانتے ہیں کہ قرآن حکیم ایک تخلیقی وجدان کے طور پر ظہور میں نہیں آیا تھا، بلکہ اس کا ایک ایک لفظ اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا؟

علامہ نے جواب دیا، میرا پختہ ایمان ہے کہ قرآن حرفاً حرفاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔

سوال کرنے والے نے اس یقین کے متعلق کوئی دلیل مانگی تو علامہ اقبال نے جواب دیا، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تو بڑی عظیم ذات ہے۔ میں ایک گناہگار انسان اور شاعر ہوں۔ لیکن کبھی کبھی تو مجھے بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے اشعار کا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر یوں اتر رہا ہے جیسے ٹین کی چھت پر بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گرتے ہیں۔

یہ بھی ہماری خوش نصیبی ہے، کہ ہدایت و حکمت کی ایسی عظیم الشان کتاب پڑھنے اور نماز کے ذریعہ علم و عرفان کی سیڑھیاں

چڑھنے پر ہمیں پورا اختیار اور آزادی حاصل ہے۔ اس کے لئے نہ تو ہمیں کسی کی خوشامد کرنا پڑتی ہے درخواست دینا پڑتی ہے نہ کوئی پرمٹ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ نہ کسی افسر کی اجازت مانگنی پڑتی ہے۔ نہ کسی پیر فقیر کے حکم کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ نہ ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ نہ فیس ادا کرتے ہیں۔ نہ چلّہ کاٹتے ہیں۔ اگر ان نعمتوں کی ارزانی کا احساس عام ہو جائے۔ تو جس طرح کے کیو اب سینما گھروں کے باہر نظر آتے ہیں، اس سے بھی زیادہ لمبی قطاریں مسجدوں کے سامنے لگنا شروع ہو جائیں گی۔ اگر کبھی پاکستان میں ایسا ہوا، تو اس ارض پاک میں صرف تیل ہی نہیں بلکہ قناعت کے دودھ اور فضیلت و طمانیت کے شہد کی نہریں بھی بہنے لگیں گی۔ کیونکہ علامہ اقبال کے الفاظ میں یہ اللہ تعالےٰ کا اپنا وعدہ ہے کہ

کی محمد سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے سعادت مندانہ ملاقاتیں

مولانا غلام مرشد

خاکسار کو علامہ اقبالؒ کی زیارت کا شرف اُس تعلیمی زندگی میں حاصل ہو چکا تھا۔ جو اکتوبر ۱۹۱۱ء سے اگست ۱۹۱۲ء تک منشی فاضل اور مولوی فاضل کے نصاب میں مہارت پیدا کرنے کے لئے گزرا جو پنجاب یونیورسٹی کا اس وقت مروجہ سلیبس تھا۔ اس کی تکمیل کے لیے میں نے کام کیا۔ جس کی تدریس کا فرض یونیورسٹی نے اورینٹل کالج کے سپرد کیا ہوا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور دارالعلوم نعمانیہ ہند کے صدر مدرس (پرنسپل) مولانا غلام رسول صاحب گجراتی اور مدرسہ حمیدیہ کے پرنسپل مولانا محمد ذاکر صاحب بگوی اور مفتی عبداللہ ٹونکی کی خاص توجہ اور التفات سے دونوں کام پایۂ تکمیل کو متوقع عزت کے ساتھ پورے ہوئے۔ اور فاضلیت کی سندیں حاصل کیں اور ۱۵-۱۹۱۴ء کو دورۂ حدیث کی سند حاصل کرنے کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تھے۔ اُس کے بعد وہ اپنی حریت پسندی کی وجہ سے اسیرِ مالٹا ہو گئے۔ وہ دورۂ حدیث کے قابلِ اعتماد تلامذہ سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی بیعت لیتے تھے۔ جس کا شرف خاکسار کو بھی حاصل ہوا۔ سالانہ امتحان میں اللہ کے فضل و کرم سے نہ صرف فرسٹ رہا۔ بلکہ ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ یہ مستند ترین سندیں حاصل کرنے کے بعد اجمیر شریف میں جو نظام حیدر آباد (دکن) نے دارالعلوم قائم کیا اور جس کے وائس چانسلر نظامِ دکن کی طرف سے مولانا انوار اللہ مدار المہام امورِ مذہبیہ تھے اور پرنسپل مولانا معین الدین تھے۔ علمائے خیرآباد میں مولانا عبدالحق خیرآبادی جو مولانا فضل الحق خیرآبادی جو جنگِ آزادی میں گرفتار ہوئے اور جن کو دریائے شور کی سزا ملی اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔ ان کی ساری علمی وراثت اور ہزاروں احترام کے قابل حضرت مولانا ابوالبرکات ٹونکی، انہوں نے فلسفہ قدیم ہیئت اقلیدس اور منطق کی تمام قلمی اور غیر قلمی کتابیں یونیورسٹی کے سپرد کر دیں۔ جو حیدر آباد (دکن) کے کتب خانے میں تھیں۔ میں نے دو سال وہاں رہ کر عقلیات کے اُس نصاب کو مکمل کیا اور سالانہ امتحان میں فرسٹ آیا۔ اور ممتحنِ اعلیٰ ابوالبرکات ٹونکی صاحب نے میرے پرچے پر یہ سنہری حروف رقم فرمائے کہ اگر امتحان کا قانون مقررہ کئے ہوئے نمبروں سے زیادہ نمبر کی اجازت دیتا تو میں اس طالبعلم کو بجائے سو نمبروں کے ۱۱۰ (ایک سو دس) نمبر دیتا۔ وہاں سے فراغت کے بعد اپنے مرحوم والد کی اُس وصیت پر عمل کیا، جو میری ایک سال کی عمر میں انہوں نے اپنے مرشدِ کامل خواجہ اللہ بخش صاحب تونسویؒ سے یہ کہا تھا کہ میں اپنے لڑکے کو انگریزی حکومت کے کسی محکمے میں خصوصاً فوج میں بھرتی نہیں کراؤں گا۔ اور آپ کے اس ارشاد کے مطابق کہ خواستہ حرام ناخواستہ حلال کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی حاصل کردہ تعلیم کا کسی پرائیویٹ درس گاہ میں درس دوں گا۔ چنانچہ پہلے سیال شریف ضلع سرگودھا میں جو ضیاء العلوم کے نام سے درس گاہ قائم تھی۔ حضرت خواجہ اللہ بخشؒ کے جانشین حضرت حامد میاں کے حکم کے مطابق درس دیا۔ پھر انھیں کے حکم سے سور کی تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا میں اپنے مرحوم و مغفور کے وفات پا جانے کی وجہ سے ان کے عزیز ان کی تعلیم کی تکمیل کے لئے

وہاں درس دیتا رہا ۔ اس درس گاہ کو اس وقت خدا نے بہت عزت بخشی کہ شمالی ہندوستان کے بہت سے طالب علم داخل ہوئے اور دورۂ حدیث کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ یہاں رہ کر خلیفہ شجاع الدین مرحوم و مغفور کی ترغیب پر آل انڈیا مسلم لیگ کا ممبر ہوا ۔ اور جمعیت العلمائے ہند دہلی کی طرف سے صوبائی جمعیت کا صدر مقرر ہوا اور پنجاب خلافت کمیٹی کا وائس پریذیڈنٹ ڈاکٹر کچلو کی گرفتاری کے بعد منتخب کیا گیا ۔ جس کے پریذیڈنٹ مولانا عبدالقادر قصوری تھے ۔ جو مسٹر محمود علی قصوری بیرسٹر کے والد ماجد تھے ۔ اور ملک لال خان مرحوم جس کے سکریٹری تھے ۔ یہ کمیٹی ستم رسیدہ ترکوں کی حمایت و امداد کے لئے قائم کی گئی تھی ۔ اور جس گہری اور دوربین چال سے ٹرکی کا عروج ختم ہوا ۔ وہ ظاہر تھی ۔ اسی انگریز نے خلافت کمیٹی کو ناکام بنانے کے لئے یہاں معززین کو انعامات اور خطابات کے لالچ دے کر خرید لیا اور ان خرید شدہ بزرگوں نے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ان کی طرف سے اس قسم کے مضامین شائع کرنے شروع کر دیئے کہ قریشیوں کے سوا اسلام میں خلافت کا کوئی حق دار نہیں ۔ یہاں تک کہ اس اخبار نے خود بھی ایسے افتتاحی اور شذرات لکھنے شروع کر دیئے جن کا عنوان "الائمۃ من القریش" یہ جب پیغمبر کا اعلان موجود ہے کہ میرے بعد خلیفہ اور امام قریشی ہوں گے ۔ پنجاب کمیٹی کے مرحوم صدر نے مجھے یاد فرمایا کہ ہماری تحریک کو ناکام بنانے کی جو انگریز نے سازش شروع کی ہے کیا آپ اس سازش کو ناکام کر سکتے ہیں میں نے ایک ہفتے کی مہلت مانگی "تاکہ اِس روایت کا تجزیہ کیا جائے ۔ میری اطلاع دینے پر کمیٹی نے بھاٹی دروازہ کے باہر ایک پبلک جلسے کا اعلان کر دیا اور میں نے اللہ کی توفیق سے اس پبلک جلسے میں تقریر کی ۔ یہ میری پہلی سیاسی تقریر تھی ۔ اور اخبار زمیندار کے نمائندوں کے سوا دوسرے اخباروں کے نمائندے بھی موجود تھے ۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کا نمائندہ بھی شامل تھا اور مسلمانوں کا انگریزی اخبار مسلم آؤٹ لک جو مولانا عبدالحق کی زیر قیادت نکل رہا تھا ۔ اس کے نمائندے بھی شامل تھے ۔ اسے ایک تاریخی اجلاس کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا خاکسار نے اس پُر امن جلسے میں اُس حدیث کا پورا تجزیہ کیا اور ثابت کیا کہ یہ حدیث نہ روایتاً صحیح ہے نہ درایتاً صحیح ۔

۱۔ یہ الفاظ صحیح بخاری اور مسلم میں موجود نہیں اور جن صحیحین کے سوا جن بزرگ محدثین نے اس روایت کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے ۔ ان کی سندوں کے جو سلسلے بھی بیان کئے ہیں ۔ ہر سلسلے میں کوئی نہ کوئی بدترین کذب کا مرتکب ہے روایت کا تو یہ حال ہے

۲۔ درایتاً کہ قرآن نے جو مسلمانوں کو اعلیٰ اقتدار امامت، امارت، خلافت کی بشارت دی ہے ۔ اس میں ہاشمیت اور قریشیت کی کوئی تمیز نہیں (سورہ چوبیس[۲۴] آیت پچپن[۵۵]، پارہ اٹھارہ[۱۸] رکوع تیرہ[۱۳]) اور جن بزرگ مسلمانوں نے قریشیت کو خلافت کی شرط قرار دیا ہے ۔ جو اپنے دور میں بہت معزز و محترم محقق سمجھے جاتے تھے ۔ اور بڑی بڑی عقائد کی کتابوں کے مصنف بھی تھے ۔ حضرت علامہ تفتازانی کی شرح مقاصد سے کون بے خبر ہے اور میر سید شریف جرجانی کی شرح مواقف سے اور حضرت شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ سے کون ناواقف ہے ۔ بلاشبہ انہوں نے اپنی کتابوں میں شرائط خلافت کے متعلق جو لکھا ہے ۔ ان شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ قریشی ہو ۔ مگر یہ حضرات خود یہ نظریہ اپنے دور کی غیر قریشی حکومتوں کے دوران میں کیوں نہ پیش کر سکے ؟ حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۱۱ جلد دوسری)

۳۔ ان ترکوں کی شرافت اور دیانت کا یہ حال ہے کہ انہوں نے ترکی میں اپنے دور کے بہت بڑے مجاہد عثمان کے عہد میں حکومت عثمانیہ کی بنیاد رکھی اور اقتدار اعلیٰ کے مالک ہو گئے ۔ مگر جب تک کہ حکومت عباسی کا دور قائم رہا ۔ وہ انہیں خلیفہ تسلیم کرتے رہے ۔ اور سلیم الاوّل کے دور میں تمام اسلامی سلطنتوں نے ان کو خلافت کا اعزاز بخشا ۔ یہ واقعہ ۱۷ مئی ۱۵۱۲ء کو پیش آیا ۔ عثمان کے اقتدار کی بنیاد

۲۸ ستمبر ۱۲۹۹ء کو پڑی .... بہر ان کے اسی اعزازنہ کی خاطر مسلمان اپنے جمعوں اور عیدین کے خطبوں میں انھیں کا نام لے کر ان کی فتح و کامرانی کی دعائیں مانگتے رہتے تھے۔

اس پہلی سیاسی تقریر کے بعد علامہ اقبال سے اس خاکسار کو یاد فرما کر شاباش دی اور میری پورے مجمع کے سامنے یہ پہلی ملاقات تھی۔

(۲)

دوسری اہم ملاقات کا شرف تقریباً سال بھر کے بعد ہوا۔ علامہ اقبال نے اس خاکسار کو علامہ سے والہانہ عقیدت مندی رکھنے والے مسٹر محمد دین تاثیر (جو بعد میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے) کے ذریعہ بلوا بھیجا۔ علامہ اقبال کو ڈاکٹر تاثیر سے پرخلوص محبت تھی اور اگر یہ کسی وجہ سے ان کے پاس نہ جاتے تو ان کو بہت بے چینی ہوتی تھی۔ خاکسار نے کناری بازار کی اونچی مسجد میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کو قرآنی ہدایات کا درس دینا شروع کیا ہوا تھا۔ اور انھیں اجازت دے رکھی تھی کہ انھیں جو شبہات قرآنی تعلیم کے متعلق پیش آئیں۔ انھیں درس کے اختتام کے بعد پیش کریں۔ چنانچہ انہوں نے ماسٹر عبد اللہ چغتائی اور ڈاکٹر نذیر احمد پشنر گورنمنٹ کالج کے ساتھ مل کر قرآنِ کریم کی کتابت کے متعلق سوال پیش کیا۔ خاکسار تقریباً ایک ہفتے تک اس سوال کا جواب دیتا رہا۔ اس علمی گفتگو کا علم علامہ اقبالؒ کو ڈاکٹر تاثیر کے ذریعے ہوگیا اور اپنے حاضرینِ مجلس کے سامنے اپنے مخلص احباب کی موجودگی میں یہ بحث شروع ہوگئی۔ خاکسار نے پوری تفصیل کے ساتھ اس کا جواب عرض کیا۔

۱۔ قرآنِ کریم نے کتابت کے جتنے لوازم ہیں۔ انھیں ذکر کر دیا۔ جو آج تک تسلیم کئے جاتے ہیں۔ قلبی خیالات و معلومات کو قلم کے ذریعے قلم بند کرنا (سورہ نمبر ۹۶ آیت نمبر ۴ و ۵) یعنی جس خدا نے تم پر قرآنِ کریم ایسی انمٹ کتاب بھیجی ہے۔ اسے قلم بند کرنے کے لئے قلم بھی عطا فرمایا۔ اور ان آخری مکمل اور واضح ہدائتوں کو قلم بند کرنے کے لئے کاغذ سے بھی نوازا اور ان کے قلم بند کرنے کے لیے خوبصورتی کے لیے سیدھی لائنوں میں لکھنے کے اسباب بھی فراہم کر دیئے (سورہ نمبر ۵۲ آیت نمبر ۲، ۳ کتاب مسطورٍ فی رق منشورٍ) اور ان انمٹ ہدایاتِ خداوندی کو تمہیں پوری طرح پڑھانا اور یاد کرانا نہیں ہے۔ بلکہ اُن کو ترتیب وار لکھوانا اور تفصیلات بیان کرنا بھی ہے (سورہ نمبر ۷۵ آیت نمبر ۱۷-۱۸-۱۹) اسی "رق منشور" کی تفسیر ایک ایسے لفظ سے کی جو آج تک مروج ہے۔ قرطاس ابجد (سورہ نمبر ۶ آیت نمبر ۷)۔

۲۔ قیصر و کسریٰ وغیرہ کی حکومتوں نے جو کھلی تجارت کی تحریری اجازت جو حضرت ہاشم کے چاروں بیٹوں کو دے رکھے تھے۔ وہ بھی قلموں سے لکھے ہوئے تھے اور اُس دَور کے مروّجہ کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نبوت و رسالت سے نوازا جانے سے پہلے بیس برس کی عمر میں بنی قیس اور بنی کنانہ میں جو جنگ ہوئی جسے حربِ فجار کہتے ہیں۔ اس کے بعد جو معاہدہ طے پایا تھا۔ جو تاریخ میں حلف الفضول کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ بھی قلم سے لکھا گیا تھا۔ اس معاہدے میں آپؐ نے نہ صرف شرکت فرمائی۔ بلکہ اس معاہدے کا مضمون بھی تیار فرمایا۔ جس کی دو شقیں بہت مشہور ہیں۔ فریقین میں ہر ایک فریق جو حربِ فجار میں شامل ہوئے تھے۔ وہ مظلوم کی حمایت کرے اور دوسری شق اس معاہدے کو توڑنے والے اور ظلم و ستم

کرنے والے کو مکے میں داخل ہونے سے روک دیا جائے۔ آپؐ نے رسالت اور ختم نبوت سے نوازے جانے کے بعد کئی بار اس معاہدے کا تذکرہ فرمایا۔ نہ صرف تذکرہ فرمایا۔ بلکہ یہ بھی فرمایا کہ ان شرائط پر آج بھی اگر کوئی مجھ سے معاہدہ کرنا چاہے تو میں تیار ہوں (طبقات ابن سعد)۔ پھر جب مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ تو وہاں کے امن پسند قبائل سے تحریری معاہدے کئے! اور صلح حدیبیہ کے معاہدے کو کون نہیں جانتا ہو ۶ ہجری میں ہوا۔ یہ بھی کاغذ پر تحریر تھا۔ پھر صلح حدیبیہ دو درجن کے قریب کسریٰ و قیصر اور دوسرے سلاطین کو گرامی نامے لکھے۔ جن میں ان کو اسلام کی دعوت دی۔ ان کے لئے تو کاغذ مل گیا۔ نہیں ملا تو قرآن کے لکھنے کے لئے۔ نیز حضورؐ کی تشریف آوری سے قبل جب تمام عرب کا ایک بڑا اجتماع حج کے موقع پر ہوا۔ جس میں زمانہ جاہلیت کے قصیدوں کا انتخاب کیا گیا۔ سات قصیدوں کا انتخاب کیا گیا جن میں پہلا قصیدہ امراؤالقیس کا ہے۔

۳۔ علامہ ابن ندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں اپنے پہلے مقالے کے پہلے فن میں ایک عنوان لغات الامم من العرب والعجم واقلامہا وانواع خطوطہا واشکال کتاباتہا قائم کیا۔ جس میں اس نے ثابت کیا ہے۔ مختلف حالتوں میں اور سائزوں میں ہزاروں سال سے قسم قسم کے کاغذات موجود تھے۔ ان میں مصر کے ترقی یافتہ کاغذ کی نوعیت پر اچھی بحث کی ہے۔ ایرانیوں اور رومیوں نے اپنی ذلیل ترین شکستوں کا انتقام لینے کے لئے اسلام کا لباس اوڑھ کر اس قسم کی حدیثیں وضع کرنی شروع کر دیں کہ عام لوگ ان متضاد روائتوں سے متاثر ہو کر حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم اور خاتم الکتب قرآن مجید کی عظمت ان کے دلوں سے اُٹھ جائے۔ کیونکہ ان کو جو شکست ہوئی قرآن کی بدولت ہوئی۔ چنانچہ سب سے زیادہ جو حدیث کی مستند ترین کتابوں میں آئی وہ یہ ہے کہ حضورؐ کے وصال تک کوئی بھی حصہ قرآن کا جمع نہیں ہوا۔ اور اُسی زید ابن ثابت کے ذریعے مشہور ہوا کہ آپ کے دَور میں قرآنِ پاک اپنے طور پر بعض صحابۂ کرام نے ہڈیوں پر، چیتھڑوں پر، پتوں پر اس کے کچھ حصّے لکھوا رکھے تھے سب سے پہلے جنگ یمامہ میں حفظ قرآن کی نعمت سے مالا مال ہوئے تھے۔ حفاظ وسیع پیمانے پر اس جنگ میں قتل ہوئے اور ان محدثین کے قول کے مطابق انھیں قرآنِ کریم کے مٹ جانے کا خطرہ لاحق ہوا حضرتؓ نے جمع قرآن کی تجویز حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش کی۔ جو ردّ و قدح کے بعد منظور ہوئی۔ اور حضرت زید ابن ثابت انصاری کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ جو اپنے طور پر ہر قسم کی لکھی ہوئی تحریریں پیش کریں اور ان کی نگرانی میں قراطیس بھی مل گئے۔ یہی نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے اور حضرت عمرؓ کی نگرانی میں رہا۔ انہوں نے وفات کے وقت اپنی صاحبزادی ام المومنین حفصہؓ کے سپرد کیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد جب حضرت عثمانؓ کو علم ہوا۔ کہ لوگوں نے اپنے طور پر بھی قرآن کے بعض حصّے اپنی خود ساختہ تفسیروں کے ساتھ بنا کر لکھ رکھے ہیں۔ لہٰذا حضرت ام المؤمنین حفصہؓ سے وہ قرآن کا مستند نسخہ منگوا کر ایک بارہ آدمیوں کی کمیٹی میں پیش کر دیا اور حکم جاری کیا کہ جس جس کے پاس جو بھی قرآن کا حصّہ لکھا ہوا ہے۔ وہ اس کمیٹی کے سامنے پیش کرے۔ پھر اس معیار پر جن کی اپنے طور پر تحریر کی ہوئی آیتیں اور تفسیریں منطبق نہ ہوئیں تو انھیں جلا کر ان کی راکھ کو دفن کر دیا اور اس مستند نسخے کی متعدد مستند نقلیں کروا کر اپنی سلطنت کے اسلامی ممالک کے ہر صوبے میں بھیج دیں اور گورنروں کو ہدایت کی کہ جو بھی عالم قرآن کے درس دینے پر متعین ہو۔ وہ اس نسخے کو ہمیشہ نظر رکھے۔ اور اپنی وفات تک قرآن حکیم کے ان مستند نسخوں کو

مدرسین کی تشریحات سے پاک رکھا اور اگر تم بضرورت تشریح کرو تو ان تشریحات کو قرآن حکیم کا جز نہ بننے دیں۔

ڈاکٹر اقبال نے اس خاکسار کا امتحان لینے کی غرض سے تاریخی شہادت طلب فرمائی جس کے جواب میں خاکسار نے یہ عرض کیا کہ قرآن کریم کی جمع اور ترتیب کو قرآن کے بدترین مخالف بھی تسلیم کرتے تھے۔ یہی ہدایات کو یہ شخص یعنی سرکار دو عالمؐ ہدایات خداوندی کے نام سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ در حقیقت ہماری نظروں میں پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ جنہیں اس نے لکھوا لیا ہے اور جو صبح و شام اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں۔ (سورہ نمبر ۲۵ آیت نمبر ۵ پارہ ۱۹ رکوع ۱۴) اور اس تاریخی واقعہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب مختلف ممالک کی طرف سے حضور کی خدمت میں وفدوں کی شکل میں وفد آئے اور ان میں سے ایک ثقیف کا وفد تھا۔ سرکار دو عالمؐ اس وقت قرآنِ کریم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپ نے اپنا فرضِ تلاوت ختم فرمایا۔ تو ان سے معذرت کی کہ تمہیں میرے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے انتظار کرنا پڑا۔ جب میں اس قرآن پاک کی تلاوت شروع کرتا ہوں اور جب تک اس حصے کو ختم نہ کر لوں میں کسی سے بات نہیں کرتا۔ چنانچہ تم سے زیادہ تعداد میں لوگ مسجد میں قدیم ترین اور مخلص ترین مسلمان بھی اسی انتظار میں تھے۔ وفدِ ثقیف نے گرویدگی اور محبت سے قرآن پاک کی روزانہ تلاوت کے متعلق آپؐ کا فرض پوچھا۔ آپؐ کی عادت پوچھی۔ تو فرمایا۔ ایک دن سورہ فاتحہ سے شروع کر کے سورۃ النسا کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور دوسرے دن سورۃ مائدہ سے شروع کر کے سورۂ توبہ کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں۔ تیسرے دن سورۂ یونس سے شروع کر کے سورۃ نحل کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور چوتھے دن سورۃ بنی اسرائیل سے شروع کر کے سورۃ الفرقان کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں، اور پانچویں روز سورۃ شعرا سے شروع کر کے سورۃ یٰسین کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور چھٹے دن سورۃ والصافات سے شروع کر کے سورۃ الحجرات کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور ساتویں دن سورۃ قٓ سے لے کر سورۃ والناس کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں۔ یہ بے مثل قرأت صدیوں تک علما کی نظر میں تحزیب کے نام سے مشہور تھی۔ آپ کے دریافت فرمانے پر خاکسار نے عرض کیا کہ اس بے مثل قرأت کا تذکرہ صحاح ستہ میں سنن ابو داؤد میں موجود ہے۔ پھر فرمایا کہ ان روایات کا کیا بنے گا۔ جن میں بڑے زور شور سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی جمع و ترتیب کا ولولہ صحابۂ کرام کے دلوں میں جنگ یمامہ میں بہت سے قاریوں کے شہید ہونے سے پیدا ہوا۔ خاکسار نے گزارش کی کہ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں عرض کروں گا کہ یہ روایات بھی مسلمانوں کو قرآن کریم سے منحرف کرنے کے لئے گھڑی گئی تھیں۔ بڑے زوردار الفاظ میں یہ اعلان موجود ہے کہ یہ اٹل حقیقت اور ناقابلِ تردید صداقت ہے کہ صرف ہمیں نے اس قرآن کو اتارا ہے۔ جو قیامت تک انسانوں کو ان کے فرائض کی یاد دہانی کراتا رہے گا۔ اور یقیناً یقیناً ہم ہی اس کی قیامت تک حفاظت کرتے رہیں گے اور عرض کیا کہ اس قسم کی احادیث قرآن کے مقابلے میں کون پیش کر سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ فریب کار اپنے فریب کارانہ اور ابلیسانہ شکل میں ایسی حدیثیں وضع کریں اور ہمارے سادہ لوح انسان ان پر بحثیں کریں کسی میں حضرت ابو بکرؓ کی منقبت ہو۔ کسی میں حضرت علیؓ کی اور حدیثیں گھڑنے والے ان دونوں کے لئے متضاد حدیثیں وضع کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو حیرانگی میں ڈال دیتے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے چھ برس تک اس قسم کی احادیث کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس لئے ان کے دور میں قرآن حکیم تھا اور جگہ جگہ اس کی ہر قسم کی

تعلیم کا انتظام تھا۔ وہاں قرآن نے جن اوامر اور نواہی کی کوئی خاص کیفیت، کمیت، ہیئت اور وضع اور شکل متعین نہیں فرمائی اور حضورؐ کو حکم دے دیا کہ جو ان اوامر اور نواہی کی تفصیلات حالات کے مطابق آپ چاہیں متعین فرما دیں اور آپ کے متبعین کا فرض ہے کہ اس اسوۂ حسنہ کی تعمیل کریں۔ ہاں! اگر آپ کے جانشین اپنی مجلس شوریٰ کے ساتھ مل کر کچھ تبدیلی کرنا چاہیں۔ تو تبدیلی کر سکتے ہیں جیسے خود حضورؐ نے مالِ غنیمت کی تقسیم میں بدر سے لے کر حنین تک متبادل صورتوں میں تقسیم کیا۔ محدثین کے اسی جمع و تدوین کے کارنامے جو مسلمانوں کی محض سلفِ صالحین کی محبت کی وجہ سے سرانجام پائے وہ آخر پہلی دفعہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ذریعہ پھر اس جمع و تدوین کے سلسلے میں جب خارجی اور رافضی کے دو متضاد فرقے پیدا ہو گئے۔ جو افتراق سے قبل ان مسلمانوں کے قتل عام کا موجب بنے جو صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان میں سے دو جنگیں جنگِ جمل اور جنگ صفین کے نام سے مشہور ہیں۔ ان دونوں جنگوں میں تقریباً نوے ہزار آدمی قتل ہو گئے۔ اور جب ان کے منشا کے خلاف صلح ہو گئی۔ جو ان کے مشن کے خلاف تھی وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ حمایت کرنے والے شیعہ کہلائے اور شدید ترین مخالفت کرنے والے خارجی پھر ان کی آپس میں جنگ ہوئی۔ جسے جنگِ نہروان کہتے ہیں۔ اور تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمان مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہو گئے اور وہ اپنے تفرقے میں کامیاب ہو گئے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں جو احادیث کی صحت و عدم صحت کی منظم کوشش شروع ہوئی وہ بھی بے وقت ہونے کی وجہ سے ناکام رہی۔

(۳)

علامہ مغفور نے اپنا خاص قاصد بھیج کر فوری طور پر پہنچنے کا حکم دیا۔ جب یہ خاکسار اس حکم کی تعمیل میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں پہنچا۔ دیندار علماء، وکلاء مخلص احباب، جن میں جج صاحبان بھی موجود تھے۔ خاص طور سے جسٹس دین محمد صاحب موجود تھے۔

ان دنوں ان کے عقیدت مند دوست اور خدام ۱۹۲۶ء کے الیکشن کے لئے آپ کو پنجاب کونسل کی لاہور سیٹ سے انتخاب میں حصہ لینے کے لئے تیار کر رہے تھے۔ اتنے بڑے بزرگوں کے اجتماع کو دیکھ کر ایک گونہ حیرت بھی ہوئی۔ اور ایسے وقت میں یاد فرمائی پر تعجب بھی ہوا۔ میرے جانے پر ان بزرگوں کے جمع کو دو حصوں میں بٹا ہوا دیکھا۔ جو قرآن کریم کی بعض آیات کے منسوخ ہونے پر بحث فرما رہے تھے۔ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ علامہ نے پیار سے فرمایا "بدّو مولوی میرے پاس آجاؤ اور تم بھی حصہ لو" میں نے دونوں طرف کے اکابر کی طرف اشارہ کرتے عرض کیا کہ آپ اور ان بزرگوں کی موجودگی میں اس نو عمر خاکسار کو جس کی عمر زیادہ سے زیادہ چھبیس سال ہے۔ اتنے اہم مسئلے میں کیسے حصہ لے سکتا ہے۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ "میں حکم دیتا ہوں کہ آپ بھی اس سلسلے میں اظہار خیال کریں" خاکسار نے گزارش کی کہ آپ کو اور ان بزرگوں کو معلوم ہے کہ قرآن کریم میں نسخ آیات کا ذکر ضرور موجود ہے۔ بلکہ تبدیلی آیات کا بھی (سورۃ نمبر ۲ آیت نمبر ۱۰۶ پارہ پہلا رکوع ۱۳ (اور) سورہ نمبر ۱۶ آیت نمبر ۱۰۱ پارہ ۱۴ رکوع ۲۰) نسخہ کا لفظ عرب کئی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کتابت یعنی لکھنا۔ (سورۃ نمبر ۴۵ آیت نمبر ۲۹ پارہ ۲۵ رکوع ۲۰) تحویل و انتقال۔ ان معنوں میں بھی ان دونوں بزرگ جماعتوں کو معلوم ہے کہ وراثت کی کتابوں میں تناسخ المیراث کا ایک مستقل باب ہے یعنی ترکے کا انتقال غالباً اسی معنی کو پیشِ نظر رکھ کر ہندوستان کے ہندوؤں میں ایک عقیدہ آواگون کا سلسلہ جاری ہے۔ تیسرا معنی ازالہ و محو (مٹا دینا) (سورۃ نمبر ۲۲ آیت نمبر ۵۲ پارہ ۱۷ رکوع ۱۴) آیاتِ خداوندی کا لفظ بھی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً مناظرِ قدرت اور

تاریخی قوموں کے آثار قدیمہ (سورۃ نمبر ۱۷ آیت نمبر ۲۲ پارہ ۱۵ رکوع ۲) و (سورۃ نمبر ۱۶ آیت نمبر ۱۱-۱۲-۱۳ وغیرہ) و (سورۃ نمبر ۲۶ آیت نمبر ۸ پارہ ۱۹ رکوع ۱) و آیت نمبر ۶۷ رکوع ۴، و آیت نمبر ۱۰۳ رکوع ۵، و آیت نمبر ۱۲۱ رکوع ۶ و آیت نمبر ۱۳۹ رکوع ۷، و آیت نمبر ۱۵۸ رکوع ۸ و آیت نمبر ۱۷۴ رکوع ۹ و آیت نمبر ۱۹۰ رکوع ۱۰) سورۃ شعرا آیت نمبر ۱۲۹ پارہ ۱۹ سورۃ نمبر ۲۶) یہ آیات مثالیں ہیں۔

سلسلۂ رسالت کے شروع ہونے سے لے کر آخر تک جو خدا کی طرف سے نبیوں کی وساطت سے قوموں کو ہدایت دی گئیں چنانچہ حضرت آدمؑ کو جب وحی نبوت کے ذریعے چند انمٹ ہدائیتیں دیں۔ تو ان کی تعبیر آیات اللہ سے کی (سورۃ نمبر ۲ آیت نمبر ۳۹ پارہ پہلا رکوع ۴) (و) سورۃ نمبر ۷ آیت نمبر ۳۵ پارہ ۸ رکوع ۱۱ (و) سورۃ نمبر ۷ آیت نمبر ۱۰۳ پارہ ۹ رکوع ۳) اور حضرت نوحؑ کے تذکرے میں (سورۃ نمبر ۱۰ آیت نمبر ۱ پارہ ۱۱ رکوع ۱۲)۔

آپ کی تشریف آوری سے قبل انمٹ ہدائتیں اللہ پاک کی طرف سے نبیوں کے ذریعہ سے دی گئیں۔ وہ تو ان کی وفات کے بعد ان کے خود غرض، دین فروش مذہبی پیشواؤں نے دولت مندوں اور حکومتوں سے پیسے بٹورنے کے لئے فراموش کر دیں اور عوام کے دلوں سے ان کے نقش و نگار مٹا دیئے۔ ان احکام خداوندی کی جگہ اپنی پیشوائیت کو قائم رکھنے کی غرض سے کچھ احکام خود گھڑ لئے۔ ان مذہبی پیشواؤں کے مخترع احکام کی تعبیر بھی آیاتِ ربانی سے کی اور انھیں آیات اللہ کہنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر خدا کے پیدا کئے ہوئے بعض جانوروں اور زمین کی پیداوار کے ایک حصے کو اپنے خود ساختہ معبودوں کے لئے مخصوص کر دیا۔ اسی طرح اپنی اولاد خصوصاً بعض بیٹوں کو قتل کر دینے کے احکام جاری کر دیئے اس سے دیوی اور دیوتا خوش ہوتے ہیں۔ یہ ہدائتیں تھیں۔ اسی طرح بعض چارپاؤں پہ سواری یا ان سے کام لینے کو ممنوع قرار دے دیا اور بعض مردار جانوروں کا گوشت کھانا حلال ٹھہرا دیا اور بعض جانوروں سے استفادہ عورتوں کے لئے حرام کر دیا اور مردوں کے لئے حلال کر دیا (سورۃ نمبر ۶ آیت نمبر ۱۳۱-۱۳۷ پارہ ۸ رکوع ۳) اس قسم کی افترا پردازانہ احکام کا تذکرہ (سورۃ نمبر ۵ آیت نمبر ۱۰۳ پارہ ۷ رکوع ۴) اسی طرح یہودیوں کی اصلاح کے لیے وقتی طور پہ جو حکم جاری کیا کہ ناخن دار جانوروں اور گائیوں اور بکریوں کی مخصوص چربیوں کا استعمال تمہارے لئے حرام (سورۃ نمبر ۶ آیت نمبر ۱۴۷ پارہ ۸ رکوع ۵ (و) سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۱۰۷ پارہ ۶ رکوع ۲) اس قسم کے وقتی احکام کو بھی مذہب کا دائمی حکم ٹھہرا دیا۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ منسوخ شدہ آیتوں سے قرآن کی آئتیں مراد نہیں بلکہ پہلے مذہبی پیشواؤں کے من گھڑت احکام کا نسخ یعنی ملیامیٹ کرنا مراد ہے اور جن احکام خداوندی کو انہوں نے اپنی دین فروشی کے ماتحت دین فروشی کی غرض سے یعنی مذہبی سیادت کو قائم رکھنے کی غرض سے اپنے عوام کے دلوں سے ان کے نقوش تک مٹا دیئے تھے۔ میری سمجھ میں یہی آتا ہے اور قرآن نے انمٹ اور ابدی احکام جن کے نقوش تک یہ مذہبی پیشوا مٹا چکے تھے۔ انھیں صحیح شکل و صورت میں پیش کر دیا۔ جنھیں تمام پیغمبر پیش کرتے رہے تھے۔ سب سے زیادہ زور قرآن نے شرک کے مٹانے پر دیا۔ جسے تمام پیغمبر اپنے اپنے وقت میں مٹاتے رہے وہ شرک شفاعت میں ہو یا عبادت میں ہو۔ یا حکم میں ہو۔ قرآن نے سارا زور اسی پر دیا ہے۔ قرآن نے ان کی خود ساختہ اور ان کے

مذہبی دین فروش پیشواؤں کے احکام جو خدا کے نام پر پیش کرتے تھے۔ جن سے وہ بگڑ کر معاذاللہ آپ پر افترا پردازی کی تہمتیں لگاتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے (سورۃ نمبر ۱۶ آیت نمبر ۱۰۱ پارہ ۱۴ رکوع ۲۰) کہ جب بدلتے ہیں ہم کسی حکم کو ان کے خود ساختہ مذہبی احکام کی جگہ تو وہ چیخ چیخ کر یہ پکارتے ہیں "کہ تو فقط افترا پرداز ہے۔" اگلی چار آیتوں میں ان کی افترا پردازیوں کی مزید تفصیل فرمائی ہے اور (سورۃ نمبر ۲۲ کی آیت نمبر ۵۲ پارہ ۱۷ رکوع ۱۴) بڑی وضاحت کے ساتھ اعلان فرما دیا کہ ہم نے تم سے پہلے جب کبھی اپنا رسول بھیجا اور اس نے اپنی قوم کو میری آیتوں کے سنانے کا سلسلہ شروع کیا، تو شیطان سیرت مذہبی پیشواؤں نے آیات کے سلسلے میں اپنے مروجہ احکام کی آڑ لے کر ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کیں۔ لیکن ہم نے ان کی رکاوٹوں کو ملیا میٹ کر دیا اور پھر اپنے رسول کے ذریعے دی ہوئی انمٹ ہدایتوں کو لوگوں کے دلوں میں مستحکم اور مضبوط منقش کر دیا اور پارہ پہلا سورہ دو کے پہلے رکوع کی پہلی آیت میں مسلمانوں کو حضور کے حق میں ذو معنی الفاظ استعمال کرنے کے لئے سختی سے مخالفت فرمائی۔ بلکہ اس کو کفر قرار دیا۔ رکوع کی دوسری آیت میں یعنی ۱۰۵ میں اہلِ کتاب اور مشرکوں کو بدترین دشمنی اور افترا پردازی سے فراموش کرائے ہوئے کسی حکم کو فراموش ہو جانے کا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ تو ان سے بہتر یا ان جیسا حکم تمہارے ذریعے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یعنی ان کے افترائی احکام میں سے جو کسی موزوں شکل میں قائم رکھے جا سکتے تھے انھیں اچھی سے اچھی شکل دے کر پیش کر دینے اور جو کسی ہئیت صورت، کیفیت کی تبدیلی کے قابل نہیں ہوتے۔ انھیں سرے سے مٹا کر ان کی جگہ بہتر سے بہتر احکام صادر فرما دیتے ہیں۔

خاکسار کی یہ تقریر میر محفل کے احترام کی وجہ سے نہایت خاموشی سے سنی گئی۔ مگر آپ نے فرمایا کہ آیاتِ قرآنی کے نسخ کا مسئلہ کیسے پیدا ہو گیا؟ خاکسار نے عرض کیا کہ نسخ پر مسلمانوں نے جو کتابیں لکھی ہیں خود ان میں سے علمائے کرام کے ایک فریق نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ان آیات میں ان احکام کی نسخ کا ذکر ہے جو پہلی امتوں کے پاس من گھڑت مذہبی احکام یا وہ فروعات ہیں جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جن کا تذکرہ آٹھویں یا پانچویں پارہ کی سابقہ آیات میں عرض کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں قرآن نے پیش کی ہے (سورۃ نمبر ۳ آیت نمبر ۴۹ پارہ ۳ رکوع ۱۲) میں نے اپنی بساط کے مطابق اس مسئلے پر مسلمانوں کی جو کتابیں پڑھی ہیں۔ جن میں سے مشہور کتاب 'الناسخ والمنسوخ' امام ابو جعفر النحاس المتوفی ۳۳۸ ہجری مطبوعہ مصر (۱۳۲۳) اس کے بغور مطالعہ کرنے سے یہ چند باتیں ظاہر ہوتی ہیں:۔

۱۔ پورے قرآن میں کسی آیت کو دوسری آیت سے منسوخ کرنے کا تذکرہ تک نہیں۔

۲۔ کسی آیت کے منسوخ ہونے کے متعلق یا ناسخ ہونے کے متعلق کوئی ایسی روایت صحیح مرفوع موجود نہیں۔ جو محدثین کے نزدیک قانونِ روایت کے مطابق صحیح ہو۔

۳۔ صحابہ کرام کے نام پر موقوف روائتیں موجود ہیں۔ لیکن متضاد۔

۴۔ پہلے پارے کی نسخ کی آیت کے ساتھ نسیان آیات کا بھی ذکر ہے۔ جس کی خود قرآن کریم نے بڑے زوردار الفاظ میں تصدیق کر دی ہے۔

خدا کی پڑھائی ہوئی آیتوں کے متعلق حضور کا نسیان کا شکار ہونا خود قرآن کریم کی آیت کے اعلان کے خلاف ہے (سورۃ نمبر

۸۷ آیت نمبر ۶ پارہ ۳۰ رکوع ۱۲)۔

۵۔ منسوخ آیات قرآنی معاذ اللہ مخترع تعداد میں بے حد اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا ارشاد ہے (سورۃ احزاب ۳۳، سورۃ بقرہ کے برابر تھی، حالانکہ سورہ بقرہ کی آیتوں کی تعداد ۲۸۶ ہے اور سورہ احزاب کی صرف ۷۳، جو سیکڑوں سے متجاوز ہو جانے کے بعد پھر گھٹنی شروع ہوئی۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب الاتقان میں ان کی منسوخ آیتوں کی تعداد بیس متعین کی اور انہوں نے اسے اپنی کتاب میں منظم شکل میں پیش کیا۔ تائیسواں حصہ صفحہ ۳۱۴۔ بعض بزرگ ایسے پیدا ہوئے۔ جنہوں نے فرمایا کہ جابر کافروں کے ظلم و ستم سہتے ہوئے صبر کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ ایک سو چوبیس آیتوں کو آیت سیف نے منسوخ کر دیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ بعض بزرگ اس کا یہ خیر میں یہ عجیب بات لکھ گئے کہ (سورۃ نمبر ۷ کی آیت نمبر ۱۹۹ پارہ ۹ رکوع ۱۴) تین فقروں کی جو آیت ہے۔ ان میں سے دو فقرے منسوخ اور درمیانہ فقرہ غیر منسوخ۔

۶۔ نسخ کا سوال آیات کے تضاد پر موقوف ہے اور قرآنِ کریم نے تضاد کی پوری نفی کر دی ہے۔ بلکہ خود قرآن نے تضاد نہ ہونے کو اپنے کلام کی دلیل بنایا ہے۔ (سورہ نمبر ۴ آیت نمبر ۸۲ پارہ ۵ رکوع ۸) اور تضاد کے متعلق علم ادب و علم منطق کا یہ فیصلہ ہے:

در تناقض ہشت وحدت شرط داں
وحدتِ موضوع و محمول و مکاں (مبتدا و خبر)
وحدت شرط و اضافت جزو کل
قوت و فعل است در آخر زماں (فعل)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اعلان فرمایا کہ اس اہم مضمون کی تکمیل آئندہ ملاقات میں ہوگی (یعنی آٹھ دن کے بعد) بعض جدید و قدیم تعلیم یافتہ بزرگوں نے عرض کیا کہ ہمیں چند سوالات پوچھنے کا موقع دیا جائے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس کا بھی اسی دن موقع ملے گا۔ یعنی آٹھ دن کے بعد۔

(۴)

سب سے پہلے ان بزرگوں نے اپنے افکار اور سوالات کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد مجھے ارشاد فرمایا۔ جس پر میں نے عرض کیا کہ اُن بزرگوں کے ارشادات زیادہ تر اس بحث کے متعلق جو ہمارے پیشواؤں نے کتابیں لکھی ہیں۔ ان پر مبنی ہیں اور کسی بزرگ نے کسی آیتِ قرآنی کے نسخ کے متعلق نہ تو قرآنِ کریم کی کسی آیت کو پیش فرمایا ہے اور نہ اپنی عقیدت مندی کی بنا پر غیر معصوم بزرگوں کے اقوال درج کئے ہیں ایک طرف تو وہ متضاد ہیں جو کسی ایک آیت کو منسوخ کہہ رہا ہے۔ دوسرا اس کو ناسخ تبلا رہا ہے۔ جس کی شہادت میں خاکسار اپنے ساتھ کتابُ الناسخ و المنسوخ' مصنفہ ابو جعفر نحاف متوفی ۳۳۸ ہجری اور امام ابن خدیمہ کی کتابُ الناسخ والمنسوخ' مطبوعہ مصر لے کر گیا تھا۔ ان کے صفحات پڑھ کر سنائے، جن میں سے ایک ایک آیت کے نسخ کے سلسلے میں بڑے بڑے اماموں کے پانچ پانچ اقوال ہیں۔ جن پر ایک جگہ خود علامہ ابن نحافؒ نے یہ لکھا کہ کسی آیتِ قرآنی کو اس وقت تک منسوخ نہیں کہا جا سکتا جب تک کوئی دوسری آیتِ قرآنی جسے ناسخ قرار دیا جاتا ہے۔ اُس کی ہر حیثیت سے متضاد نہ ہو۔ (کتاب الناسخ والمنسوخ ص۱۲)۔

اور یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کی دو آیتوں کا ملنا محال ہے اور یہ قرآن اسی عدم تضاد کو انمٹ احکام خداوندی کا مجموعہ ہونے کی دلیل ٹھہراتا ہے (سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۸۲ پارہ نمبر ۵ رکوع ۸) اور ہمارے ان بزرگوں نے جن غیر معصوم بزرگوں کی کتابوں کو اعتقاد کی سند دے رکھی ہے۔ ان میں سے امام بخاریؒ کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ جو بظاہر موقوف ہے۔ حضرت عمرؓ پر وہ پیش فرمائی ہے۔ اگر اس کو مرفوع بھی فرض کیا جائے تو خود اس کے، دونوں جملوں میں تضاد ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ شادی شدہ زناکاروں کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد ان کو سنگسار کر دیا جائے۔ لیکن میں اس پر بھروسہ رکھ کر قرآن میں نہیں لکھوانا چاہتا اور نہ اس کے لکھنے کو حضور نے پسند فرمایا۔ اس تضاد کی موجودگی میں اس غیر یقینی روایت کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے اور نہ اس میں موجود ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ جب قرآن کریم کی کوئی آیت یا سورت حضورؐ پر نازل ہوتی تھی تو ایک طرف تو معجزانہ رنگ میں حضور کے ذہن میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ دوسری طرف حضور اسی قرآن کریم کی کتابت کرنے والوں میں سے جو بزرگ ڈیوٹی پر موجود ہوتے تھے۔ ان سے لکھوا لیتے تھے۔ حق یہ ہے کہ جب مکہ معظمہ میں سرکار دو عالم پر سورہ نمبر ۶ مکہ میں بیک وقت نازل ہوئی۔ جس کی آیتیں ایک سو چھیاسٹھ ۱۶۶ ہیں اور ۲۰ رکوع ہیں، اس وقت حضورؐ نے قرآن کریم کے جو کاتب ڈیوٹی پر تھے۔ اسی ترتیب سے پڑھ کر جس طرح خداوند کریم نے پڑھائی تھی لکھوا دی۔ ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں یہ موجود ہے کہ یہودی حضورؐ کی عدالت میں شادی شدہ زناکار مرد اور عورت کو لائے اور ان کا جرم ثابت ہو گیا کیونکہ حضورؐ نے ہر مذہب کی رعیت کو اجازت دے رکھی تھی، کہ ان کے دیوانی اور فوجداری مقدمات ان کے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ ہوں گے، تو حضورؐ نے پوچھا کہ تمہاری مذہبی کتاب تورات میں اس جرم کی کیا سزا لکھی ہے تو انہوں نے غلط بیانی سے کام لے کر کہا کہ ہم اس کو کوڑوں کی سزا دیتے ہیں اور اسے رسوا کرتے ہیں۔ اسی محفل میں حضرت عبداللہ بن سلام موجود تھے۔ جو پہلے پکے یہودی عالم تھے۔ ان کی اس غلط بیانی کو وہ برداشت نہ کر سکے اور عرض کیا کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ تورات منگوائی گئی اور حضرت عبداللہ بن سلام نے اس میں سے رجم کی آیت پڑھ کر سنائی۔ اس ثبوت کے مل جانے کے بعد حضورؐ نے تورات کی آیتِ رجم کے مطابق ان کو سزا دی۔ آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ان بزرگوں نے جن کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ ان میں کوئی ایک حدیث مرفوع صحیح تک موجود نہیں ہے۔ چہ جائیکہ قطعی ہو اور خود ان بزرگوں نے اپنے غیر معصوم مذہبی پیشواؤں کی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ انہیں میں یہ درج ہے کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ اور نہ کسی آیت نے اس کو منسوخ کیا یعنی قرآن کی کسی آیت نے کسی آیت کو منسوخ نہیں کیا ہے۔ بلکہ کتابی اور غیر کتابی غیر مسلم جماعتوں کے گمراہ کن زرپرست مذہبی پیشواؤں نے اپنے من گھڑت احکام کو خدا تعالیٰ کے احکام کا نام دے رکھا تھا۔ اور دیدہ دانستہ خدا پر افترا باندھتے تھے۔ جہاں تک جن انمٹ احکام کی خداوند کریم نے ہر رسول کے ذریعے ہر مذہب کی تعلیم دی تھی۔ وہ بھی انہوں نے فراموش کر دی۔ چنانچہ سب سے بڑا حکم جو ہر نبی کے ذریعے خداوند کریم نے دیا۔ وہ توحید فی الصفات توحید فی العبادات اور توحید فی الحکم کا حکم دیا تھا۔ وہ انھیں ایسا فراموش ہوا۔ کہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدا تعالیٰ کے صفات و عبادت و حکم میں شریک کر دیا۔ (تفسیر اتقان تصنیف امام سیوطی شافعی ۸۷۸ ہجری و مطبوعہ ۱۲۸۰ھ مطبع احمدی دہلی صفحہ ۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴) یہی وجہ ہے۔

اس گفتگو کے بعد مجلس برخاست ہوئی۔

(۵)

۲۶ء کے الیکشن میں خاکسار بھی دوسرے مخلص ورکروں کی طرح شامل تھا۔ تقریباً ہر انتخابی جلسے میں جہاں ملک لال دین قیصر گلے نئی اپنی شاعرانہ سحر بیانی سے ان محفلوں کو گرما دیتے تھے۔ خاکسار بھی اپنی استطاعت کے مطابق ان محفلوں کو ارائیں اور کشمیری برادری کے سوالات سے بالاتر رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ میں اس الیکشن کو اسلام اور کفر کا مقابلہ کہہ کر تعارف کراتا تھا۔ ملک محمد دین ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور علامہ اقبال مرحوم کا تعلق کشمیری برادری سے تھا ان کو معلوم تھا کہ ارائیں برادری کے ووٹوں کی تعداد اسی حلقے میں کشمیری برادری سے کہیں زیادہ ہے۔ اس واسطے میں ارائیں اور کشمیری تفرقے سے بالاتر رہ کر علامہ مغفور کی حمایت میں اپیل کرتا تھا۔ اس عرصے میں متعدد مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کیونکہ ہر رکن ان کے فرمان کے بموجب ہر روز اپنی اپنی کارکردگی پیش کرتا تھا۔ وہ یہ روئداد سنتے تھے اور تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ ایک دن رات کے دس بجے ان کا نمائندہ خاکسار کے مکان پر تشریف لایا اور حکم دیا کہ آپ کو صبح علامہ صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ ان کی قیام گاہ پر پہنچ کر بلوا بھیجنے کی حکمت معلوم ہوئی۔ بڑے مشفقانہ اور ہمدردانہ انداز میں یہ سوال فرمایا کہ آپ نے خلافت کمیٹی کا عہدہ دار ہونے کے باوجود تحریکِ ہجرت کی مخالفت کیوں کی؟ میں نے عرض کیا کہ خاکسار اس تحریک کو گاندھی مہاراج کی ایک بدترین چال سمجھتا تھا، کہ جو ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں انھیں شدھ کر لیا جائے گا۔ باقی جو ہیں ان کو دیس نکالا دے دیا جائے گا۔ کابل میں جا کر رہیں یا روس میں رہیں یا مکہ مدینہ جا کر رہیں۔ یہاں ان کے رہنے کی گنجائش نہیں۔ ان کو یہ چیز بڑی ناگوار گزری۔ مگر مجمع میں سکون رہا اور میں نے عرض کیا کہ یہ ہجرت پر آمادہ کرنے والے بڑے معزز اراکین خود کیوں ہجرت نہیں فرماتے اور مجمع کو کہا کہ بلاشبہ ہجرت ناقابلِ برداشت مظالم کے وقت ایک مستحسن فعل ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ غیر مسلم حکومت کے ناقابلِ برداشت مظالم سے تنگ آ کر دوسرے ملک میں جائیں۔ اس غرض سے جائیں کہ ہم اُس ملک میں پناہ گزیں ہو کر قرآنِ حکیم کی انمٹ ہدایتوں کے مطابق باعزت زندگی گزاریں گے۔ جس کی مثال ہجرت حبشہ ہے۔ حضورؐ نے بھی اس کی اجازت دے دی تھی۔ مگر آپ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ جب تک شدید ترین مظالم توڑنے والی حکومت بدل نہ جائے اور منصفانہ حکومت قائم نہ ہو جائے۔ اُس وقت تک اس ملک میں واپس نہ آئیں ورنہ یہی ہجرت اِن کے لئے بدترین ابدی سزا کا موجب ہوگی۔ چنانچہ جہاں مہاتما گاندھی اور ان کے ہم خیال ہم مسلک ان کے چیلے مسٹر پٹیل اور پنڈت نہرو وغیرہ نے شدھی والوں کو وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو شدھ کرنے کے لئے امداد دی اور ہر صوبے میں، ہر بڑے شہر میں بڑے وسیع پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ جن میں سے ایک لاہور کا مشہور ترین فساد حویلی کابلی مل متصل ڈبی بازار و چوک سرجن سنگھ بڑے وسیع پیمانے پر ہوا۔ اور سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس فساد میں مسلمانوں نے کافروں کا رویہ اختیار کیا اور کافروں نے مسلمانوں کا۔ یعنی جس پر ہاتھ اٹھاؤ اُسے جان سے مار ڈالو۔ (اسوۂ نمبر ۴۷ آیت نمبر ۴ پارہ ۲۶ رکوع ۵)۔

اس ناپسندیدہ روش کے نتیجے میں جن ہندوؤں اور مسلمانوں کے چالان ہوئے۔ مسلمانوں ہی کو عدالتوں نے پھانسی کی سزا دی جن میں چنگڑ محلے کا مقدمہ دنیا میں مشہور رہے۔ انھیں ملک گیر فسادات کے دور میں جو مسلمان ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے۔

انھیں کابن کی مہرحد پار کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اس پر علامہ اقبال" بہت ہنسے اور فرمایا کہ قبوں کے گرانے کے خلاف یہاں جو تحریک چلی تھی۔ اس کی تم نے کیوں مخالفت کی۔ حالانکہ سب مسلمان ماتم منا رہے تھے اور تم اکیلے آدمی اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ نجدیوں کے جدِ اعلےٰ امام عبدالوہاب نجدی توحید کے مسئلے میں بڑے متشدد تھے اور یہاں تک کہ بزرگوں کی قبروں کی زیارت کے لئے جانا بھی ان کے نزدیک مشرکانہ فعل تھا۔ ممکن ہے کہ اُسی تشدد کے ماتحت شریف حسین جیسے لوگوں نے مزاروں اور ان پر بنے ہوئے قبوں کی زیارت کو جانے والوں کی مشرکانہ حرکات سے متاثر ہو کر انہوں نے یہ کام کیا۔ کیونکہ نجدیوں سے پہلے حجاز کی امارت کا شرف شریف حسین کو تھا۔ جن کا عرب ممالک میں ترکوں کا اقتدار ختم کرنے میں بڑا دخل تھا اور جو بدترین چال باز انگریز کرنل لارنس سال ہا سال تک اسلام کا مقدس لباس پہن کر ترکوں کے خلاف فضا سازگار کرتا رہا۔ جسے یہ عرب عقل مندی سے شیخ کوبت کے نام سے پکارتے تھے۔ جب حرمین شریفین میں وہ اسلامی لباس اوڑھ کر اسلامی رسوم کے طور پر نماز ادا کرنے کو آتا تھا۔ تو حرم شریف کی مسجد کے امام صاحبان اُس کی اقتدا میں نماز ادا کرتے تھے۔ اور شریف حسین اور اس کے صاحبزادوں پر انگریز کا مطلب برآری کے بعد اعتماد نہ رہا۔ تو نجدیوں کو ان کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی شریف حسین کی کوئی سازش ہوتا کہ ہند کے عوام نجدیوں کے خلاف ہو جائیں۔ اس طرح انگریز کی پھیلائی ہوئی خبروں کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تمام کی تمام صحیح ہوں۔ مگر ان مشکوک خبروں سے متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ تحریک اس وسیع پیمانے پر چل نکلی تھی کہ جگہ جگہ انگریز کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنا پڑی۔ اس لئے نجدیوں کی حمایت میں جو مولانا ظفر علی خان نے جلسہ کرنا چاہا۔ تو وہ جہانگیر کے مقبرے کے صحن میں ہوا۔ خاکسار بھی تماش بین کے رنگ میں اس جلسے کو دیکھنے گیا۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم نے مجھے دُور سے دیکھ کر اسٹیج پر بلا لیا اور تقریر کرنے کی فرمائش کی میں نے وہاں مختصر تقریر کی جو "زمیندار" اور دوسرے اخبارون کے فائلوں میں محفوظ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے :-

اگر نجدی والئی حرمین شریفین کی حیثیت سے، سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے اور ان مشرکانہ رسوم کو مٹانے کی کوشش کرتے۔ تو سب سے پہلے ان مشرکانہ رسوم میں جو لوگ مبتلا تھے۔ ان کے دلوں میں سے شرک اور کفر کے قبے گراتے تو ان سے مضبوط اور مضبوط تر قبوں کے مٹ جانے کے بعد وہ لوگ پتھروں، اینٹوں کے قبے خود مٹا دیتے۔ نبوت کے اکیس سال کے بعد جب مکہ شریف فتح ہوا، تو بعض مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ کعبے کی یہ عمارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی عمارت کے خلاف ہے خلیل اللہ کی عمارت کو کعبے کی موجودہ عمارت سے جس حصے کو باہر نکال دیا گیا ہے اسے حطیم کہتے ہیں۔ اسے بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی طرز پر بنا دیں۔ جس طرح آپ نے بتوں سے کعبے کو پاک کیا۔ ارشاد فرمایا کہ یہ تعمیر اس وقت ہوئی جب میری عمر پچیس برس تھی۔ اور میں نے خود ایک مزدور کی حیثیت میں اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ مجھے اس حصے کے چھٹ جانے کا علم ہے اور اسکی وجہ کا بھی علم ہے۔

چنانچہ حضورؐ کی بات سچی ہوئی تھی۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے حضورؐ کی روکی ہوئی تجویز کے مطابق کعبے کو تعمیر کیا تاکہ لوگوں میں اُسے مقبولیت حاصل ہو۔ ان کی فرضی مقبولیت کو حجاج بن یوسف نے خاک میں ملا دیا۔ جہاں اس کی تحریک ختم ہوئی۔ وہاں اس کی بنائی ہوئی کعبے کی عمارت بھی ختم ہو گئی، اور اس نے اس شکل میں اس کی تعمیر کرائی جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

نے جس کی شکل بدلنے سے پرہیز فرمایا تھا۔ اب تک موجود ہے۔

اس پر خاکسار نے یہ بھی عرض کیا۔ کہ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ خاکسار کو دارالعلوم نعمانیہ ہند کی انتظامیہ کی طرف سے اس تقریر کی تردید کرنے کو کہا گیا۔ خاکسار نے خندہ پیشانی کے ساتھ ان کے نوٹس کی پشت پر لکھ دیا۔ آپ میرا استعفا منظور فرمائیں۔ چنانچہ استعفا منظور ہو گیا۔ اور میں ان طلبہ کو ساتھ لے کر بھاٹی دروازہ کی اونچی مسجد میں آ گیا۔ بھاٹی دروازے کے مخیر لوگوں نے ان کے لئے کتابیں مہیا کر دیں اور ان کے قیام اور طعام کا بھی بندوبست کر دیا۔ جنہیں یہاں باقاعدہ درس دیا گیا۔ جو کورس رہ گیا تھا۔ اس کو مکمل کرنے کے لئے یہاں درس دیا گیا۔ علامہ نے اس موقع پر فرمایا کہ آپ نے اپنے مستقبل کا کیوں خیال نہیں کیا۔ خاکسار نے حضرت علامہ کی ہمدردی کے اظہار پر عرض کیا کہ جو مسبب الاسباب مجھے چند روزہ زندگی عطا کرے گا۔ میری ضروریات کا بھی بندوبست فرمائے گا۔ ان الفاظ پر یہ پانچویں ملاقات ختم ہوئی۔

(۶)

جب گاندھی جی سمیت ہندوؤں کی فریب کاریوں سے ہندو مسلم اتحاد کا تاج محل زمین بوس ہو گیا۔ اب وہی بزرگ اسی فریب کاری کے محل کا میٹیریل ہو تھا۔ شدھی اور سنگھٹن کے تخریب کارانہ اوزار سے ریزہ ریزہ کر رہے تھے اور ملک گیر فسادات کا سلسلہ جاری تھا۔ اس فتنہ پردازی کو مزید فروغ دینے کے لئے ایک طرف ہندو پریس اس ریزہ ریزہ شدہ میٹیریل سے اپنی زمین کو پاک کرنے کے لئے آمادہ کرتا رہتا تھا۔ وہ لگاتار اڈیٹوریل مسلمانوں کے خلاف لکھتے تھے۔ یہ جو کتے سے آئے ہیں وہ کتے جائیں اور جو یہاں کے لوگ مسلمان ہوتے ہیں وہ شدھ ہو کر ہندو ہو جائیں ان کا ہندوستان میں کیا کام ہے۔ مسلمانوں کا نام انہوں نے ملیچھ قوم رکھا ہوا تھا اور شودروں سے بھی ان کو حقیر تر سمجھتے تھے اور اسی پریس میں ان کے لیڈروں کے زہریلے بیانات اسی قسم کے شائع ہوتے تھے۔ دوسری طرف فتنہ انگیز اشتہاروں، پمفلٹوں اور رسالوں کی شکل میں بے پناہ زور سے پروپیگنڈہ کرنا شروع کیا۔ جن میں سے رنگیلا رسول اور ورتمان وغیرہ کی دل آزارانہ روش کی بدولت انگریز کو ان کی ضبطی کے احکام بھی بادل ناخواستہ جاری کرنے پڑے اور پورے پنجاب میں خصوصاً ہندوؤں کے خلاف ایجی ٹیشن غیر منظم طریق پر شروع ہو گیا۔ جس میں مجلس احرار اسلام پیش پیش تھی۔ علامہ اقبال پنجاب کونسل کے ممبر بھی ہو چکے تھے۔ وہ تو کونسل کی ممبری سے قبل بھی ہزار عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور بڑے بڑے سرکردہ مسلمان ان کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کی اس دل آزارانہ کتاب رنگیلا رسول اور اس کے خلاف کی گئی غیر منظم ایجی ٹیشن کو کنٹرول کرنے کے لئے معززین کی ایک جماعت کو بلایا۔ جن میں بڑے بڑے سرکردہ خطابات یافتہ وکلاء اور جج صاحبان کے علاوہ علمائے کرام بھی تھے۔ خاکسار کو بھی اس محفل میں شرکت کے لئے بلایا۔ محفل میں حضور کی عزت و احترام کو قائم رکھنے کے لئے اور آپ کی عزت و ناموس پر حملہ کرنے والوں کے خلاف استغاثہ دائر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ خاکسار نے پوری خاموشی کے ساتھ ان کے اس فیصلے کو سنا۔ مگر آپ نے اپنی خاص کرم نوازی سے خاکسار کو کہا کہ بدر صاحب آپ کیوں نہیں بولتے۔ خاکسار نے عرض کیا کہ مجلس مشاورت کے معززین کے احترام کا تقاضا ہے کہ میں کچھ نہ بولوں۔ مگر آپ نے اصرار فرمایا کہ آپ کو بولنا پڑے گا۔ خاکسار نے ان کی اور ان کی بلائی ہوئی محفل کا احترام کرتے ہوئے عرض کیا کہ کیا ان بزرگوں اور علمائے کرام نے اس طرح

کتاب کا پوری طرح سے مطالعہ فرما لیا ہے؟ ہندوؤں کی ملعون جماعت کے ملعون نمائندے نے اس کتاب میں بھی بڑی فریب کاری کی ہے۔ کیونکہ اس نے اس کتاب میں تمام حوالہ جات مسلمانوں کی کتابوں سے دیئے ہیں، اور استغاثہ میں آپ بزرگوں کی طرح باقی تین جماعتوں کو جو قانونی طور پر مسلمان کہلاتی ہیں ان کے نمائندوں کے دستخط بھی ہونا چاہئیں۔ ورنہ وہ سرمایہ دار ہندو قوم ان جماعتوں کے مسلمانوں کو صفائی کے طور پر شہادت پیش نہ کر دیں۔ اس پر علمائے کرام کچھ ناراض ہوئے کہ ہم تو ان مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں خاکسار نے عرض کیا کہ وہ بھی آپ کو کافر سمجھتے ہیں اور یہاں جو اہلِ حدیث دیوبندیوں، بریلویوں اور شیعوں کی طرف سے نمائندہ کے طور پر موجود ہیں۔ ان کے خود ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے موجود ہیں۔ آپ نے مجھے حکم دیا کہ ابھی استغاثہ ان بزرگوں کے مشورے سے تیار ہوتا ہے۔ جس پر ان کے دستخط ہوں گے۔ آپ ان تینوں جماعتوں کے نمائندوں کے دستخط خود کرائیں۔ خاکسار نے ہامی بھر لی۔ چنانچہ خاکسار نے اس تیار شدہ استغاثے پر لاہوری جماعت کے امیر مولانا محمد علی اور قادیانی کے مرزا بشیر الدین اور چکڑالوی جماعت کے مولانا حشمت علی سے بڑی آسانی سے دستخط کروائے۔ اس طرح یہ استغاثہ مکمل ہو کر اس دور کے مروجہ طریق کار کے مطابق مسٹر فیل بوتھ (اینگلو انڈین) مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ استغاثہ دائر ہونے کے بعد اس استغاثے کے بارے میں کئی دفعہ شرفِ باریابی حاصل ہوا۔ اور وہ حضور اکرم صلعم کی محبت میں پوری طرح مست ہو کر زار و قطار روتے تھے۔ میں نے عرض کیا "آپ غیر معصوم بزرگوں کی تحریروں سے متاثر ہو کر کب تک آنسو بہاتے رہیں گے۔ یہ تو آوے کا آوا ہی خراب ہے۔ آپ کا فرض تھا جو اس ملعون مصنف کے خلاف استغاثہ دائر کر دیا اب فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے اور معجزہ نمائی کرنا خدا کا کام ہے۔ استغاثے کی طرف سے شیخ محمد نصیب ایڈووکیٹ کو منتخب کیا گیا۔ آپ کے حکم اور اصرار پر خاکسار نے عرض کیا کہ آپ اس معزز و محترم وکیل صاحب کو میرے پاس بھیجتے رہیں کہ ان کو استغاثے میں کیا کیا دقت پیش آ رہی ہے۔ خاکسار نے اندازہ کیا کہ وکیل صاحب کا دل بھی حضور کی عزت و احترام سے بھرا ہوا ہے۔ ملعون راجپال نے اپنی صفائی کا بیان دیتے ہوئے یہ کہا کہ میں نے اس کتاب میں تو اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ مسلمانوں کی مستند کتابوں کے حوالے دیئے ہیں اور صفائی کے گواہوں کی فہرست پیش کی۔ جن میں سب سے زیادہ معزز گواہ اس نے پنڈت رام چندر دہلوی کو بنایا! ۔ اس کے لاہور اسٹیشن پہنچنے پر ہندو زعما نے اُس کا بڑی عزت سے استقبال کیا۔ دوسرے دن اس کی شہادت ہونی تھی۔ شیخ محمد نصیب صاحب گوردا سپوری نے علامہ رحمۃ اللہ کے حکم کے مطابق رات کا بیشتر حصہ اس مقدمے کی روئیداد کے بڑے بڑے حصوں کو میرے سامنے پیش کرنے میں گزارا اور صفائی کے گواہوں پر جرح کرنے کے وجوہ دریافت کئے۔ خاکسار نے ان سے عرض کیا کہ آپ حضورؐ کے عشق میں مست ہو کر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کے اس عشق و محبت کو قائم رکھے لیکن جرح کے وجوہ تو صفائی کی شہادتوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ آپ پہلے ہی کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں! چنانچہ دوسرے دن شیخ محمد نصیب صاحب کے ساتھ خاکسار بھی اجازت لے کر عدالت میں پیش ہوا۔ عدالت نے اپنی روٹین کے مطابق کارروائی شروع کی۔ پنڈت رام چندر نے شہادت شروع کرنے سے قبل اپنے تعارف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ خاکسار نے ان کو چٹ پر لکھ کر یہ سوال دیا کہ آپ بتائیں کہ تمام مسلمان فرقوں کی مستند مسلم کتاب کون سی ہے۔ اس پہ خدا کی طرف سے اس کی زبان سے عدالت کے سامنے یہ لفظ نکلوا دیا کہ تمام فرقوں کی مستند کتاب صرف قرآن ہے اور عدالت نے یہ الفاظ ریکارڈ کر لیے۔

ضمنی سوالات شیخ محمد نسیب صاحب کی طرف سے میں نے چٹ لکھ کر یہ کروائے کہ مسلمانوں کی مستند کتابیں تو بہت سی ہیں۔ جن میں سے بعض کے حوالے رنگیلا رسول میں موجود ہیں۔ لیکن دوسرے فرقے انھیں مستند نہیں مانتے تمام فرقوں کی مستند کتاب صرف قرآن ہے عدالت نے یہ جواب بھی ریکارڈ کر لیا۔ تیسرا یہ سوال چٹ پر لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ کہ یہ رنگیلا رسول اور یہ قرآن پاک ہے۔ آپ ثابت کریں کہ اس مستند کتاب میں یہ لغو اور لچر باتیں موجود ہیں۔ پھر بھی اس کی زبان سے خدا نے نکلوایا کہ اس کی پہلی سطر سے آخری سطر تک کسی آیت میں ان الزامات میں سے کسی ایک الزام کا بھی ذکر نہیں۔ خدا کی اس معجز نمائی کے نتیجے میں عدالت نے راج پال کو مجرم قرار دیا اور چھ ماہ کی سزا دی۔ یہ تھا ایک ملاقات کا پس منظر۔

دوسرے دن جہاں ہندو اخباروں نے اس فیصلے کو شائع کیا۔ وہاں خاکسار کے خلاف جو کچھ وہ لکھ سکتے تھے۔ انہوں نے لکھا۔ وہاں مسلمانوں میں سے محترم سید حبیب صاحب نے اپنے اخبار سیاست میں بھی مجھ پر اپنی کرم نوازی کے پھول برسانے میں کمی نہ کی اور خاکسار کو جگت دالوی کے لقب سے نوازا۔ چنانچہ یہ زریں اخبار علامہؒ کے مطالعہ میں آیا۔ تو آپ نے اپنے معزز نمائندے کے ذریعے مجھے کہلا بھیجا اور اس فیصلے پر ان کو بے پناہ مسرت حاصل ہوئی تھی۔ سید صاحب کی گل فشانی اور ذرہ نوازی پر فرمایا کہ ہمیشہ سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ حق گوئی کے بدلے میں بیگانوں سے بڑھ کر اپنے لعنت کے تیر برساتے ہیں۔ دستور کے مطابق ان فریبکار سرمایہ دار ہندوؤں کے ایجنٹ کی طرف سے ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی اور غیر مسلم جج نے راج پال کو بری کر دیا۔ اس کے بری ہونے پر پھر ایجی ٹیشن شروع ہو گیا۔ اس دوران میں ایک غریب طبقے کے مسلمان نے حضور کی عزت و احترام سے بھرپور ہو کر ملعون راج پال کو دن دہاڑے اس کی دکان پر قتل کر دیا۔ اس نوجوان کا نام علم الدین تھا۔ چالان ہوا۔ مگر وہ عاشق رسولؐ ابتدائی عدالت سے لے کر عدالتِ عالیہ تک راج پال کے قتل کے الزام کو صحیح تسلیم کرتا رہا۔ نہ اپنے بے سہارا رشتہ داروں کی بے چارگی سے متاثر ہوا اور نہ اکابر سے اکابر ترین وزرا کے مشوروں کی پروا کی۔ بالآخر ۱۹۲۹ء میں میانوالی جیل میں پھانسی کی شکل میں سزا پائی۔ مسلمانوں کا اصرار تھا کہ اس کی لاش کو لاہور لایا جائے۔ مگر پنجاب کی سرکار کو نقضِ امن کا شدید ترین خطرہ تھا۔ مگر سر میاں شفیع مرحوم نے اپنی ذاتی ضمانت کی بنا پر گورنر کے دل میں جو خطرہ تھا اُسے دُور کر دیا اور وہ اپنی اس ذاتی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ شہید علم الدین کی لاش پوری شان و شوکت اور عزت و احترام اور پورے امن و امان کے ساتھ قبرستان میانی میں دفن کر دی جو اب تک زیارت گاہِ خواص و عوام ہے۔

(۷)

علم الدین شہید کی تدفین کے بعد علامہ اقبالؒ نے اپنے تاریخی خطبات کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں کئی بار خاکسار کو نہ صرف اپنی ملاقات کا شرف بخشا بلکہ ان کے بعض حصے سنانے سے بھی عزت افزائی فرمائی اور حضرت امام اعظمؒ کے طریق استحسان کی کچھ تفصیلات، ماہیت، کیفیت، کمیت اور حالات کا جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی متعین ضابطہ نہیں مقرر فرمایا۔ مثال کے طور پر آپ (سورۃ نمبر ۴۲ کی آیت نمبر ۳۸) ملاحظہ فرمائیں اور اس کے ساتھ مجلس شوریٰ کو ہر دور میں بدلتے ہوئے حالات کے ماتحت قائم

رکھنے کا حکم دیا (سورہ نمبر ۴۲ آیت نمبر ۳۸ پارہ ۲۵ رکوع ۵ اور سورہ نمبر ۳ کی آیت نمبر ۱۵۸ پارہ ۴ رکوع ۸) میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ان میں بے حد دیانت دار اور قرآن شناس مجلس شوریٰ سے مشورہ لینے کا حکم دیا اور جنگ بدر سے لے کر حجۃ الوداع تک اس معزز مجلس شوریٰ سے مشورہ لیتے رہے اور ان کی بار بار شاباش لینے سے خاکسار کو اپنی تعلیم کو اور زیادہ مکمل کرنے کا موقع ملا۔ ان ملاقاتوں کے علاوہ اہم ترین ملاقات وہ ہے۔ جو اشاعت اسلام کالج کے نام سے انجمن حمایت اسلام کی "تاریخ" میں موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ وائسرائے کی کونسل کے معزز ممبر سید غلام بھیک نیرنگ نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریک کو بے اثر بنانے کے لئے دعوت و تبلیغ کی ا ک۔ انجمن انبالہ میں قائم کی اور علامہ کے سامنے عرض کیا کہ ان قدیم درس گاہوں کے سند یافتہ لوگ اس مردود تحریک یعنی شدھی کو ختم نہیں کر سکتے۔ اس تحریک کے ہشیار پنڈتوں نے رنگیلا رسولؐ ایسی ملعون کتابیں جو لکھی تھیں اور یورپ کے مستشرقین نے جو دل آزار کتابیں لکھی تھیں ان سے کام لے کر ان کی پیش کی گئی ہوئی حدیثوں کو پیش کرتے ہیں اور ہمارے بزرگ انھیں تسلیم کر کے قسم قسم کی تاویلیں کرتے ہیں۔ جو اکثر عام مسلمانوں کے شکوک میں اضافے کا موجب ہوتی ہیں۔ ان کی انجمن کے یہ دل خراش نتائج سن کر ان سے اشاعت اسلام کالج قائم کرنے کا وعدہ فرمایا اور انجمن حمایت اسلام کے معزز اراکین کو اس پر آمادہ کیا اور خاکسار کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ جن آیتوں کی آڑ میں ہمارے مفسرین نے احادیث جمع کی ہیں جن کی آڑ لے کر غیر مسلم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات اور اا۔ کے قرآن سے لوگوں کو متنفر کرتے ہیں۔ تمہارا یہ فرض ہے کہ اشاعتِ اسلام کالج کے ایک اعزازی وائس پرنسپل کی حیثیت سے اپنا درس انھیں آیتوں میں محدود کر دو اور ان احادیث کے متعلق طلبہ کو صحیح اور تسلی بخش جواب دینے کی تربیت دو۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں وہ کالج قائم ہو گیا۔ جو قرارداد پاکستان کے بعد تقریباً ۱۹۴۴ء تک جاری رہا۔ ۴۴-۱۹۴۳ء میں اس کالج کو انجمن نے بند کر دیا۔ اس کالج میں بڑے اچھے ذہین طلبہ داخل ہوئے جو جدید تعلیم کی رو سے کم از کم فرسٹ ڈویژن میٹرک پاس ہوتے تھے۔ ان کو داخلہ دیا جاتا تھا۔ ان میں سے مرزا عبدالحمید مرحوم جو پاکستان بننے کے بعد اوکاڑہ کالج کے پرنسپل ہوئے اور صدر ایوب خان کے دور میں ان کے مذہبی مشیر رہے، دوسرے مولانا عبدالستار نیازی جو اب تک اللہ کے فضل و کرم سے موجود ہیں۔ اسی طرح دوسرے بزرگ بھی تھے۔ اس کالج کے اس وقت پرنسپل حضرت یوسف سلیم چشتی تھے۔ جنہوں نے بعد میں مولوی فاضل کی سند پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ یہ بھی خدا کے فضل و کرم سے اب تک زندہ ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے اس سات سال میں نہ صرف غیر مسلموں کا لٹریچر بلکہ اپنے بڑے بڑے مفسرینِ کرام کی اردو، فارسی اور عربی میں تفسیریں بھی دیکھیں اور مشہور مناظر مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم اور مرزا غلام احمد قادیانی کا وہ لٹریچر بھی پورے غور کے ساتھ دیکھا جو انہوں نے گستاخ پادریوں اور پنڈتوں کے جواب میں لکھا تھا۔ خاکسار نے ان تمام آیات کا جو خاکسار کی نظر میں صحیح ترجمہ تھا وہ بیان کر دیا اور قابل صد احترام مفسرین نے ان کے متعلق جو گل فشانیاں فرمائی تھیں ان کے وہ پھول ان کی قبروں میں دفنا دیئے اور یہی کہا کہ خدا تمہاری مغفرت کرے۔ نمونے کے طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سیرت نگاروں نے جو ہولناک واقعہ درج فرمایا ہے۔ اور جس کی آڑ لے کر غیر مسلموں نے جو کچھ اس کمینی حرکت کی وہ سب کی۔ اس واقعہ کا نام "افک" ہے ہمارے بزرگوں نے (سورہ نمبر ۲۴ آیت نمبر ۱۱ تا ۲۶) ان سولہ آیات کے ذیل میں اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ درج فرمایا ہے۔ لیکن میں نے ان بزرگوں کو خود یہ ہولناک واقعہ بیان کرتے ہوئے دیکھا کہ زار و قطار رو رہے تھے۔ خاکسار نے اشاعت اسلام کالج کے سامنے اور پھر علامہ اقبال مرحوم

کے روبرو ان سولہ آیتوں کو پیش کیا اور عرض کیا کہ ان میں سے کون سی آیت ہے۔ جس کا تعلق اس واقعۂ حائلہ سے ہے۔ ان آیتوں میں نہ اس جنگ کا ذکر ہے۔ جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ اس جنگ میں پیش آیا اور حضرت عائشہ صدیقہ تو کجا اصحاب المؤمنین میں سے کسی کا ذکر تک نہیں، ہاں اگیارھویں آیت میں لفظ 'افک' کا ذکر ہے۔ لیکن افک کا لفظ کوئی اسی آیت سے مخصوص نہیں ہے اور بھی کئی جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ نے جو اپنی ستارہ پرست قوم کے ساتھ مذاکرہ کیا۔ اس مذاکرے میں بھی اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ جو کہ ان کے جھوٹے معبودوں اور من گھڑت دیوتاؤں کی وجہ سے پوجے جاتے تھے۔ انھیں بھی 'افک' کہا ہے۔ سورہ نمبر ۳۷ آیت نمبر ۸۶ پارہ ۲۳ رکوع ۷، اسی لفظ کے متعلقات 'افاک' کو گھڑت جھوٹی خبریں گھڑنے والے کو کہا ہے اور وہ بستیاں جو ایک ناقابل ذکر بے حیائی اور بدکاری کی من گھڑت خبروں کی وجہ سے الٹا دی گئی تھیں ان کو 'مؤتفکات' کہا گیا ہے۔ (سورہ نمبر ۹ آیت نمبر ۷۰ پارہ ۱۰ رکوع ۱۵) اسی لفظ کا مضارع اور ماضی مجہول کی شکل میں قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ گو ان لوگوں کو کہا گیا ہے۔ جو اپنے من گھڑت عقائد کی وجہ سے قرآنی ہدایات سے منحرف ہو کر ان ہدایات کو پیش کرنے والوں کے لئے ہے۔ یہ لفظ کوئی زنا کی تہمت کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ (سورہ نمبر ۵۱ آیت نمبر ۹ پارہ ۲۶ رکوع ۱۸) اور اسی سورۃ نمبر ۲۴ آیت نمبر ۱۲ پارہ ۱۸ رکوع ۸ میں یہ اعلان فرمایا کہ اس قسم کے لغو لچر اور بے ہودہ باتیں سنتے ہی کہہ دینا یہ من گھڑت جھوٹ ہے اور سورہ نمبر ۱۳ میں اعلان فرمایا کہ اس قسم کی غلط بیانیوں اور من گھڑت باتوں کے ثبوت میں جب تک وہ مکار فریب کار لوگ عدالت میں حاضر ہو کر شہادت نہ پیش کر سکیں تو انھیں بہتان تراشی کی سزا ملنی چاہیے۔ ورنہ وہ خدا کے قانون کی نظر میں جھوٹے ہیں۔ اسی کا تذکرہ اسی سورۃ کے ساتویں رکوع کی آیت ۴ میں اس کو سنگین جرم قرار دیا۔ اور اسی کوڑوں کی سزا مقرر کی اور یہ بھی اعلان فرما دیا کہ ایسے لوگوں کی کسی دوسرے مقدمے میں بھی شہادت قبول نہ کی جائے اور اسی سورۃ کی آیت نمبر ۱۶ میں اعلان فرمایا۔ کہ جس خبر کی معصوم نبی، معصوم قرآن' اور معصوم قرآن بھیجنے والے معصوم خدا پر زد پڑتی ہو۔ اور ان کی عصمت کے متعلق مشکوک و شبہات پیدا ہوتے ہوں، مسلمانوں کو حکم دیا کہ تمہیں ایسی لچر خبر سنتے ہی بغیر کسی تفتیش کے یہ کہہ دینا چاہیے "ہٰذا بہتان عظیم" اور تمہیں اسے آگے نہیں پھیلانا چاہیے، لہٰذا 'افک' کے مسئلے کی بنیاد ہی غلط ہے۔ نہ لغت اس کی تائید کرتی ہے نہ قرآن۔

نمونے کے طور پر ایک حدیث حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قرآن کی آخری دو سورتوں کو مفسرین کرام نے عموماً صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث کی آڑ لے کر یار شاد فرمایا کہ آپ پر ایک یہودی نے بہت بڑا جادو کیا۔ جس سے آپ مسحور ہو گئے۔ یہاں تک کہ آپ خاکم بدہن اُس جادو سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپ خیال کرتے تھے کہ آپؐ نے ایک کام کیا ہے۔ حالانکہ وہ کام آپ نے نہیں کیا ہوا ہوتا تھا یا خاکم بدہن آپؐ جادو زدہ ہو کر اس یہودی کے جادو سے متاثر ہو کر یہ خیال نہ لاتے تھے کہ آپؐ نے فلاں کام نہیں کیا۔ حالانکہ وہ کام آپ نے سیکڑوں آدمیوں کے سامنے کیا ہوا ہوتا تھا اور اسی کارگردگی سے غلامانِ محمدؐ کے دلوں میں آپ کی بے پناہ الفت پیدا کرنے کے لئے ان دونوں سورتوں کو جو حقیقت میں مکی ہیں مدنی بنا کر پیش کیا۔ حالانکہ قرآن پاک نے آپؐ کے بدترین دشمنوں کے لگائے ہوئے الزاموں کی تردید کی۔ اسی طرح یہ تردید بھی فرمائی آپؐ نہ ساحر تھے نہ مسحور۔ ان کی ان الزام تراشیوں سے قرآن بھرا پڑا ہے۔ (سورۃ نمبر ۲۵ آیت ۸ پارہ ۱۸ رکوع ۱۶ و سورہ نمبر ۱۷ آیت نمبر ۴۷ پارہ ۱۵ رکوع ۵)۔

قرآن حکیم میں اس قسم کی جتنی آیات ہیں جن کی علامہ اقبالؒ نے نشان دہی کی یا طلبہ نے مفسرین کی تفسیریں پڑھ کر اپنے شکوک کا اظہار فرمایا اور خاکسار نے ان تمام شکوک کا ازالہ کیا۔ علامہ اقبالؒ اس سے بے حد خوش ہوئے۔ اس سلسلے میں ہمیشہ طلبہ اور پرنسپل صاحب بڑی عقیدت مندی سے ان سے ہر روز ملتے تھے اور آپ کی محفل میں اسی موضوع پر بحثیں ہوتی تھیں ایک دفعہ (سورہ نمبر ۸۰ آیت نمبر ۱ تا ۱۲) قرآن کریم کو منگوا کر اور سامنے رکھ کر ان کا ترجمہ فرما کر حکم دیا کہ ان کے مشہور ترجموں اور تفسیروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رؤسائے قریش کو پیغام خداوندی پہنچا رہے تھے۔ تو اتنے میں ابن ام مکتوم آ گئے اور انہوں نے آپ کی توجہ کو اپنی طرف پھیرنا چاہا۔ جسے حضور صلوٰۃ اللہ علیہ السلام نے ناپسند کیا۔ خاکم بدہن خدا تعالیٰ نے اس ناپسندیدگی پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ خاکسار نے عرض کیا۔ اس سورۃ کی آیتوں میں سے چند آیتوں میں ضمیر غائب کا مرجع مفسرین نے حضورؐ کی ذات گرامی کو بنا دیا اور پھر جوان میں خطابات کے صیغے ہیں۔ ان کا مخاطب حضورؐ کو بنا دیا۔ تو قصہ بن گیا۔ خاکسار نے عرض کیا کہ آپ بتائیں کہ اس سورۃ کی کسی آیت میں حضور کے نام یا لقب کا تذکرہ ہے۔ فرمایا کہ نہیں تو خاکسار نے عرض کیا کہ پھر حضورؐ کو اس کا مصداق کس دلیل پر ٹھہرایا گیا بُرا منایا۔ منہ پھیر لیا۔ آخر کس سے؟ دراصل ان غائب ضمیروں کا مرجع (سورہ نمبر ۶۹ آیت نمبر ۳۸۔ ۳۷۔ ۴۳ و ۴۶) دین فروش اور زر پرست انسانوں کا تذکرہ ہے اور یہ غائب ضمیریں انھیں شخصوں کی طرف جاتی ہیں ایسے لوگ بے کس مزدوروں جو حق کی تلاش میں آن کے پاس آتے ہیں۔ ان کا آنا ان کے بعض رؤسا کو ناگوار گزرتا تھا اور مخاطب بھی وہی ہیں اور ان میں عبوس تولی۔ تصدی اور تلہی کے جو افعال آئے ہیں۔ حضورؐ تو نسلِ انسانی کو ان قبیح افعال سے روکتے ہیں اور خاکم بدہن یہی افعال آپؐ میں موجود تھے۔ 'عبوس' کے معنی ہیں ترشروئی، سختی سے پیش آنا، 'تولی' کے معنی روگردانی، منہ موڑنا۔ 'تصدی' لایعنی بات کرنا اور 'تلہی' کسی کا مذاق اڑانا، فعل کو دیکھ کر فاعل متعین کیا جاتا ہے۔ یہ افعال تو حضورؐ کے دشمنوں اور کافروں کے تھے۔ جنہیں حضور روکنے کے لئے آئے تھے۔ چنانچہ بدترین کافروں کے اوصاف یہ بیان کئے ہیں کہ وہ قرآن کریم کو سن کر تیوریاں چڑھاتے ہیں اور پھر پیٹھ پھیر جاتے ہیں۔ اور اپنے تکبر میں مست ہو کر حق پرستوں کو نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں (سورہ نمبر ۴، آیت نمبر ۲۳-۲۲ پارہ ۲۹ رکوع ۱۵) خاکسار نے عرض کیا اس کی تفسیر ہمارے ایک پنجابی شاعر نے کی ہے ؎

جتھے دیکھن چنگا چوکھا پڑھن کلام سوائی ہُو
جتھے دیکھن وال تے روٹی حرف نہ آوے کائی ھو

. . . .

دوئیں جہاناں مٹھے باھو جنہاں دین کھادی کمائی ھو

علامہ اقبالؒ مسکرائے اور اس شعر کی بڑی داد دی۔

خاکسار نے گزارش کی کہ انھیں گیارہ آیتوں کے بعد بارھویں آیت میں فرمایا کہ تمھیں ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میری انمٹ ہدایتیں اور ناقابل تردید حصہ ہیں نسلِ انسانی کے لئے بڑی عظیم الشان نصیحتیں ہیں۔ غریب امیر جو نصیحت حاصل کرنا چاہیں انہیں کیسے مواقع حاصل ہیں۔ پھر ہمارے بزرگوں نے حضرت ابن ام مکتوم کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے ان کے نابینا ہونے کا عذر پیش کیا۔ میں نے

عرض کیا۔ کہ حضورؐ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ گفتگو سننے کا تعلق آنکھوں سے نہیں۔ ان بزرگوں کو چاہیئے کہ ان کے نابینا ہونے پہ زور نہ دیتے بلکہ ان کے بہرہ ہونے پر زور دیتے۔ اس گفتگو کے بعد یہ مجلس برخاست ہوئی۔

(۸)

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بے مثل عصمت کے متعلق ڈاکٹر اقبالؒ کے معلومات بہت وسیع تھے۔ لیکن جب سید غلام بھیک نیرنگ مرحوم و مغفور انبالوی نے ہندوؤں کی جارحانہ تحریک شدھی کو خطرناک فتنہ ارتداد کی بدترین شکل میں دیکھا اور ہمہ تن اس کا مقابلہ کرنے کے لئے دعوت التبلیغ کے نام سے انبالہ میں انجمن قائم کی۔ اور چند مہینے پُرخلوص کام کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوؤں کی جارحانہ شدھی کی بنیاد مفسرین، محدثین اور مؤرخین کی وہ غلط روایات ہیں۔ جو قرآنِ کریم میں پیش کی ہوئی اٹل صداقتوں اور ناقابلِ تردید حقائق سے تغافل برتتے ہوئے نہ صرف اپنی مصنفہ کتابوں میں درج کر دیں۔ بلکہ انھیں قرآن کی تفسیر کی شکل میں پیش کیا اور نیرنگ صاحب کی مخلصانہ مساعی کو تقویت دینے کے لئے انجمن حمایت اسلام لاہور کی جنرل کونسل کو اشاعتِ اسلام کالج کے نام پہ ایک کالج قائم کرنے پر آمادہ کر لیا اس کالج کا اہم ترین موضوع یہی تھا کہ قرآن پاک کی جن آیتوں کے ذیل میں اس قسم کی روائتیں درج کی گئی ہیں ان کا قلع قمع کیا جائے۔ اس لئے کہ صحابہ کرام کے سمیت نہ تو وہ مصنفین کرام معصوم ہیں اور نہ حدیثوں کی روایت کرنے والے معصوم ہیں۔ بڑے سے بڑے راوی کی حیثیت محض ایک غیر معصوم شہادت کی ہے۔ اور ان غیر معصوم راویوں کی شہادت پہ جن بزرگ مصنفین نے فیصلے فرمائے ہیں۔ وہ بھی غیر معصوم ہیں۔ لہٰذا حضور اکرمؐ کی ناقابلِ تردید عصمت کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اسی قطعی عصمت کو ان کی نبوت اور رسالت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ چند مثالیں انسان کی رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔

سورہ نمبر ۹۶ کی پہلی تین آیتوں کو عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلے قرآن میں نازل ہوئیں۔ لیکن ہمارے بڑے جلیل القدر بزرگوں نے ایک ایسی روایت کو اس کی تفسیر میں درج کر دیا کہ غارِ ثور میں جب جبرئیلؑ خدا کی طرف سے یہ پانچ آیتیں لے کر نازل ہوئے۔ تو آپ کی حالت معاذ اللہ اتنی غیر ہوئی کہ ہزاروں مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے گھر پہنچے اور گھر والوں کو حکم دیا کہ مجھ پہ لحاف ڈالو۔ میری حالت غیر ہو گئی۔ چنانچہ اس تبدیلی حالات کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اس زمانے کے ایک علم دوست ورقہ بن نوفل نے آپ کی تشخیص کے بعد آپ کو اطمینان دلایا کہ آپ بیمار نہیں ہیں۔ آپ کو خدا نے اپنے کلام سے نوازا ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ۹۶ (چھیانوے) نمبر سورۃ ان پانچ پہلی آیتوں میں کسی ہولناک خبر کا وجود نہیں۔

سورہ نمبر ۹۳ (ترانوے) میں کی ایک آیت نمبر سات اور آٹھ پہلے تو ہمارے بزرگوں نے یہ ترجمہ فرمایا اور حضورؐ کی عزت و احترام کا شرف حاصل کیا اور مسلمانوں کو خدا کی کرم نوازی سے آگاہ فرمایا۔ لیکن تیسری آیت کا ترجمہ یوں فرمایا کہ تو گمراہ تھا۔ تجھے سیدھی راہ پر میں نے لگایا اور تم تنگ دست تھے خدا نے تمہیں مالدار بنا دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ لفظ "ضال" کو عربی زبان میں اور قرآنِ کریم میں کئی معنوں میں استعمال کیا۔ کسی چیز کی محبت میں زیادہ منہمک ہونے کو بھی "ضال" کہتے ہیں اور کسی ضروری چیز سے بے خبر ہونے والے کو بھی "ضال" کہتے ہیں۔ اسی ۹۳ نمبر کی سورت کی تیسری آیت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میری مدد سے تم کبھی محروم نہیں ہو گے اور نہ کبھی نادار ہو گے۔ یہاں ایک سیدھی سادی چیز کو ایک کہانی کی شکل میں بیان فرمایا کہ حضورؐ

دو تین رات بیمار ہوگئے، اور تہجد کے لئے مسجدِ حرام میں نہ جا سکے۔ ایک خبیث عورت نے کہا۔ (معاذ اللہ) جسے تم خدا کہتے ہو اس شیطان نے تمہاری حمایت چھوڑ دی ہے۔ حالانکہ تہجد کے لئے جاگنا، مسجدِ حرام میں نہ جانا، اور خدا کی ناراضگی میں کوئی تلازم نہیں ہے۔ نہ قرآن کے نزول کے متعلق وہ یہ پکھو اس کر سکتی ہے۔ کیونکہ قرآن تو وقفوں کے بعد اترا ہے۔ (سورہ نمبر ۲۵، آیت نمبر ۳۲ پارہ ۱۹ رکوع پہلا)۔

علامہ اقبال رح اشاعتِ اسلام کالج کے نصاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر بار بار اصرار فرماتے تھے نیرنگ صاحب کی رپورٹ سے قبل مستشرقین کی لکھی ہوئی کتابیں ازبر کئے ہوئے تھے۔ سیّد صاحب کی ناکامی نے جلتی پہ تیل ڈال دیا۔ خاکسار یہ معذرت کرتا رہا کہ ان کے اعتراضات کے جوابات کا سلسلہ خود مسلمانوں کی مستند کتابوں سے حرف گیری کے بغیر نجات مشکل ہے۔ اور جن کتابوں کی عدم موجودگی میں نہ صرف عربوں نے خدا کی انمٹ حقیقتوں کو رسولِ اکرم ؐ کی پہلی چالیس سالہ زندگی کے آئینے میں دیکھ کر سمجھ لیا تھا اور عربوں کے سوا جو لوگ حق کے متلاشی تھے۔ انہوں نے بھی ان ناقابلِ تردید صداقتوں پر یقین کامل حاصل کر لیا تھا اور جس انمٹ مکمل مفصل کتاب کو دنیا کے سامنے پیش کیا اسے خود قرآن کریم نے بار بار "الکتاب المبین" کہا ہے اور اسی قرآن حکیم کا انمٹ ہدایتوں اور ناقابلِ تردید صداقتوں کو تبیان لکلِ شئی ؕ کا لقب عطا فرمایا ہے۔ آخر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد کونسی ناقابلِ حل مشکلات (خاکم بدہن) پیدا ہو گئیں۔ جن کے سمجھنے کے لئے حضرت امام بخاریؒ کے دور تک ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ صرف امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری مرتب کرنے سے پہلے خود چھ لاکھ حدیثوں کا ذخیرہ جمع کر لیا۔ جن میں سے ان کے اعتقاد کے مطابق روایتاً قانونِ درایت کی رُو سے صحیح ترین روایتیں مکرر احادیث کو نظر انداز کرنے کے بعد تقریباً پانچ ہزار مشکل بنتی ہیں۔ اسی قانونِ درایت کی اتباع کرتے ہوئے آپ کی زندگی ہی میں ان کی تعداد بڑھ گئی اور جو روایات کی تنقید کی بنیاد آپ نے رکھی تھی۔ اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور خوابوں اور کشفوں کے نام ان کی منتخب احادیث پر اپنی عقیدت مندی کی بنا پر کل روایات کی تنقید سے اجتناب کیا۔ جو صریحاً قرآن کریم کی انمٹ ہدایتوں کی روشنی میں عام انسان کے خلاف نظر آتی ہیں اور مفسرین کرام نے محض عقیدت مندی کی بنا پر انھیں قرآن کریم کی تفسیر قرار دیا۔ ان عظیم ترین بزرگوں نے خود جن احادیث کو صحیح مانتے ہوئے ظنّی قرار دیا تھا۔ الٹا حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت نے جس قانونِ درایت کی رُو سے ان اقوال و افعال کو جو محدثین نے حضور کی طرف یا صحابۂ کرام کی طرف منسوب کئے۔ یا نیکوکار تابعین کی طرف منسوب کئے تھے۔ کے پرکھنے کا معیار قرآن کریم کو قرار دیا تھا اور یہ اعلان فرما دیا تھا کہ گو دلیبی بے ضرر احادیث جو حضورؐ کی طرف نسبت کی وجہ سے احادیثِ مرفوعہ اور صحابہ کرام کی طرف نسبت کی رُو سے جن کو احادیثِ موقوفہ اور نیکوکار تابعین کی طرف منسوب کردہ کی وجہ سے احادیث مقطوعہ کہا جا سکتا ہے اور ان کی صحت تسلیم کی جا سکتی ہے لیکن ان میں سے کوئی قرآن کی طرح یقینی نہیں ہے۔ الٹا امام اعظم پر برسنا شروع کر دیا۔ اور ان پر ایسے اعتراضات کرنے شروع کر دیئے۔ جن کے لکھنے سے بھی شرم آتی ہے۔

حالی نے کیا خوب کہا ہے ؎

جگر جس سے شق ہو، وہ تحریر کرنی

چنانچہ اس پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ ایسی ناگفتہ بہ جرح و تنقید کی اگر کسی کو جرأت ہے۔ تو وہ محدثین کرام میں سے خطیب بغدادی کی

کتاب پڑھیں جو کئی جلدوں میں ہے اور حکم دیا کہ تم اپنا کام جلدی مکمل کرو۔ خاکسار نے ان کی خدمت میں ایک ہفتے کے بعد حاضر ہو کر اس قسم کی تحریر پیش کی۔ قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت، استعارات و کنایات جس کے سامنے بڑے بڑے فصاحت اور بلاغت پر گھمنڈ کرنے والوں کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور اسے دوام بخشنے کے لئے خود قرآن کریم کی دس سورتوں کے برابر اپنا فصیح و بلیغ کلام پیش کریں اور جن مخالفین کی امداد کی توقع رکھتے ہیں ان سے بھی بھرپور امداد لیں ورنہ اس قسم کی افترا پردازیوں سے باز آ جائیں۔ (سورہ ۱۱، آیت نمبر ۱۳، ۱۴ پارہ نمبر ۱۲، رکوع نمبر ۲) اور یہ بھی اعلان فرمایا کہ قرآن کریم کے تمام مخالفین ایک دوسرے کے زبردست پشت پناہ ہو کر اپنی طرف سے ایسا فصیح و بلیغ کلام پیش کریں اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکیں گے (سورہ نمبر سترہ، آیت نمبر ۸۸، پارہ ۱۵، رکوع ۱۰) قرآن کریم کے ان اعلانوں کے سلسلے میں یہ اعلان بھی نوٹ کر لیں کہ تمام مخالفینِ قرآن پوری طاقت صرف کر کے بھی قرآن جیسی فصیح و بلیغ ایک سورۃ بھی پیش نہیں کر سکیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ ان دونوں کلاموں یعنی اس قرآنِ کریم کی فصاحت و بلاغت اور تمہارے خود ساختہ فصیح و بلیغ کلام میں فیصلہ دینے کے لئے تم اپنی طرف ہی سے جج مقرر کر دو (سورۃ ۲، آیت نمبر ۲۳ پارہ ایک، رکوع ۳)

علامہ سکاکی ابو یعقوب یوسف نے عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کے سلسلے میں ان عرق ریزیوں سے کام لیا کہ ان کی کتاب عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کی ایک معیاری کتاب "المفتاح" کے نام سے دنیا میں موجود ہے۔ اس کتاب کو کچھ اختصار کے ساتھ علامہ محمد بن عبدالرحمٰن قزوینی جامعہ دمشق کے خطیب نے تلخیص کے نام سے کتاب لکھی جس کی دو بڑی شرحیں علامہ تفتازانی (متوفی ۷۹۱ھ) نے لکھیں۔ جن میں سے ایک مولوی عالم کے نصاب میں مختصر المعانی اور دوسری شرح المطول جو مولوی فاضل کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کتاب "تلخیص المفتاح" میں فصاحت و بلاغت کے کئی مسائل ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ کیا فصیح و بلیغ عربی زبان خصوصاً قرآن کریم جیسا بے مثل فصیح و بلیغ کلامِ الٰہی، مجاز لغوی اور مجاز عقلی، کلام کی فصاحت اور بلاغت میں اضافہ کا موجب ہے۔ اور یہی مجاز و استعارہ، کنایہ و تشبیہہ اس کلام کی فصاحت کو چار چاند لگاتا ہے۔ اعجاز العقلی فی القرآن کثیر۔ ہاں اس فعل میں مجاز عقلی کے لئے ضروری ہے۔ جو ظاہری نسبت رد کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ بسا اوقات وہ قرینہ اس متکلم کے کلام میں خود موجود ہوتا ہے۔ جسے قرینہ لفظیہ کہتے ہیں اور کبھی وہ قرینہ معنوی بھی ہوتا ہے۔ جیسے اس فعل کی نسبت اس فاعل کی طرف عقلاً، عادتاً اور شرعاً محال ہے۔ (مختصر المعانی صفحہ ۳۱ مطبوعہ کانپور)

"کُن" تلخیص المفتاح کے مسائل میں سے ایک مسئلہ صنعتِ التفات ہے۔ کسی چیز کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے کلام میں ایک جگہ تو غائب قرار دیا جائے۔ پھر اسی کلام میں اسے متکلم یا مخاطب بنایا جائے، یہ التفات ہے۔ مثلاً سورۂ فاتحہ کی پہلی تین آیتوں پر آپ غور کریں۔ جن میں خدا تعالیٰ کا تذکرہ غیبت میں ہے۔ چوتھی آیت میں مخاطب اور پانچویں میں مخاطب اس کا نام صنعتِ التفات ہے اور سورۃ نمبر دس، آیت نمبر ۲۲، پارہ گیارہ، رکوع ۸) میں آپ دیکھیں گے کہ پہلے اور دوسرے جملے میں انسانوں کو مخاطب بنایا گیا ہے اور تیسرے جملے میں غائب اور (سورۃ نمبر ۷، آیت نمبر ۵۷، پارہ ۸، رکوع ۱۴) (مختصر المعانی صفحہ ۱۲۴ مطبوعہ کانپور) ان مباحث میں سے ایک بحث خطاب کے متعلق ہے۔ تعریفی خطاب اصل مخاطب میں ہوں، لیکن فتنے سے بچنے کے لئے مخاطب دوسرے کو بنا رہا ہوں۔

خطاب کی حقیقی صورت یہ ہے کہ ایک فرد مخاطب ہو تو اس کے لئے واحد کا لفظ مخصوص ہو اور اگر جماعت مخاطب ہو۔ تو اس کے لئے جمع کا لفظ مخصوص ہو لیکن تشبیہً و استعارۃً تعریضاً اور کنایۃً فصحا و بلغا کے کلام میں اس کا الٹ بھی ہوتا ہے۔ بظاہر ایک شخص مخاطب بنایا جا سکتا ہے لیکن جماعت کا ہر فرد اس کا مخاطب ہوتا ہے (مختصر المعانی صہ۳۹) اور بسا اوقات سادہ لوح انسان جس کو مخاطب سمجھتا ہے۔ وہ متکلم کے نزدیک مخاطب ہی نہیں ہوتا۔ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (سورۃ چھ، آیت ۳۵ پارہ ۷، رکوع ۱۰) اس دور کے عربوں کو کبھی وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے مخاطب سرورِ کائنات ہیں بلکہ وہ پوری نسلِ انسانی ہے۔ جو انمٹ ہدایات خداوندی کا انکار کر رہی ہے اور (سورۃ نمبر ۱۰ پارہ گیارہ، رکوع ۱۵ آیت نمبر ۹۴، ۹۵) میں ہے۔ فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ خطاب واحد ہے اور مخاطب جماعت ہے۔ جس جماعت کے دل میں ہزاروں شکوک اور شبہات بھرے ہوئے تھے۔ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ان سے پوچھو جو تم سے پہلے کتاب پڑھتے تھے۔ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ پہنچ گئی ہیں۔ تمہارے سامنے حق خدا کی انمٹ حقیقتیں اور ناقابلِ تردید صداقتیں۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ تمہیں شک کرنے والوں میں سے کبھی نہیں ہونا چاہیے۔ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اللہ کی آیتوں کو جھٹلانے والے مت ہو فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ آٹھ کے آٹھ خطاب نسلِ انسانی کو ہیں۔ جو ان ہدایاتِ خداوندی کے شکوک میں مبتلا تھے۔ جو کچھ حضورؐ کی طرف سے پیش کئے جا رہے تھے۔ حضورؐ مخاطب نہیں اس سے نسلِ انسانی مخاطب ہے اگر حضور کو خاکم بدہن مخاطب سمجھا جائے تو یہ صریح کفر ہے اس قسم کے خطابات سے مستشرقین کو یہود کو نصاریٰ کو، ہنود کو اور غیر مسلموں کو حضورؐ کے خلاف دلائل کے طور پر پیش کیا گیا۔ چنانچہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اسی سورہ کی ۱۰۴ (ایک سو چار) آیت میں اس شکل میں پیش کیا۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ۔ اس آیت میں یہ واضح کر دیا کہ تم مخاطب ہو میں نہیں ہوں۔ اس سے مخاطب بگڑی ہوئی نسلِ انسانی ہے اور پہلے آٹھ خطابوں کی طرح ان واحد خطابوں کا مخاطب بھی بگڑی ہوئی نسلِ انسانی ہے۔ جیسا کہا گیا ہے فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ج فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ اگر تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کا سلسلہ جاری رکھا۔ تو تم قیامت کے دن ظالموں کے زمرے سے اٹھو گے پھر اسی سورۃ کی ۱۰۸ (ایک سو آٹھ) نمبر آیت میں یوں خطاب فرمایا۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔ اے بگڑی ہوئی نسلِ انسانی انمٹ صداقتیں اور ناقابلِ تردید حقیقتیں تم کو پہنچا دی گئیں۔

جب میں نے یہ رابطے علامہ صاحب کو سنائے تو انہوں نے اس خاکسار کو اپنے سینے سے لگا کر دعا کی۔ اللہ اس نوجوان کو اس سیدھی راہ پر قائم رکھ۔

(۹)

حضرت علامہ اقبالؒ کو مبلغین کے لئے ایک ایسا نصاب مرتب کرنے کا عشق تھا کہ کسی غیر مسلم کو مسلمانوں کی پیش کردہ آیتوں کی آڑ لے کر حضرت نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر راج پال کی طرح دریدہ دہنی کا موقع نہ ملے۔ اس لئے خاکسار کو بار بار یاد فرماتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات اپنے مخلص احباب کی موجودگی میں فرضی طور پر معترض بن کر اعتراضات فرماتے تھے اور جواب کی فرمائش کرتے تھے۔

ایک دن اپنا خاص نمائندہ بھیج کر یاد فرمایا اور پہلا یہ اعتراض فرمایا جو سورۃ نمبر ۸۰، آیت نمبرا۔ ۱۱، پارہ تیس۳۰، رکوع پہلا ا کہ تم نے جو کسی گزشتہ محفل میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ آیت نمبر ایک اور دو وغیرہ میں غائب ضمیروں کا مرجع حضور کی ذاتِ گرامی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مرجع سورۃ ۶۹ کی آیت ۳۷، ۳۸، ۴۳، ۴۴) میں مذکور ہے۔ جس سے نہایت مختصر الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ دین فروش۔ زر پرست نزاندونہ مذہبی پیشوا ہیں۔ اور جن کے دل خوف خدا سے خالی ہیں۔ آج کی محفل میں تمہارا مزید امتحان لینا چاہتا ہوں کہ آیت نمبر تین چھ سات آٹھ نو دس میں مخاطب کون ہے؟ خاکسار نے ان کے جواب میں عرض کیا کہ قرآنی فصاحت اور بلاغت کے مسلمہ اصولوں میں سے ایک ضابطہ "صنعتِ التفات" ہے۔ اسی ضابطے کے ماتحت وہ گمراہ کن مذہبی پیشوا ہی مخاطب ہیں۔ جس کی تائید آیت گیارہ، بارہ سے ہوتی ہے آیت گیارہ کیا ہے؟ کلا تمھیں ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ تمھیں جو انمٹ ہدایتیں میری طرف سے دی جاتی ہیں۔ انھیں دوستوں سے بڑھ کر دشمنوں کے سامنے بھی ہر مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے پیش کرنی چاہیے۔ انھیں قبول کرنا، ان کی تعمیل کرنا اور دوسروں کو ان کی تبلیغ کرنا۔ یہ ان کا فعل ہے۔ آپ نے پھر فرمایا کہ اس صنعت کو فصاحت و بلاغت کے ان مسلمہ ضابطوں کو جس بزرگ نے عمدہ ترتیب سے مرتب فرمایا۔ اس بزرگ کا نام کسی گزشتہ محفل میں علامہ سکاکی کہا گیا ہے۔ اس علمی محفل میں تم بتاؤ کہ اس کا نام نامی کیا تھا؟ اور کس سنہ میں اس کی وفات ہوئی؟ خاکسار نے عرض کیا کہ ان کا نام نامی یوسف بن محمد، کنیت یعقوب اور لقب سراج الدین اور ۶۲۲ ہجری میں ان کی وفات ہوئی تھی۔ اس مقدس محفل کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ سورۃ ۶۶ کی ابتدائی پانچ آیتوں کا تم کیا مطلب سمجھے ہو؟ خاکسار نے عرض کیا کہ آپ کی محفل میں جو علمائے کرام موجود ہیں۔ پہلے ان سے آپ دریافت فرمالیں۔ کہیں خاکسار کے الفاظ ان کو ناگوار نہ گزریں۔ کہ ہمارے دور میں بزرگ محدثین تو کیا؟ مورخین پر اپنی خوش فہمی سے اتنا اعتماد قائم ہو چکا ہے۔ کہ انھیں ہر وقت انھیں کی عصمت کا وعظ فرمانا پڑتا ہے۔ حالانکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد کسی بزرگ تر صحابی تابعی اور کسی محدث اور فقیہہ کی عصمت کا نہ کسی نے دعوٰی کیا ہے۔ نہ کوئی دعوٰی کر سکتا ہے۔ ان روایتوں کے راویوں کو زیادہ سے زیادہ غیر معصوم شہادت سمجھا جاسکتا ہے اور ان راویوں کی روایت کی صحت پر جن بزرگ ائمہ کرام نے ان کی روایات کی صحت کا دعوٰی کیا ہے ان کے متعلق بھی صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ غیر معصوم بزرگوں کا ایک فیصلہ ہے۔ خاکسار کی اس گزارش کو سننے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان بزرگوں کے خیالات میں کئی دنوں سے سن چکا ہوں۔ اور ان لوگوں کے مقدس پیشواؤں کی کتابوں کا مطالعہ بھی کر چکا ہوں۔ تم اپنے خیالات کا اظہار کرو۔ آیت نمبر ا میں یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ کے لفظ سے افتتاح فرمایا جو واحد مذکر مخاطب کی شکل میں ہے۔ خطاب کیا ہے؟ ان کا مخاطب کون ہے! خاکسار نے عرض کیا کہ ہمارے اکثر بزرگوں نے اس کا مخاطب بھی حضور کو ٹھہرایا ہے۔ لیکن میری ناقص رائے یہی ہے کہ اس کے مخاطب حضور کے نام لیوا ہیں اور حضور کی امت کا ایک حصہ اس قبیح فعل کا صبح و شام مرتکب ہوتا ہے۔ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ کو قرآن کریم نے ہر حالت میں قبیح فعل ٹھہرایا ہے۔ یا یہ کہ دوسرے شخص کو خوش کرنے کی خاطر اس کا دائرہ فقط الفاظ تک محدود ہو وہ بھی قبیح فعل ہے اور فقہائے کرام اور محدثینِ عظام جسے 'قسم' ٹھہراتے ہیں۔ مگر اس قسم ٹھہرانے سے وہ چیز حسین نہیں ہوسکتی۔ قبیح ہی رہے گی اور اس قسم کی بے ہودہ قسم کو توڑنے کا قرآن بھی حکم دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں سورۃ نمبر ۲، آیت نمبر ۲۲۴، پارہ ۲، رکوع ۱۲) یہ ارشاد فرمایا ہے کہ میرے نام پر قسم کھا کر نیک ترین کاموں کا سلسلہ مت روکو اور

(سورہ نمبر ۲، آیت نمبر ۲۲۶) میں عربوں کی ایک ایسی رسم ہے، جسے وہ ــــ کہتے تھے اور جنسی دیکھ بھک چاہتے تھے۔ ازدواجی زندگی کے حقوق خدا کی قسم کھا کر بند کر دیتے تھے اُسے رد کیا اور آیت نمبر ۲۲۷ میں اعلان کیا کہ ازدواجی زندگی کے بگڑے ہوئے حالات کسی قسم کی اصلاح کے قابل نہیں رہے۔ تو جس طرح ایک مجمعِ عام میں ازدواجی زندگی کا عہد و پیمان کیا گیا تھا۔ اسی طرح اسے طلاق دے کر توڑ دو۔ اور اسی سورۃ کی آیت نمبر ۲۳۱ میں اس بدترین زیادتی اور ظالمانہ فعل اور ہدایتِ خداوندی کو ہنسی اور مذاق قرار دیا اور سورۃ نمبر پانچ آیت نمبر ۸۷، پارہ سات، رکوع ۲) میں یہ واضح سے واضح تر اعلان فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ جو میں نے حدیں مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہیں کرنا۔ اور اسی سورۃ کی آیت نمبر ۸۹ میں قسم توڑ کر کفارہ دینے کا حکم دیا۔ اس لئے اس آیت میں امت ہی مخاطب ہے حضورؐ کی ذاتِ گرامی جہاں میں خبیث افعال سے روکنے کے لئے آئی وہاں پاکیزہ ترین چیزوں کو حلال ٹھہرانے کے لیے آئی (سورۃ نمبر ۷، آیت نمبر ۱۵۷ پارہ ۹ رکوع ۹) اس لئے اس فعل کو کسی معنی میں بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بھی دیکھنے کے قابل چیز ہے کہ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ کا کسی شکل میں حضورؐ کو مخاطب نہیں بنایا جا سکتا اور وہ ذاتِ پاک جو اللہ کی ہدایتوں کے مطابق یہ بار بار اعلان کرتا ہے۔ کہ مجھے ہر نیک کام پر اس وقت معاوضہ ملے گا۔ جب صرف خدا کی رضامندی تمہارے پیشِ نظر ہوگی اگر لفظِ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ کسی کو اس لغو ترین خطاب کا مخاطب حضورؐ کو بنانے پر آمادہ کرتا ہے۔ تو ان بزرگوں کو (سورۃ ۳۳ آیت ۱ پارہ اکیس، رکوع ۱۷) کا مطالعہ فرمانا چاہیے۔ جس آیت کو يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ سے شروع کیا ہے۔ اس کے بعد وہ خطاب کے صیغے استعمال کئے ہیں جن کا مخاطب یہ بزرگ محدثین، مفسرین اور فقہا حضور صلعم کو نہیں بناتے۔ کیونکہ یہ فعل حضورؐ کی شانِ نبوت کے خلاف ہے۔ اِتَّقِ اللّٰهَ یعنی ڈرو اللہ سے تقویٰ تو حضورؐ کا ذاتی فعل تھا اور نزولِ قرآن سے قبل بھی چالیس برس تک حضورؐ کے معجزانہ کمالات میں شمار ہوتا تھا۔ جو تقویٰ کا مجسمہ ہیں۔ اس لئے ہم جیسے گنہگاروں کو مخاطب بنایا جا سکتا ہے اور وہ ہمیں ہیں۔ امام سیوطیؒ نے اپنی مشہور تفسیر 'اتقان' میں ایک حصہ خطاباتِ قرآن کے متعلق لکھا ہے۔ جس میں یہ تصریح کر دی ہے کہ جو فعل حضرت خاتم النبیینؐ کی شان کے خلاف ہے۔

اس خطاب کا تعلق امت کے ساتھ ہے۔ حضورؐ کے ساتھ نہیں دوسرا خطاب اس آیت میں یہ ہے وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ۝ معاذ اللہ اس کے مخاطب حضورؐ نہیں خاکم بدہن۔ اس کے مخاطب ہم ہیں جو ان کا کلمہ پڑھتے ہوئے خدا تعالیٰ کی ہدایتوں کے خلاف کفار کی ہدایتوں کی تعمیل و تبلیغ کرتے ہیں اور اسی سورۃ کی آیت نمبر ۴۸ میں بھی ناپسندیدہ خطاب حضورؐ کا نام لے کر امت کو مخاطب کیا گیا ہے۔ آثار تو شہادت دیتے ہیں کہ معاذ اللہ اس خطاب کا مخاطب بھی حضورؐ ہیں لیکن اگر اس کا مخاطب حضورؐ کو بنایا جائے۔ تو حضورؐ کی عصمت اور پاک دامنی کی تمام عمارت ناپید ہو جاتی ہے۔ لہٰذا سورۃ ۶۶ کی پہلی آیت میں امت ہی مخاطب ہے۔ جو آئے دن اس فعل قبیح کی مرتکب ہوتی رہتی ہے اس حقیقت کو اس سورۃ کی دوسری آیت میں یہ کہہ کر واضح کر دیا ہے کہ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ اَيْمَانَكُمْ کہ امت حقیقت ہے کہ تم اس قسم کی قسموں کو توڑ کر خدا تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا کفارہ ادا کر دو۔ لہٰذا قسمیں کھانے والے بھی ہم اور جن کو کفارہ ادا کرنے کا یہ حکم ہے وہ امت ہی ہے۔ ورنہ خاکم بدہن تَحْرِيْمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ کی قسم حضورؐ کھائیں اور قسم کے توڑنے کا کفارہ امت ادا کرے۔ یہ کوئی مفہوم نہیں۔ لہٰذا دوسری

آیت میں قسمیں توڑ کر کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہی لوگ پہلی آیت میں یہ لغو قسمیں کھانے کے مخاطب ہیں۔ اسی سورۃ کی آیت نمبر تین میں یہ اعلان فرمایا کہ تم جن عورتوں کی رضا مندی حاصل کرنے کی خاطر لغو قسمیں کھاتے ہو۔ تو یہ تمہارے راز دوسروں کے سامنے افشا کرتی رہتی ہیں۔ گو وہ عورتیں نبی کی بیویاں ہی کیوں نہ بن جائیں اور ان عورتوں کی مشکوک رضا مندی کا مفہوم جو تمہارے ذہن میں ہے وہ کبھی پورا نہ ہوگا۔

آیت نمبر ۴ اور ۵ میں جملہ شرطیہ کی شکل میں جو خطاب نظر آتا ہے۔ اسے بھی علم فصاحت و بلاغت میں اپنے ایک اصول کے ماتحت طے کر دیا۔ عام طور پر عربی میں جملہ شرطیہ کے لئے تین حرف استعمال ہوتے ہیں۔ ۱۔ اِن ۲۔ اِذا ۳۔ لَو

اول الذکر اس شرطیہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جو ممکن الوقوع ہو۔

ثانی الذکر اس جملہ شرطیہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں شرط کا وقوع یقینی ہو۔

اور ثالث الذکر اس شرطیہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جس شرطیہ میں شرط کا عدم وقوع یقینی ہو یا اس کا وقوع یقینی ہو۔ وہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(سورۃ ۴۳ کی آیت نمبر ۸۱ پارہ ۲۵ رکوع ۱۳) میں اسی شرطیہ پر غور فرمائیں: قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ۔ یہاں 'اِن' کے معنی 'لَو' کے ہیں یعنی یہ فرض محال ہے۔ اگر خداوند کریم کی کوئی اولاد ہوتی یعنی بیٹا یا بیٹی، تو میں اس کا پہلا عبادت گزار ہوتا۔ اس شرطیہ میں شرط کا وقوع محال اور ممنوع ہے۔ ورنہ ساری توحید کی تعلیم ختم ہو جائے گی۔ لیکن لفظ 'اِن' استعمال کر دیا۔

اور پہلی سورۃ میں آیت نمبر ۲۳ پارہ پہلا رکوع تیسرا) اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا۔ یعنی اِن کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ اس جملۂ شرطیہ کی شرط کا وقوع یقینی ہے اور قرآن اس کا ذکر بار بار کرتا ہے۔ لفظ 'اِن' یہاں (اِذا) کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے مخالفین اس وقت شکوک و شبہات کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور یہ شرط کے وقوع کا نہ صرف امکان تھا بلکہ اس کا وقوع یقینی تھا اس لئے آیت نمبر ۴ میں اِن کے افشائے راز کرنے والی نبی کی بیویوں کے لیے دو جملے شرطیہ استعمال کئے۔ پہلا جملہ اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ افشائے راز پر جب تمہاری شان شایان ندامت موجود ہے۔ اس کی علت اور سبب یہ ہے کہ تمہارے دل و دماغ میں اور گفتار و کردار میں نبی کی محبت رچی بسی ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ آپ اگر کی بجائے جب سے کریں۔ یعنی 'اِن' کو 'اِذا' کے معنی میں استعمال کریں۔ تو کوئی الجھن نہیں پیدا ہوگی۔ بلکہ ازواج مطہرات کی مدح و ستائش کا پہلو نکلے گا۔ دوسرے جملے کا مفہوم بھی یہی ہے اور 'اِن' اس جملۂ شرطیہ میں حرف شرط 'لَو' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ تو اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اگر بفرض محال تم نے ایک دوسرے کی حمایت کی اور امداد کی۔ خدانخواستہ اگر اس افشائے راز کی بجائے معین و مددگار بن گئیں اور اپنے اس ناپسندیدہ فعل پر بفرض محال ندامت کی جگہ تم نے ایک دوسرے کی پشت پناہی شروع کر دی۔ تو نبی کی شان میں کوئی فرق نہ پیدا ہوگا اس لئے کہ اس نبی کے مددگار خدا تعالیٰ اور فرشتے اور نیکوکار ایماندار موجود ہیں اور وہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں لہذا اس آیت میں بھی 'اِن' 'لَو' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ ان کا افشائے راز اور اس مجرمانہ فعل پر اتحاد اور امداد باہمی کا وقوع محال ہے۔ اسی طرح آیت نمبر ۵ میں بھی 'اِن' کا لفظ 'لَو' کے معنی میں مستعمل ہے۔ اِنْ طَلَّقَكُنَّ۔

اگر طلاق دے دی اُس نے تم کو تو تمہارا ہی صرف نقصان ہوگا۔ وہ تو تمہاری جگہ تم سے بہتر عورتیں ہدایت، دعوت و تبلیغ زندگی کے لئے منتخب کر لیں گے اس ترجمہ میں کئی نقشے پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ سب غلط ہیں۔ کیونکہ ان میاں بھی 'تو' کے معنی میں استعمال ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شرط کا عدم وقوع یقینی ہے یعنی وہ نبیؐ تمہاری مخلصانہ فداکاریوں کو دیکھتا، تو ہرگز طلاق نہیں دے گا۔ اور تم سے ازدواجی تعلقات منقطع نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ یہ تعلقات نبیؐ اور تمہاری مرضی اور تمہارے رشتہ داروں کی مرضی سے طے نہیں ہوئے بلکہ خدا تعالیٰ کی صریح ہدایتوں کے مطابق ہوئے ہیں۔

(سورۃ ۳۳، آیت نمبر ۲۸-۲۹ پارہ ۲۲، رکوع پہلا) یعنی نبی کریمؐ کو اس شرط کا اعلان کرنا پڑا کہ جو عورتیں آپ کی ازدواجی زندگی میں آنا چاہیں اور پیغمبر ان کو اپنی ازدواجی زندگی میں لانا چاہے۔ تو ان کے رشتہ داروں پر واضح کر دے کہ اگر تم دنیاوی آسائشوں کو پیشِ نظر رکھ کر ان کی ازدواجی زندگی میں آنا چاہو تو تمہیں اس بات سے مجتنب رہنا چاہیے۔ اور یہ بھی اعلان فرما دیا۔ اسی سورہ کی ۳۴ آیت میں کہ میرے بے مثل نبیؐ کی ازدواجی زندگی میں آنے والی نیکوکار عورتیں بھی بے نظیر و بے مثال ہیں اور ان کی یہ بے مثل صفت مرتے دم تک قائم رہے گی۔ اور انھیں خصوصیات کی وجہ سے انھیں امہات المؤمنین کا لقب خدا نے عطا فرمایا۔ (سورۃ ۳۳ آیت نمبر ۶ پارہ ۲۱ رکوع ۱۷) اور ان کی پاکیزہ ترین ازدواجی زندگی کا تذکرہ سورہ ۳۳ کی آیت نمبر چونتیس میں کیا۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ط یعنی تمہاری ازدواجی زندگی کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ جہاں سیکڑوں ہزاروں مردوں کو حضورؐ قرآنِ کریم کی آیتوں کا امین بنا رہے ہیں اور صبح و شام ان کی تصدیق و تعمیل کے بعد ان کی تبلیغ کرنا ان کا فرض ٹھہراتے ہیں۔ اُسی طرح اس نبی کا فرض ہے کہ یہی طور پر ازدواجی تعلقات قائم کر لئے جائیں اور ان نیکوکار بے مثل عورتوں کو خدا کی بے مثل ہدایتوں کا بے تکلفی سے درس دیں اور اسی سورہ ۳۳، آیت نمبر ۵۰ اور ۵۱ میں جہاں اس ازدواجی زندگی کے متعلق حضورؐ کے فرائض کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وہاں ازواجِ مطہرات کی یہ بے مثل خصوصیت بیان فرمائی ہے کہ ان کی آنکھیں حضور کی محبت سے اس وقت ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ جب حضورؐ ہدایاتِ خداوندی کا درس دینے میں زیادہ توجہ فرماتے ہیں تو بجائے رنجش و حسد کے ان کے دل میں مسرت و فرحت کے دریا بہنے لگتے ہیں اور ضروریات زندگی میں سے جو کچھ بھی حضور عطا فرماتے ہیں۔ اس عطیہ کی شاہی تخت و تاج سے زیادہ قدر کرتی ہیں۔ بلکہ واقعات ہیں ہے کہ لبسا اوقات ایسا ہوتا تھا۔ کہ عصر کے وقت تو معاشی زندگی کے اسباب و ذرائع ان میں آپؐ تقسیم فرماتے تھے اور شام کے وقت تک عشا کے وقت تک ضروریاتِ زندگی کی کوئی چیز بھی اپنے گھر میں فالتو نہیں رہنے دیتے تھے اور ان تمام چیزوں کو بے کس اور بے نوا گھرانوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اور جب رب العالمین کی منشا کے مطابق ان بے مثل ٹرینڈ ازواجِ مطہرات کی تعداد پوری ہوگئی۔ تو حضورؐ کو حکم دیا اب ان کے بعد کسی عورت سے ازدواجی زندگی کا تعلق قائم مت کرو۔ بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ یہ بھی آپ نہیں کر سکتے کہ اگر کوئی عورت اعلیٰ سے اعلیٰ صفات کی مالک ہو۔ ان موجودہ ازواجِ مطہرات میں سے کسی کو الگ کر دیں اور اس کی جگہ اس اعلیٰ ترین اخلاق کی مجسمہ عورت کو اپنی ازدواجی زندگی میں لے آئیں اور اسی سورۃ کی آیت نمبر ۵۳ میں مسلمانوں کو ازواجِ مطہرات کی امہات المؤمنین ہونے کی یوں حقیقت بھی بیان فرما دی۔ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ط ان ہدایات کو پیشِ نظر رکھ کر مفسرین کی الجھی ہوئی روایتوں میں کون پھنس سکتا ہے۔

حضرت علامہؒ نے خاکسار کی یہ گزارشیں سننے کے بعد علما کی موجودگی میں فرمایا کہ بڑے بڑے محدثین نے لکھا ہے کہ حضورؐ نے ان کی کسی لغزش سے متاثر ہو کر انھیں طلاق دے دی تھی۔ خاکسار نے گزارش کی کہ اس قرآن میں جو چودہ سو سال سے ہمارے پاس چلا آتا ہے۔ اس میں ان بیان کردہ واقعات کے سوا کوئی واقعہ درج نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت صحیح بخاری میں موجود ہے جو ہمارے ان بزرگوں کے کئے کرائے پہ پانی پھیر دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ کو ان کے قابلِ اعتماد دوست اور پڑوسی نے یہ حیران کن اطلاع دی کہ حضورؐ نے تمام ازواجِ مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔ وہ اسی وقت تیار ہو کر مسجد نبوی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب مسجد نبوی میں حاضر ہوئے تو وہاں برگزیدہ صحابہ کرام کو روتا ہوا پایا۔ ان سے رونے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے آپ کے پڑوسی کے خبر کی تصدیق کی۔ چنانچہ آپ نے اس الجھن سے نکلنے کے لئے سرورِ کونینؐ کے دروازے پہ کچھ وقفے ڈال کر تین دفعہ حاضر ہونے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اپنے مخصوص کارکن کے ذریعے اپنی معذوری کا اظہار فرمایا لیکن میری یہ خوش قسمتی تھی کہ جب میں حجرۂ مبارکہ سے دو چار قدم آگے نکلا تو حضورؐ کا خادمِ خاص دوڑتا ہوا پہنچا کہ حضورؐ یاد فرما رہے ہیں۔ میری مسرت کی حد نہ رہی۔ اس بے حد مسرت کے ساتھ میں آپ کے دربار میں حاضر ہوا کہ خون آلود کپڑوں میں پیٹے ہوئے آپ ایک بڑا سرہانہ سر کے نیچے رکھے ہوئے لیٹے ہوئے تھے اور فرش کی چٹائی بھی خون آلود تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر میں حیرت میں رہ گیا۔ آپؐ نے میری حیرت کو ختم کرنے کے لئے خود ارشاد فرمایا کہ کس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر تم آئے ہو؟ عرض کیا۔ اے رسولؐ! کیا سچ مچ آپ نے اپنی عورتوں کو طلاق دے دی؟ آپ نے اس سوال سے متاثر ہو کر ارشاد فرمایا کہ بخدا ایسا کوئی واقعہ نہیں۔ میں نے راویوں کی آہ و بکا کو ختم کرنے کے لئے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ آپ نے تکیہ کا ذرا سہارا لیتے ہوئے سنبھل کر فرمایا کہ مدینہ کے قرب و جوار میں ایک بستی میں دو مسلمان پارٹیوں کا کچھ جھگڑا تھا وہ عشا کے بعد میرے پاس آئے اور مجھے اپنی بستی میں لے جانے پر اصرار کیا۔ میں بین الناس کا فریضہ ادا کرنے کے لئے ان کی درخواست منظور کرتے ہوئے اپنی سواری پر اکیلا ہی روانہ ہو گیا اور جب صلح کرا کر واپس ہوا تو ایک گھاٹی میں سے گزرتے ہوئے میری سواری بے لگام ہو گئی۔ اس کے بے قابو ہونے کی وجہ سے میں گر گیا۔ لیکن چند قدموں پہ سواری رُک گئی۔ میں اس شدید ترین زخمی حالت میں اس پہ سوار ہو کر گھر پہنچا اور ازواج مطہرات میری انتظار میں تھیں۔ مجھے اس شدید ترین زخمی حالت میں دیکھ کر آہ و بکا شروع کر دی۔ جو مجھے قطعاً ناگوار گزری کیونکہ وہ اپنی جگہ مجبور تھیں میں اپنی جگہ مجبور۔ ان کا فرض تھا کہ وہ میری حالتِ زار کو دیکھ کر آہ و بکا کا شکار رہوں اور میں اپنی جگہ۔ میں نے ان کو روکتے ہوئے انھیں کہا کہ میرے کمرے سے نکل جاؤ۔ بس بات اتنی تھی جس کا بتنگڑ بن گیا۔

حضرت علامہ بے حد مسرور ہوئے اور مرحوم تاثیر پرنسپل اسلامیہ کالج کو حکم دیا کہ صبح جب ان کے درس میں جاؤ تو صحیح بخاری کا وہ صفحہ نوٹ کر کے لے آنا۔ لہٰذا میں ان کی مخلصانہ دعاؤں کے بعد رخصت ہو کر گھر آ گیا۔

اقبال کے اُردو کلام کا عروضی مطالعہ

ڈاکٹر گیان چند

اُردو میں اقبال پر جتنی زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں اتنی کسی اور ادیب پر نہیں۔ ان کے ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے ان کے فنی مطالعے کے سلسلے میں عروضی پہلو کا تجزیہ بھی کیا کہ نہیں۔ چونکہ میری محدود نظر سے نہیں گزرا اس لیئے میں اقبال کے اسی پہلو کا جائزہ لیتا ہوں۔ اس جائزے میں کلیات اقبال ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ طبع دوم ۱۹۷۶ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس طرح ان کے تمام مجموعوں کا احاطہ کر لیا گیا ہے لیکن بعد کی دریافت شدہ ابتدائی باقیات کو شامل نہیں کیا گیا۔ مضمون میں کہیں کہیں فارسی کلام کا بھی ذکر ہوگا گو وہ براہ راست میرے دائرۂ تحریر میں نہیں آتا ہیں اس مضمون میں بحر اور زحافات کے ناموں پر اکتفا نہ کروں گا۔ زحافات کے نام وحشت انگیز ہوتے ہیں اور محض ان کے بل پر موازنے میں ارکان وزن کی پہچان مشکل ہوتی ہے۔ ان کو حل کرنے کے لئے کتاب کا سہارا لینا پڑتا ہے اس لئے میں بحر کے ساتھ ساتھ ارکان وزن کو صریحاً لکھوں گا۔

اقبال کے عروضی تجزیے کے طور پر ادل میں دو جدول پیش کرتا ہوں۔ پہلے جدول میں اقبال کے تمام اُردو مجموعوں کے اشعار کے اوزان کو شمار کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ :-

۱- میں نے پورے اشعار کو شمار کیا ہے۔ اشعار سے آزاد مصرعوں مثلاً مخمس کا پانچواں مصرع یا مصرعوں کے ٹکڑوں مثلاً مستزاد کے نیم مصرعوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

۲- شمار میں دوسروں کے وہ سب اشعار بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو اردو نظموں کا جزو ہیں مثلاً بالِ جبریل کی نظم پیر و مرید میں ۲۷ شعر مثنوی مولانا روم کے ہیں انھیں شمار میں لے لیا گیا ہے۔

۳- وہ فارسی اشعار بھی لے لیے گئے ہیں جو اردو مجموعوں کا جزو ہیں۔ ارمغانِ حجاز کے صرف اُردو کلام کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے کیوں کہ کلیاتِ اُردو میں وہی شامل ہے۔

۴- میں نے اشعار و اوزان کو صرف دو بار شمار کیا ہے۔ ممکن ہے میزان میں دو چار کا سہو ہو گیا ہو۔ اشعار کو گنتے وقت واہی نقوی کا یہ طنزیہ مصرع

اِس سے سب نطلے گنے ہیں میر کے دیوان کے

بار بار میرے ذہن میں لہراتا تھا۔ کئی بار گن کر میں اس تعریض کا موزوں ترین ہدف نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اس جدول میں اوزان کو کثرتِ استعمال کی بنا پر ترتیب دیا ہے یعنی سب سے پہلے وہ وزن لیا ہے جس میں سب سے زیادہ اشعار ملتے ہیں اس کے بعد اس سے کم مستعمل وزن۔

دوسرے جدول میں اشعار کے بجائے نظموں اور غزلوں کو بیش نظر رکھا ہے یعنی سب سے پہلے وہ وزن لیا ہے جس میں سب سے زیادہ نظمیں ہیں۔ اگر ایک نظم کے مختلف اجزا ایک سے زیادہ اوزان میں ہیں تو ان نظم پاروں کو علاحدہ شمار کیا ہے دونوں جدولوں میں میزان کے کالم کی بنا پر ترتیب دی گئی ہے۔

جدول نمبر ۱ اشعار کے اوزان

نمبر شمار	وزن کا نام	وزن کے ارکان	بانگِ درا	بالِ جبریل	ضربِ کلیم	ارمغانِ حجاز	میزان
۱	رمل مثمن محذوف یا مقصور	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات	۸۵۶	۸۵	۲۸	۸۴	۱۰۵۳
۲	مجتث مثمن مخبون محذوف ابتر وغیرہ	مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن یا فعلان	۲۱۲	۱۹۶	۲۴۴	۴۵	۶۹۷
۳	ہزج مثمن اخرب مقصور یا محذوف	مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن یا مفاعیل	۱۰۰	۱۴۲	۲۷۲	۴۹	۵۶۳
۴	رمل مثمن مجنون مقصور محذوف ابتر	فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن یا فعلان وغیرہ	۳۵۷	۴۸	۱۱۹	۴	۵۲۸
۵	ہزج مثمن سالم	مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن	۳۴۲	۱۰۰	۷	۱۱	۴۶۰
۶	مضارع اخرب مکفوف محذوف یا مقصور	مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن یا فاعلات	۱۹۸	۱۲	۳۵	۳	۲۴۸
۷	ہزج مسدس مقصور یا محذوف	مفاعیلن مفاعیلن فعولن یا مفاعیل	۲۰	۹۲		۳۴	۱۴۶
۸	متقارب مثمن مقصور یا محذوف	فعولن فعولن فعولن فعل یا فعول	۱۹	۱۱۵			۱۳۴
۹	ہزج مسدس اخرب مقبوض یا محذوف	مفعول مفاعلن فعولن یا مفعولن فاعلن فعولن وغیرہ	۴۸	۲۷	۵۴		۱۲۹
۱۰	مضارع مثمن اخرب	مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن	۱۲۱	۷			۱۲۸
۱۱	منسرح مطوی موقوف	مفتعلن فاعلات مفتعلن فاعلات یا مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن	۰	۹۴	۴۲	۶	۱۲۴
۱۲	متقارب مثمن سالم	فعولن فعولن فعولن فعولن	۳۵	۴۲	۳	۱۲	۹۲
۱۳	رجز مثمن مطوی مخبون	مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن یا مفتعلن مفاعلان مفتعلن مفاعلان	۲۸	۶۳			۹۱
۱۴	ہزج مثمن اخرب	مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن	۲۱	۴۵	۱۴	۱	۹۰
۱۵	خفیف مسدس مخبون ابتر وغیرہ	فاعلاتن مفاعلن فعلن یا فعلان	۶۲	۱۲	۲		۷۶
۱۶	رمل مسدس مقصور یا محذوف	فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات	۶	۶۰			۶۶

نمبرشمار	وزن کا نام	وزن کے ارکان	بانگ درا	بال جبریل	ضرب کلیم	ارمغان حجاز	میزان
۱۷	متقارب مقبوض اثلم شانزدہ رکنی	فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن	۴۷	۱۰	۳	۶	۶۶
۱۸	رمل مثمن مشکول	فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن		۲۱	۱۰		۳۱
۱۹	متقارب مثمن اثلم	فعلن فعولن فعلن فعولن یا فعولان		۱۲	۱۴		۲۶
۲۰	کامل مثمن سالم	متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن	۲۰				۲۰
۲۱	متدارک مجنون یا مقطوع شانزدہ رکنی	فعِلن فعلن فعِلن فعلن فعِلن فعلن فعِلن فعلن	۱۳				۱۳
۲۲	رجز مثمن سالم	مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن	۸				۸
۲۳	ہندی وزن سرسی	فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع			۵		۵
۲۴	رباعی - ہزج اخرب مقبوض ابتر -	مفعول مفاعلن مفاعیلن فع	۲				۲
میزان			۲۵۱۵	۱۱۹۲	۸۳۴	۲۵۵	۴۷۹۶

جدول ۲ نظموں کے اوزان

نمبرشمار	وزن کا نام	وزن کے ارکان	بانگ درا	بال جبریل	ضرب کلیم	ارمغان حجاز	میزان
۱	مجتث مجنون محذوف ابتر	مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن یا فعلان وغیرہ	۲۲	۳۳	۶۶	۶	۱۲۷
۲	ہزج اخرب مقصور یا محذوف	مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن یا مفاعیل	۷	۲۶	۶۷	۹	۱۰۹
۳	رمل مقصور یا محذوف	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات	۴۶	۱۳	۷	۴	۷۰
۴	رمل مجنون مقصور محذوف یا ابتر	فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن یا فعلان	۲۱	۷	۳۵	۱	۶۴
۵	ہزج مسدس مقصور یا محذوف	مفاعیلن مفاعیلن فعولن یا مفاعیل	۳	۴۲	-	۱۴	۵۹
۶	ہزج مثمن سالم	مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن	۱۸	۱۳	۳	۳	۳۷
۷	مضارع اخرب مکفوف مقصور محذوف	مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن یا فاعلات	۲۷	۳	۷	۱	۳۸

نمبر شمار	وزن کا نام	وزن کے ارکان	بانگِ درا	بال جبریل	ضرب کلیم	ارمغانِ حجاز	میزان
۸	ہزج مثمن اخرب	مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن	۳	۹	۳	۱	۱۶
۹	ہزج مقبوض محذوف وغیرہ	مفعول مفاعلن فعولن یا مفعولن فاعلن فعولن	۶	۴	۲	۰	۱۳
۱۰	مضارع اخرب	مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن	۱۲	۱			۱۳
۱۱	متقارب سالم	فعولن فعولن فعولن فعولن	۴	۶	۱	۲	۱۳
۱۲	ہزج مطوی موقوف	مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن یا مفتعلن فاعلات مفتعلن فاعلات		۵	۴	۳	۱۲
۱۳	رجز مطوی مجنون	مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن یا مفتعلن مفاعلان مفتعلن مفاعلان	۴	۷			۱۱
۱۴	متقارب مقبوض اثلم شانزدہ رکنی	فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن	۵	۱	۱	۱	۸
۱۵	خفیف مسدس مجنون ابتر وغیرہ	فاعلاتن مفاعلن فعلن یا فعلان	۳	۲	۱		۶
۱۶	متقارب مقصور یا محذوف	فعولن فعولن فعولن فعول یا فعِل	۲	۴			۶
۱۷	رمل مسدس مقصور یا محذوف	فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات	۲	۲			۴
۱۸	رمل مثمن مشکول	فعِلات فاعلاتن فعِلات فاعلاتن		۳	۲		۵
۱۹	متقارب مثمن اثلم	فعلن فعولن فعلن فعولن یا فعولان		۲	۲	،،	۴
۲۰	کامل مثمن سالم	متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن	۳				۳
۲۱	تدارک مجنون یا مقطوع شانزدہ رکنی	فعْلن فعِلن فعْلن فعِلن فعْلن فعِلن فعْلن فعِلن	۳				۳
۲۲	رجز سالم	مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن	۱	.			۱
۲۳	ہندی وزن سرسی	فعْلن فعْلن فعْلن فعْلن فعْلن فعْلن فاع			۱	-	۱
۲۴	ہزج اخرب مقبوض ابتر	مفعول مفاعلن مفاعیلن فع	۱			-	۱
میزان			۱۹۳	۱۸۳	۲۰۳	۴۵	۶۲۴

ان دونوں جدولوں میں اشعار کا جدول زیادہ اہم ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی شعری صلاحیت کن سانچوں میں ڈھلنا زیادہ قبول کرتی تھی۔ نظموں کے جدول کی اس لئے اہمیت ہے کہ نظم کہنے سے پہلے وزن کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے کتنی بار کس وزن کا انتخاب کیا۔ اس میں نظموں کے طول کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے جس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وزن کا انتخاب کرنے کے بعد شاعر کی فکر اس سانچے میں کتنی دور تک چل سکی۔ ایک نظم میں زیادہ اشعار کہنے کے معنی ہیں کہ شاعر کو اس وزن میں کہتے رہنا زیادہ آسان معلوم ہوا۔ اس طرح مکمل صورتِ حال دونوں جدولوں پر نظر رکھنے ہی سے واضح ہو سکے گی۔

فارسی میں بھی اقبال نے ان ۱۴ اوزان کے علاوہ کسی اور وزن میں کچھ نہیں کہا۔ بلکہ ان سب میں بھی نہیں کہا۔ ذیل میں اول ان اوزان کے بارے میں فرداً فرداً اپنے مشاہدات پیش کرتا ہوں مجموعی جائزہ بعد میں لیا جائے گا۔

۱۔ رمل = فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات۔

میری ناقص رائے میں اردو میں دو اوزان سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ مندرجہ بالا اور دوسرا رمل ہی کا فاعلاتن فِعلاتن فِعلاتن فِعلن۔ اقبال نے اول الذکر میں سب سے زیادہ اُردو اشعار یعنی ۱۰۵۳ کہے لیکن ان میں سے ۸۵۶ بانگِ درا ہی میں ہیں باقی کسی مجموعے میں سو اشعار بھی نہیں۔ نظموں کی تعداد کے لحاظ سے اس وزن کا نمبر دوسرا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس وزن میں کئی طویل نظمیں کہی گئیں مثلاً شمع اور شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضرِ راہ، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ دوسری قابلِ ذکر نظمیں ہمالہ، مرزا غالب، داغ، فلسفۂ غم، جبریل و ابلیس ہیں۔ یہ وزن بہت سہل اور سبک ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعد کے مجموعوں میں اقبال کی مشکل پسند طبیعت نے اسے کم نوازا۔ شاید اس وزن میں گفتگو کرنا ابلیس کو بہت مرغوب ہے۔ وہ جبریل سے بات کرے کہ اپنے مشیروں سے مشورہ کرے یا خدا کے منہ آئے اس کے منہ سے الفاظ اسی وزن میں ڈھلتے ہیں۔ ملاحظہ ہو جبریل اور ابلیس، تقدیر یعنی ابلیس اور یزدان، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ زبورِ عجم کی ایک نظم خواجہ اور مزدور اسی وزن میں ہے اور اس میں ہر شعر کے بعد دو چھوٹے ٹکڑے اسی وزن میں ہیں۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب   از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

اقبال نے مناظرِ فطرت کے لیے اس وزن کو بطورِ خاص پسند کیا۔ بانگِ درا کی کئی نظمیں اسی رنگ و آہنگ میں ہیں۔ ان کے علاوہ بالِ جبریل کی ایک مترنم غزل بھی ابتداً فطرت ہی سے متعلق ہے۔

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

مُجتثّ = مفاعلن فَعِلاتن مفاعلن فعلن۔

اس کے آخر میں فعلن کی جگہ فعلان، فِعلن اور فِعلان بھی لایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اُردو کا مقبول وزن ہے۔

اقبال کو یہ وزن بانگِ درا سے زیادہ بالِ جبریل میں اور بالِ جبریل سے زیادہ ضربِ کلیم میں مرغوب رہا۔ بالِ جبریل میں سب سے زیادہ اشعار اسی وزن میں ہیں۔ ضربِ کلیم میں مقبولیت کے اعتبار سے یہ دوسرے نمبر پر ہے۔ جہاں تک نظموں کی تعداد کا تعلق ہے یہ

وزن چوتھی پر ہے۔ اس میں کوئی طویل نظم تو نہیں ملتی لیکن مختصر نظمیں اور غزلیں بکثرت ہیں مثلاً

حقیقتِ حسن = خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا

ساقی = نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

اور وہ پُرشکوہ نظم = خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ

جاوید کے نام = دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر

بالِ جبریل کی کئی غزلیں بھی اسی وزن میں ہیں۔

ضمیرِ لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں

اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد

۳- ہزج مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن یا مفاعیل

اُردو میں اس مضمون کو مرثیہ گویوں نے مقبول بنایا ہے۔ اقبال کے یہاں اشعار کے اعتبار سے اس کا نمبر تیسرا اور نظموں کی تعداد کی رو سے دوسرا ہے۔ اس میں بھی بانگِ درا سے زیادہ اشعار بالِ جبریل میں ہیں۔ ضربِ کلیم کے سب سے زیادہ اشعار اور سب سے زیادہ نظمیں اسی وزن میں ہیں۔ اس وزن میں اقبال کی کئی چھوٹی لیکن مشہور نظمیں ہیں مثلاً:

زہد و رندی = اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

وطنیت = ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

فرمانِ خدا = اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

شعاعِ امید = اک شوخ کرن شوخ مثالِ نگہِ حور

فنونِ لطیفہ = اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن وغیرہ

انہوں نے اس وزن میں ایک اُردو مستزاد بھی کہا ہے یعنی شعر کے بعد ایک چھوٹا ٹکڑا بھی لاتے ہیں۔ ارمغانِ حجاز میں مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا (کذا) بیاض" کا پہلا جزیہ ہے۔

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب

مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب

اے وادیِ لولاب

پیامِ مشرق میں ایک فارسی نظم "شبنم" اسی وزن میں ہے جس میں ہر شعر کے بعد تین چھوٹے چھوٹے مصرعے انھیں قوافی میں آتے ہیں۔ اس طرح قوافی کے تواتر سے ترنم آفرینی کی ہے۔

در پیرہنِ شاہد گل سوزن تمام است

خار است و لیکن زندیمانِ نگار است

از عشق نزار است

در پہلوئے یار است

ایں ہم ز بہار است

زبورِ عجم میں ایک مخمّس "از خواب گراں خیز" میں بھی ہر بند کے اخیر میں ایک چھوٹا ٹکڑا شامل کیا ہے۔

۴۔ رمل = فاعلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعْلن

اس وزن کا آخری رکن فعلان، فعِلن، فعلان بھی آسکتا ہے۔ اور شاذ پہلے فاعلاتن کی جگہ بھی فعِلاتن لے آتے ہیں۔ میں اس وزن کو وزن (۱) کے ساتھ اُردو کے دو مقبول ترین اوزان میں مانتا ہوں۔ بانگِ درا میں اس کا دوسرا نمبر اور ضربِ کلیم میں تیسرا ہے۔ بالِ جبریل اور ارمغانِ حجاز میں اس وزن میں بہت کم اشعار کہے۔ پورے کلام میں اشعار اور نظموں دونوں کے اعتبار سے اس کا چوتھا نمبر ہے۔ اس کی مشہور ترین نظمیں شکوہ اور جوابِ شکوہ ہیں۔ چھوٹی نظموں میں بچے کی دعا ؏

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

بہت مشہور ہے۔

بالِ جبریل سے مجھے اس کی ایک غزل یاد آتی ہے ؎

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی

ارمغانِ حجاز میں صرف چار شعر کی ایک نظم ہے۔ "سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدرآباد دکن کے نام" اس کا آخری شعر مشہور ہے۔

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول

جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

۵۔ ہزج = مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن۔

اُردو میں سالم بحروں کا رواج بہت کم رہا ہے لیکن یہ بحر طویل ہونے کے باوجود سالم شکل میں مقبول رہی ہے۔ حفیظ جالندھری نے اس میں اپنا ضخیم شاہنامہ لکھا۔ غالب کی کئی مشہور غزلیں اسی پردے میں ظاہر ہوئیں۔

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

رمل مثمن محذوف کی طرح اس وزن کے سانچے میں بھی الفاظ آسانی سے ڈھل جاتے ہیں اقبال کو بانگِ درا اور بالِ جبریل میں یہ وزن مرغوب رہا ہے لیکن ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں بانگِ درا کی دو مشہور طویل نظمیں تصویرِ درد، اور طلوعِ اسلام ملتی ہیں۔ بالِ جبریل کی کئی پاروں کی نظم "حکیم سنائی کے مزار پر" اسی وزن میں ہے۔ ان کے علاوہ کئی مشہور و مقبول غزلیں

قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً

اگر کج رَو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی

۶۔ مضارع = مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن یا فاعلات

یہ بھی اُردو کا مشہور وزن ہے۔ مرثیوں کے لیے یہی سب سے مقبول ہے یعنی ہزج کے وزن مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن سے بھی زیادہ۔ نوے فی صدی مرثیے انھیں اوزان میں ملتے ہیں۔ غزلوں کے لیے بھی یہ پسندیدہ رہا ہے۔ اقبال نے بانگِ درا میں اس وزن میں تقریباً دو سو اشعار کہے لیکن بعد کے مجموعوں میں یہ معروفِ عام وزن ان کی نظرِ انتخاب سے گر گیا۔ بانگِ درا کی دو مشہور غزلیں اس وزن میں ہیں۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے

اور۔

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے

نظموں میں کوئی غیر معمولی نظم اس وزن میں نہیں۔ بانگ درا میں بھی رام ؏

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جام ہند

اور ضربِ کلیم میں ابی سینیا ؏

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر

کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ ہزج مسدس = مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل یا فعولن

اردو میں اس وزن میں اقبال کے ۱۴۶ اشعار ملتے ہیں۔ ان کے قطعات بنام رباعی کو نظر انداز کر دیں تو اقبال نے اس میں بہت کم اشعار کہے۔ بانگِ درا کی ایک غزل اس وزن میں ہے جس کا یہ شعر مشہور ہے ؎

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

ان کی فارسی کی مشہور مثنوی گلشنِ رازِ جدید اسی وزن میں ہے۔ اُردو میں سب سے زیادہ اشعار بالِ جبریل میں ہیں۔ ضربِ کلیم میں اس وزن میں ایک شعر بھی نہیں۔ معلوم نہیں کیوں اقبال نے اس وزن کو اپنی نام نہاد رباعیوں کے لیے پسند کیا۔ سترہ اٹھارہ سال پہلے ہماری زبان کے صفحات پر بحث چلی تھی کہ اقبال کی ان نظموں کو رباعی کہا جا سکتا ہے کہ نہیں۔ ڈاکٹر محمود الٰہی قدیم فارسی شاعر باباطاہر

کے یہاں سے ایسی مثالیں تلاش کر کے لائے تھے جن میں اس نے رباعی کے مقررہ اوزان کے علاوہ کسی اور وزن کے قطعے کو رباعی کہا تھا۔ چونکہ رباعی ایک اصطلاحی نام ہے اس لیے اس کا اطلاق اس کے مقررہ اوزان والی نظم ہی پر ہوگا۔ دوسرے اوزان میں دو بیتی قطعہ کہنے کی ممانعت نہیں لیکن انھیں رباعی کہنے پر کیوں اصرار کیا جائے۔ انھیں قطعہ کیوں نہ کہا جائے معلوم نہیں اقبال نے ان قطعوں کو رباعی کہا تھا یا ناشرین نے یہ نام دے دیا تھا۔ سب سے پہلے بالِ جبریل میں یہ نظمیں نظر آتی ہیں۔ دوسری غزل کے بعد ہی ایک نظم ہے۔

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے

ہاں غزلوں کے بعد ایک دم ۳۹ ایسی دو بیتی نظمیں ہیں جن پر رباعیات کا عنوان دیا ہے۔ اسی طرح کی ۱۴ نظمیں ارمغانِ حجاز کے اُردو حصے میں ہیں۔ فارسی میں اس قسم کی قطعہ نما رباعیاں اور زیادہ ہیں۔ پیامِ مشرق کی ابتدا ہی میں لالۂ طور کا عنوان ہے اور اس طرح کی ۱۶۳ نظمیں ہیں۔ وہاں انھیں رباعی نہیں کہا گیا لیکن اگر کہہ بھی دیا جاتا تو بھی راقم الحروف کے نزدیک یہ قطعات ہی رہتے۔ اقبال کے علاوہ اردو کے کسی اور شاعر نے کسی دوسرے وزن کی نظموں کو رباعی نہیں کہا۔ اس وزن کا سب سے زیادہ زور ارمغانِ حجاز کے فارسی حصے میں ہے جو پورے کا پورا اسی وزن میں ہے۔ اس کی نظمیں اسی وزن کے دو بیتی بندوں سے تشکیل پاتی ہیں۔

۸۔ متقارب = فعولن فعولن فعولن فعول یا فَعَل

یہ مثنویوں کا مشہور ترین وزن ہے۔ اس مختصر وزن میں شعر کہنا بہت آسان ہے۔ فردوسی نے جب اس میں شاہنامہ اور نظامی نے سکندر نامہ لکھا تو خیال ہوا کہ یہ وزن رزمیہ کے لئے موزوں ہے لیکن سعدی نے اسی میں اخلاقی مثنوی بوستان اور میر حسن نے بزمیہ مثنوی سحرالبیان لکھی۔ اس طرح اس وزن کی صلاحیتیں لامحدود ہیں۔ اقبال نے صرف ایک طویل نظم مثنوی کی ہیئت میں لکھی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے معدودے چند شعر ہی اس وزن میں کہے۔ بانگِ درا میں ایک بچوں کی نظم ماں کا خواب اس وزن میں ہے۔ ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز میں اس وزن میں ایک شعر بھی نہیں۔

۹۔ ہزج = مفعول مفاعلن فعولن یا مفعولن فاعلن فعولن یا مفاعیل

اس وزن میں چار تبادلات کی اجازت ہے مفعول مفاعلن کی جگہ تسکینِ اوسط کے زحاف کے ساتھ مفعولن فاعلن آسکتا ہے۔ اور آخر میں فعولن کی جگہ مفاعیل۔ یہ وزن مثنوی گلزارِ نسیم اور ترانۂ شوق کی وجہ سے مشہور ہے مختصر اوزان سیدھے سادے مضامین کے لئے بہت مناسب ہوتے ہیں۔ اقبال نے بانگِ درا میں بچوں کی یا مناظرِ فطرت کی کئی نظمیں اس وزن میں کہیں

مثلاً ہمدردی = ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا

چاند اور تارے = ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے

انسان = قدرت کا عجیب یہ ستم ہے

ایک شام، تنہائی وغیرہ۔ بانگِ درا میں جو وزن مظاہرِ فطرت کی سادگیوں اور رنگینیوں کے بیان سے کام میں لایا گیا ہے بالِ جبریل کی غزلوں میں اسی کے ذریعے خودی کے راز افشا کیے گئے ہیں۔

مثلاً

تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

یا

فطرت کو خرد کے روبرو کر

بالِ جبریل کی نظم عبدالرحمان اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت ع

"میری آنکھوں کا نور ہے تو"

بھی اسی وزن میں ہے۔ ضربِ کلیم کی نسبتاً طویل دو نظموں میں ایک فلسفہ زدہ سید زادے اور جاوید کو درس دیا ہے پہلی نظم کی ابتدا ہے ع

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا

جاوید کو انتباہ کیا ہے۔ ع

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ

ارمغانِ حجاز میں اس وزن میں کوئی شعر نہیں:

۱۰۔ مضارع = مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن۔

اس وزن میں اقبال نے بانگِ درا میں ۱۲۱ اشعار اور بارہ نظمیں کہیں۔ جبکہ بالِ جبریل میں سات شعر کی صرف ایک غزل ہے۔ تھوڑے اشعار کے باوجود میں اسے بانگِ درا اور اقبال کے اہم اوزان میں شمار کروں گا۔ یہ وزن بہت نرم رَو ہے۔ اس کا مزاج سکون یا اداسی کا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں اضطراب یا تفلسف کے مضامین بآسانی نہیں کھپائے جا سکتے۔ اس وزن میں اقبال کی دو قسم کی نظمیں ہیں۔ ۱۔ قومی۔ ۲۔ مناظرِ فطرت کی۔ قومی نظموں میں نیا شوالہ، ترانۂ ہندی، ترانۂ ملی اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت ع

چشتی نے جس زمیں پہ پیغام حق سنایا

مشہور ترین ہیں۔ اگر "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کو اقبال کی سب سے زیادہ معروف نظم قرار دیا جائے تو یہ وزن بھی اسی قدر اہم ہوگا۔

جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے میں مناظرِ فطرت کی نظموں کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ ان سب میں فطرت پسندی کے ساتھ نرم سیری ہے۔ ان کا ٹھہراؤ بعض اوقات غم زدگی کا روپ دھار لیتا ہے۔ ان میں یہ سادہ نظمیں قابلِ ذکر ہیں =

پرندے کی فریاد = آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ۔

اک آرزو = دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب

بزمِ انجم = سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو

بالِ جبریل میں اس وزن میں ایک غزل ملتی ہے۔ اقبال کی بعد کی شاعری کو دیکھتے ہوئے ہم توقع نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی فلسفہ طرازی کے لیے یہ نرم اور سبک سیر وزن منتخب کریں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شاعر اقبال اس وزن کے پردے میں نہایت کامیابی سے ظاہر ہوا ہے۔

۱۱۔ منسرح مطوی موقوف = مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن۔

بسیط مطوی = مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

بسیط میں فاعلن کی جگہ فاعلات نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن منسرح میں دونوں جگہ فاعلات کو بدل کر فاعلن بھی لا سکتے ہیں۔ اقبال نے فاعلن کی جگہ فاعلات بھی باندھا ہے۔ مثلاً

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اس لئے ان کی تقطیع بسیط میں نہ کر کے منسرح میں کی جائے گی۔

میں نے اس سے پہلے وزن مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن کو شاعر اقبال کا مظہر قرار دیا ہے۔ زیرِ نظر وزن کو میں مفکرِ اقبال کی آواز کہوں گا۔ اس وزن کا مزاج بالکل غیر ہندی ہے۔ اقبال کے علاوہ اردو کے دوسرے شعرا نے اسے بالکل کم استعمال کیا ہے۔ اقبال کی بدولت ہی اردو اس سے روشناس ہوئی۔ اقبال نے بھی بانگِ درا میں اسے بالکل نہیں برتا۔ میں اقبال کی نظموں میں مسجدِ قرطبہ کو سب سے عظیم نظم سمجھتا ہوں۔ یہ اور اس کے ساتھ کی نظم 'دعا' اسی دشوار گزار وزن میں ہے۔ اس نظم میں فکر کی جو رفعت اور عظمت ہے یہ وزن بخوبی اس کا حریف ہو سکا ہے۔ اس وزن میں بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں کچھ غزلیں بھی ہیں۔ لیکن ان میں بھی نظموں کی طرح تفلسف ہے۔ اس سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ شاید یہ وزن گہرے خیالات ہی کا امین ہے لیکن فارسی مجموعے پیامِ مشرق سے اس کا بطلان ہو جاتا ہے۔ وہاں انہوں نے اسے بہار کا غنائیہ اور ساربانوں کا حُدی بنا کر کامیابی سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

فصلِ بہار = خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

حدی = تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

معلوم ہوتا ہے کہ کسی وزن کا بالطبع کوئی مزاج نہیں ہوتا قادر الکلام استاد کے ہاتھوں میں اگر وہ کھیلتا ہے۔ استاد اسے جس رنگ میں ڈھالنا چاہتا ہے وہ اسے بے چون و چرا قبول کر لیتا ہے۔

اب ان اوزان کو لیا جاتا ہے جن میں اقبال نے سو سے بھی کم اردو شعر کہے۔

۱۲۔ متقارب = فعولن فعولن فعولن فعولن۔

اس مشہور اور قدیم وزن میں اقبال نے ہر مجموعے میں کچھ اشعار کہے لیکن کل ملا کہ اس میں ان کی ایک ابتدائی نظم عشق اور موت معروف ہے۔ جس کا آخری مصرعہ یہ ہے۔ ؎

قضا تھی شکارِ قضا ہو گئی وہ

"بانگِ درا" میں چند غزلیں ہیں جن میں سے پرانے رنگ کی یہ غزل مشہور ہے۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

اور جدید رنگ میں بالِ جبریل کی غزل کا طنطنہ دیکھیے :-

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اور ضربِ کلیم میں اس وزن میں شاہین نے اپنی پلٹ جھپٹ کا مظاہرہ کیا ہے :

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

۱۳۔ رجز مثمن، مطوی مخبون : مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن

اس وزن کے آخر میں مفاعلان لانا جائز ہے لیکن اہلِ عرب کے مطابق پہلے مفاعلن کو مفاعلان نہیں کیا جا سکتا۔ عروضی اصطلاح میں حشو میں اذالہ کا زحاف جائز نہیں لیکن اہلِ ایران و ہند نے اسے جائز سمجھا ہے اس لیے دونوں جگہ مفاعلن کو حسبِ ضرورت مفاعلان کیا جا سکتا ہے۔ پہلے مفاعلان کی مثال میں غالب کا مشہور مطلع ہے :

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اقبال نے دونوں جگہ بے روک ٹوک مفاعلان کا استعمال کیا ہے :۔

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

یہ وزن گیارھویں وزن مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن کا جوڑی دار ہے حالانکہ وہ منسرح یا البسیط میں تھا اور یہ رجز میں ہے لیکن دونوں کا مزاج یکساں ہے یعنی دونوں کا آہنگ رجزیہ ہے اور دونے حجازی اور عجمی۔ گو اس وزن میں اقبال سے پہلے بھی چند غزلیں ملتی تھیں لیکن اسے مقبول کرنے کا سہرا اقبال کے سر ہے۔ بالِ جبریل کی ابتدا ہی اسی سے ہوتی ہے :

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں

اور آگے چل کر :

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

اس سے پہلے وہ بانگِ درا میں بھی اسے چار نظموں میں برت چکے ہیں۔ بالِ جبریل میں اس وزن میں سات غزلیں یا نظمیں ہیں وہاں فرشتے اسی لحن میں نغمہ سرائی کرتے ہیں :۔

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی

اور فلسطین میں اپنی مشہور نظم ذوق و شوق کے لیے بھی اقبال اسی کا انتخاب کرتے ہیں۔

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز میں انہوں نے اس وزن کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ اس طرح انہوں نے اردو میں اس وزن میں کل ۹۱ اشعار کہے ہیں۔ اشعار شماری سے پہلے مجھے گمان تھا کہ یہ اقبال کا مرغوب وزن ہے اور اس میں انہوں نے بہت اشعار

کہے ہوں گے لیکن شمار کرنے پر میرا مفروضہ غلط ثابت ہوا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال کو یہ وزن محبوب تھا۔ انہوں نے اسے اُردو سے زیادہ فارسی میں سر سبز کیا۔ یہ گنج بادآورد ہے ہی ایران سے درآمدہ۔ حافظ کی چند غزلیں اس وزن میں ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ اقبال نے انھیں سے متاثر ہو کر اس وزن کو اپنایا۔ زبورِ عجم میں ان کی ایک مشہور غنائیہ غزل ملاحظہ ہو۔

فصلِ بہار این چنیں، بانگِ ہزار این چنیں　　چہرہ کشا، غزل سرا، بادہ بیار این چنیں

اور پیامِ مشرق میں اس وزن میں گیت ہی گانے لگے ہے

ہستی ما، نظامِ ما
مستی ما، خرامِ ما

(سرودِ انجم)

ایسی ہی موسیقیت ان کی نظم کشمیر میں ہے :

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر　　سبزہ جہاں جہاں بہیں، لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج، مرغِ بہار فوج فوج　　صلصل و سارہ زوج زوج، بر سرِ نارون نگر

ان اشعار کو پڑھ کر بے اختیار قاآنی کے قصیدوں کی یاد آتی ہے ع

نسیمِ خلد می وزد مگر ز جوئبار ہا

اقبال کے یہاں مناظرِ فطرت کا مترنم بیان اسی طرح ہے لیکن حیرت ہے کہ اقبال نے قاآنی کے پسندیدہ وزن مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن میں کچھ نہیں کہا۔ اوپر جن فارسی غزلوں اور نظموں کی نشان دہی کی گئی ہے ان میں اقبال خالص متغزل غنائیہ شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ پیغامبر اقبال کے ساتھ شاعر اقبال کی حیثیت بھی اتنی ہی اہم ہے۔ یہ ان کی قدرت ہے کہ

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں　　غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

والے وزن میں وہ

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے　　پی کے شرابِ لالہ گوں میکدۂ بہار سے

(شاعر، بانگِ درا)

اور ع　　فصلِ بہار این چنیں بانگِ ہزار این چنیں

جیسے نغمے بھی بکھیر سکے۔ یہ اوزان اس سے ملتا جلتا وزن نمبر ۱۱ اُردو کو اقبال کی دین ہیں۔ انہوں نے ان کے امکانات کو روشن کر دکھایا اور ان کی بدولت یہ محترم ہوئے۔

۱۴۔ ہزج اخرب مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن۔

میرے ذہن میں یہ وزن میر کی غزل ع　　کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میر نظر آئی

اور جگر کی غزل ع اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے ۔ سے وابستہ ہے - اس میں بھی عربی روایاتِ عروض کے مطابق درمیانی مفاعیلن میں تسبیغ کا زحاف لگا کر مفاعیلان کرنا جائز نہیں لیکن ایران اور ہندوستان میں یہ عام رہا ہے - اقبال نے بھی ایسا کیا ہے :

یا اپنا گریباں چاک ۔ یا دامنِ یزداں چاک

اس وزن میں اقبال کی ایک مشہور نظم دعا ملتی ہے ۔

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے

نظموں کے علاوہ اس میں انہوں نے چند غزلیں بھی کہیں ۔

پھر بادِ بہار آئی اقبال غزل خواں ہو وغیرہ

بالِ جبریل میں نسبتاً زیادہ کہا ہے ۔

۱۵- خفیف مخبون ابتر وغیرہ ..... فاعلاتن مفاعلن فعلن

اس کا آخری رکن فعلن، فعلان، فعلن، فعلان میں سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اُردو کا ایک مقبول اور آسان وزن ہے - اقبال نے بانگِ درا میں اس وزن میں ۶۲ شعر کہے لیکن بعد میں ان کی مشکل پسند طبیعت اس پیش پا افتادہ سانچے سے اجتناب کرنے لگی- بالِ جبریل میں ۱۲ اور ضربِ کلیم میں صرف دو اشعار ملتے ہیں- نظموں اور غزلوں کی تعداد صرف ۶ ہے- اس وزن میں ان کی ہلکی پھلکی نظمیں ملتی ہیں- مثلاً ایک گائے اور بکری جس کا یہ شعر مشہور ہے :

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی دل کو لگتی ہے بات بکری کی

یا سیرِ فلک یا وہ مشہور مزاحیہ قطعہ ع

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی

لیکن بالِ جبریل میں آکر اس ہلکے پھلکے وزن میں بھی کس سہولت کے ساتھ اپنے گہرے افکار کو ادا کر دیتے ہیں ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں اس کی تقدیر میں حضور نہیں

۱۶- رمل مقصور یا محذوف فاعلاتن فاعلاتن فاعلن -

یہ وزن مثنوی مولانا روم کا ہے اور رومی اقبال کے پیرِ طریقت ہیں - فارسی مثنویوں کے لئے اقبال نے اسی کا انتخاب کیا - اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پس چہ باید کرد، مسافر، زبورِ عجم کی مثنوی بندگی نامہ اور جاوید نامہ کا یہی وزن ہے - اس طرح اُردو فارسی کلام کو ملا کر دیکھا جائے تو اقبال نے اس وزن میں سب سے زیادہ اشعار کہے - یہ مختصر وزن آسانی سے الفاظ کا جامہ قبول کر لیتا ہے - اس لیے لمبی نظموں کے لئے بہت موزوں ہے -

اُردو میں اقبال کو یہ وزن بالکل پسند نہیں - بانگِ درا میں صرف ۶ غیر اہم اشعار ہیں اور بالِ جبریل میں ایک ۵۸ شعر کی نظم "پیر و مرید" ہے جس کے ۵۸ شعروں میں ۳۱ اقبال کے ہیں اور ۲۷ مولانا روم کے اگر رومی کے اشعار کو خارج کریں تو اُردو میں اقبال نے اس وزن

میں صرف ۲۹ شعر کہے ہیں معلوم ہوتا ہے وہ اس وزن کو صرف مثنوی کی گوں کا مانتے تھے ۔

۱۷۔ متقارب مقبوض اثلم شانزدہ رکنی فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن

اس وزن میں ہر مجموعے میں چند شعر ملتے ہیں ۔ بانگ درا میں اس وزن میں کئی غزلیں کہی گئی ہیں ۔ جن میں مشہور ترین یہ ہے :

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا

۱۸۔ رمل مثمن مشکول فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن ۔

اس وزن میں تین غزلیں بالِ جبریل میں اور دو ضربِ کلیم میں کہیں ۔

نہ زبان کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر ہیں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی ! (بالِ جبریل)

اس دور میں اقبال کو عجمی اور تازی صدائیں ہی دل کشا معلوم ہوتی تھیں ۔

۱۹۔ متقارب مثمن اثلم فعلن فعولن فعلن فعولن ۔

اس وزن میں فعولن کی جگہ فعولان لانا پسندیدہ نہیں خصوصاً پہلے فعولن کی جگہ لیکن اقبال دونوں جگہ لائے ہیں

ع ساحل کی سوغات خار و خس و خاک

اس وزن میں انہوں نے بالِ جبریل میں ۱۲ اور ضربِ کلیم میں ۱۴ اشعار کہے ۔ یہ وزن ہے تو متقارب جیسی سہل بحر کا لیکن چونکہ شکستہ ہو گیا ہے اس لیے ایسا وزن اقبال کے ڈھب کا تھا اور انہوں نے اس میں اپنے مخصوص رنگ کے اشعار کہے ہیں ۔

ع

ہر شے مسافر ہر چیز راہی

یا ۔ جیتا ہے رومی ، ہارا ہے رازی یا نے مہرہ باقی ، نے مہرہ بازی

۲۰۔ کامل مثمن سالم متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن ۔

اس وزن کی شان بھی بالکل غیر ہندی ہے ۔ اقبال سے پہلے اردو میں اس وزن کی دو غزلیں بہت مشہور ہیں ۔

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی (سراج)

اور

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو (مومن)

اس وزن میں اقبال نے صرف بانگِ درا میں ۲۰ شعر کہے ہیں جن میں سب سے مشہور اور اہم وہ غزل ہے :

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

اس ایک غزل نے اس وزن کو پایۂ اعتبار بخشا ۔

۲۱۔ متدارک مجنون مقطوع شانزدہ رکنی ۔ فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

اگر صرف فعلن بہ سکون آٹھ بار لایا جائے تو یہ وزن بحرِ متقارب اور متدارک دونوں میں مشترک ہو جاتا ہے لیکن فعلُن صرف متدارک میں آتا ہے۔ اور یہ ایک سے لے کر آٹھ جگہ تک آسکتا ہے۔ اقبال نے اس وزن میں صرف تین غزلیں لکھیں جن میں کل ملا کر ۱۲ اشعار ہیں اور یہ سب بانگِ درا میں ہیں۔ ان میں سب سے مشہور شعر یہ ہے:

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

انہوں نے موہ کی واو یا ہائے ہوز کو ساقط کر دیا جو مناسب نہ تھا۔ یہ وزن خالص ہندی ہے جو ہندی کے سویّا سے مشابہ ہے! اقبال جو بار بار اپنی نوا کو عجمی اور حجازی کہتے ہیں وہ ایسے سو فی صدی ہندی وزن میں لکھنے پر کیوں راغب ہوتے۔ یہ تو میرؔ ہی کو راس آسکتا تھا۔

۲۲۔ رجز مثمن سالم: مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن۔

اس میں اقبال نے صرف آٹھ شعروں کی ایک غیر اہم نظم کہی جو ملا قمی کے اس مشہور شعر کی تضمین ہے

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

۲۳۔ ہندی وزن سرسی فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع

ضربِ کلیم میں محراب گل افغان کے افکار کے نام سے کئی نظم پارے ہیں ان میں پہلی نظم پانچ اشعار کی ہے ع

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان

اس میں ہر شعر کے بعد ٹیپ کے دو ٹکڑے آتے ہیں۔

اپنی خودی پہچان

او غافل افغان

یہ نظم کسی اُردو وزن میں تقطیع نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کوئی وزن چہار دہ رکنی نہیں ہوتا۔ یہ ہندی کا مشہور ماترائی وزن سرسی ہے جس میں ۲۷ ماترائیں ہوتی ہیں اور سولہویں ماترا کے بعد وقفہ ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر دو اجزا ہوتے ہیں پہلا سولہ ماترا کا اور دوسرا گیارہ ماترا کا۔ اردو میں اگر دوسرے جزو میں گیارہ کے بجائے دس ماترائیں ہی ہوں یعنی فاع کی جگہ فع لایا جائے تو بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ معافی چاہتا ہوں ایک تُلہ مضمون میں ایک فلمی گیت سے مثال دینے کی۔

کھلم کھلا پیار کریں گے ہم دونوں اس دنیا سے نہیں ڈریں گے ہم دونوں

یہاں ۲۶ ماترائیں ہیں اور توازن و ترنم میں کوئی کمی نہیں۔ لیکن اقبال نے ہندی کے مطالبے کو سختی سے نبھایا ہے اور آخر میں ہمیشہ فاع لائے ہیں چنانچہ مصرع ملاحظہ ہو۔

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریائے

دریا کو دریائے باندھنا ۲۷ ویں ماترا کی خاطر ہی ہے۔ اس وزن میں اُردو کے کئی اور شعرا نے طبع آزمائی کی ہے مثلاً۔

دِل میں ڈر کا تیر چھپا ہے سینے پر ہے ہاتھ (میراجی)

پیٹ بڑا بدکار ہے بابا پیٹ بڑا بدکار — جوش
خوابوں کا تاریک خرابہ ہے میری جاگیر — عمیق حنفی
سات سمندر پار سے گوالی آئی پیا کے دیس — مصطفیٰ زیدی
ہونٹ گلابی نین شرابی مکھڑا بدرِ منیر — ناصر شہداد

۲۴- رباعی = ہزج اخرب مقبوض ابتر = مفعول مفاعلن مفاعیلن فع
اقبال نے اُردو میں صرف ایک رباعی رباعی کے مقررہ اوزان میں لکھی ہے، اور وہ بھی بانگ درا کے مزاحیہ کلام میں ہے ع
مشرق میں اصولِ دین بن جاتے ہیں
پیامِ مشرق کے آخر میں خردہ کے عنوان سے متفرق اشعار ہیں وہاں بھی ایک فارسی رباعی ہے۔
گل گفت کہ عیشِ نو بہارے خوش تر
عجب اتفاق ہے کہ اردو اور فارسی رباعیوں کے آٹھوں مصرعہ مندرجہ بالا ایک ہی وزن میں ہیں۔

عروضی تجربے

ان کے دو عروضی تجربے توجہ چاہتے ہیں۔
انھوں نے کئی نظموں کے اجزا مختلف اوزان میں لکھے ہیں مثلاً رات اور شاعر (کلیات ص ۱۷۲) کے دو مختلف وزن

اجزا :
کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں
میں ترے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں (ص ۱۷۲، ۱۷۳)

'فرشتوں کا گیت' اور 'فرمانِ خدا فرشتوں سے' اگر ایک ہی نظم کے دو اجزا ہیں تو ان میں بھی دو اجزا ہیں۔
عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

"یورپ سے ایک خط" میں بھی دو بحریں ہیں یعنی پہلے جزو کا وزن ہے۔
اک بحرِ پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومی (کلیات ص ۱۴۸)
دوسرے جزو کا عنوان 'جواب' ہے اور اس میں رومی کے دو فارسی اشعار فاعلاتن فاعلاتن فاعلن کے وزن میں ہیں۔ اگر اقبال پوری نظم کا ایک ہی وزن رکھنا چاہتے تو دونوں اجزا ایک ہی وزن میں لکھ سکتے تھے۔
ارمغانِ حجاز میں ایک نظم 'عالمِ برزخ' کے نام سے ہے جس میں مردہ اور قبر میں سوال و جواب ہوتے ہیں۔ دو بار صدائے غیب آتی ہے اور آخر میں زمین کچھ کہتی ہے۔ اس کے مختلف اوزان کے نمونے یہ ہیں۔
کیا شے ہے کس امروز کا فردا ہے قیامت

گرچہ ہر فری روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

آہ یہ مرگِ دوام آہ یہ رزمِ حیات

فارسی میں بھی یہ ٹکنیک نظر آتی ہے ۔ پیامِ مشرق کی نظم تسخیرِ فطرت کے پانچ حصّوں میں تین اوزان ہیں

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد

نوریؑ ناداں نیم، سجدہ بآدم برم !

چہ خوشست زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن

ایک نظم صحبتِ رفتگاں (در عالمِ بالا) کے عنوان سے ہے ۔ اس میں مختلف مرحومین کچھ کہتے ہیں اور مختلف اوزان ہیں ۔

ان کا دوسرا تجربہ یہ ہے کہ پابند نظموں میں انہوں نے بعض مصرع نصف طول کے لکھے یعنی مثمن وزن کے ساتھ مربع وزن میں یہاں مستزاد کا ذکر نہیں ۔ ان سے ہٹ کر ایسی مسلسل نظمیں ہیں جن میں ایک شعر کے مصرعے چار ارکان کے ہوتے ہیں اور ان کے بعد کئی مصرعے دو ارکان کے ۔ یہ تجربہ فارسی ہی میں ہے ۔ ملاحظہ ہو پیامِ مشرق سے ۔

فصلِ بہار میں ایک مصرع چار ارکان کا ہوتا ہے ۔ اس کے بعد پانچ مصرعے اس سے نصف یعنی دو ارکان کے اور آخر میں پھر پہلے چار رکنی مصرع کی تکرار ہے ۔ یہ ایک بند ہوا ۔

نظم حُدی کے مصرعے بنیادی طور سے دو ارکان کے ہیں لیکن ہر پانچ مصرعوں کے بعد ایک چار رکنی مصرع

تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

آ گیا ہے اور اسے ہر پانچ چھوٹے مصرعوں کے بعد دہرا دیا جاتا ہے ۔

نظم شبنم میں ایک مثمن ارکان والے شعر کے بعد اس سے نصف طول کے تین مصرعے ہیں ۔ مستزاد میں عموماً ایک اور شاذ دو چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں تین کبھی نہیں ہوتے ۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال کے یہ تجربے خوشگوار اور کامیاب ہیں ۔

عروضی کمزوریاں

اقبال کے اُردو کلام میں مجھے ایک جگہ کے علاوہ کہیں کوئی عروضی غلطی نہیں نظر آئی 'اقبال تنہا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے ۔'

اس مصرعہ میں موہ بر وزن فع آیا ہے یعنی اُس کا دیا ہائے ہوز ساقط ہوتی ہے ۔ اس کا جواز نہیں ۔ شکستِ ناروا کا سقم ان کے کئی مصرعوں میں پایا جاتا ہے ۔ شکستِ ناروا کی اصطلاح پہلی بار حسرت موہانی نے اپنے رسالے "معائبِ سخن" میں وضع کی ۔ اس پر تفصیلی اور تجزیاتی بحث شمس الرحمان فاروقی صاحب نے اپنی کتاب "عروض، آہنگ اور بیان" کے ایک باب میں کی ہے ۔ بعض اوزان ایسے ہوتے ہیں جن کے درمیان ایک وقفہ لازمی ہوتا ہے ۔ یہ دو گروہوں میں بانٹے جاتے ہیں ۔

ا ۔ ایسے اوزان جن کے ارکان کی ترتیب لب لب ہوتی ہے یعنی ایک مصرعہ میں دو مختلف ارکان کے دو جوڑے ہوتے ہیں انھیں فاروقی نے شکستہ بحر کہا ہے ۔ مثال :

مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

مفتعلن مفعلن مفتعلن مفعلن

۲- زیادہ طویل اوزان جن کے نصف کے بعد سانس کو ایک وقفہ درکار ہوتا ہے مثلاً

متفعلن متفعلن متفعلن متفعلن

یا شانزدہ رکنی اوزان جن کے ہر مصرعہ میں آٹھ ارکان ہوتے ہیں۔ ان آٹھوں کو آسانی سے ایک سانس میں نہیں پڑھا جا سکتا۔ ان دونوں قسموں کے اوزان میں نصف جزو کے بعد توقف لازمی ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ پہلے جزو کے ساتھ لفظ یا ترکیب مکمل ہو جائے اور لٹک کر دوسرے جزو تک نہ جائے۔ ترکیب کی یہ صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ا- اضافت یا عطف کی ترکیبیں چشم گرداب، سوز و سازہ،

ب- بار و بجرور کی ترکیب یا کئی اجزا سے مرکب فعل مثلاً آمیزش سے،

بے چارگی کے، رہے ہیں وغیرہ

مندرجہ بالا پورے مرکبات کو ایک جزو ہی میں ہونا چاہئے اگر ایسا نہیں ہو گا تو شکست ناروا کا عیب واقع ہو جائے گا۔ اقبال کے کلام سے اس کی چند مثالیں دیکھئے:

دریا کی تہ میں چشم گرداب سو گئی ہے (بانگ درا، کلیات اردو ۱۷۲)

ع یہ بھی سنو کہ نالۂ / طائر بام اور ہے (بانگ درا، کلیات ۱۱۴)

ع روشن ہے جام / جمشید اب تک (بال جبریل کلیات ۳۶۳)

شاہی نہیں ہے بے شیشہ بازی

مرا ساز گرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا — وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

(بانگ درا کلیات ۲۸۲)

تری آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں — جب خون جگر کی آمیزش / سے اشک پیازی بن نہ سکا

(بانگ درا)

ع ہزاروں سجدے تڑپ رہے / ہیں مری جبین نیاز میں

اے باد صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا — قبضے سے امت بے چاری / کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

سب سے خراب مثال "ستم رسیدہ" والے شعر کی ہے جہاں تیغ قاطع "اسی" کے بعد آ کر گرتی ہے۔ دوسرے مصرعوں میں بھی مصرعہ کے دوسرے جزو کا "سے اشک" "ہیں میری" "کے دین" سے شروع ہونا خوش گوار نہیں۔ واضح ہو کہ شکست ناروا عروضی غلطی نہیں کمزوری ہے۔

مجموعی جائزہ

اقبال کے تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری (شکوہ)

مرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی
(بانگ درا)

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

مجھے تسلیم ہے کہ ان اشعار میں لے نوا اور صدا سے ہیئت خارجی یا الفاظ مراد نہیں بلکہ طریق فکر و گرمیٔ جذبات کی طرف اشارہ ہے لیکن پھر بھی یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اقبال ہندی نغمہ پر اتنا معذرت خواہ ہے کہ پانی پانی ہوا جا رہا ہو۔ اُسے تو عجمی خم یا عجمی مضراب پر بھی شرمندگی ہے۔ وہ صرف حجازی لے اور عربی نوا پر فخر کرتا ہے۔ یہ ایک مزاج کی نشاندہی کرتا ہے۔ شعر کا وزن لے اور آہنگ میں ایک اہم حصہ ادا کرتا ہے۔ اقبال کے اردو کلام کو دیکھیں تو یہ ارتقا صاف نظر آتا ہے کہ وہ مختصر آسان اور زیادہ مقبول اوزان سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جاتے ہیں اور اپنے گہرے افکار کے لئے مشکل و شوار گزار رجزیہ قسم کے اوزان کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہندوستانی مزاج سے نزدیک وہ وزن ہے جسے ہندی بحر کہا جاتا ہے اور جو فعلن فعلن یا فعل فعولن سے تشکیل پاتا ہے ہماری کہاوتیں اور بچوں کی تکتبی تک بندیوں پر نظر ڈالئے تو وہ اسی وزن پر کسے جا سکتے ہیں مثلاً

جان بچی لاکھوں پائے لوٹ کے بدھو گھر کو آئے
تختی پہ تختی تختی پہ اینٹ وغیرہ

اقبال نے بانگِ درا میں ان اوزان میں کچھ اشعار کہے لیکن بعد میں جب ان پر عجمیت اور حجازیت کا غلبہ ہوا تو انہوں نے ایسی بحروں کو اپنی متاع خاص بنایا۔

مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن
مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن
مفعول مفاعیل مفاعیل مفاعیل

اردو کا سب سے مقبول وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔ بانگ درا میں اس وزن میں ۸۵۶ اشعار ہیں لیکن بعد کے مجموعے میں سو شعر بھی نہیں ہیں وہ تو شکر کیجیے کہ ارمغان حجاز کی طویل نظم ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ہے۔ اقبال کے ابلیس کو اسی وزن میں مکالمہ کرنا پسند ہے۔ اس لئے ارمغان حجاز میں اس وزن میں ۸۴ شعر ہو گئے۔

"چھوٹے اور مسدس اوزان بھی اقبال کو زیادہ پسند نہیں ہیں۔ ان میں کہے گئے اشعار کا تناسب اقبال کے کلام میں بہت کم ہے معلوم نہیں کیوں وہ رباعی کے وزن کو بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ بلند بانگ اور پرشکوہ اوزان کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ بانگ درا میں اقبال کی پہچان ؎

مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

کے سبک سیر وزن سے ہوتی ہے تو بعد میں ذیل کے دو اوزان سے

مفتعلن فاعلات مفتعلن فاعلات۔

مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن

تعداد اشعار سے قطعِ نظریہ اقبال کی اصلی آواز اور طرۂ امتیاز معلوم ہوتے ہیں۔ بالطبع یہ اوزان دقیق ناہموار اور سنگلاخ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اقبال نے اُردو میں انھیں نباہ دیا ہے اور فارسی میں تو انھیں چنگ و رباب کا نغمہ بنا دیا ہے۔ میں اقبال کے مصرعہ میں ترمیم کر کے کہہ سکتا ہوں کہ ؏

کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ ہندی

اقبال کا شعری آہنگ

ڈاکٹر عبدالحق

اقبالیات میں یہ گفتگو ابھی ناتمام ہے کہ اقبال کی حیثیت فلسفی شاعر کی ہے یا شاعر فلسفی کی۔ ان موضوعات میں تقدیم و تاخیر کا ہی فرق نہیں بلکہ دونوں متضاد ہیں اور ان کے نتائج بھی مختلف النوع ہیں اقبال شناسوں کے درمیان اختلافِ گفتگو موجود ہے قارئین بھی کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اگرچہ اقبال کی شخصیت، فکر اور شاعری پر دوسرے فن کاروں کے مقابلے میں زیادہ دو ٹوک رائے دیکھنے میں آتی ہے۔ جو عام طور پر غیر سنجیدہ مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس بارے میں قطعی فیصلہ ناممکن نہ ہی دشوار ضرور ہے مگر یہ بات زیادہ اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ اقبال کو محض شاعر سمجھ لینا۔ صرف اقبال کی ہی نہیں بلکہ اس تہذیب کی بھی توہین ہے جس کی اقبال ترجمانی کرتے رہے۔ اس فکر کی بھی اہانت ہے جو قوموں کی تقدیر بدل دینے کا حوصلہ رکھتی ہے فلسفی محض تسلیم کر لینا بھی ان کی عظمت و آفاقیت کے منافی ہے۔ اقبال کے یہاں دونوں پہلوؤں کا اظہار موجود ہے لیکن مجموعی طور پر انہوں نے اپنی متفکرانہ حیثیت پر زیادہ زور دیا ہے:

که میں ہوں محرمِ رازِ درونِ سے خانہ
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
دگر دانائے راز آید کہ ناید!

جیسے فکر انگیز بیان زیادہ توجہ چاہتے ہیں اور انھیں آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کیا جانا چاہیے۔

اقبالیات کے مطالعہ سے یہ بات ذہن نشین ہوتی ہے کہ وہ فن پر خاطر خواہ متوجہ نہیں ہیں۔ ان کی بعض اہم نثری تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں فنِ شاعری سے دل چسپی کم ہے اور انہوں نے چند خاص مقاصد کے بیان کے لئے شعری اسلوب اظہار اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک حقائق ملی اور اخلاقی ہیں۔ فن یا زبان و بیان یا طریقِ اظہار ثانوی ہے۔ انہوں نے فکر و پیغام کی ترجمانی یا حقائق کی ترسیل کے لئے ملکی و قومی روایات سے متاثر ہو کر شعری اسلوب کو پسند کیا۔

قارئینِ اقبال کو معلوم ہے کہ ان کے کلام میں فکر و پیغام سے خالی اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ خاص طور پر فلسفیانہ شخصیت کے اظہار یعنی اسرارِ خودی (۱۹۱۵ء) کے بعد تو فکر سے عاری اشعار معدوم ہوتے گئے۔ ان کی توجہ فنی حسن آفرینی سے ہٹتی اور فلسفہ و فکر پر مرتکز ہوتی گئی۔ ان کی فلسفیانہ شخصیت کی نمود اور اظہار ہر محاذ پر غالب اور پورے فن پر سایہ نشین ہے فلسفہ پر ان کی توجہ روز افزوں ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ اب اصلاحِ شعر کی طرف بھی کم مائل ہیں باقیات و اصلاحات کے مختلف مجموعوں سے

اندازہ ہوتا ہے کہ "بانگِ درا" کے مقابلہ میں دوسرے شعری مجموعوں میں کلام پر فنی نقطۂ نظر سے نظرِ ثانی کم سے کم تر ہوتی گئی ۔

دراصل یہ معجزۂ فن کی نمود ہے کہ ان کا فن بھی عظمت و عروج کی ان بلندیوں پر پہنچا جہاں فارسی اور اردو کے دوسرے شعرا کی رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ اقبال کے کمال و ہنر کی انتہا اور معراج بھی یہی ہے۔ فلسفہ و فکر کی گہرائی لطافتِ فن سے اس طرح ہم آہنگ ہے کہ دنیائے ادب میں کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ اسی امتزاج و ارتباط میں ان کی عظمت اور آفاقیت کا انحصار ہے۔

فلسفہ و شعر کا ایک دوسرے سے ہم دوش و ہم نشین ہو جانا دراصل دونوں کی معراج ہے۔ اقبال کے دیئے ہوئے اسی معیار و منہاج پر آفاقی شعر و ادب کا تقابلی تجزیہ ممکن ہے۔ یہی آہنگ و ارتباط تخلیقی فن پاروں کو پرکھنے کا اصل الاصول قرار پا سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کے متفکر شاعر کی اس تہذیبی بلندی و برنائی کو ہم ابھی تک پورے طور پر نہ سمجھ سکے ہیں اور نہ پیش کر سکے ہیں۔ عالمی اور دوامی شہرت رکھنے والے کسی فن کار کو اقبال کے روبرو نہیں لایا جا سکتا۔ کیوں کہ کسی ایک کے ہاں فکر و فن کا ایسا دل نشین مرکب موجود نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی فن کی تازہ کاری میں اقبال سے سبقت لے جائے مگر فکر کی بلندی و تہ داری میں بہت ہی کوتاہ قد نظر آئے گا۔ اقبال کے ہاں یہ امتزاج جوہری توانائی کی طرح بے کراں ہے۔ ان کے پیغام کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ قوم پرستوں اور ترقی پسندوں نے اقبال کو کیا کچھ نہیں کہا ان کی پیغمبرانہ شخصیت کو پامال کرنے اور اقبال کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا گیا۔ مگر اقبال کے فن کی فسوں گری نے سب کو بے اثر بنا دیا اور جب کبھی زبان و بیان کی غلطیاں زیرِ بحث آئیں تو فکر کی عظمت کے سامنے ٹھہر نہ سکیں۔

اسی حسنِ امتزاج کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اقبال کے فن پر گفتگو کرتے وقت ان کے فلسفہ و فکر کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ابہام و تفہیم کی سادہ و رنگین راہیں پُرپیچ و پُرخطر بن جاتی ہیں۔ شارح و سامعین دونوں حیرت فروش دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال کے شعری آہنگ پر آپ سے مخاطب ہوں گا۔ اس عجز اور اعتذار کے ساتھ کہ دورانِ گفتگو فلسفہ و فکر کا تذکرہ آ جائے تو درگزر کیجئے گا۔

فلسفہ و شعر کی جس آمیزش یا ارتباط کا ذکر کیا گیا وہ بے محل یا طولانی تمہید نہیں بلکہ یہی اقبال کے شعری آہنگ کا سرچشمہ یا مینارۂ نور ہے۔ اسی امتزاج سے نغمے پھوٹتے اور بکھرتے ہیں۔ ان میں سوز و گداز کی زیریں لہریں کارفرما ہیں ساتھ ہی جلال و جبروت کی پُروقار آوازیں بھی اس آہنگ کو حیرت خیز بناتی ہیں۔ آہنگ کی اس نقش گری میں تینوں زاویے انتہائی چست اور مربوط ہیں۔ خیال کی فکر انگیزی کو الفاظ کی صورت میں ڈھال کر صوت و صدا سے آراستہ کیا گیا ہے۔ گویا خیال، لفظ اور آواز تینوں ہم راز بن کر آہنگ کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی مربوط نظام سے ان کا آہنگِ شعر ایک منفرد لب و لہجہ اختیار کرتا ہے، اور دوسرے فن کاروں سے ممتاز یا متمائز ہوتا ہے۔ آہنگ کی ترتیب میں فکر و خیال سب سے زیادہ متحرک آلۂ کار کی صورت رکھتے ہیں۔ فکر کی تنظیم سے آہنگ کی ترتیب اور تاثیر ممکن ہوتی ہے۔ جب خیال منتشر اور غیر مرتب ہو تو آہنگ بھی بکھر کر بے اثر ہو جاتا ہے۔ لفظوں کی موزونیت اور صوتی حسن تو مل سکتا ہے مگر آہنگ کا بنیادی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ آہنگ دامنِ احساس کو مس ہی نہیں کرتا بلکہ اسے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ آہنگ تشنہ اور تکمیل طلب ہے۔ صرف مترنم لفظوں کے انتخاب سے پیدا ہونے والا آہنگ وقتی اور طلسماتی ہو کر رہ جاتا ہے نہ وہ دیرپا ہو سکتا ہے اور نہ ہمارے حواس و مدرکات

کو گرفت میں لاسکتا ہے۔ خیال کی سطحیت کو الفاظ کے گورکھ دھندوں میں چھپانے کی کوشش سے آہنگ عنقا ہو جاتا ہے۔ جوش کی شاعری کو پیش نظر رکھیے تو اندازہ ہوگا۔

اقبال کا شعری آہنگ حرف و صوت پر مشتمل ضرور ہے۔ مگر وہ فکر کی گہری معنویت اور تہ داری سے قوت حاصل کرتا ہے۔ جس سے وہ اتنا ہی خیال افروز بن جاتا ہے۔ یہ آہنگ ہمارے قلب و نظر کی دنیا کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ہم فکرِ اقبال سے تھوڑی دیر کے لئے غافل بھی ہو سکتے ہیں مگر ان کا آہنگ ہمیں بیدار رکھتا ہے اور ہمیں بھٹکنے نہیں دیتا۔ خیال الفاظ میں منتقل ہوتا ہے۔ فکر کے متحمل الفاظ ذہن پر خیال و فکر کے پیکر مرتسم کرتے ہیں۔ آہنگ خیال و اظہار کے درمیان ایک سیلِ رواں کی صورت دونوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اسی وجہ سے اقبال کے فلسفہ و فکر کی ترسیل ناکامیوں سے دوچار نہیں ہوتی بلکہ بھرپور اور بے حجاب ہوتی ہے۔ خیال کی ترسیل و ترجمانی کے ضمن میں اقبال سب سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ انھیں خیال کے برملا اور بے کم و کاست اظہار پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ ایک عظیم فن کار کی طرح لفظ کو خیال کی بھرپور ادائیگی کا متحمل بنا دینا ان کے لئے بہت آسان ہے۔ ان کے تصورات مرتب اور ان کی بصیرت و آگہی مدتوں کی ریاضت سے وجود میں آئی ہے۔ اس لئے انھیں دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ خیالات کا تلاطم یا تموج اسلوبِ گفتار کی پرِ ہلا نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں الفاظ کا حسنِ انتخاب ان کا دروبست مستحکم ہوتا ہے۔ صوتی نظام میں تصنع یا ترصیع بندی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بلکہ یہ تخلیقی اظہار کا جزو بن جاتے ہیں۔ ان کا شعری آہنگ میں بھی اسی تخلیقی فعالیت سے سیراب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے آہنگ افکار کے سیل کا جزو بن کر رواں دواں ہوتا ہے۔ نظموں سے قطع نظر اردو اور فارسی غزلوں میں بھی یہ کیفیت اپنی غایت کو پہنچی ہوئی ہے۔ آہنگ کی یکساں اور رواں کیفیت کی وجہ سے ان کی نظموں اور غزلوں کا فرق محسوس نہیں ہوتا۔ دونوں کی خوبی و خوش نمائی ایک جیسی معلوم ہوتی ہے۔ "زبورِ عجم" کی غزلیں ہوں یا "بالِ جبریل" کی آہنگ کے سیل سے سرشار ہیں۔ مثال کے لئے ایک غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں:

از چشمِ ساقی مست شرابم ... بے مے خرابم بے مے خرابم
شوقم فزوں تر از بے حجابی ... بینم نہ بینم در پیچ و تابم
از من بروں نیست منزل گہِ من ... من بے نصیبم راہے نیابم

صرف صوتی تکرار یا ہم آواز لفظوں کے استعمال سے آہنگ کی اس مترنم کیفیت کی تخلیق نہیں کی گئی ہے بلکہ الفاظ کو فکر و خیال کا بھرپور متحمل اور مکمل اظہار کے لئے ترسیل سے معمور کیا گیا ہے۔ مفہوم کی باطنی تنظیم سے آہنگ کی تشکیل ہو رہی ہے اور یہ تشکیل رفتہ رفتہ منتہا کی طرف بڑھتی ہے آہنگ کی انتہا پیغام کے عروج پر ختم ہوتی ہے۔ "بالِ جبریل" کی مکمل اور آہنگ کی انوکھی کیفیات کی نمائندہ غزل:

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

کے ابتدائی اشعار کو لیجیے اور آخری شعر تک آہنگ کے تدریجی بہاؤ کو سامنے رکھیے:

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

غزلوں میں بھی ان کا آہنگ انتشار یا فرد فرد خیال کی جگہ مسلسل اور مربوط ہے ایک کیفیت، ایک تاثر اور ایک لے ملتی ہے۔ آہنگ کی

اندرونی تنظیم خارجی ترتیب سے بیگانہ نہیں ہونے پاتی۔ لفظ و معنی کے گہرے رشتہ پر مبنی یہ آہنگ انوکھا اور حیرت انگیز ہے۔ الفاظ ترسیل کی ناکامی کا احساس پیدا ہونے نہیں دیتے کیوں کہ آہنگ درمیان میں حائل حجاب کو دور کر دیتا ہے۔ اگر آہنگ کے مجموعی تاثر کو ذہن میں رکھیں تو یہ حقیقت بھی آشکار ہوگی کہ اقبال کے یہاں آہنگ اظہار کے لئے ایک مؤثر وسیلے کا کام انجام دیتا ہے۔ آہنگ جب اس منزل پہ پہنچ جائے تو سمجھیے کہ یہ اس کی سب سے بڑی معراج ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اُردو شاعری اقبال کے گوناگوں اکتسابات سے ہمیشہ زیرِ بار رہے گی اقبال کو اظہار کے سانچوں میں بے پناہ توسیع اور فکر کی ابلاغ کے لئے بلاشبہ نئی زبان اور نئے سانچے تخلیق کرنے پڑے جسے صرف عبقری ذہن ہی انجام دے سکتا ہے۔ اقبال نے ایک طرف مروج الفاظ و علامتوں کو نئی فکر اور نئے خیال سے آراستہ کیا۔ دوسری طرف ان کو نیا رنگ و آہنگ بھی دیا ان الفاظ کی ترتیب، اجتماع اور ثبت ہونے کی کیفیت نے آہنگ کو اور بھی دیا۔ ان الفاظ کی ترتیب، اجتماع اور ثبت ہونے کی کیفیت نے آہنگ کو اور بھی نغمگی دی۔ درد و داغ، سوز و ساز، جستجو و آرزو، قلب و نظر، عقل و خرد، حسن و عشق خودی و بے خودی۔ فقر و غنا جیسے سینکڑوں الفاظ مفہوم کی نئی دنیا سے دوچار ہوتے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنا روایتی مفہوم ترک کر چکے ہیں۔ ان پر قاریوں کی نگاہ بار بار ٹھہرتی ہے۔ ذہن بھی دامن کشاں ہو کر نہیں گزرتا بلکہ بصیرت و آگہی کے عالمِ نو کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس سے قطع نظر یہ الفاظ اقبال کے آہنگ کی اندرونی تشکیل میں بھی معاون ہوتے ہیں۔ سوز و ساز کے الفاظ ترسیل کے طلسم کو توڑ اور الفاظ کے جام کو چاک کر کے آہنگ کے سوز و گداز میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ الفاظ گھل کر خارجی ہیئت کھو بیٹھتے ہیں صرف آہنگ کا معنوی جذب و شوق باقی رہ جاتا ہے جس سے آہنگ اور مفہوم کی اثر آفرینی دوچند ہو جاتی ہے اور قاری اسی آہنگ میں ڈوب جاتا ہے۔ بالِ جبریل کی چھوٹی بحر کی اس غزل کے آہنگ پر نظر رکھیے۔ لفظوں کی معنویت اور آہنگ کے اتفاق کو ملاحظہ کیجیے۔

ہر شے مسافر ہر چیز راہی　　کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی
کچھ قدر تو نے اپنی نہ جانی　　یہ بے سوادی یہ کم نگاہی
دنیائے دوں کی کب تک غلامی　　یا راہبی کر یا پادشاہی

یہی غزلوں کی عام فضا ہے۔ نظموں میں یہ فضا بدرجۂ اولیٰ موجود ہے۔

اقبال کی نظر کلاسیکی ادب کے بیش بہا ذخیرے پر بہت گہری اور نتیجہ خیز ہے۔ انھیں کلاسیکی ادب کے اسالیبِ اظہار کا بھرپور عرفان حاصل ہے۔ وہ خواہ عربی ہو یا فارسی۔ ساتھ ہی انگریزی ادب کی آگہی نے اس تجربہ کی دنیا کو اور بھی بے کراں بنا دیا ہے۔ لفظوں کی باہمی ترتیب، ترکیبوں کی تخلیق اور استعمال پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کے کلام میں قدیم فن کاروں کی فکر، اشعار کی تضمین اور حوالوں کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو ان کے اسالیب سے بھرپور واقفیت حاصل ہے۔ اس لئے اقبال کے آہنگ میں کلاسیکی مزاج کی کارفرمائی ناگزیر تھی۔ ان کے آہنگ کا ایک غالب حصہ اسی کلاسیکی آہنگ سے خمیر حاصل کرتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو شعراء میں اقبال کا آہنگ سب سے زیادہ کلاسیکی ہے اگرچہ وہ عہدِ جدید کے فن کار ہیں۔ اس عنصر کی شمولیت نے ان کے آہنگ کی اثر آفرینی کو دائمی خلش کی صورت دی اور اسے پائیدار بنا دیا۔ اقبال کا قاری محسوس کرتا ہے کہ ان کا آہنگ مصنوعی نہیں اور عارضی بھی نہیں اور نہ جسم کی بالائی

سطح کو چھو کر یا مشتعل کر کے گزر جاتا ہے وہ احساس و ادراک کی گہرائیوں میں پیوست ہو کر ایک اضطراب پیہم سے دوچار کرتا ہے۔ ایک خلش اور جاں گدازانہ کیفیت دائمی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں شاعر کے خلوص سے انکار ناممکن ہو جاتا ہے اسی کلاسکیت کا نتیجہ ہے کہ اقبال کی اردو شاعری بھی فارسی لفظوں، ترکیبوں، علامتوں سے بوجھل ہے۔ ایک تو وہ دو زبان شاعر ہیں۔ دوسرے کلاسیکی ادب کے رمز شناس ہیں تیسرے ان کے فکر کی بنیادی خصوصیت عہدِ رفتہ کے احوال و کوائف کی باز آفرینی ہے۔ ان کا پیغام کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے۔ اسلاف کے قلب و نظر کی داستان سرائی کے لئے بھی قدیم کی طرف توجہ ضروری تھی۔ ان وجوہ سے آہنگ کی تشکیل میں فارسی یا قدیم عناصر کی آمیزش ناگزیر تھی۔ یوں بھی خیر کی زندگی قدیم و جدید کے ارتباط کے بغیر ممکن نہیں اردو شاعری میں فارسی ترکیبوں علامتوں سے قطع نظر پورے پورے مصرعوں کی موجودگی سے فارسی اظہار آہنگ کو، غنائیت کو بڑھا دیتا ہے خلاق رابہ سجود دے صنماں را بطواف

اردو کے مقابلے میں فارسی کا آہنگ کہیں زیادہ متنوع اور غنا سے پُر ہے۔ اقبال کی اردو نظموں میں کہیں ابتدا، کہیں درمیان اور کہیں آخر میں فارسی شعر کے استعمال سے نظم کی موسیقیت میں مزید اضافہ کیا گیا ہے۔ ان کی مکمل ترین نظموں کے آہنگ میں یہ اسالیب کارفرما ہیں۔ شمع و شاعر، مسجدِ قرطبہ، ذوق و شوق میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو شاعری کے مقابلے میں اقبال کی فارسی شاعری زیادہ آہنگ و نغمہ رکھتی ہے ان کا فکری ارتفاع بھی فارسی میں ملتا ہے یہی صورت غالب کی فارسی شاعری کی بھی ہے۔ اقبال کے شعری آہنگ کی بھرپور غنائیت فارسی شاعری میں جس اہتمام سے ملتی ہے اردو میں مشکل سے نظر آتی ہے۔

خورشید بہ داما نم، انجم بہ گریبانم   در من نگری ہیچم، در خود نگری جانم

در شہر و بیابانم، در کاخ و شبستانم   من دردم و درمانم، من عیشِ فراوانم

من تیغِ جہاں سوزم، من چشمۂ حیوانم

پیامِ مشرق، کی نظموں یا زبورِ عجم کی غزلوں پر ہی موقوف نہیں ہے یہی غنائیت اردو شاعری کے آہنگ کو بھی بادہ سے زیادہ مترنم بنا دیتی ہے۔

اقبال کے انفرادی اور تابناک آہنگ کی تربیت میں مذہبی اظہار کو بڑا دخل ہے۔ کلاسیکی آہنگ کا یہ دوسرا پہلو ہے۔ اقبال عقیدے کی بنا پر ہی نہیں بلکہ فلسفیانہ ادراک کی وجہ سے مذہب کے تقدس کے قائل ہیں۔ وہ صحفِ سماوی کی آخری برگزیدہ کتاب کی آیات و ارشادات سے اچھی طرح باخبر ہیں اور عربی و اسلامی ادبیات کے ذخیرے سے بھی واقف ہیں۔ ان کی فکری اور شعری تخلیق میں ان سرچشموں کا غالب اثر باقی ہے اور ان ماخذ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں آیات و احادیث کے علاوہ اسماء اماکن، تلمیحات و واقعات بھی شامل ہیں۔ اقبال کو قرآن سے بہت زیادہ انہماک رہا ہے۔ آیات کا جس کثرت اور اہتمام سے استعمال کیا ہے مشرقی ادبیات میں مولانا رومی کے بعد دوسرا فن کار نظر نہیں آتا۔ ان کے شعری آہنگ کی فضا میں حجازی لے کا نمایاں ہونا اسی شغف کا نتیجہ ہے۔ یہ لے زیر و بم یا مدھم سروں کے ساتھ بھاری بھرکم آوازوں سے مرکب ہے۔ کیفیت کے اعتبار سے یہ لے جمیل اور دل کش ہے مگر جلال کی پروقار لہریں غالب ہیں۔ ان میں شان و شکوہ کی سربلندی ہے۔ جو عزم و حوصلہ بخشتی ہے۔ وہ فعال اور متحرک کرتی ہے۔ یہ لے ترانے یا حدی خوانی سے زیادہ قریب ہے۔ عربی فقروں، جملوں اور آیات کے استعمال سے حجازی لے بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ اجنبی یا اشعار میں نامانوس بن کر آہنگ کے بہاؤ میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتے بلکہ یہ بھی سیال بن کر آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی نرمی و لطافت، مترنم و مدھم آوازوں میں گھل مل کر

آہنگ کو پُرکیف بنا دیتی ہے۔ اگر اس ترکیب، فضا اور تاثیر کو بہ غور دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ ان کا آہنگ کلاسیکی سازو آواز سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اسے دف، چنگ، رباب، بربط، وغیرہ موسیقی کے ساز پہ زیادہ مؤثر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بھی ان کا آہنگ، ان کی فکری اساس اور اس کی فضا سے مستحکم ہے۔ ضربِ کلیم کی نظم لا الٰہ الا اللہ کو سامنے رکھیے تو آہنگ کے مذہبی اظہار، کلاسیکیت اور حجازی لے کا اندازہ ہوگا۔

آہنگِ اقبال کی ایک نمایاں پہچان اس کا جوش و خروش ہے۔ یہ بھی ان کے فکری تصورات سے ہم آمیز ہے۔ ان کے فکر کی بنیاد حرکت و توانائی، انقلاب و ثبات پہ قائم ہے۔ ان کا فلسفہ خود داری و خود بینی کے ساتھ جہانِ تازہ کی تخلیق کا عزم پیدا کرتا ہے۔ یہ شعور دل و نظر میں سما کر انسانی وجود کو تلاطم خیز بنا دیتا ہے۔ اس فکری نظام کی ابلاغ میں پُرجوش آہنگ کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ پیغام اور ابلاغ کے باہمی رشتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نکتہ بھی سامنے رہے کہ آہنگ کی تشکیل کا مدار حرف و صوت پر ہی نہیں ہوتا اس کا گہرا تعلق باطن کے خروشِ احساس سے ہے۔ یہی خروشِ احساس ہے جس کی بدولت عظیم فن پاروں کی تخلیق اور نمود ممکن ہو سکی ہے۔ اس کا مکمل اظہار فن کار کے خلوص اور خونِ جگر کے بغیر ممکن نہیں ہر بڑا فن کار خونِ دل کو فن میں تحلیل کرتا ہے اس کے خلوص کی صداقت اور قدروں پہ محکم یقین سے فن جاودانی بنتا ہے۔ انھیں کی مدد سے بلند آہنگ کی تشکیل ہوتی ہے۔ خروشِ احساس خلوص، خونِ جگر، صداقت اور اقدار کے بغیر فن بے معنی یا شعبدہ گری کا مظہر تو ہو سکتا ہے مگر ادبی فن پارہ نہیں بن سکتا بڑے بڑے قلمکاروں کی سیاسی اور وقتی تخلیقات بھی ہمارے سامنے ہیں۔ جو ادبی قدر و قیمت سے محروم تسلیم کی جاتی ہیں۔ اقبال کے خلوص یا فکر میں موجود ہجومِ افکار سے انکار ممکن نہیں۔ جب ہجومِ افکار پیرایۂ اظہار اختیار کرتا ہے تو پہاڑوں سے گزرنے والی جوئے آب کی طرح آزاد ہوتا ہے دشت و دمن اور سنگ و ریگ سبھی اس کی زد میں بے اماں نظر آتے ہیں یہاں اقبال کا آہنگ بھی پرجوش اور پُرشور دکھائی دیتا ہے۔ یہی اثباتِ فکر اور انقلابی پیغام کے لئے موزوں ترین آہنگ ہو سکتا تھا تاکہ جذبہ و احساس کو بیدار و برانگیختہ کر کے صحیح سمت میں اپنے ساتھ لے چلے۔ آہنگ کا یہ بہاؤ بتدریج بڑھتا ہے۔ فکر و نظر کی مخصوص فضا سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ ابتداً ذہن کو متوجہ کرتی ہے خضرِ راہ مسجدِ قرطبہ، ذوق و شوق، ساقی نامہ کے ابتدائیہ کو بہ غور دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ نفسِ موضوع یا پیغام کے سیاق و سباق سے متعلق تہذیبی یا خارجی پس منظر ابھرتا ہے اور آہنگ اسی فضا سے آہستہ آہستہ نمودار ہوگا۔ ذوق و شوق جیسے غیر مرئی موضوع کو تہذیبی علامتوں میں ڈھال کر پیکرِ احساس دیا گیا ہے۔ یہ وہی ثقافتی فضا ہے جو مسجدِ قرطبہ، طارق، عبدالرحمٰن اول اور ہسپانیہ کی علامتوں سے تخلیق پاتی ہے۔ ساقی نامہ کے ابتدائی اشعار میں دوسری تصویر اور دوسرے کوائف ایک نئی فضا پیش کرتے ہیں۔ آہنگ اس پس منظر کے اندرون سے ابھرتا ہے، جوئے کہستان کے ساتھ ساتھ آہنگ کا سیل بھی تیز و تند ہو جاتا ہے۔ پوری نظم میں آہنگ کا عروج آگے کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ اور یہ سفر 'فروغِ تجلی' پر تمام ہوتا ہے۔

اقبال نے آہنگ سے ایک اور کام لیا ہے۔ ان کی طویل اور مشہور نظموں کے مختلف بندوں کو لیجیے۔ ہر بند میں ایک نیا موضوع ہے۔ مثلاً مسجدِ قرطبہ کو لیجیے۔ پہلا بند زمان و مکاں سے متعلق ہے۔ دوسرا عشق کی ابدیت پر مشتمل ہے۔ تیسرا فن کے دوام کا ذکر کرتا ہے، چوتھا اور پانچواں مردِ کامل پہ محیط ہے۔ اسی طرح سے دوسرے بند بھی ہیں۔ اگر انھیں علیحدہ کر دیں تو گویا ساقی بالِ جبریل کی غزلوں میں شامل

ہو جائیں گے اور اگر ان کا عنوان قائم کر دیں تو کئی نظمیں وجود میں آئیں گی۔ ایسی طویل نظموں کی تخلیق میں ان مختلف حصوں کو فکر کی باطنی تنظیم اور آہنگ کی اندرونی کیفیت سے مربوط کیا گیا ہے۔ آہنگ کا یہ تسلسل ان طویل نظموں کو زیادہ بامعنی اور مؤثر بناتا ہے۔ آہنگ کا خروش اور تسلسل لفظوں کے تلازمے، ترتیب اور معنی آفرینی سے متحرک تصویریں نمایاں کرتا ہے۔ ساقی نامہ کے پہلے بند کو دیکھئے: شہید ازل لالہ خونیں کفن اور لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں کا پیغام یا کائناتی بصیرت نیلی نیلی فضاؤں سے جوئے آب کی صورت آشکار ہوتی ہے۔ یہاں آہنگ کو رجز و رزمیہ کی حد تک سے بچایا گیا ہے۔ یہ اشتعال عارضی نہیں بلکہ سوز و گداز کی دوامی کیفیت دلوں کو عزیمت عطا کرتی ہے۔ اس گداز کی وجہ سے آہنگ انتہائی مؤثر ہے۔ فکر اقبال کے مخالف بھی آہنگ کی اثر آفرینی سے محفوظ نہیں رہ پاتے۔ اقبال کے نزدیک خارا شگافی اور خارا گدازی پسندیدہ عمل ہے۔ آہنگ کی اس گدازی سے ثقیل و سنگ لاخ الفاظ کی کرختگی اور ناہمواری یا کم مانوس الفاظ کی اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ ان سے نغمہ و آہنگ کی ریزش شروع ہوتی ہے۔ وہ نغمہ جو انفی آوازوں یا نرم و نازک اصوات سے نہیں پیدا کیا جاتا۔ بلکہ غیر انفی اور غیر مترنم اصوات کے مجموعی تاثر سے وجود میں آتا ہے۔ عتیق، زندیق، دقیق: سماوات، نظرات، مقامات رحیل، اسمٰعیل، جبریل، فساد، کشاد، بنیاد، ادراک، خاشاک، عرقناک، اللہ ہو، کدو، جستجو، کشود، کبود۔ درود کے قافیوں کو ملاحظہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ الفاظ کس طرح پگھل کر ترنم پیدا کرتے ہیں۔ نغمہ و آہنگ کا بہت کچھ مدار اسلوب، ہیئت یا خارجی سانچے پر ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں ردیف و قافیہ کی پابندی وزن و بحر کی رعایت نے نغمہ آفرینی میں اضافہ کیا ہے۔ غزل گو شعرا نے مترنم بحروں کے انتخاب اور خوش آہنگ قافیوں کا بڑا التزام برتا ہے۔ غزل کی ہر دل عزیزی میں نغمگی کو کافی دخل ہے۔ ان سب کے باوجود یہ حقیقت مسلم ہے کہ نفس موضوع ظاہری ہیئت کے "تابع" نہیں۔ لیکن ہر بڑے فن کار کے لئے عظیم فن کار ہیئت کی دنیا میں بھی اپنے انکسابات سے بڑی تبدیلیاں لاتا ہے۔ وہ روایتی پابندیوں سے انحراف بھی کرتا ہے۔ موضوع اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے اقبال کی دنیائے غزل روایات سے یکسر بدلی ہوتی ہے۔ انہوں نے مینائے غزل کو نئے ممکنات اور نئی جہت سے روشناس کیا۔ مطلع و مقطع، ردیف قافیہ کے مروجہ اصولوں کو بھی نظر انداز کیا۔ بال جبریل کی پانچویں غزل ردیف و قافیہ کے اعتبار سے مختلف ہے۔ مستعار کا، انتظار کا، کے ساتھ لازوال ہو کا قافیہ ان کے اسی اجتہادی نقطۂ نظر کی غمازی کر رہا ہے اس اختلاف کے باوجود غزل کا آہنگ مجروح نہیں ہوتا۔ فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ کے آہنگ میں اشھدان لاالٰہ الا اللہ کی آواز مدغم ہو جاتی ہے۔ یہ تجربات آسان اور عام تخلیق کار کے لئے نہیں۔ اقبال کی شاعری کا آہنگ کا دائرہ بہت زیادہ وسیع اور تہ در تہ ہے۔ اور اس حد تک ترنم خیز ہے کہ اسے ساز کے ہر تار پر گایا جا سکتا ہے اور خاطر خواہ مؤثر کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اقبال نے اثر آفرینی کے لئے کسی خاص مخصوص بحر یا اوزان کا انتخاب نہیں کیا بلکہ ان کی شاعری کے مختلف بحروں میں یہ نغمگی عام ہے۔ خواہ یہ طویل بحریں ہوں یا مختصر۔ ان کی طویل بحروں کی دونوں غزلیں بہت مشہور ہیں ؎

۱۔ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

۲ نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ طریقہ تجھ میں خلیل کا

لیکن مختصر ترین بحروں میں بھی موسیقیت کیف و کم کے اعتبار سے کم تر نہیں ؎

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

اقبال نے آہنگ تراشی کے لئے کم مترنم یا غیر نغمی آوازوں کے ساتھ خوش آہنگ قافیوں کے استعمال سے آہنگ کی جھنکار میں دل کشی پیدا کی ہے۔ جیسے جنوں، زبوں، گردوں، گوناگوں، کن فیکون، زیاں، طیلساں، پرنیاں، کارواں وغیرہ۔ یا شعر و نغمہ کی لطافتوں سے لبریز نظم شاہین کو لیجیے۔ جس میں آہنگ اور موسیقی ایک سحر آفریں تخلیق کی صورت میں نمودار ہوتی ہے ہر مصرع اور ہر شعر مترنم آوازوں پر مشتمل ہے۔ یہاں نغمگی کا انحصار صرف قافیوں اور لفظوں کے حسنِ انتخاب پر ہے۔ فکر و پیغام تخلیقی تجربے کا طاقت ور محرک بن گئے ہیں۔ تخلیقی تجربہ کی یہ نوعیت فن کے اسلوب و ہئیت یا نغمہ و آہنگ کی مرہونِ منت نہیں ہوتی بلکہ وہ تخلیقی فعالیت کی گرفت و گیر میں ہوتی ہے۔ اور اسی فعالیت کی شدت یا گہرائی پر شعر و فن کا منہاج مقرر ہوتا ہے فن کے اعلیٰ معیار و منہاج پر شعر و پیغام کی مغائرت یا فرق ختم ہو جاتا ہے، اقبال کے کلام کا بڑا حصہ شعر و پیغام کے اسی میزان پر قائم ہے، جہاں قاری متحیر ہو کر شعر و پیغام کی ابتدا اور انتہا کا سراغ نہیں لگا پاتا۔ اقبال کے نزدیک شاعری کلام موزوں کا نام نہیں اور نہ ذریعۂ انبساط فن پیغام کی ترجمانی کا ایک مؤثر وسیلہ ہے۔ حقائق زندگی کا شعور پیدا کرنے کے لئے انسانی تخلیق کا بے مثل ذریعۂ اظہار ہے۔ شاعری آوازوں کی موزونیت کے ساتھ موسیقی و نغمگی سے پیدا ہونے والی مترنم کیفیت کا نام ہے خواب آوری کی کیفیت نہیں بلکہ وہ کوائف جو جذبہ و احساس میں ہنگامہ اور ہلچل پیدا کر سکیں۔ اقبال کو وہی پُر شور اور پر سوز آہنگ پسند ہے جو جذبہ و ادراک کو بیدار کرے اور توانا رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شاعری کے جملہ اصناف یا خارجی ہئیت کو برتنے کے باوجود آہنگ کے رچاؤ کو باقی رکھا۔ غزلوں اور نظموں کی عام مروجہ ہئیت سے قطع نظر دوسری صورتیں اسی نکتہ کو پیش کرتی ہیں

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستاں اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

یا

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب   مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب
اے وادیٔ لولاب

"نغمۂ ساربانِ حجاز" کے ہر بند میں مستعمل اس مصرع!

تیز ترک گامزن منزلِ ما دور نیست

پر نظر رکھیے تو دوسرا آہنگ اور ایک مختلف کیفیت نظر آئے گی۔ اس مصرع کی تکرار اور اس کی غنائیت دوسرے بندوں کو جوڑتی اور آہنگ کے بہاؤ کو آگے بڑھاتی ہے۔ آہنگ کا ایک اور روپ "زبورِ عجم" میں ملتا ہے۔ ابتدائی تینوں مصرعوں کا آہنگ ایک ہے

بعد کے چوتھے مصرع اور ٹیپ کے مصرعے ہم آواز ہوکر ترنم کی نئی صورت پیدا کرتے ہیں:

فریاد ز افرنگ و دل آویزئ افرنگ فریاد ز شیرینی و پرویزئ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزئ افرنگ معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

رزمیہ آہنگ کی دوسری کیفیت "زبورِ عجم" میں ملاحظہ ہو

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

اس کی تیسری صورت "پیامِ مشرق" کی نظم "شبنم" میں ملتی ہے۔

رجز خوانی کے اس دھن میں صوتی تکرار کی جھنکار سے جذبہ و احساس، فوج و سپاہ کے ساتھ پس منظر کی فضا بھی جاگ اٹھتی ہے۔ ان کے آہنگ کی یہ انوکھی کیفیت ہے، آہنگ کی یہ عجیب و غریب کیفیت جسم و جاں کے رگ و پے میں پیوست ہو جاتی ہے، اقبال کا یہ اختراعی آہنگ منظر و محاکات کی خارجی شکلوں میں نغمہ سرائی کی کیفیات سے معمور نظر آتا ہے۔ "پیامِ مشرق" کی کئی نظموں میں آہنگ کی یہ نادر صورت موجود ہے۔ ساقی نامہ، فصلِ بہار، جوئے آب وغیرہ۔ مؤخر الذکر نظم کی ہئیت مختلف ہے اور اس کا آہنگ بھی مختلف ہے۔

دررا ہِ او بہار پری خانہ آفرید نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید
ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبزہ پوش صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید
زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

اس نظم میں چھ مصرعوں کے بعد ساتواں اور آٹھواں مصرع صوتی تکرار پیدا کرتا ہے۔ خارجی مناظر کے تعلق سے آہنگ کی دوسری کیفیت اس طرح کے کلام میں ملتی ہے:

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر

شعر و نغمہ کی زد میں حواس اور مظاہر سبھی بے اماں نظر آتے ہیں۔ آہنگ کی روح مظاہر کائنات میں زندگی پیدا کرتی ہے۔ اس پس منظر میں الفاظ آہنگ کی بدولت تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں الفاظ کی گھلنی اور تحلیل ہوتی تصویریں آہنگ کے سیال کو سیلِ رواں

میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اقبال کے ہاں یہ سیلِ فکر کے تلاطم سے متحرک ہوتا ہے۔ بیرونی فضا میں نغمہ کی یہ رواں دواں کیفیت سماعت سے گزر کر نظر کے سامنے موجود ہوتی ہے۔ ایک اچھوتی مثال ملاحظہ ہو:

رنگ ہا، بوہا، ہوا ہا، آب ہا　　آب ہا، تابندہ چوں سیماب ہا

لالہ ہا در خلوتِ کہسار ہا　　نار ہا یخ بستہ اندر نار ہا

اِک اضافہ سے صرف مناظرِ فطرت کی بوقلمونی و فراوانی ظاہر نہیں ہوتی۔ آہنگ کی ارزانی بھی پورے پس منظر میں پھیل کر سوزِ کائنات بن جاتی ہے۔

اقبال کو آہنگ کا احساس باشعور وجدانی طور پر حاصل ہے۔ جذب و شوق یا سوز و گداز کی کیفیات کے ساتھ آہنگ کی سبک اور خاموش سرمستی بھی انتہائی خیال افروز اور جاں گداز ہوتی ہے، آہنگ کی غنائیت پر وہ حسبِ ضرورت متوجہ نہیں ہیں۔ کیوں کہ ان کے مقاصد دوسرے ہیں۔ اس کے باوجود کلام میں آہنگ کی ہمہ گیر صورتیں موجود ہیں۔ اصنافِ ادب کا ہر پہلو انفرادی تجربات کے ساتھ موجود ہے۔ پیغام و فکر کی رعایت سے ہیئت کے انتخاب نے آہنگ کو زیادہ پُراثر بنا دیا ہے۔ مسدس، مخمس، مثنوی، مستزاد، قطعات، غزل، نظم وغیرہ مختلف اسالیب نے آہنگِ شعر کو ایک جہانِ ممکنات سے روشناس کیا ہے۔ جس سے آہنگ کا کینوس بہت ہی پھیلا ہوا ہے۔

اقبال کا آہنگ سیال صفت ہے۔ اس کی جولانی میں فلسفہ کے نکات اور الفاظ بھی سیال ہو جاتے ہیں۔ اس سبب آہنگ کے سیال کی افزونی میں توسیع ہوتی ہے۔ اقبال کے اسالیب کے ساتھ ذخیرۂ الفاظ بھی بہت ہی ہمہ گیر ہے الفاظ کی تہ در تہ معنویت اسے اور بھی زیادہ وسعت بخشتی ہے۔ اس سے آہنگ کی معنوی دنیا اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی کثرت کے باوجود آہنگ کی تشکیل میں اقبال نے کثرتِ اصوات سے گریز کیا ہے۔ مصرعوں کی ساخت میں صرف چند یا محدود آوازوں سے کام لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے شعری آہنگ آوازوں کی کثرت کے سبب نہ بکھرتا ہے اور نہ پھیل کر بے اثر ہوتا ہے۔ محدود آوازوں پر منحصر آہنگ زیادہ منظم اور موثر ہوتا ہے:-

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر

تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب

مظاہرِ فطرت کی مصوری میں متحرک آہنگ قابلِ ذکر ہے۔ یہ آہنگ چند آوازوں کے سہارے تیار کیا گیا ہے۔ پورا مصرع اٹھائیس آوازوں پر مشتمل ہے۔ اس میں کل بارہ بنیادی آوازیں ہیں حروفِ علت کو ملا کر پندرہ آوازیں شامل ہیں۔ دوسرے مصرع میں اٹھائیس آوازیں ہیں۔ مگر آہنگ آفرینی کے لئے کل بارہ حرفوں سے مدد لی گئی ہے۔ پورے شعر میں ستاون حروف ہیں مگر آہنگ کے لئے کل چودہ آوازیں مستعمل ہیں۔ کلامِ اقبال میں آہنگ آفرینی کے لئے یہ صورت بہت نمایاں ہے جس کی وجہ سے آہنگ کی تنظیم اور تاثیر لے پایاں ہے۔

اقبال کے کلام میں اکثر مصرعوں، فقروں، ترکیبوں کا تکرار بھی ملتا ہے۔ اس تکرار سے آہنگ کا صوتی حسن بڑھ جاتا ہے اور خوش آہنگ لب و لہجہ کھنک اور ترتیبِ دلوں کی حسن آفرینی میں بڑا مددگار ہوتا ہے۔ موسیقی کے پیہم ارتعاشات سے ذہنوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ مسجدِ قرطبہ کا "سلسلہ روز و شب" اور "مسولینی" میں ندرتِ فکر و عمل کے تکرار سے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے اور یہ آہنگ

بتدریج بڑھتا ہے۔ قاری کو اس منزل پر چھوڑتا ہے جہاں جذبات اشتعال سے گزر کر جنوں خیز ہو جاتے ہیں۔ جیسے۔ خضرِ راہ کا پہلا بند۔ آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے یا دوسری نظمیں۔

کلامِ اقبال کی طرح ان کے آہنگ کی ایک انفرادیت اس کا تمثیلی یا ڈرامائی اسلوب و اظہار ہے۔ مکالماتی پیرایۂ بیان میں غنائیت کی ارتقائی صورت اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ دو مختلف و متضاد پیکروں کے درمیان آہنگ کا اظہار بھی مختلف اور دوسرے سے نمایاں ہوتا ہے۔ کرداروں کے اعمال و افکار کا اختلاف آہنگ سے نمایاں ہو، فن کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ اقبال کی مکالماتی نظمیں پیشِ نظر ہوں تو یہ نکتہ زیادہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ جبریل و ابلیس، پیرِ رومی و مریدِ ہندی، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ، محاورہ مابین خدا و انسان وغیرہ۔

اقبال نے صرف اسالیب یا اظہار کی بدولت شاعری کو نئے ممکنات سے ہی نہیں دوچار کیا۔ بلکہ ان کے اکتسابات اور عظیم تخلیقی سرچشمہ نے نغمہ و آہنگ کے بے کراں دنیا کو شاعری میں سمو دیا۔ اگرچہ وہ نہ مغنی تھے نہ موسیقار۔ مگر تخلیقِ فن کی اس سربلندی پر فائز تھے۔ جہاں صرف فنونِ لطیفہ کے ہی نہیں بلکہ علم و ادراک کے تمام شعبے نقطۂ وجدان پہ مدغم ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے اسے نقطۂ نور سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے سرچشمۂ زندگی کی شادابی ہوتی ہے۔ خودی اسی نقطۂ نور کا مظہر ہے۔ یہ نقطۂ نور اپنی حیثیت میں قائم بالذات نہیں بلکہ عرض ہے۔ جس کا بنیادی جوہر نورِ الٰہی ہے۔

خودی روشن ز نورِ کبریائی است

اقبالؔ کے شاہین کا ایک اور مطالعہ

سید محمد عقیل

اقبال کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ان پر قلم اٹھاتے ہی ایک رعب سا طاری ہو جاتا ہے۔ جس شخصیت کے بارے میں تقریباً سو[1] سے زیادہ اچھی کتابیں تصنیف ہو چکی ہوں، اس کے متعلق کون سی نئی بات مقالہ نگار پیش کر سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی شاعری کے تقریباً ہر رُخ پر متعدد مقالے، مضامین اور بہت سی تعبیریں پیش کی جا چکی ہیں۔ تاہم اس مقالے میں کچھ مفروضات کے متعلق کچھ وضاحتیں اور کچھ معتقدات کو ایک نئے زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبال نے شاہین کو ایک علامتی کردار عطا کر کے، اپنی فکر و فن کی توسیع کا مرکز بنایا۔ جس طرح ان کا فلسفۂ خودی، ان کی شاعری کا جزو لاینفک ہے، اسی طرح شاہین کو بھی ان کی شاعری سے الگ کر کے اقبال کی فکر و نظر کی بہت سی جہتیں واضح نہیں ہو سکتیں۔ میرے لیے یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اقبال کو یہ پرندہ کہاں سے ملا؟ کیا یہ محض ان کے ذہن کی تلاش ہے؟ یا اپنے خیالات کے اظہار کے لئے انھیں یہ پرندہ اپنی چند خصوصیات کی بنا پر، زیادہ معیاری معلوم ہوا۔ یا یورپ کے دوران قیام یعنی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء کے درمیان انہوں نے یہ تصور کہیں اور سے مستعار لیا۔ نازی جرمنی سے اس پرندے کے تصور کا جو عام خیال ہے، وہ صحیح نہیں۔ بہر حال شاہیںؔ اور عقابؔ، اپنے معمولی خد و خال کے ساتھ سب سے پہلے بانگِ درا کی آخری نظموں میں نظر آتے ہیں۔ اقبال نے شاہین کو سب سے پہلے محاصرۂ اَدرنہ میں استعمال کیا ہے جو ۱۹۱۲ء کے گرد و پیش لکھی گئی ہے۔ اس محاصرہ میں ترکوں نے یہودیوں کی رسد پر قبضہ کر لیا تھا جو اسلامی نقطۂ نظر سے معیوب بات تھی۔ اقبال نے مسلمانوں کی اس حرکت پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے

ہر شے ہوئی ذخیرۂ لشکر میں منتقل — شاہیں گدائے دانۂ عصفور ہو گیا

اس کے بعد بانگِ درا میں مندرجہ ذیل چار اشعار اور ملتے ہیں ہے

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست — ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے — کبوتر کے دلِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے — ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک — ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے ذہن میں شروع ہی سے شاہین کی تمام خصوصیات واضح ہیں جن کی بعد میں مزید تشریح کی

---

[1] مکاتیبِ اقبال، مرتبہ شیخ عطاء اللہ مجھے دستیاب نہیں ہو سکی جس میں خود اقبال نے شاہین پر بحث کی ہے۔

تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اقبال نے خود بھی شاہین کی علامت کی متعدد خطوط میں وضاحت کی ہے۔ جن کا لب لباب یہ ہے کہ شاہین انفرادیت پسند ہے۔ اپنی محنت پر آپ بھروسہ کرتا ہے، کسی کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ ہمیشہ بلند پروازی کی طرف مائل رہتا ہے۔ کبھی تھکتا نہیں، نئے نئے آسمانوں کو تلاش کرتا رہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مختصر طور پر اسے عزم و ہمت کی علامت سمجھنا چاہیے اگرچہ بعد کو اس عزم و ہمت نے بہت سے پہلو اختیار کئے مگر ابتدا میں یہ جذبہ ہندوستان کے سیاسی حالات کے خلاف لڑنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ اُن محدود صورتوں میں مسلمان، اپنی فلاح و بہبود کے لئے ہندوستان کے تمام انسانوں کے ساتھ مِل جُل کر کیا کر سکتے ہیں؟ اور ان حالات سے کس طرح لڑ سکتے ہیں؟ اسی کے لئے عزم و ہمت کی ضرورت تھی جو ہندوستان کو غلامی سے نجات دلا سکتے ہیں؟ جس سے مسلمان بھی جو روز بروز پستی میں گرتے جاتے تھے، اپنی بہتری کی عملی صورتیں اختیار کریں۔ ایک طرح سے یہ وہی لہر ہے جو حالی کے مسدس اور سرسید کی علی گڑھ تحریک سے وابستہ ہوتی ہے۔ حالی کی طرح اقبال بھی سوچتے تھے کہ مسلمان جو ایک عظیم ورثہ کے ماضی میں حامل رہ چکے ہیں وہ اپنی بے عملی اور کردار کی پستی کے سبب سے، تنزل کی اس منزل کو پہنچے ہیں۔ اگر ان میں ذوقِ عمل اور کردار کی استقامت پیدا ہو جائے تو ابھی ان میں ترقی کے امکانات ہیں شاہین بار بار خود بھی اس کا اعلان کرتا ہے اور شاعر، جہاں شاہین کی سربلندی کے اسباب بتاتا ہے، وہاں یہ بات زور دے کر کہی جاتی ہے۔

اے جانِ پدر نہیں ہے ممکن — شاہیں سے تَدَرو کی غلامی
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا — پُردَم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد
یہ پورب، یہ پچھم چکوروں کی دنیا — مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پئے شاہباز اں بساط است سنگ — کہ بر سنگ رفتن کند تیز چنگ
برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر — یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

اقبال کی نظر، بلندی کردار، ایمان و ایقان اور سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہمیشہ قرن اولیٰ کے مسلمانوں پر رہی اور بغیر زمان و مکان کے اس بُعد اور تاریخی اور سماجی تبدیلیوں سے گذر کر اس دور تک پہونچنے والے مسلمانوں کی مجبوریوں اور ان کے حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے، وہ ہمیشہ یہی سوچتے رہے کہ یہ صورتیں پھر واپس آسکتی ہیں اگر مسلمان صحیح معنوں میں "مسلم آئینی" ہو جائیں۔ شاہین کو ہمیشہ اسی لئے انہوں نے اسی قرن اوّل کے مسلمان کی شکل میں دیکھنے کی کوشش کی اور یہ روپ فی زمانہ حادثات کی تہ اور کردار کی پستی میں دبا دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ شاہین اب چکور، کبوتر، زاغ اور کرگسوں کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس میں آرام طلبی اور بے حسی اس حد تک پیدا ہو چکی ہے کہ اب اسے اپنی حیثیت کا اندازہ بھی نہیں ہو پاتا۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں — اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی — خراب کر گئی شاہیں بچوں کو صحبت زاغ
میانِ شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک — ترے بازو میں ہے پروازِ شاہین قہستانی

از مقامِ خویشتن دور افتادۂ کرگسی کم کن کہ شاہیں زادۂ
قریانداں نیست در پروانۂ شاں از تدرواں پست تر پروازِ شاں

اقبال، مسلمانوں کے اسی کردار کو پھر ابھارنا چاہتے ہیں جس میں ایک عام انسان کی بہتری بھی مضمر ہے۔ اس مسئلے پر بارہا بحث کی جا چکی ہے کہ شاہین کی علامت سے، اقبال طاقتِ جارحانہ کے حصول کا سبق دیتے ہیں جس سے فاشیزم کی راہیں کھلتی ہیں جو نازی جرمنی کے عقابی نشان تک پہنچتی ہیں۔ یہ تجزیہ، اقبال کے مزاج اور ان کے ایقان سے بے خبری کا تجزیہ ہے۔ یہ تجزیہ وہی کرتا ہے جو اقبال کے جملہ تصورات کو نظر میں نہیں رکھتا۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال، مسولینی سے بے حد متاثر تھے۔ اس کی تعریف میں ایک نظم ان کی بال جبریل میں ہے اور دوسری طنزیہ نظم ضرب کلیم میں لیکن شاہین کے جو صفات، اقبال نے بیان کئے ہیں، یا جو کام وہ اس سے لینا چاہتے ہیں اور جس طرح لینا چاہتے ہیں، وہ ایک درد مند دل، ایمان و آگہی، تمام اسلامی عقائد اور شرائط کے ساتھ ہی لئے جا سکتے ہیں۔ اسی لئے ان کا شاہین نہ تو محض مجرد اور جارحانہ قوت کا مظہر بنتا ہے اور نہ محض خونریزی ہیں اسے دلچسپی ہے یہ اتفاق ہے کہ انھیں مسولینی کا یہ جملہ کہ "جنگ، لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہے" پسند آگیا اور انھوں نے اسے شاہین کے منہ سے کہلوا بھی دیا لیکن اُس وقت تک اقبال مسولینی کے اصل مزاج اور مقصد سے واقف نہ تھے لیکن جیسے ہی مسولینی کا اصل روپ انھیں جنگِ حبشہ میں نظر آیا، انہوں نے ضرب کلیم ہی میں یہ اشعار لکھ کر مسولینی کے رویے سے اپنی نفرت کا اظہار کر دیا۔

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش
ع ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش

اقبال نے مسولینی کی تعریف اس جذبے کے تحت کی تھی کہ اس نے ایک مردہ قوم کو، جو برّ اعظم یورپ میں Nation of waiters کہلاتی تھی، اسے ایک زندہ قوم بنا دیا۔ کاش مسلمان بھی یا ہندوستانی بھی اس طرح بیدار ہو سکتے۔ پھر یہی نہیں، جینوا کانفرنس میں، جب اٹلی کے قبضۂ حبش کو تسلیم کرنے کی کوشش کی گئی تو اقبال نے "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں اسی اٹلی کو "گرگ"، اور برطانیہ و فرانس کو جو ثالث بنے ہوئے تھے، انھیں "کفن چور" ٹھہرایا۔

شرعِ یورپ بے نزاعِ قیل و قال برّہ را کردست بر گرگاں حلال
نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد از "کفن دزداں" چہ امید کشاد

اقبال کے شاہین کی طاقت محض جہادِ زندگانی کے لئے ہے۔ طاقت پرستی کے لئے نہیں۔ وہ تلخ زندگانی سے نپٹنے کے لیے طاقت چاہتے تھے، انسانوں پر ظلم کرنے کے لئے نہیں۔ ان کے شاہین کی طاقت ہر طرف سے اسلامی شعار کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسی لئے ہر جگہ شاہین ایک پابند controlled قوت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ غیر پابند قوت رکھنا اور ہر وقت اسی قوت کے نشے میں سرشار رہنا، بے حد خطرناک بات ہے۔ جس کی اقبال نے بار بار

مذمت کی ہے۔ لیکن اگر انسانوں میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ وہ اپنی مدافعت کر سکیں تو ایسے انسان اور ایسی قومیں، یقیناً صفحۂ دنیا سے مٹ جاتی ہیں۔ بال جبریل میں ابوالعلا معرّی والی نظم اور بہت سے اشعار، ان کے اس خیال کی تائید میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایسی طاقت، اقبال کے خیال کے مطابق مرگ مفاجات سے بچاتی ہے اور ان آقاؤں کے خیموں کی طناب بھی توڑنے میں کام آتی ہے جو بنی نوع انسان کو غلام بنائے ہوئے ہیں۔ یہ طاقت اس لئے بھی ضروری ہے کہ انسان مظلوم کی نفسیات سے بچتا ہے! ایسی نفسیات جو آہ سرد بن کر اچھے خاصے انسانوں کو بھیڑ، بکریوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔

لیکن اقبال کا تصور حیات جذباتی زیادہ ہے اور عملی کم۔ وہ عام مسلمانوں کی طرح ماضی کے تابناک کارناموں سے حال کے انتشار کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق، اگر تمام مسلمان نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر، متحد ہو جائیں تو اسلامی شعار، اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ واپس آ سکتا ہے۔ یا کم از کم مسلمان بہت کچھ اپنی آج کی نارسائیوں کا ازالہ کر سکتا ہے! اور یہی اسلامی شعار، ان کی تمام خامیوں، تمام محرومیوں اور تمام پس ماندگیوں کا علاج ہے۔ جدید صنعتی ترقی اور ٹیکنیکل نظام زندگی میں سوا محرومی کے اور کچھ نہیں ہے۔ یہ طرز زندگی بھی انھیں 'پرویزی' کی طرف جاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام سے بھی بیزار ہیں کیونکہ یہ محض جنگ، زرگری ہے جس میں سوا بد اخلاقی، مادہ پرستی اور کھوکھلے پن کے اور کچھ نہیں، جو انھیں انسانی قدروں سے بہت دور لے گیا ہے۔ اور اس لئے انسان کو اگر کہیں پناہ مل سکتی ہے تو صرف مذہب کے اصولوں کی پابندی میں۔ کینٹ ول اسمتھ cant well smith نے اپنی کتاب 'ماڈرن اسلام ان انڈیا' میں اس موقع پر چند جملے اقبال کے لئے یوں لکھے ہیں۔

> "His poetry has been ordinarily exploited in support of a fascist movement, The middle class throughout the world, just because, they well not understand The eco-nomic system, have shown themselves ever ready to be reduced by moral and religious arguments that they do understand, into a reactionary position." [1]

کینٹ ول اسمتھ سے قدرے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اُس کا محاسبہ مجموعی طور پہ درست ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کے اسباب آج کی دنیا میں بہت کچھ، ان کی معاشی ترقی، اقتصادیات کی صحیح تفہیم، حصول اور استعمال میں مضمر ہیں۔ پھر آج زندگی میں سائنس کا جو ادراک ہو رہا ہے اور Applied Science نے جو انقلاب برپا

---

1. Modern Islam in India by cantwell Smith P.123, 1946 edition,

کیا ہے، اس کی طرف کسی قوم یا انسانوں کی جماعت کا کیا رویہ ہے یہ مسئلہ زندگی کا بہت اہم مسئلہ ہے۔ سائنس جو روز بروز نہ صرف زندگی کے نئے امکانات تلاش کرتی رہتی ہے بلکہ ان امکانات کو اپنے اس وقت تک کے تجربوں کی روشنی میں پرکھ کر پھر ایک نئے تجربے کے لئے تیار ہو جاتی ہے، اس کی طرف ان قوموں اور انسانی جماعت کا کیا رویہ ہے۔ اقبال کا رویہ اس مسئلے میں نہ صرف مبہم ہے بلکہ کسی حد تک بے نیازی کا رویہ ہے۔ سائنسی انکشافات کی وجہ سے، مذہب، اخلاقیات، تعلیم، طرزِ معاشرت، تہذیب اور نئے سماجی حالات میں جو ایک انقلاب آ رہا ہے، اس سے اقبال بے پروا سے معلوم ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے مسائل حیات کو ان نئے علوم سے نہیں بلکہ وجدان اور مذہب کی اخلاقی قدروں سے حل کرنا چاہتے ہیں اسی وجہ سے شاہین کا رویہ ایک مابعد الطبیعاتی اور صوفیانہ بے نیازی کی اڑان کا رویہ بن جاتا ہے۔

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں (عقاب اور چیونٹی)

زد بانگ کہ شاہینم و کارم بہ زمیں چیست
صحرا است، کہ دریاست، تہِ بال و پرِ ماست

جیسے اشعار سے، شاہین کے رویے کا پتا چلتا ہے۔ شاہین، دراصل مردِ مومن ہی کا عکس ہے جو صرف سوزِ دروں اور قوتِ عمل سے سب کچھ کر سکتا ہے۔ یہ تصور، تسخیرِ فطرت کا ایک رومانی، مبہم اور کسی حد تک اندھا تصور ہے ایسے افراد، اقبال کے یہاں کسی سماجی نظام کے توڑ پھوڑ یا کشمکش سے وجود میں نہیں آتے، بلکہ ایمانِ کُل اور عقیدوں کے راستے سے ان کی دنیا تک رسائی ہو سکتی ہے لیکن جو سیاسی اور سماجی تبدیلیاں، جمہوری یا غیر جمہوری حکومتوں کے برتاؤ اور رویے سے ہوتی رہتی ہیں یا ان تبدیلیوں سے جو افراد کی زندگی میں انقلاب آ سکتا ہے اور پھر وہ حالات کے جبر کے تحت کیا انسان بنے گا، اس کا ذکر اقبال نہیں کرتے اور اگر کہیں کچھ اشارے ملتے ہیں تو ان پر ان کی رجائیت یہ حکم لگاتی ہے کہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم، اپنے حسب منشا سب کچھ بدل سکتے ہیں اور اس طرح بدلتے ہوئے حالات اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اگرچہ بدلتے ہوئے حالات کا ان کو اچھی طرح اندازہ ہے اور اسی سلئے وہ وقت اور تبدیلی کو قوموں کی زندگی میں، سب سے بڑا حربہ بھی سمجھتے ہیں سلسلہ روز و شب کیسے کیسے انقلاب لا سکتا ہے، اس سے ان کی پوری نظم "مسجد قرطبہ" بھری پڑی ہے۔

شاہین کا عمل اور اس کی کوششیں، حالات اور ممکنات کے تحت ہوں گی؟ تاریخ کے اتار چڑھاؤ اس کی کوششوں کو متاثر کر سکیں گے یا نہیں؟ ایمان والوں کی جہد (struggle) سیاسی کشمکش اور مادی حالات کے خلاف ہو گی یا موافقت میں یا صرف روحانی اور اخلاقی دنیا میں، اس کا واضح جواب شاہین کے پاس نہیں ہے وہ ایسے خاکداں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے، جہاں زندگی، محض آب و دانے کا نام ہے۔ وہ "پورب اور پچھم" سب کو چکوروں کی دنیا سمجھتا ہے تو پھر کس کے مقابلے میں یہ کشمکش جاری ہے؟ غیر اللہ کے خلاف؟ سرمایہ داری کے خلاف؟ لامذہبیت کے خلاف؟ یہ سب کچھ واضح نہیں ہے

جہد اور مقابلے کی کوشش (competitive spirit) کیا نتیجہ نکالتی ہے اور یہ مقابلہ یا حالات کی سختیوں سے ٹکراتے رہنا، کیا ٹکرانے والوں کو صرف ایمان و آگہی کے منطقے میں سربلند کرتا ہے یا معاشی مقابلے اور مادی وسائل کی دنیا میں بھی؟ اور اگر ایسا بھی ہے تو یہ جذبہ، دھیرے دھیرے، شاہین کو اسی سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے کی دوڑ میں لے جاتا ہے، جہاں فرسٹریشن (Frustration) یعنی محرومیاں، خوف و ہراس، تشویش، تشکیک، عدم اعتمادی، مقابلے میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور متعدد استحصال کی صورتیں بھی رونما ہوتی ہیں۔ کس طرح جگیں۔ کساد بازاری اور کارخانوں کی تباہیاں اور زرعی پیداوار کی بربادی، ملکوں کی تقدیر کا فیصلہ کرتی ہیں، ان تمام باتوں کا تجزیہ کئے بغیر، صرف وجدان سے قوموں کی ترقی اور تنزل کا فیصلہ کیسے ہوگا؟ شاہین اور مردِ مومن اس وقت تک اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس سوسائٹی کا ڈھانچہ نہ بدلے، معاشی حالات نہ بدلیں، ذرائع پیداوار نہ بدلیں اور پیداوار، منافع خوری کے لئے نہ ہو اور ان معیاروں کے مطابق سوسائٹی کی تشکیل ہو جو، وقت، تاریخ اور معاشی سائنسی امکانات کے ساتھ وابستہ ہوں۔ بغیر واجبی معاشی، تشفی کے، جمالیاتی، اخلاقی اور روحانی قدریں کس طرح باقی رہ سکتی ہیں اور اس کے حاصل کرنے کا جو طریقہ 'خودی اور وجدان' بتاتے ہیں وہ مادی امکانات کے پیچ در پیچ مسائل میں شاہین اور مردِ مومن، دونوں کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اس لئے شاہین کی تمام جد و جہد خیالی بن کر رہ جاتی ہے۔

اقبال نے اپنے اس خیال کو ہر جگہ ایک عملی پروگرام بنا کر پیش کیا ہے۔ آج کی سماجیات اور معاشی صورتوں میں جو نئے تجربے نئی دریافت ہوتی رہتی ہے، کیسے کہا جائے کہ اقبال ان سب سے باخبر نہ تھے، لیکن ان کے لکچروں اور ان کے اشعار کہیں سے ان کی اس واقفیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اپنے اس پروگرام کو وہ حقیقی اور عملی روپ میں بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جذباتی طور پر، ایک خاص منزل تک چلنے کے بعد، ان کا یہ سارا پروگرام محض UTOPIAN ہو جاتا ہے۔ وہ اسلامی جمہوریت کو دنیا بھر میں یا کم از کم اسلامی ممالک میں نافذ کرنا چاہتے ہیں مگر جمہوریت اور سیاسی افکار کو حالات کے تحت فطری طور پر بڑھنے اور پھیلنے کا موقع نہیں دیتے۔ اس میں فیضانِ سماوی کی شمولیت کو لازم قرار دیتے ہیں اور سیاسی افکار کو بغیر اسلامی یا مذہبی قید و بند کے، "ابلیس کی ایجاد" بتاتے ہیں۔ اُولی الامر منکم کے اشارے سے وہ کسی حد تک Dictator Saviour بھی چاہتے ہیں جو سماج کو بچانے میں بھی مدد کر سکے اور اس کی غلطیوں پر احتساب بھی۔ شاہین اسی لئے، درویش صفت اور قلندرانہ شان رکھنے کے ساتھ ساتھ، جبری اور سخت طبع بھی ہے لیکن یہ قلندرانہ شان اور درویشی کسی حد تک تضاد کا شکار ہو جاتی ہے۔ جب اقبال ۱۹۲۲ء میں "سر" کا خطاب منظور کر لیتے ہیں اور ۱۹۳۱ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن بھی جاتے ہیں۔ اگرچہ شاہین کے مزاج میں یہ لچک اور مصلحت پسندی نہیں رکھی گئی۔ شاید حکومت کا یہ اعزاز واپس کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی جیسا کہ آج بھی کبھی کبھی اس جمہوری دور میں ایسی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں اور اس سے فرد پسندی اور شخصیت پرستی کے رجحان کا سراغ ملتا ہے۔

اقبال کی شاعری سماج کی اجتماعی ترقی کی تصویر نہیں پیش کرتی، اگرچہ بادی النظر میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اُمتِ مرحوم، شخصیات اور افراد کی انفرادی کوششوں سے ترقی کا اندازہ ضرور کرا دیتی ہے۔ شاہین خود پسندوں کی دنیا کا درویش ہے

جو اپنی انفرادیت پر ناز کرتا ہے اور عام پرندوں سے الگ رہ کر اپنی انفرادیت سے متاثر کرنا چاہتا ہے۔ غازی امان اللہ خاں، خوشحال خاں خٹک، ٹیپو سلطان، تیمور، ملا زادہ ضیغم۔ لولابی، مجدد الف ثانی، نادر شاہ، نپولین، محمود، سب اپنے انفرادی کارناموں سے تاریخ اور ترقی کے زینوں تک پہنچ کر عالمگیر شہرت کے حامل ہوتے ہیں۔ جو اقبال کو بے حد پسند ہیں۔ ان کی ترقی میں کسی سماج کا من حیث الجماعت، کوئی ہاتھ نہیں۔ یہ حالات کے پروردہ نہیں بلکہ شخصی اور انفرادی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ یہ فرداً فرداً ترقی، پھر ان کا ایک بنا کر ایک اجتماعی شکل پیش کرتی ہے اور اس طرح سماجی ترقی کا ایک مجموعی تاثر قائم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

بہ یک وقت سماج میں مادی صورتوں سے اجتماعی طور پر تبدیلی لانے کا کوئی لائحہ عمل، حکیم الامت کے پاس نہیں ہے۔ پھر فرد، طاقت کی آخری منزل پر پہونچ کر کس طرح ہٹلر اور مسولینی بننے سے روکا جا سکے گا، اگر اس نے خدا ترسی، ایمان اور اللہ کی برہان بننے سے انکار کر دیا، جس کا ہر وقت امکان ہے؟۔ پھر صرف خدا ترسی، روحانیت، ایمان اور عشق کے سہارے یہ مردانِ خدا ایک رشتے میں منسلک ہو کر کن ارتقائی سمتوں کی طرف جائیں گے۔ روحانی ارتقا کی سمت میں یا مادی ترقیوں کی طرف؟ جبکہ مادی ترقی کا کوئی نظام، اقبال تجویز نہیں کرتے، کینٹ ول اسمتھ نے اپنی کتاب ماڈرن اسلام اِن انڈیا میں دلچسپ بات لکھی ہے کہ اقبال، سویت روس سے اس وجہ سے خفا تھے کہ وہ سب لامذہب ہیں اور خدا کے منکر مگر یہ نہیں دیکھتے تھے کہ مذہب نے انسانی فلاح و بہبود، ہمدردی، بھائی چارے اور انسانیت کا جو تصور دیا ہے اس پر سب سے زیادہ عمل اشتراکی ممالک کرتے ہیں جبکہ سرمایہ دارانہ مذہبی سماج میں مذہب کی ایسی تمام باتوں پر مشکل ہی سے عمل ہوتا ہے لیکن زبان سے روحانیت اور انسانی قدروں کا بڑا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔' اقبال سویت روس کی ترقی پر خوشی کا اظہار بھی کبھی کبھی کرتے ہیں مگر تمام خوبیوں کے اعتراف کے باوجود اس نظام زندگی کے متعلق ان کی یہ رائے ہے۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ع جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے
مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادیں — کنیزِ اہرمن و دُوں نہاد و مردہ ضمیر
جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

اقبال مغربیت اور سرمایہ داری کو کبھی الگ نہیں کر سکے اور یورپ سے ان کا مطلب زیادہ تر برطانیہ رہا۔ شاید اس کا سبب ہندوستان کی انگریزی حکومت تھی جس سے ان کا سابقہ پڑا تھا۔ جس کی بنیادیں سرمایہ دارانہ شاہی نظام پر تھیں۔ انگریزی حکومت نے جس طرح اپنی ٹیکس کی پالیسی سے ہندوستانی دیہاتوں کی اقتصادیات کو دھکا پہونچا کر، اس کے ملبے پر برطانیہ کی تاجرانہ سرمایہ داری کی بنیاد

رکھی تھی، یہ تاریخ کا بالکل ایک نیا رخ تھا جس نے ہندوستان کی طرف سے برطانیہ کا رویہ بالکل بدل دیا۔ ہندوستان ان کے لئے ایک ایسی کالونی تھی جو انگریزی کارخانوں اور کرگھوں کے لئے کچا مال سپلائی کرتی تھی جس کا فائدہ برطانیہ کے سرمایہ دار اٹھاتے تھے لیکن ہندوستان کی اپنی اقتصادیات کو کوئی فائدہ نہ تھا جس سے یہاں کے مزدور طبقے اور کسانوں پر اثر پڑ رہا تھا اگرچہ ان میں سے بہت کم یہ سمجھ پاتے تھے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ہندستان اور دوسری کالونی سے جو کچھ یورپ پہنچتا سب سرمایہ کی شکل میں تبدیل ہو کر، مزید لوٹ کھسوٹ کے لئے، سرمایہ داروں کو تیار کرتا۔ اقبال اور ان جیسے متوسط طبقے کے مفکرین، ان باریکیوں کی تہ تک کس حد تک پہونچے تھے، کہا نہیں جا سکتا لیکن ان کو ایک عام اندازہ ضرور تھا کہ یہ نظام زندگی، ہندوستان کا استحصال کر رہا ہے اور ان باتوں کے لئے وہ مغرب ہی کو الزام دیتے تھے۔ وہ سرمایہ داری سے زیادہ مغرب کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال دونوں کے فرق کو نہیں سمجھتے تھے، لیکن ہندوستان کی غلامی، برطانیہ کی سامراجیت، یورپ کے چند ممالک کی مادہ پرستی اور بے دینی، روس کا انقلاب، سب نے مل کر اُن کی فکر کو ایسا گنجلک (CONFUSE) کر دیا تھا کہ وہ صحیح تجزیہ نہ کر پاتے اور ایسی حالت میں انھیں، جوش، جذبے اور وجدان سے بڑا سہارا ملتا۔ وہ جھنجھلا کر مغرب، برطانیہ اور یورپ سب کے خلاف ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو صف آرا کرتے ہیں۔ شاہین سے جو باتیں کہی یا کہلائی جاتی ہیں، ان کی تہ میں اقبال کا یہی ذہن کام کرتا رہتا ہے۔

یا ز دے شاہیں گشا خونِ تدرواں بریز   مرگ بود باز را ز یستن اندر کنام

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے   کبوتر کے دلِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

جینے کا جگر چاہئے شاہیں کا تجسس   جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانشِ افرنگ

ما چشمِ عقاب و دلِ شہباز نہ داریم   چوں مرغ سرا لذتِ پرواز نہ داریم

اے مرغ سرا خیز و پریدن دگر آموز

یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نظر میں، اپنی منزل کا تصور واضح نہیں ہو پاتا۔ کبھی وہ دینِ مبین اور حبلِ متین کی گرفت کو اس دور مادیت میں کافی سمجھتے ہیں، کبھی مغرب کی مخالفت، ان کا مطمحِ نظر ہے تو کبھی انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا، ان کا نصب العین اور حبیب ان سب سے مسلمان عہدہ برآ ہو جائیں، تو انھیں ترقی حاصل کرنے اور ایک با عزت قوم بننے کی فکر کرنی چاہئے۔ اقبال کے یہی نصب العین سمجھ میں آتے ہیں لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ ان تمام نصب العین تک پہونچنے کے لئے جو طریقے بتائے جاتے ہیں وہ کسی بھی ایسے راستے کی اس طرح نشاندہی نہیں کرتے کہ اُن پر چلنے والا صحیح منازل تک پہنچ سکے۔ مسلم سوسائٹی اپنے مسئلوں میں اس طرح الجھ گئی تھی کہ نہ تو ان مسائل کا کوئی حل اقبال کے پاس تھا اور نہ بہت سی باتوں کا تجزیہ کر کے وہ کسی ایک نتیجے پر پہنچ سکتے تھے۔ اس میں اُن کی تصوریت پرستی (IDEALISM) کو بھی دخل ہو سکتا ہے اور بہت سے

سماجی اور معاشی مسائل تک نارسائی کو بھی۔ وہ زندگی سے روحانیت کے طلب گار تھے لیکن یہ سوچنے پر تیار نہ تھے کہ روحانی اور اخلاقی قدریں، بغیر مادی حقیقتوں کے ممکن نہیں اور نہ اس دنیا اور اس میں بسنے والوں کا ارتقا مادی حالات کے اتار چڑھاؤ ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ شاہین ان مادی حقیقتوں اور وسائل کو "شکارِ مردہ" سمجھتا ہے اور کسی مسئلے کا مادی وسائل سے حل تلاش کرنے کے بجائے وجدان کے عالم میں ایک زقند بھر کر فضا کی پہنائیوں میں گم ہو جاتا ہے اور اس طرح اقبال کے یہ تصورات نہ تو material force بنتے ہیں اور نہ عوام پر اثر انداز ہو پاتے ہیں[1]

زد بانگ کہ شاہینم و کارم بہ زمیں چیست
صحراست کہ دریاست تہِ بال و پرِ ماست

———

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

———

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے تری آنکھوں نے نہ فطرت کے اشارات

———

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

اس طرح شاہین اقبال کے عمل و حرکت کے تصور کی علامت بھی ہے اور مادی عملی دنیا سے ان کی نارسائی اور فرار کی ایک مثال بھی۔

---

[1] "Theory becomes material force when it grips the masses." — Marx

اقبال ۔ مجموعۂ اضداد یا دانائے راز؟

فتح محمد ملک

اسے عجز بصیرت کہیں یا مخصوص مفادات کی چاکری کا شاخسانہ کہ گزشتہ نصف صدی کی ادبی تنقید اقبال جیسے عالمی اور آفاقی شاعر کو، باعادہ و تکرار، تنگ نظری، فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کا الزام دیتی آئی ہے۔ یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ ترقی پسندی اور روشن خیالی کی علمبردار تنقید نے اُس شخص اور شاعر کو "پنجابیت" اور "سستے قسم کی ملیت اور اسلاف پرستی" کا طعنہ دیا ہے جس کی پرواز جنوں پر آفاق کی وسعتیں تنگ ہیں اور جس نے اپنے لیے "بندۂ حق بین و حق اندیش"، "درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی" اور "مردِ آفاقی"[1] کے سے خالص انسانی معیار متعین کر رکھے ہیں۔ ممتاز ترین ترقی پسند ناقدین کی اقبال شناسی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"اقبال جس تصور کو بھی لے کر اٹھتے ہیں وہ اول اول نہایت بلند اور وسیع اور تمام دنیائے انسانیت پر محیط ہوتا ہے لیکن بہت جلد اس وسعت اور بلندی سے وہ اس قدر سراسیمہ ہو جاتے ہیں کہ اپنی فکر و نظر کا دائرہ گھبرا کر نہایت تنگ اور اپنی سعی و عمل کی سطح بہت پست کر دیتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس عشق کو انسان کا خمیر بنایا گیا ہے وہ محض کسی مردِ مومن کا اجارہ کیونکر ہو سکتا ہے اور جو عشق ایک کائناتی حقیقت ہے اس کو پھر حجازیت یا کسی دوسرے عنوان کے قومی یا ملی پیغام کا سنگِ بنیاد بنانا کہاں کی دانائی ہے؟

اقبال کی تنگ نظری اور غلط فکری میلانات کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں

---

[1] نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی — سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی — رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے — آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش — خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند

پر جس کا ماضی بھی رہ ہو اور جس نے سیکڑوں قوموں سے ٹکر لی ہو، جس کے دشمن اور رقیب بھی ہوں آفاقی شاعر نہیں بن سکتا۔ اقبال نے ایک ایسے مردِ مومن کے کردار کو جنم دیا ہے جو ایک مخصوص شریعت کا پابند ہے۔ آج دنیا سے مذہبی مشن کا زمانہ اُٹھ چکا ہے اور یہ خیال کرنا کہ ہم کسی مذہبی تنظیم فکر کے ماتحت پوری دنیا کو متحد کر سکتے ہیں ایک فعل عبث ہے۔"

(ممتاز حسین - نقدِ حیات)

درج بالا اقتباسات اقبال پر ترقی پسند تنقید کے نمائندہ اعتراضات کے عکاس ہیں۔ یہ اعتراضات اقبال کے فنی و فکری مسلک سے زیادہ اقبال کے سیاسی مسلک اور عملی سیاسی جد و جہد کے خلاف رُدِ عمل سے پھوٹے ہیں دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ترقی پسندوں نے جس استدلال کے سہارے اقبال کی آفاقیت کی نفی کی ہے بالکل اُسی استدلال کے ساتھ سوویٹ یونین کے ادبی نقاد اقبال کی عظمت کا اثبات کرتے ہیں۔ چنانچہ نکولائی آنی کنیف نے اقبال کے فلسفۂ خودی پر اپنے "تازہ مقالے میں" ان ترقی پسندوں اور نام نہاد ترقی پسندوں" کو ہدفِ تنقید بنایا ہے جو "اقبال کے فکر و فن پر صرف اس وجہ سے رجعت پسندی اور قدامت پرستی کا الزام دھرتے ہیں کہ اقبال نے، بقول اُن کے، صرف مسلمانوں سے خطاب کیا ہے اور اُس کے نظریات، استدلال اور مشرق کی بیداری کے تصورات قرآن سے پھوٹے ہیں۔" نکولائی آنی کنیف کے نزدیک بحیثیت فلسفی اقبال کی عظمت کا راز انسان کے ازلی، ابدی اور آفاقی مسائل کو تجرید اور مادرائیت کی دھند سے نکال کر اپنے ماحول اور اپنے عہد کے سیاق و سباق میں سمجھنے اور اپنی قومی نشاۃ ثانیہ کے تقاضوں کی روشنی میں بیان کرنے میں مضمر ہے[1] اس کے برعکس ہمارے ترقی پسند اس بات پر برہم ہیں کہ اقبال نے ہندی مسلمانوں کو اپنا سوز کیوں عطا کیا، لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند، دلوں میں اک ولولۂ تازہ کیوں پیدا کیا اور مشرق کی مردہ سرزمینوں کو حیاتِ تازہ سے سرسبز و شاداب دیکھنے کی تمنا کیوں کی؟[2] ——— ان کے نزدیک مسلمانوں کے مصائب پر دلسوزی فرقہ آرائی ہے اور مشرق کو مغرب کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کا تصور رجعت پرستی ہے[3] ایک بار پھر آفاقیت کے مستعار کتابی تصور کے عہد کے میں وہ یہ دیکھنے سے معذور رہیں کہ اقبال عالمِ اسلام کو صرف اور صرف عالمِ انسانیت کی سربلندی کی خاطر بیدار اور سرگرمِ کار دیکھنے کے تمنائی ہیں:

---

[1] "اقبال ——— پاکستان کا شاعر فلسفی" صفحہ ۲۸۴ مرتبہ حفیظ ملک، مطبوعہ نیویارک (انگریزی)

[2] دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا — وہ اک مردِ تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں — ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا

[3] 'ادب اور انقلاب' ——— اختر حسین رائے پوری۔

ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ وہ اتنی بڑی شخصیت کے باوجود ٹھیٹھ پنجابی تھے۔ پنجابی فطرتاً صوبائی فرق و امتیاز کا دل سے قائل ہوتا ہے۔ اقبال چونکہ اتنے بڑے مفکر اور مبصر تھے اس لیے ان کے ہاں جغرافیائی اور صوبائی امتیازات نے خیالات و اعتقادات کی فرقہ بندی کی شکل اختیار کر لی اور ملکیت و قومیت کچھ مجرد ہو کر ملیت بن گئی۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا مسلک انسانیت اور آفاقیت تھا یا پستی قسم کی ملیت اور اسلاف پرستی، اس لئے کہ دونوں عناصر اقبال کے ہاں مخلوط اور گڈمڈ ملتے ہیں جس سے ہم کو اکثر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ خود اقبال کے لئے ان کے افکار و خیالات صاف اور سلجھے ہوئے نہ تھے۔ اقبال کا وہ میلان جو حجازیت کے نام سے مشہور ہے ان کی اسی ماضی پرستی اور رجعت پسندی کا نتیجہ ہے۔" (مجنوں گورکھپوری۔ اقبال صفحات ۳۵، ۳۶)

"اقبال فاشیت کا ترجمان ہے اور یہ درحقیقت زمانہ حال کی جدید سرمایہ داری کے سوا کچھ نہیں۔ اقبال ایک قوم ہی کو نہیں بلکہ اس قوم کے ایک خاص طبقے کو مخاطب کرتا ہے۔ یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے۔" تاریخ اسلام کا ماضی اُسے بہت روشن اور شاندار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا دورِ فتوحات اسلام کے عروج کی دلیل ہے۔ اقبال قومیت کا اس طرح قائل ہے جس طرح مسولینی۔ اقبال ایسے ہی ڈکٹیٹر کو اسلامی پاکستان کے استحکام کا ضامن سمجھتا ہے۔ مختصر یہ کہ اقبال اسلامی فاشسٹ ہے اور اس کا ردِ عمل ہندو فاشزم کی صورت میں نکل رہا ہے۔" (اختر حسین رائے پوری: ادب اور انقلاب)

"اقبال کی سامراج دشمنی اور احیائیت ساتھ ساتھ چلتی ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے معاشی اور سیاسی سوال کو ایک اخلاقی مسئلے میں تبدیل کر دیا جس کی وجہ سے یہ سوال حل ہونے کے بجائے اور الجھ گیا ..... اس تضاد کی وجہ سے اقبال کی شاعری کہیں انتہائی بلند، حسین اور پرشکوہ ہو گئی ہے اور کہیں بے انتہا پست۔" (علی سردار جعفری ۔ ترقی پسند ادب)

"ہر وہ مفکر جو سچے دل سے پوری انسانیت کے لیے سوچتا ہے اور خیر و فلاح کی قدروں کو طبقاتی مفاد سے بالاتر کر دینا چاہتا ہے وہ لامحالہ اشتراکی نظام ہی کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ اقبال نے کارل مارکس کو صاحب کتاب جانا اور لینن کو حضور بارگاہ میں مغرب کی سرمایہ دارانہ چیرہ دستیوں کے خلاف کھڑا کر دکھایا لیکن اشتراکی نظام سے بھرپور ہمدردی کا اظہار نہ کیا۔

کوئی بھی شاعر کسی مذہبی یا سیاسی تحریک کی بنا پر اور بالخصوص ایک ایسی مذہبی تحریک کی بنیاد

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ
معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

'نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر' مسلمانوں کے اتحاد کے پیغام پر "سستی قسم کی ملیت اور احیائیت" کی تہمت تراشتے وقت یہ لوگ اس سنگین حقیقت سے قطع نظر کر لیتے ہیں کہ اس وسیع و عریض خطۂ ارض پہ بسنے والے مسلمان، اقبال کے عہد کے مظلوم ترین انسان ہیں جو ایک جابر و جابہ سامراج کے آہنی جال میں اسیر ہیں۔ اِن "نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں" مسلمانوں کی مادی اور روحانی پسماندگی مغرب کی سامراجی حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے۔ اقبال بھی اسی مردہ سرزمین میں پیدا ہوا ہے مگر وہ ان مسلمانانِ افرنگی مآب کی خود فراموشی اور بے بصری پہ حقارت کی نگاہ ڈال کر ان سے کنارہ کش نہیں ہو جاتا بلکہ انہی غلام ابن غلام ابنِ غلام انسانوں کے دل و دماغ میں اتر کر انہیں 'بیداری' اتحاد اور جہاد کا درس دیتا ہے۔ اقبال اپنے درسِ خودی سے اس عبدِ فرنگ کو عبدہٗ بنانے کا آرزومند ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ محکوم و مجبور مسلمان ملوکیتِ افرنگ کی پرستش چھوڑ کر اسلام کی انقلابی اساس پہ متحد ہو جائے۔ یہ اتحاد کسی "اسلامی فاشزم" کے قیام کی خاطر نہیں بلکہ مشرق کو مغرب کے سیاسی اقتصادی اور تہذیبی استبداد سے نجات دلا کر اتحادِ انسانی کا علمبردار بنانے کا اولیں مرحلہ ہے۔

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

ہندوستانی وطنیت کے محدود تصور سے بڑھ اور پھیل کر اقبال پورے مشرق کی نجات کا پیامی بنا تو ہماری ادبی تنقید نے اُسے تنگ نظر فرقہ پرستی کا شکار قرار دیا۔ ہندوستانیت سے اسلامیت اور اسلامی بین الاقوامیت سے عالمگیر انسانی بین الاقوامیت تک اقبال کے مسلسل پھیلتے ہوئے ذہنی افق پہ تدریجی فکری ارتقا کی بجائے فکری تضادات کے نقوش دیکھے اور پھر اسلام کی آفاقی انسانی اقدار کی بازیافت اور عہدِ جدید کے سیاق و سباق میں ان اقدار کی تشکیلِ نو کی خاطر قیامِ پاکستان کی جانب اقبال کی فکری اور عملی پیش قدمی کو فرقہ پرستی کی جانب مراجعت ٹھہرایا۔ قدامت پسند ذہن کی اقبال ناشناسی تو قدرتی بات ہے مگر ترقی پسند تنقید کے یہ حجابات ایک تہذیبی المیے سے کم نہیں۔ اس تنقید کا حجابِ اکبر آفاقیت کا وہ کسی خارہ ہولا ہے جس کی رُو سے "کوئی بھی شاعر کسی مذہبی یا سیاسی تحریک کی بنا پر آفاقی شاعر نہیں بن سکتا۔"[1] اقبال کی آفاقیت کے مقامی رنگ اور زمانی روپ ایک خاص عہد اور ایک خاص سرزمین سے پھوٹتے ہیں۔ اقبال کے ہاں مسلمانوں کا سیاسی اور تہذیبی آشوب اور یورپ کا سامراجی تسلط خالص علمی اور فکری سوال نہیں بلکہ ذاتی اور جذباتی روگ ہے۔ چنانچہ

---

[1] ممتاز حسین: "کیا اقبال آفاقی شاعر ہیں؟"

اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

اقبال محبت کے متصوفانہ شعور کو عام کر کے اس آتشِ بیکار کو گل و گلزار بنانے کا عزم کرتے ہیں تو ان کی ساری توجہ ہندوستان کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے متحارب فرقوں کو انسانی وحدت عطا کرنے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یوں وہ 'نیا شوالہ' وجود میں آتا ہے جس میں ملائیت اور برہمنیت ہر دو کو رد کر کے اقبال دھرتی کے باسیوں کو محبت کی راہِ نجات دکھاتے ہیں۔ یہ اسلام سے انحراف کی نہیں بلکہ اسلام کے اثبات کی راہ ہے۔ 'نیا شوالہ' دراصل ڈیڑھ اینٹ کی وہ جُدی مسجد ہے جو میر تقی میر[1] شیخ و برہمن سے دور کسی ویرانے میں تعمیر کرنے کے آرزومند تھے۔ مسلمانوں کے ادب میں کفر کی روایت کی معنویت سے شناسا ذہن گواہی دے گا کہ اس تشکیلی دور میں بھی اقبال کے ہاں غالب رجحان وطنیت نہیں اسلامیت ہے۔ اسلام کے مسلکِ انسانیت کے زیرِ اثر اقبال برصغیر کی روحانی وحدت کا جو مثالی تصور 'نیا شوالہ' میں پیش کرتے ہیں اُسے برہمنیت اور ملائیت کے اجارہ دار پوری قوت کے ساتھ رد کر دیتے ہیں اور ہندوستان کی فضا روز بروز زیادہ نفاق انگیز ہونے لگتی ہے تو اقبال مثالیت کی ماورائی بلندیوں سے حقیقت کی سنگین زمین پر اتر آتے ہیں: ؎

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

اقبال کی شاعری میں ۱۹۰۵ء کے بعد اسلامیت کے جس رجحان کے خد و خال نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ وہ قلبِ ماہیت کا نہیں بلکہ تدریجی فکری ارتقا کا آئینہ دار ہے۔ یہ ترمیمِ نظر کی نہیں بلکہ 'پختگیٔ نظر' کی دلیل ہے۔ ہماری ادبی تنقید مثالیت اور حقیقت کے تصادم سے پیدا ہونے والے اس نئے شعور کے پیچھے قیامِ یورپ اور مغربی قوم پرستی کی ہلاکت آفرینی کے اثرات کی کارفرمائی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے اور ہندوستان کی اندرونی کشمکش سے صرفِ نظر کرنے کی خوگر ہے۔ حالانکہ اقبال کے فکری ارتقا کے اس مرحلے کو سمجھنے کا مرکزی حوالہ قیامِ یورپ نہیں بلکہ ہندوستان کی سیاسی کشمکش ہے۔

جس وقت اقبال ملائیت اور برہمنیت کو مٹا کر ایک نیا شوالہ تعمیر کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے عین اُس وقت رابندر ناتھ ٹیگور سودیشی سماج کے قیام کا منصوبہ پیش کر رہے تھے اور آربندو گھوش، بنکم چندر چیٹرجی کے 'انند مٹھ' کے عکس پر بھوانی مندر لکھنے میں مصروف تھے۔ جس وقت اقبال برہمن کو صنم کدے سے پرانے بت باہر نکال پھینکنے کی تلقین کر رہے تھے عین اُس وقت ہندو احیائیت کی تحریک آربندو گھوش اور ٹیگور کے زیرِ اثر نسلی برتری کا ایک نیا بت تراش رہی تھی۔ ۱۹۰۵ء کی تقسیمِ بنگال نے ہندو احیائیت کی اس تحریک کو ایک خطرناک جارحانہ رنگ دے دیا تھا۔ خالص انتظامی بنیادوں پر بنگال کی تقسیم پر ہندوؤں کے ردِ عمل نے ہندوستان کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں فرقہ واریت کی خلیج کو ناقابلِ عبور بنا دیا تھا۔ ہندو احیائیت جو ابھی کل تک محض علمی موشگافی اور مذہبی مناظرہ بازی تک محدود تھی اب ایک باقاعدہ سیاسی تحریک میں ڈھل گئی تھی۔

---

[1] شرکتِ شیخ و برہمن سے میرؔ — کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جُدی مسجد — کسی ویرانے میں بنائیے گا

غلامی، سامراج اور انقلاب کے تصورات مجرد صورت میں کہیں اوپر سے نازل نہیں ہوتے بلکہ عملی زندگی کی کشمکش سے جنم لیتے اور جیتی جاگتی انسانی صورتِ حال سے رنگ و آہنگ پاتے ہیں۔ اپنے ذہنی ارتقا کے کسی بھی مرحلے پر اقبال نے انسانیت کی ترجمانی اور دنیائے اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں اپنے شدید انہماک میں کبھی کوئی تضاد نہیں دیکھا۔ انہماک بلکہ انجذاب کی اسی والہانہ کیفیت نے اقبال کے آفاق غور و فکر و تخیل کو ایک منفرد زمینی محور عطا کیا ہے اور یہی محور اقبال کی عظمت کی حقیقی بنیاد ہے۔

وطنیت یا اسلامیت ؟

جسے عرفِ عام میں ہندوستانی وطنیت کا دور کہا جاتا ہے وہ دراصل اقبال کی مشقِ سخن کا دور ہے۔ ذہنی نشو و نما کے اس ابتدائی مرحلے میں اقبال اسلامی تہذیب میں رندی اور وسیع المشربی کے اساسی تصورات کی روشنی میں حالی اور آزاد کی فطرت پرستی، انگریزی ادب اور قدیم ہندی و عجمی فکری روایات سے اخذ و اکتساب کے عمل میں مصروف ہیں۔ یہ گویا اپنے آپ کو ڈھونڈنے[۱] اور اپنا منفرد شعری اسلوب تراشنے کی جد و جہد کا زمانہ ہے۔ شخصیت اور شاعری کے اس تشکیلی دور میں بھی اقبال کی فکر گرد و پیش کی زندگی کی حقیقتوں سے مربوط ہے۔ اس عہد کا ہندوستان اقبال کو تباہی کے دہانے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ اس کی فضا فرقہ بندی، تعصب، نفرت اور باہمی پیکار کی فضا ہے۔ اس مسموم فضا میں اقبال ایک خالص انسانی مسلک پر استقامت کے ساتھ گامزن ہیں:

بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں
نوعِ انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں
شاہدِ قدرت کا آئینہ ہو، دل میرا نہ ہو
سر میں جز ہمدردیٔ انساں کوئی سودا نہ ہو (آفتابِ صبح)

عالمگیر انسانی وحدت اور اخوت کا یہ تصور اسلام کے مسلکِ توحید کی دین ہے۔ اس تصور کو دل و دماغ میں جاگزیں کر کے وہ ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی منظر پر نظر دوڑاتے ہیں تو ان کی شاعری صدائے درد بن جاتی ہے:

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آتی نہیں اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں
لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں

۱۔ ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

۱۹۰۵ء میں اقبال اپنے علمی سفر پر یورپ روانہ ہوتے اور ٹیگور عملی سیاست میں آتے ۔ تقسیم بنگال کی مذمت میں ٹیگور نے ترانے لکھے، ہڑتالیں کرائیں، احتجاجی جلوسوں کی قیادت کی اور راکھی بندھن کی سی خالص مذہبی رسومات کو پہلی مرتبہ سیاسی رنگ دیا اور اربندو گھوش نے ۱۹۰۶ء میں 'بندے ماترم' کے نام سے اپنا انتہا پسند ہفتہ وار اخبار شائع کرنا شروع کیا۔ بندے ماترم نے رام کرشن ویویکانند اور بنکم چندر چیٹرجی کے احیائی تصورات کو بنگالی قوم پرستی کی انتہا پسند تحریک کی فکری اساس بنایا تو جارحانہ احیائیت کا رخ مسلمانوں کی طرف پھر نے لگا ۔ شکتی کی منظم قوت سے ہندوستان میں آریہ ورت قائم کرنے کا تصور عام ہونے لگا ۔ شکتی کی خالص شکتی اور ملیچھ شکتی میں تقسیم ہوئی اور بقول لیونارڈ ۔ اے ۔ گورڈن مسلمانوں کو ملیچھ شکتی سمجھ کر قومیت کے دائرے سے خارج قرار دیا جانے لگا[۱] اقبال نے کہا تھا : ؎

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

مگر تقسیمِ بنگال کے ردِعمل میں سیاسی رہنما ہی نہیں تہذیبی زعما بھی ہندوستان میں محبت کا ایک نیا شوالہ آباد کرنے کی بجائے ایک ایسے قدیم آریہ ورت کے قیام کا خواب دیکھنے لگے ۔ جس میں شانتی اور پریت صرف ہندو نسل کے لیے وقف ہو اور خالص شکتی ملیچھ شکتی پر غلبہ پا سکے ۔ تقسیمِ بنگال کا اعلان گویا ایک بھونچال تھا جس نے ہندوستانی زندگی کے باطن میں گرجنے والے منافرت کے لاوے کو زندگی کی خارجی سطح پر لا پھینکا تھا ۔ اقبال کے لیے اس سے بڑا المیہ کیا ہو گا کہ بنگالی قوم پرستی کی یہ تحریک جس فلسفے کے زور پر بڑھ اور پھیل کر ہندوستانی قوم پرستی کی آہین ہندو تحریک میں ڈھل رہی تھی وہ نسل پرستی کا فلسفہ تھا ۔ چنانچہ رنگ و نسل کے امتیازات سے بالاتر اتحادِ انسانی کا مثالی تصور ؏

نوعِ انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں

ہندوستانی زندگی کے حقائق کی تاب نہ لا سکا تو اقبال ہندی فرقہ سازوں کے تراشے ہوئے بتوں سے دامن بچا کر توحید پرستی کا بول بالا کرتے ہیں ؎

---

[1] "It would seem from both internal evidence and wider information about Aurobindos thought that he either completely ignored the muslims or would include them with Melecha shaktis. In doing so, he was following the implicit or explicit anti-Muslim line of the Hindu nationalists and religious ideologues of the later nineteenth century."

Bengal: the Nationalist Movement, 1876 – 1940, Columbia University Press 1974 – Pages 113 – 114

گیا ہے تقلید کا زمانہ مجاز رختِ سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

اسلامیت یا انسانیت؟

تقلید سے اجتہاد کی جانب یہ پیشقدمی تضاد یا تناقص کی بجائے ذہنی ارتقا کی مظہر ہے۔ ہندوستانی وطنیت سے اسلامی بین الاقوامیت کی جانب یہ سفر وسیع المشربی کا کرشمہ ہے نہ کہ فرقہ پرستی کا شاخسانہ۔ درحقیقت یہ ایک وسیع النظر اور عالی ظرف ہستی کی فرقہ آرائی اور نسل پرستی کے خلاف بغاوت ہے۔ قیامِ یورپ کے مشاہدات اور اندرونِ ہند قیامت کی نفاق انگیز فضا نے اقبال کے فکری نشوونما کو حیرت انگیز رفتار دی اور وہ بہت جلد وحدت الوجود کے دھندلکے (ہندوستانیت) سے وحدت الشہود کی روشنی (اسلامی بین الاقوامیت) میں آگئے۔ ہندوستانیت کے دور میں اگر وہ توحید کے متصوفانہ احساس میں کھوئے ہوئے تھے تو اسلامیت کی منزل پر وہ توحید کے پیغمبرانہ شعور کے امین بن گئے۔ چنانچہ اب عالم بشریت کے اتحاد کی تمنا مجرد تصور نہ رہی بلکہ ایک معین و مستقیم راہِ فکر و عمل میں ڈھل گئی:

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد — بر اساسِ کلمہ تعمیر کرد
تا ز بخشش ہائے آں سلطانِ دیں — مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں

چونکہ 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بیخودی' کی اولیں مخاطب ملتِ اسلامیہ ہے اس لئے بیشتر نقادوں کی نگاہیں ان فلسفیانہ مثنویوں کے ظاہر میں الجھ کر رہ گئیں اور وہ ان کی باطنی آفاقی منطق سے انصاف نہ کر سکے۔ 'اسرارِ خودی' کی تمہید میں اقبال اپنا محرکِ شعری یوں بیان کرتے ہیں:

بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست — تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
از درونِ کارگاہِ ممکنات — بر کشیدم سرِ تقویمِ حیات

مگر صوفیانہ احساس اور پیغمبرانہ شعور میں تمیز سے عاری ذہن نے اپنے معاشرے سے اقبال کے عاشقانہ برتاؤ کو ہدفِ تنقید بنایا۔ ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے خط میں اقبال نے اس تنقیدی رویے پر یوں اظہارِ خیال فرمایا تھا:

"مسٹر ڈکنس نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے مگر باعتبار اطلاق و انطباق مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے انکا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اگر اُسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطبِ اولیں نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرۂ مخاطبت محدود کر دیں گے ——— جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک ایسی سوسائٹی اسلام ہے ......"

"...... دراصل اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انساں سے محبت کرتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود یا ملک پر ہے دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوع کی حیثیت سے انھیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے۔

"...... میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوتِ طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطعِ نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات مٹا دینا ہے[1]۔"

یہ وضاحت ناقدینِ اقبال کی تشفی نہیں کر پاتی۔ چنانچہ 'پیامِ مشرق' کے دیباچے میں اقبال کو ایک مرتبہ پھر اسی موضوع پر قلم اٹھانا پڑتا ہے :-

"یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے ......

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

" اس وقت دنیا اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابلِ احترام ہے۔"

---

[1] اقبال نامہ، جلد اول، صفحات ۴۵۷ تا ۴۷۷۔

اقبال کا عہد سرمایہ دارانہ لوٹ مار اور سامراجی استحصال کے عروج کا عہد ہے۔ دنیائے مشرق، مغربی استعمار کی لپیٹ میں گراں خواب ہے۔ اقبال مشرق کو بیدار اور انقلاب کی راہوں پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری جہانِ پیر کی موت کی بشارت ہی نہیں دیتی بلکہ جہانِ نو کے امکانات بھی روشن کرتی ہے۔ اقبال اپنی شاعری اور فلسفے کو "افراد اور اقوام میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید" کا وسیلہ بناتے ہیں تاکہ ان کے تصورِ "نئی دنیا" انسانوں کے ضمیر میں متشکل" ہونے کے بعد خارجی وجود اختیار کر سکے۔ چنانچہ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" کی تخلیق کا مقصد اگر زندگی کی اندرونی گہرائیوں کو انقلاب آشنا کرنا ہے تو بعد کی شاعری میں جلوہ گر، فلسفۂ خودی کے رنگا رنگ ——— اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی روپ زندگی کی خارجی سطح پر انقلاب بپا کرنے کی تمنا کے شعری اور فکری مظہر ہیں۔ اقبال انقلاب درآمد کرنے کی بجائے اپنے گرد و پیش کی زندگی کی اندرونی گہرائیوں سے برآمد کرتے ہیں اس لئے لامحالہ ان کے انقلاب کا آفتاب سرزمینِ مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ بے شک اِس آفتاب جہاں تاب کی اوّلیں کرنیں اسلامی مشرق کو بیدار، متحد اور سرگرمِ عمل کرتی ہیں مگر اس کی بھرپور روشنی تمام عالمِ انسانی کو منور کرتی ہے: ع

معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

اقبال، پرانی دنیا کی خاکستر سے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کی دعوت بطورِ خاص معمارِ حرم کو دو وجوہ سے دیتے ہیں۔ اوّل یہ کہ:

سارا عالمِ اسلام سامراج کے آہنی جال میں اسیر ہے اس لیے انسانیت کا سچا درد رکھنے والا کوئی بھی شاعر، کسی بھی صورت میں، محکوم و مجبور انسانوں کے اس انبوہِ عظیم کی مادی اور روحانی غلامی کی زنجیروں سے قطعِ نظر نہیں کر سکتا۔ اقبال کی نظر میں ان کا عہد نمرود کا عہد ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ نمرود کی خدائی سے انکار اور پیکار کے لئے حضرت ابراہیمؑ موجود تھے اور اقبال کا دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے: ؎

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

سو، اقبال مسلمانانِ عصرِ حاضر کو یہ یاد دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ انھیں آگ کو گلزار بنانے کا وہی پرانا چیلنج درپیش ہے۔

دوم یہ کہ:

عالمگیر اخوت و مساوات کے اسلامی تصورات ہی اتحادِ انسانی کی معتبر اور پائیدار اساس بن سکتے ہیں:

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم
مکّہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

اقبال کے تصورِ انقلاب میں ملوکیت، مارکسیت اور مروجہ اسلام کی کلی یا جزوی نفی کا خیال نمایاں ہے۔ اس لیے مغربی ملوکیت، مارکسیت اور مروجہ اسلام کے ترجمان اقبال کے اتحادِ اسلامی کے تصور پر معترض ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آئیے اس

فکرِ ملوکانہ[1] سے آنکھیں چار کریں۔

سلطانیٔ جمہور کا مغنی' اقوامِ مشرق میں" ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید" کی خاطر جب اسلام کی انقلابی روح کو پھر سے بیدار اور سرگرمِ کار دیکھنے کی تمناؤں کو نغموں میں ڈھالنے لگا تو انسان دوستی کے مغربی تصورات کے علمبرداروں نے اقبال کو ایک خونیں ستارہ قرار دیا۔ بات یہ ہے کہ ملوکیتِ افرنگ کی تباہی مشرق کی سیاسی اور روحانی آزادی کی شرطِ اول تھی اس لیے اقبال نے مغرب کے تاجرانہ ضمیر اور اس کے تہذیبی اور استعماری بحران کو ایک توانا صداقت پسندی کے ساتھ بے نقاب کیا تو دنیائے مغرب کے چند علمی اور تہذیبی حلقے خوف اور بدگمانی میں مبتلا ہو گئے۔ فکرِ ملوکانہ سے جنم لینے والے انسان دوستی کے فارمولے کی رُو سے فاسٹر اور ڈکنس جیسے نقادوں نے اقبال کے تصورِ خودی کو احیائے اسلام کی ایک مؤثر اور جارحانہ کوشش قرار دیا۔ اقبال نے نکلسن کے نام اپنے مشہور خط میں اس بے جا خوف کو دور کرنے اور اپنے فکر و فن کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

> "مسٹر ڈکنس کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے: تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ . . . . مجھے پوری طرح یقین ہے کہ کشورکشائی اور ملک گیری ابتداً اسلام کے مقاصد میں شامل نہ تھی۔ اسلام کو جہاں ستانی اور کشورکشائی میں جو کامیابی ہوئی ہے میرے نزدیک وہ اس کے مقاصد کے حق میں بے حد مضر تھی۔ اس لیے کہ وہ اقتصادی اصول نشوونما نہ پا سکے جن کا ذکر قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی میں جا بجا آیا ہے۔"[2]

اتحادِ انسانی کا یہ مسلک محض شاعرانہ خوش خیالی نہیں بلکہ پیغمبرانہ عہدنامہ ہے اس لیے اس مسلک کو عملی زندگی میں ڈھالنے کی جدوجہد کا آغاز گھر (مشرق) سے ہوتا ہے۔ سامراجی اور نوآبادیاتی طرزِ فکر و عمل کی تردیدِ محکم، غلامی اور انحطاط سے مشرق کی نجات کی جانب پہلا قدم ہے۔ سامراج دشمنی کا یہ زبردست رجحان مغربی نقادوں کو اتحادِ اسلامی کے تصور سے بدگمان اور برگشتہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اسلامی اتحاد کو تنگ نظری اور گروہ بندی گردانتے اور اقبال اس تصور پر فخر کرتے نہیں تھکتے:

اقبال کی غزل سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

اس باب میں اقبال نے ۱۹۳۱ء میں ایک سوال کے جواب میں واضح اور قطعی موقف اختیار کیا ہے۔ یہ بتلانے کے بعد کہ پین اسلامزم کا جو تصور مغربی ذہن پہ ایک موہوم اندیشہ اور ایک بے بنیاد خطرہ بن کر چھایا ہوا ہے وہ اُس فرانسیسی صحافی کے دماغ کے سوا کہیں موجود نہیں جس نے پین اسلامزم کی اصطلاح اختراع کی تھی، اقبال پین اسلامزم کی دو صورتوں کی نشاندہی کرتے ہیں:

---

[1] یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت . جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد

[2] اقبالنامہ - جلد اول صفحات ۴۷۴ تا ۴۷۵ -

"پین اسلامزم کی اصطلاح دو معنوں میں استعمال کی گئی ہے . . . ایک تو ان معنوں میں جن میں جمال الدین افغانی نے اسے استعمال کیا تھا۔ نہیں معلوم کہ انہوں نے یہ اصطلاح استعمال بھی کی تھی یا نہیں مگر واقعتاً انہوں نے افغانستان، ایران اور ترکی کو یورپ کی جارحیت کے خلاف متحد ہو جانے کا درس دیا تھا۔ یہ ایک خالص دفاعی حربہ تھا اور میں ذاتی طور پر جمال الدین افغانی کے نقطۂ نظر کو بالکل درست سمجھتا ہوں لیکن اس اصطلاح کو ایک اور مفہوم میں بھی استعمال کرنا چاہیے اور یہ مفہوم قرآنی تعلیمات سے لبریز ہے۔ ان معنوں میں یہ ایک سیاسی منصوبہ نہیں بلکہ ایک سماجی تجربہ ہے۔ اسلام ذات، نسل اور رنگ کی تمیز نہیں کرتا۔ فی الاصل اسلام ہی وہ نظریۂ حیات ہے جس نے رنگ کے مسئلے کو کم از کم اسلامی دنیا میں حل کر دیا ہے۔ جبکہ یورپی تہذیب سائنس اور فلسفہ میں اپنی تمام تر فتوحات کے باوجود اس مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس مفہوم کی پین اسلامزم رسول اکرم صلعم نے سکھائی تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ اس اعتبار سے ہر مسلمان پین اسلامسٹ ہے اور لازماً ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ان معنوں میں پین اسلامزم پین ہیومنزم ہے اور اس اصطلاح میں سے پین کا لفظ حذف کر دینا چاہیے۔"[۱]

گویا اقبال کی اسلامی بین الاقوامیت کے دو رُخ ہیں۔ ایک سیاسی اور دوسرا معاشرتی۔ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ سامراجی یلغار کے مقابلے میں ایک دفاعی حصار ہے اور معاشرتی زاویۂ نگاہ سے رنگ و نسل کے امتیازات سے ماورا انسانی اتحاد کی پائیدار اساس ہے۔ اوّل الذکر سے مشرق و مغرب کا تنازعہ جنم لیتا ہے اور ثانی الذکر سے اسلام اور ملوکیت و اشتراکیت کے درمیان ردّ و قبول کا رشتہ۔ جو لوگ مشرق اور مغرب کی آویزش کو ایک غیر ترقی پسند خیال تصور کرتے ہیں[۲] اور اسے اسلامی فاشزم سے تعبیر کرتے ہیں[۳] وہ اس حقیقت سے چشم پوشی کے مرتکب ہیں کہ اقبال کے نظامِ فکر کی بلند و بالا عمارت 'زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک' کے تصور پر قائم ہے اور ان کے ہاں مشرق و مغرب کی کوئی جغرافیائی یا نسلی تمیز موجود نہیں ہے۔ وہ مشرق کو مغرب کی سامراجی گرفت سے آزاد دیکھنے کے تمنائی ہیں اس لئے فطرتاً قاہر و جابر مغربی سامراج کے دشمن اور محکوم و مغلوب مشرق کے طرفدار ہیں مگر ان کی یہ آتش نوائی درحقیقت انسان پر انسان کے ظلم کے خلاف احتجاج کی شاعری ہے۔

سامراجیت اور نوآبادیت کے ہتھکنڈوں کو اقبال نے جس سفاک حقیقت پسندی اور جس فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے وہ اقبال کی گہری اور عملی انسان دوستی کا بیّن ثبوت ہے۔ مشرق کو بیدار اور آزاد کر کے مشرق کے افراد اور اقوام میں "ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تولید" دراصل اتحادِ انسانی کے تصور کو عملی زندگی کے ٹھوس قالب میں ڈھالنے کی جدوجہد کا نکتۂ آغاز ہے وہ مغرب کے علم و حکمت کے مخالف نہیں ہیں بلکہ مغرب کی سیاسی اور تجارتی لوٹ مار اور مغرب کے اخلاقی اور تمدنی زوال کے سخت گیر نقاد ہیں۔ اگر وہ کسی اسلامی فاشزم کے نقیب ہوتے تو للہ المشرق والمغرب جیسی آیۂ کریمہ سے 'پیامِ مشرق' کی پیشانی کیوں منور ہوتی؟ وہ تو مغرب کی

---

[۱] Iqbal's interview to the Bombay Chronicle, Sept. Dec. 1931. Letters and writings of Iqbal pp 55–57.

[۲] اختر حسین رائے پوری۔ ادب اور زندگی (ادب اور انقلاب) [۳] مجنوں گورکھپوری۔ اقبال۔

زیرکی[1] اور مشرق کے عشق کی آمیزش سے ایک عالمِ دیگر کے نقش ابھارتے ہیں اور ان کی نگاہیں پوری انسانیت کے مستقبل پر جمی ہوئی ہیں:

مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بے ذوقِ جستجو است

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبال کے نزدیک زندگی کی شبِ تاریک کو سحر کرنے کا اشتراکی نظام سے بھی بہتر وسیلہ اسلام ہے۔ ملوکیت کی تردیدِ محکم کے بعد اقبال اپنے آخری تجزیئے میں اشتراکیت کو بھی رد کر دیتے ہیں اور اتحادِ انسانی کی اساس محکماتِ قرآنی میں تلاش کرتے ہیں۔ یہیں سے مارکسیت کے ادبی ترجمانوں کا اقبال سے اختلاف شروع ہوتا ہے۔ چونکہ اشتراکیت بھی اپنے اندر اتحادِ انسانی کی ایک اساس رکھتی ہے اس لیے اس کے پرستاروں کے نزدیک اقبال کا ملوکیت کے مقابلے میں اشتراکیت کا خیر مقدم تو ترقی پسندی ہے مگر انقلابی اسلام کے مقابلے میں اشتراکیت کی تردید رجعت پسندی کی دلیل ہے۔ ہمارے مارکسی نقادوں کا یہ استدلال اس مفروضے سے جنم لیتا ہے کہ "اشتراکی نظام کو اپنائے بغیر کوئی بھی شاعر اور مفکر انسانیت کی نجات کا سچا علمبردار نہیں بن سکتا۔" اسلام سے وابستگی کی بنا پر اقبال کی انسانیت اور آفاقیت کو معرضِ شک میں ڈالنے والوں کو اس استدلال پر غور کرنا چاہیے جس کے ساتھ اقبال اسلام کو اشتراکیت پر فوقیت دیتے ہیں۔

ملوکیت، اشتراکیت اور اسلام کی بحث میں اقبال نے لا اور اِلّا کے خالص الٰہیاتی تصورات کو نئی سیاسی اور اقتصادی معنویت سے بریز کر دیا ہے۔ روس کے اشتراکی انقلاب کا زبردست اور والہانہ خیر مقدم کرنے کے باوجود اقبال 'جاوید نامہ' میں جمال الدین افغانی کی زبانی ملوکیت اور اشتراکیت ہر دو کو "یزداں ناشناس، آدم فریب" کہلواتے ہیں۔ مغرب کے سامراجی نظام کی تخریب کا تاریخی فریضہ سر انجام دینے کی حد تک تو وہ اشتراکیت کے پرجوش حامی ہیں:

هم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ   بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں   از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زدست   تیز نیشے بر رگِ عالم زدست
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ   لا سلاطیں لا کلیسا لا اِلٰہ

---

[1] غربیاں را زیرکی سازِ حیات   شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس   کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر شود   نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ   عشق را با زیرکی آمیز دہ   (جاوید نامہ)

مگر لا کی اس منزل پر جم کر رہ جانے کو وہ اشتراکی نظام کی سب سے بڑی خامی تصور کرتے ہیں۔ لا سے اِلّا یعنی نفی سے اثبات اور جلال سے جمال کی جانب حرکت کو اقبال زندگی کا فطری تقاضا سمجھتے ہیں۔ چونکہ اشتراکیت مساواتِ شکم کی منزل پر اڑ بیٹھی ہے اور مساوات کا حقیقی سرچشمہ شکم نہیں بلکہ دِل ہے اس لیے اقبال یہ کہہ کر عالمِ بشریت کو اسلام کی حقیقی پاکیزگی اور سادگی کی طرف بلاتے ہیں :۔

گذر از لا جانبِ اِلّا خرام

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا

اقبال کو یقین ہے کہ عہدِ حاضر میں لا کے بعد اِلّا کی قدر کی نمود عالمِ انسانی کو ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اُس تصور کی جانب لے آئے گی جس کا نام اسلام ہے :

"نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے ...... بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ نبی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب وقبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زبان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں "ابدیت" سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدی، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا، اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں[1]۔"

یہ بات دلچسپ بھی ہے اور المناک بھی کہ یہاں اقبال، اسلام کا نصب العین کسی مسٹر ڈکنس یا مسٹر فارسٹر پر نہیں بلکہ مولانا حسین احمد مدنی پر منکشف کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ تاریخِ اسلام میں یادگار رہے گا کہ متحدہ ہندوستانی قومیت اور جداگانہ مسلمان قومیت کے علمبرداروں کے درمیان ہنگامۂ بحث گرم ہوا تو اقبال نے ہندوستان کے سب سے بڑے دینی دارالعلوم کے سربراہ کو "نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات" کی جانب متوجہ کیا۔ یوں تو "اسرارِ خودی" کی اولیں اشاعت پر جو ادبی معرکہ گرم ہوا تھا اس میں بھی خواجہ حسن نظامی جیسے بزرگوں نے اسلام کے حوالے سے ہی اقبال کو ہدفِ طعن بنایا تھا۔ نظم "شکوہ" سے لے کر خطباتِ مدراس اور "جاوید نامہ" تک اقبال کا جوشِ مسلمانی بارہا ہمارے دینی حلقوں میں اضطراب کا باعث بنا اور بارہا اقبال نے ان مذہبی مناظروں سے بے اعتنائی برتی مگر متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور کے جواز میں مولانا حسین احمد مدنی کے بیان میں "پوشیدہ فتنے" کو انہوں نے "دقتِ نظر کا محتاج" سمجھا۔ مولانا مدنی کے سے برگزیدہ دینی پیشوا کو فرنگی نظریۂ وطنیت کی تائید و حمایت میں رطب اللسان دیکھ کر اقبال تڑپ اُٹھے اور انہوں نے گہرے دکھ کے ساتھ لکھا :

"عہدِ حاضر کے ہندوستان کے علماء کو حالاتِ زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو قرآن یا نبیِ امی کا منشا ہرگز نہ ہو سکتی تھیں[2]۔"

---

[1] بیان مطبوعہ روزنامہ "احسان" لاہور، مورخہ ۹ مارچ ۱۹۳۸ء

[2] بیان مطبوعہ روزنامہ احسان — "حرفِ اقبال"

چونکہ اقبال، اسلام کو اشتراکیت سے بہتر اور کامل تر ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قرار دیتے ہیں اس لئے ملوکیت کے مفکرین کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کے مبلغین کی اُن سے بوجھی ایک قدرتی بات ہے مگر علمائے اسلام کا اقبال سے فکری تصادم، المناک ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کی جڑیں مسلمانوں کے زوال اور غلامی کی طویل صدیوں پر مشتمل ماضی میں دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

اسلام کی حقیقی روح کو فراموش کر دینے کے باعث مسلمان تہذیبی انحطاط اور سیاسی استبداد کی لپیٹ میں آ گئے تو ملوکیت کے زیرِ اثر رفتہ رفتہ ناخوب، خوب بننے لگا اور نوبت یہاں آ پہنچی کہ کرۂ ارض کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے مسلمانوں میں اسلام کی ایسی مختلف اور متنوع شکلیں رائج ہو گئیں جن کا حقیقی اسلام سے یا تو قطعاً کوئی تعلق نہ تھا اور یا پھر بہت دور کا تعلق باقی رہ گیا تھا۔ اقبال نے اپنے قلب و نظر کو حقیقی اور مثالی اسلام کے تصور سے منور کر کے ملک ملک میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کو دیکھا تو انھیں ان کی زندگی جمالِ مصطفےٰ سے بیگانہ اور سحرِ فرنگیانہ میں مبتلا نظر آئی۔ مُلّا کی نظر نورِ فراست سے خالی نظر آئی تو مے خانہ صوفی کی مئے ناب بے سوز نکلی۔ عالمِ اسلام کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ایسا دلدوز منظر نظر آیا جس میں زندقِ و بیر اور میر و پیر، سب کے سب خلقِ خدا کی گھات میں بیٹھے تھے اور پیرِ حرم، گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ چرا کر بیچ کھانے میں مصروف تھا:

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفےٰ نایاب و ارزاں بولہب

ستم بالائے ستم یہ کہ:

شیخِ او لُردِ فرنگی را مرید — گرچہ گوید از مقامِ بایزید
گفت دیں را رونق از محکومی است — زندگانی از خودی محرومی است
دولتِ اغیار را رحمت شمرد — رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

ایسے میں اقبال کے دل میں رہ رہ کر یہ تمنا پیدا ہوتی ہے:

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

اس تیرہ و تار فضا میں اقبال زندگی کے تلخ حقائق کی ٹھوس سرزمین سے خواب و خیال کے طلسمات کو فرار کر کے نرا شاعر اور محض فلسفی بن کر رہ جانے کی بجائے حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حرکت و عمل اور تسخیر و تعمیر کے پیامبر بنتے ہیں۔ اقبال "اس کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری" یعنی اپنے عہد کے مسلمان کو اپنے ورسِ خودی سے بیدار اور سرگرمِ عمل کر کے آزادی، حریت اور مساوات کے اُس خواب کی تعبیر ڈھونڈنے نکلتے ہیں جو تیرہ سو سال پہلے اسلام نے دیکھا تھا۔ اسلام کی حقیقی انقلابی روح کی بازیافت کی اس جد و جہد کا آغاز قدرتی طور پر اُس خطۂ ارض سے ہوتا ہے جہاں اقبال پیدا ہوئے، جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے اور جہاں قوموں کے حقِ خود اختیاری کے اصول پر عوامی جمہوری جد و جہد سے ایک اسلامی ریاست کا قیام دائرۂ امکان میں ہے۔

یہ حقیقت آج کس قدر ناقابلِ یقین نظر آتی ہے کہ ہندی مسلمانوں کی الگ قومی ریاست کے حصول کی جد وجہد کی سر توڑ

مخالفت انگریزوں اور انڈین نیشنل کانگرس نے ہی نہیں کی بلکہ ہندوستان کے علمائے دین کی غالب اکثریت بھی قیامِ پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھی۔ ملوکیتِ افرنگ نے "اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے جو تصورات ایجاد کئے تھے علمائے اسلام کو انہی تصورات کی چاکری میں مصروف دیکھ کر اقبال اب تک فلسفیانہ تعمیم اور شاعرانہ رمز و ایما سے کام لیتے آئے تھے:۔

وقت است کہ بکشائم میخانۂ رومی باز
پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسا مست

مگر مولانا حسین احمد مدنی کو متحدہ ہندوستانی قومیت کے کانگریسی نظریے کی وکالت میں سرگرم عمل دیکھ کر انہوں نے ایک انقلابی کے قطعی اور دوٹوک استدلال کے ساتھ اپنے عہد کے علمائے ہند کو "نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات" سے بے بہرہ اور رموزِ دین سے ناآشنائے محض قرار دے ڈالا:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیست
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بہ مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبیست

اقبال کے نظامِ فکر میں فلسفۂ خودی اور تصورِ پاکستان کے سے بنیادی تصورات کی اسلام کے نام پر پُر زور مخالفت و تردید کا راز اقبال کے تصورِ اسلام اور مروجہ تصورِ اسلام کے درمیان تضاد میں پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اقبال یہ سمجھتے ہیں کہ:

"برصغیر میں ایک جداگانہ اسلامی ریاست ہندوستان کے ساتھ ساتھ اسلام کے لئے بھی فائدہ بخش ہے۔ ہندوستان کے لئے یوں کہ اسے اندرونی توازنِ اقتدار کے باعث تحفظ اور امن نصیب ہوگا اور اسلام کے لئے یوں کہ اسے موقع ملے گا کہ عرب ملوکیت کی چھاپ سے نجات پائے اور اپنے قانون، تعلیم اور کلچر کو تحریک دے کر انھیں اپنی اصل روح اور روحِ عصر سے ہم آہنگ کر دے[1]۔"

وہاں اسلام پر عرب شہنشاہیت کی چھاپ کے شیدائی علمائے دین ہندی مسلمانوں کو اپنے جداگانہ قومی وجود سے انکار کر کے انڈین نیشنل کانگرس کا ہندوستانی قومیت کا تصور اپنانے کے لئے "اسلامی" جواز مہیا کرتے ہیں۔ یہ متضاد اندازِ نظر اسلام کے مفہوم اور مقدر کے بارے میں متضاد تصورات سے پھوٹا ہے۔ اس لئے جہاں مولانا مدنی جداگانہ مسلمان قومیت کے تصور پر خطِ تنسیخ کھینچ کر بڑے اطمینان کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں:

"قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔

وہاں اقبال وطن کے اس سیاسی تصور کو اسلام کے منافی قرار دیتے ہیں کیونکہ:

"جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رُو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ

---

[1] ۱۹۳۰ء کا خطبۂ الٰہ آباد

> عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر تخلیق کرے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے نہ انفرادی ہے اور نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔[1]"

گویا ایک خالص انسانی ضمیر کی تخلیق سے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنے کی خاطر ہندی مسلمانوں پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنے جداگانہ قومی وجود پر اصرار کر کے الگ اسلامی ریاست قائم کریں۔ اس ریاست کا قیام سیرت مصطفےٰؐ کی پیروی کا سچا راستہ ہے اور اس راستے سے انحراف، چاہے اسلام کے مقدس نام پر ہی کیوں نہ ہو، بولہبی کے سوا کچھ نہیں۔

تصورِ پاکستان: مراجعت یا پیش قدمی؟

انسان دوستی کے مجرد تصورات کے پرستاروں کو اس استدلال میں تین فکری تضادات نظر آتے ہیں۔ پہلا تضاد یہ کہ "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست"۔ "اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے" اور "مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں" کے سے آفاقی تصورات سے وطنیت کے بت کو پاش پاش کر دینے کے بعد اقبال ہندی مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ وطن کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اقبال کے بعض غیر مسلم مداحوں کو یہ مطالبہ اقبال کے بنیادی افکار سے اس حد تک متصادم نظر آتا ہے کہ انہوں نے یہ ماننے ہی سے انکار کر دیا ہے کہ اقبال نے کبھی کوئی ایسا مطالبہ کیا تھا۔ اقبال سنگھ نے اقبال پر اپنی خوبصورت کتاب The Ardent Pilgrim میں یہ بات بہت زور دے کر کہی ہے کہ تصورِ پاکستان سے اقبال کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی مشہور تصنیف The Discovery of India میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہندی مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ وطن کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے تھے۔ اپنے رومانوی تصورات کی چار دیواری میں اپنے ممدوح کو مقید کر دینے کی یہ تمنا اپنی جگہ حسین بھی ہے اور معصوم بھی مگر امر واقعہ یہ ہے کہ ہندی مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ وطن کا مطالبہ اقبال کے بنیادی سیاسی تصورات کا ناگزیر منطقی نتیجہ ہے۔ اقبال کی صرف ایک سیاسی دستاویز ۔ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے پر یہ تضاد اقبال کے نظامِ فکر سے سرسری شناسائی کا شاخسانہ نظر آتا ہے اور قاری عزیز احمد کی ہمنوائی میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ "یہ وطن نہیں ایک طرح کا مرکزِ محسوس ہے جو مکان میں واقع ہے اور جہاں حکومتِ الٰہی کو رواج دینے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔[2]" اقبال کے تصورِ پاکستان کی قوتِ محرکہ وطن کا کوئی سیاسی تصور نہیں بلکہ ہندی مسلمانوں کے تہذیبی وجود کی بقا اور آزادانہ نشوونما کی تمنا ہے۔ اپنے جداگانہ تہذیبی وجود کے تحفظ اور اس کے اندر مضمر امکانات کو بروئے کار لانے کی خاطر اقبال متحدہ ہندوستانی وطن کے

---

[1] حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان مطبوعہ روزنامہ "احسان" لاہور۔ [2] "اقبال ۔ نئی تشکیل" صفحہ ۲۷۱۔

تصور کو رَد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ بہرحال ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیے کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا مفہوم کیا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کا پابند ہے۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک انقلابی نصب العین پر ہے جس کا عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند حقوق و فرائض کا مالک ہے۔

جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے اس ملک میں اس وقت تک امن و امان قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس امر کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ہندوستان کی ہر ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر جدید اصولوں پر آزادی کے ساتھ ترقی کر سکے[1]۔"

ہندی مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کا تصور پیش کرتے وقت اقبالؔ نے بڑے واضح اور دو ٹوک انداز میں ہندوستانی وطنیت کے اُس تصور کی نفی کی ہے جو مغل امپیریلزم اور بعد ازاں برٹش امپیریلزم کی سنگینوں کے زور سے قائم کی ہوئی مصنوعی جغرافیائی وحدت سے پیدا ہوا تھا۔ ان کے خیال میں برٹش انڈیا کی جغرافیائی سالمیت کے نام پر برصغیر میں بسنے والی مختلف قوموں کے منفرد تہذیبی وجود کی فنا ایک ایسا غیر انسانی اقدام ہے جس سے صرف سامراجی قوتوں کو ہی فائدہ پہنچ سکتا ہے:

"میں پنڈت جواہر لال نہرو سے ایک سیدھا سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اکثریت والی قوم دس کروڑ کی اقلیت کے کم سے کم تحفظات کو جنھیں وہ اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھتی ہے نہ مان لے اور نہ ہی ثالث کا فیصلہ تسلیم کرے بلکہ واحد قومیت کی ایسی رٹ لگاتی جائے جس میں صرف اس کا اپنا فائدہ ہے، ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟ ——— اس سے صرف دو ہی صورتیں نکل سکتی ہیں۔ یا تو اکثریت والی ہندوستانی قوم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مشرق میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برطانوی سامراج کی ایجنٹ بنی رہے گی یا پھر ملک کی مذہبی، تاریخی اور تمدنی حالات کے پیش نظر تقسیم کرنی ہو گی[2]۔"

یہ سوال اقبالؔ نے لندن کی گول میز کانفرنسوں میں شرکت کرنے والے مسلمان مندوبین کے رویے پر پنڈت نہرو کی نکتہ چینی کے جواب میں اٹھایا تھا۔ ۶ نومبر ۱۹۳۳ء کو شائع ہونے والے اس بیان میں اقبالؔ نے وطنیت کے نام پر مختلف قوموں کے جداگانہ تہذیبی وجود کو مٹا کر

---

[1] خطبۂ صدارت کل ہند مسلم لیگ اجلاس ۱۹۳۰ء منعقدہ الٰہ آباد ترجمہ سید نذیر نیازی۔

[2] حرفِ اقبال صفحہ ۱۷ - ۳۱۶ -

واحد ہندوستانی قومیت کی تعمیر کی جدوجہد میں کارفرما سامراجی ذہنیت کو یوں بے نقاب کیا ہے :

"مسٹر گاندھی کی غیر منصفانہ شرط یہ تھی کہ مسلمان اچھوتوں کے مخصوص مطالبات اور بالخصوص نمائندگی میں خاص مراعات کے مطالبے کی حمایت نہ کریں۔ اس کے جواب میں مسٹر گاندھی کو بتا دیا گیا کہ مسلمانوں کے لیے یہ شرط اس لئے ناقابل قبول ہے کہ وہ خود اس قسم کے مطالبات کر رہے ہیں۔ لیکن مسٹر گاندھی اپنی شرائط پر اڑے رہے۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ اپنے زبان زدِ عام سوشلسٹ خیالات کے پیش نظر پنڈت جواہر لال نہرو اس انسانیت کُش شرط کی کیسے حمایت کریں گے مسٹر گاندھی اور مسلمان مندوبین کے درمیان مذاکرات کی ناکامی کی اصل وجہ مسلمان مندوبین کی سیاسی رجعت پسندی تھی یا دوسروں کی سیاسی تنگ نظری؟ —اس سوال کا جواب پنڈت نہرو خود ہی دیں۔[1]"

اسی بیان میں آگے چل کر اقبال کانگرس کے اصولِ قومیت کو زیرِ بحث لاتے ہیں :

"اگر قومیت سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذہبی جماعتوں کو حیاتیاتی معنوں میں ملا جلا کر ایک کر دیا جائے تو پھر میں خود ہی نظریۂ قومیت سے انکار کا مجرم ہوں۔ میرے خیال کے مطابق ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر ان معنوں میں یہاں ایک قوم کی تشکیل ناممکن ہی نہیں بلکہ نامناسب بھی ہے اور پھر ان معنوں میں قومیت کے سب سے بڑے مخالف خود مسٹر گاندھی ہیں جنھوں نے اچھوتوں کو دوسری جماعتوں کے ساتھ مدغم ہونے کے خلاف جدوجہد کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن بنایا ہوا ہے اور جو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں کے درمیان کسی قسم کا اصلی اتحاد پیدا کئے بغیر ان کو ہندو قوم کا ایک حصہ سمجھا جائے۔[2]"

گویا جسے عرفِ عام میں دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے وہ فی الحقیقت کثیر قومی نظریہ ہے۔ یہ برصغیر کی تمام قوموں کے تہذیبی وجود کی بقا اور آزادانہ نشوونما کا منشور ہے جو ہندوستانی زندگی کے حقائق پر خالص انسانی نقطۂ نظر سے غور و فکر سے پھوٹا ہے، جو فرنگی نظریۂ وطنیت کی بجائے تہذیبی اور روحانی یگانگت کو انسانی اتحاد کی بنیاد قرار دیتا ہے اور جسکے مخالفین پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی جیسے وہ "ہندوستانی قوم پرست ہیں جن کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے۔" اس لئے وہ نہ تو ہندی مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند کرتے ہیں اور نہ انھیں یہ بات گوارا ہے کہ "شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خود مختاری پیدا ہو۔"

خیر صاحب! دیر آید درست آید۔ بالآخر ۱۹۴۷ء کے اوائل میں پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی کے ہاں "احساسِ حقائق" جاگتا ہے اور وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور غفار خان جیسے رفقائے کار کو "سیاسی تصوریت" کی دھند سے نکل کر حقائقِ حیات سے آنکھیں چار کرنے اور تقسیم ہند کو قبول کرنے کا درس دیتے ہیں[3] وہ حقیقت جو پنڈت جواہر لال نہرو کے سے خواب پرستوں کو بھی

---

[1]، [2] حرفِ اقبال صفحات : ۲۱۲ تا ۲۱۵ –

[3] ملاحظہ ہوں ابوالکلام آزاد کی تصنیف "India Wins Freedom" کے آخری چند ابواب اور خصوصاً درج ذیل سطریں :

"After a few days Jawaharlal came to see me again. He began with a long preamble in which he emphasized that we

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

تسلیم کرتے ہی بنا یہ ہے کہ ہندی مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور وہ عظیم تر ہندوستان کی کسی سیاسی تصوریت کا شکار ہو کر اپنی جداگانہ تہذیبی ہستی کو اکثریت میں ضم کر دینے پر کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے انھیں اپنی قومی جمہوری جدوجہد سے ہندوستان کی دوسری قوموں سے الگ اپنی مملکت قائم کرنے دیجیے۔

تصورِ پاکستان میں دوسرا فکری تضاد اتحادِ اسلامی کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔ اگر اتحادِ انسانی کی پائیدار اساس اسلام ہے تو پھر صرف ہندی مسلمان ہی کیوں ایک قوم ہیں، پوری دنیا کے مسلمان کیوں ایک قوم نہیں؟ ۔ اس کا جواب ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد میں اقبال نے یوں دیا ہے کہ ہندی مسلمانوں کی مخصوص صورتِ حال نے انھیں ایک جداگانہ قوم بنا دیا ہے۔ وہ ایک ایسے خطۂ ارض میں آباد ہیں جہاں ایک ناروادار اکثریت ان کی تہذیبی وحدت کو پارہ پارہ کر کے منتشر کرنے اور یوں ان کی اجتماعی ہستی کو فنا کر دینے کے درپے ہے۔ ان کے اور ذات پات کے نظام اور رنگ و نسل کے امتیازات کے پرستاروں کے مابین سماجی دیواریں حائل ہیں۔ جغرافیائی اشتراک کے باوجود ہندی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تہذیبی اور روحانی اختلاف کی ناقابلِ عبور یہ خلیج حائل ہے۔ ماضی کی طویل صدیوں کے دوران ان سماجی دیواروں کو ڈھا کر معاشرتی اور تہذیبی یگانگت پیدا کرنے کی تمام تحریکیں ناکامی سے دوچار ہوتی آئی ہیں اور زمانۂ حال میں جمہوریت کے سیاسی نظام کی آڑ میں غیر مسلم اکثریت، ہندی مسلمانوں کی جداگانہ تہذیبی اکائی کو مٹا دینے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ چونکہ یہ صورتِ حال صرف ہندی مسلمانوں کو درپیش ہے جو اپنی تہذیبی اور روحانی یگانگت اور جذباتی و نفسیاتی ہم آہنگی کی بدولت قومیت کے جدید مفہوم کی رُو سے ایک قوم ہیں اس لئے وہ اسلام کی تمدنی قوت کے تحفظ کی خاطر ایک مخصوص علاقے میں اپنا مرکزِ محسوس قائم کرنا چاہتے ہیں ـــ

نکتہ چینوں کا کہنا یہ ہے کہ چلیئے صاحب مان لیا کہ ہندی مسلمان ایک قوم ہیں اور وہ برصغیر میں اپنا مرکزِ محسوس قائم کرنے میں حق بجانب ہیں مگر اس مرکزِ محسوس اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے مرکزِ محسوس کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ ـــ کیا اقبال حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر پوری دنیا کے مسلمانوں کے اتحاد کے تصور سے دستبردار ہو کر صرف ہندی مسلمانوں تک محدود ہو گئے تھے؟ ــــــ اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل کے موضوع پر اقبالؔ کے خطبات کے مطالعے سے یہ تضاد حل ہو جاتا ہے۔ اسلام میں اصولِ حرکت کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اقبال اتحادِ اسلامی کے اُس تصور کو رد کرتے ہیں جو قرونِ وسطیٰ کی ملوکیت پرست خلافت سے پھوٹا ہے اور جو شاہوں اور شاہ پسندوں کو عزیز ہے۔ عالمی خلافت کا یہ ملوکانہ تصور عہدِ جدید میں از کارِ رفتہ ہو چکا ہے اس لئے اقبالؔ کے نزدیک عہدِ حاضر میں اتحادِ اسلامی کا سیاسی روپ جمعیتِ اقوام ہے۔ اقبال مسلمانانِ عالم کو مشورہ دیتے ہیں کہ فی الحال ہر مسلمان قوم اپنے قومی وجود کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو جائے، اپنی نگاہوں کو عارضی طور پر صرف اپنے آپ پر مرکوز کر دے حتیٰ کہ تمام مسلمان قومیں اپنی

---

should not indulge into wishful to the point and asked me to give up my opposition to partition." Page-185

خودی میں ڈوب کر طاقتور ہو جائیں اور آزاد اور طاقتور قوموں کا ایک زندہ اتحاد وجود میں آ جائے :

"For the present every Muslim nation must sink into her own deeper self, temporarily focus her vision on herself alone, until all are strong and powerful to form a living family of Republics. A true and living unity, according to the nationalist thinkers, is not so easy to be achieved by a merely symbolical overlordship. It is truly manifested in a multiplicity of free independent units whose racial rivalries are adjusted and harmonized by the unifying bond of a common spiritual aspiration. It seems to me that God is slowly bringing home to us that Islam is neither Nationalism nor Imperialism but a League of Nations which recognizes artefical boundaries and racial distinctions for facility of reference only, and not for restricting the social horizen of its members."[۱]

سو ہندی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا تصور اتحادِ اسلامی کے تصور کی نفی یا اس سے انحراف نہیں بلکہ اتحادِ اسلامی کے تصور کو حقیقت میں بدلنے کی جدوجہد کا نکتۂ آغاز ہے۔ تصورِ پاکستان بین الاسلامیت سے علاقائیت کی جانب مراجعت نہیں بلکہ بین الاسلامیت سے بین الانسانیت کی جانب پیش قدمی ہے[۲]۔ تصورِ پاکستان ہی کے موضوع پر مولانا حسین احمد مدنی سے مناظرہ بازی کے دوران اقبال نے قرار دیا تھا :

"اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی اور اساسی انقلاب چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نکتۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر تخلیق کرے۔"

اس استدلال میں علی سردار جعفری اور ممتاز حسین کو تناقص نظر آتا ہے۔ یہ تیسرا تضاد اسلام اور انسانیت کا تضاد ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک ایک ایسی مذہبی تحریک سے جس نے ماضی میں سینکڑوں قوموں سے ٹکر لی ہے اور جس کے دشمن دنیا میں موجود ہیں مذہبی گروہ بندی

---

[۱] The Reconstruction of Religious thoughts in Islam. Page 159, Sheikh Ashraf, Lahore, 1971.

[۲] بے کے رائیکل ستمبر دسمبر ۱۹۳۱ء میں مطبوعہ انٹرویو :
"Pan Islamism is only Pan-Humanism." letters and writings. Page 57

تو ممکن ہے مگر خالص انسانی ضمیر کی تخلیق ممکن نہیں۔ سروآنہ اور ممتانہ کو اس اندازِ نظر میں ماضی پرستی اور احیائیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو فراق گورکھپوری اسے رجعت پسندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ غلط فکری مذہب سے بدکنے والے ذہن کی اقبال کے تصورِ اسلام سے ناآشنائی سے پیدا ہوئی ہے۔ اقبال کے ہاں ماضی کا تصور سکونی نہیں حرکی ہے :

میرا ماضی میرے استقبال کی تصویر ہے

بے شک وہ فردا کو دوش کے آئینے میں دیکھتے ہیں مگر ان کے پیشِ نظر اسلامی تمدن کی صرف ان اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے اپنی اور نوعِ انسان کی ذات میں سرگرمِ کار کرنا ہے جو ایک خالص انسانی ضمیر کی تخلیق میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں تصورِ پاکستان پیش کرتے وقت اقبال نے یہ وضاحت ضروری سمجھی تھی کہ ہندی مسلمانوں کی اس ریاست میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ یہ ایک ایسی جدید ریاست ہوگی جس میں ہندی مسلمانوں کو یہ موقع نصیب ہوگا کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر جدید خطوط پر ترقی کر سکیں اور اسلام کو یہ موقع ملے کا کہ وہ عرب ملوکیت کی چھاپ سے نجات پا کر اپنی حقیقی روح کو روحِ عصر سے ہم آہنگ کر سکے۔ صرف دو برس بعد کل ہند مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں سامراجی نظامِ سیاست و معیشت کی مذمت کرتے وقت اقبال نے مسلمانانِ ہند کو یاد دلایا تھا کہ :

> "تم اپنے اندر جو اعتقاد رکھتے ہو وہ فرد کی اہمیت کا قائل ہے اور اس چیز کے لیے ساعی ہے کہ تم خدا اور انسان کی خدمت کر سکو۔ اس عقیدے کے امکانات ابھی پوری طرح وجود میں نہیں آئے۔ وہ اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جہاں ذات پات، رنگ یا دولت کے پیمانے سے نہیں بلکہ انسان کے طرزِ حیات سے اس کی عظمت کو ناپا جائے جہاں غریب امیروں پہ ٹیکس عاید کرتے ہوں۔ جہاں انسانی سوسائٹی شکم کی مساوات پہ نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو جہاں ایک اچھوت بادشاہ کی لڑکی کو عقد میں لا سکتا ہو۔ جہاں ذاتی ملکیت ایک امانت ہو۔ جہاں اس طرح پر ارتکازِ دولت کا امکان نہ ہو کہ وہ دولت پیدا کرنے والے پر ہی چھا جائے۔ لیکن تمہارے عقیدے کا یہ ارفع تصور قرونِ وسطیٰ کے عالموں اور فقیہوں کی نازک خیالیوں سے پاک ہو جانا چاہیے۔ روحانی طور پر ہم ان تخیلات اور احساسات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جو ہم نے پچھلی صدیوں میں اپنے گرد لپیٹ لی ہیں اور یہ ہم بڈھوں کے لیے باعثِ شرم ہے کہ ہم نے نئی پود کو ان اقتصادی، سیاسی اور مذہبی انقلابات کے لیے تیار نہیں کیا جو موجودہ دور میں انھیں پیش آئیں گے تمام ملت کو اپنی ذہنیت درست کرنے کی حاجت ہے تاکہ تازہ امیدوں اور مقاصد کا احساس پیدا ہو سکے۔"[1]

انحطاط اور ملوکیت کی کوکھ سے جنم لینے والے احساسات و تخیلات کی زنجیروں کو توڑنے کا درس دیتے وقت اقبال مسلمانوں کی تاریخ کے کسی گزرے ہوئے عہد کی تکرار کی تمنا کرنے کی بجائے اسلام کے ان خفتہ امکانات کو بیدار اور سرگرمِ کار کرنے میں کوشاں تھے جو آج تک کبھی بروئے کار آ ہی نہیں سکے۔ ان کی نگاہ سوئے کوفہ و بغداد نہ تھی بلکہ وہ ایک جہانِ نو کی تخلیق کا خواب دیکھ رہے تھے۔ "جاوید نامہ" میں ملوکیت اور اشتراکیت

---

[1] حرفِ اقبال صفحات ۷۱، ۷۲۔

ہر دو کو یزداں ناشناس اور آدم فریب قرار دے کر رد کرنے کے بعد اقبال جمال الدین افغانی کی زبانی عالمِ قرآنی کا یوں تعارف کراتے ہیں :-

عالمے در سینۂ ماگم ہنوز　　عالمے در انتظارِ قم ہنوز
عالمے بے امتیازِ خون و رنگ　　شامِ او روشن تر از صبحِ فرنگ
عالمے پاک از سلاطین و عبید　　چوں دلِ مومن کرانش ناپدید
عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر　　تخمِ او افگند در جانِ عمرؓ
لایزال و وارداتش نو بنو　　برگ و بارِ محکماتش نو بہ نو
باطنِ اُو از تغیر بے غمے　　ظاہرِ اُو انقلابِ ہر دمے
اندرونِ تست آں عالم نگر
می دہم از محکماتِ او خبر

اقبال پر ماضی پرستی، احیائیت اور رجعت پسندی کا الزام دھرنے والے عالمِ قرآنی کے محکمات سے آنکھیں چار کریں تو یہاں وہ ایک ایسی نئی اور مثالی دنیا جلوہ گر پائیں گے جو ابھی تک وجود میں تو نہیں آ سکی مگر دائرہ امکان میں ہے۔ اس عالمِ قرآنی کا باطن تو بے شک غیر مبدل ہے مگر اس کا ظاہر نت نئے انقلاب سے عبارت ہے۔ 'جاوید نامہ'، 'پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق' اور انگریزی خطبات میں اسلام کا جو تصور جلوہ گر ہے اس کی بدولت اقبال دنیا کے سب سے پہلے اور اب تک آخری عالمی شاعر بن پاتے ہیں۔ ایک ایسے شاعر جو عہدِ حاضر کے انسان پر صرف عالمِ بشریت کے اتحاد اور رادجِ کمال کا نصب العین ہی منکشف نہیں کر پاتے بلکہ اس عالمی اور آفاقی نصب العین کو عملی زندگی کے ٹھوس قالب میں ڈھالنے کی جدوجہد میں بھی اپنی آخری سانس تک شریک رہتے ہیں۔ چونکہ اس عملی جدوجہد کا آغاز قدرتی طور پر اُن کے اپنے فوری گرد و پیش سے ہوتا ہے اس لیے اُن کی لفظیات و محاکات، تشبیہات و استعارات اور طرزِ احساس و اظہار پر اسلامی تمدن کی گہری چھاپ ہے اور ان کا نظامِ خیال ہی نہیں نظامِ اساطیر بھی شعوری طور پر اسلام سے مکتسب ہے مگر از اوّل تا آخر ان کی فکر کا محور انسان ہے جس کی زندگی کی شبِ تاریک کو سحر کرنے کی خاطر وہ عمر بھر سلگتے رہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو مشقِ سخن کے دور کے "نوعِ انسان قوم ہو میری، وطن میرا جہاں" سے لے کر اپنی آخری نظم "حضرتِ انساں" تک اقبال انسان کے غیر مختتم تخلیقی اور تسخیری ممکنات، انسان کے لا انتہا ہنگامے نو بہ نو کے مغنی اور مفکر نظر آتے ہیں۔

اقبال اور ہمارے فکری رویے

سلیم اختر

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

یہ تین اشعار فکر اقبال کی جن جہات کے عکاس ہیں ان میں اندیشۂ دانا کی جنوں آمیزی اور پھر جنوں کا حرف راز سکھانا کو اساسی اہمیت حاصل ہے اور اسی جنوں پر مبنی دانائی سے جب علامہ کی غزل پُر سوز و نشاط انگیز ہوئی تو حریم ذات سے شور اٹھا اور بتکدۂ صفات میں غلغلہ ہائے الاماں بلند ہوا۔

علامہ اقبال کی یہ ایک بہت اہم خصوصیت ہے کہ اگرچہ انہوں نے مختلف اوقات میں انداز بدل بدل کر اپنی شاعری اور اس سے وابستہ خصوصی مقاصد پر روشنی ڈالی لیکن ہمارے قدیم اساتذہ کی مانند تعلّی سے کام نہ لیا۔ تعلّی اور تعلّی پسند شاعر کی اپنی ایک مخصوص نفسیات ہوتی ہے جس کی تشکیل میں نرگسیت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن علامہ نے جس قومی فلسفے، ملّی تصورات اور جن مذہبی افکار کے لئے اپنی شاعری کو وقف کر رکھا تھا اور بحیثیت مجموعی جو ان کا ادبی نصب العین تھا اس سے وابستہ فکری اور فنی تقاضوں کی تعلّی سے وابستہ سطحی جذباتیت سے ہم آہنگی نہ ہو سکتی تھی یہ امر نفسیاتی دلچسپی کا حامل ہے کہ اپنے استاد داغؔ کی مانند اقبال نے تو زبان دانی کا بھی دعویٰ نہ کیا،[1]

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے آشنا میں
کوئی دلکش صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی

---

[1] اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اقبال ایسے شاعر کے لئے زبان دانی کی کوئی اہمیت نہ ہو سکتی تھی کہ انھوں نے کبھی بھی خود کو روایتی معنوں میں نہ تو شاعر سمجھا اور نہ کبھی معاصر شعرا کی بھیڑ میں شامل ہونے کی خواہش کی ہرچند کہ لسانی شعور اور شاعری کے فنی محاسن سے آگہی میں وہ کسی سے کم نہ تھے۔ علامہ بنیادی طور پر فلاسفر تھے اور قوم کو بھی انہوں نے فلسفہ ہی دیا، زندگی سمجھنے کا فلسفہ، زندگی پرکھنے کا فلسفہ اور زندگی بسر کرنے کا فلسفہ لیکن اپنے فلسفیانہ افکار کی ترسیل میں بھی علامہ کا رویہ — نہ زباں سے آشنا میں۔ سے مشابہہ نظر آتا ہے اس لئے بہت کچھ لکھ پڑھ کر اور مشرق و مغرب کے فلسفیانہ دبستانوں پر عبور کے باوجود بھی علامہ نے جس طرح مولانا رومی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، انھیں پیر رومی کہا اور خود کو مرید ہندی ——— تو اس میں بھی ایک خاص طرح کی کسر نفسی پائی جاتی ہے یہی نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی علامہ کا رویہ کچھ اس شعر کی مانند محسوس ہوتا ہے۔

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب   روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

اس پر مرید ہندی کو پیر رومی جو جواب دیتا ہے وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اقبال اور رومی کے فکری رابطہ کی اساس مہیا کرتا ہے۔

دست ہر نا اہل بیمارت کنند   سوئے مادر آ کہ تیمارت کنند

علامہ کی یہ مشہور نظم "پیر و مرید" جہاں عصر حاضر اور اس کے انسان کے روحانی اور فکری مسائل کے بارے میں حکیمانہ نکات اور فکری بصیرت کے موتیوں کی ایک لڑی کی مانند ہے وہاں مرید ہندی اور پیر رومی کے مکالمات سے یہ نظم افلاطون کے مکالمات کی یاد دلاتی ہے جن میں سقراط قصر دانش کے در دریچے وا کرتا ہے۔ یہ نظم اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ فکرِ اقبال کا فکر انگیز خلاصہ ایک ایک دو دو اشعار کی صورت میں رومی کی زبان سے ادا کر دیا گیا ہے چنانچہ علم حاضر، دور حاضر، یورپ، جہاد، حسن مغرب، طالب علم دین اور وطن کی آویزش، سرِ آدم و غایت آدم، اسلام کی عنایت، بیداری قلب، راز قیامت، خودی، بے خودی، استحکام ملت، دنیا سے لاتعلقی اور دل سے تعلق، علم و حکمت، خلوت و جلوت اور اہل وطن کی تیرہ روزی ——— علم و حکمت کا کونسا ایسا نکتہ ہے اور فلسفۂ اقبال کا کونسا ایسا تصور ہے جس کے بارے میں پیر رومی کی زبان سے نکتہ آفرینی نہ کرائی گئی ہو اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کسی ایک نظم میں فکرِ اقبال کی تمام جہات کے بارے میں اشارات کا مطالعہ کرنا ہو تو "پیر و مرید" سے بہتر مثال پیش کرنی ممکن نہ ہوگی۔ پیر رومی نے رشد و ہدایت کے جس سلسلہ کا آغاز اس نظم میں کیا وہ "جاوید نامہ" میں اپنی منطقی انتہا کو پہنچتا ہے۔ "جاوید نامہ" فکرِ اقبال کے ارتقائی مراحل میں جہاں نکتہ عروج کی حیثیت رکھتی ہے وہاں مولانا رومی سے فکری رابطہ بھی بلندی کی انتہائی حدود کو چھوتا محسوس ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے "پیر و مرید" میں رومی کی فکری معیت میں تفہیم زیست اور ادراک حیات کی جس فلسفیانہ مہم کا آغاز کیا "جاوید نامہ" میں سیرِ افلاک کی صورت میں وہ تکمیل پا جاتی ہے۔ "پیر و مرید" میں جن مسائل پر ایک ایک دو دو اشعار کی صورت میں مجمل مگر بلیغ اشارات کئے گئے تھے "جاوید نامہ" میں مختلف افلاک پر عظیم عالمی شخصیات سے گفتگو کی صورت میں اہم تفصیلات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ تاہم بعض اوقات (بالخصوص ابتدائی حصوں میں) ایک ایک مصرع میں جس فن کارانہ چابکدستی سے رموزِ حیات کی گرہ کشائی کی گئی ہے وہ کچھ اقبال ہی سے مخصوص ہے اس ضمن میں رومی اور جہاں دوست کے مکالمات بہت خوب صورت مثال کی حیثیت رکھتے ہیں ؎

گفت مرگِ عقل ؟ گفتم ترکِ فکر — گفت مرگِ قلب ؟ گفتم ترکِ ذکر
گفت تن ؟ گفتم کہ زاد از گرد رہ — گفت جاں ؟ گفتم کہ رمزِ لا اللہ
گفت آدم ؟ گفتم از اسرار اوست — گفت عالم ؟ گفتم او خود روبروست
گفت ایں علم و ہنر ؟ گفتم کہ پوست — گفت حجت چیست ؟ گفتم روئے دوست
گفت دینِ عامیاں ؟ گفتم شنید — گفت دینِ عارفاں ؟ گفتم کہ دید

از کلام لذت جانش فزود
نکتہ ہائے دلنشیں بر من کشود

واضح رہے کہ ان اشعار میں وہی نکات ہیں جن پہ " پیر و مرید " میں گفتگو ہو چکی ہے ۔ " جاوید نامہ " میں علامہ نے جن شخصیات کے حوالے سے زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پہ روشنی ڈالی وہ یہ ہیں ۔

گوتم ، زرتشت ، طاسلطائی ، جمال الدین افغانی ، سعید حلیم پاشا ، مہدی سوڈانی ، حلاج ، غالب ، قرۃ العین طاہرہ ، فطشے ، سید علی ہمدانی ، ملا طاہر غنی کاشمیری ، شاہ ہمدان ، برتری ہری ، نادر شاہ ، ابدالی ، ٹیپو سلطان ——— ان کے پہلو بہ پہلو وہ شخصیات بھی ملتی ہیں جن کی زندگی کے سلبی پہلوؤں سے اقبال نے پہلو اثبات حاصل کیا ہے مثلاً ابو جہل ، فرعون اور ابلیس وغیرہ ۔

فلسفہ اقبال میں مختلف فکری ماخذات کے بارے میں بالعموم گفتگو ہوتی رہتی ہے اور اقبال شناسوں نے اس ضمن میں مشرق و مغرب کی کمی اہم اور معروف شخصیات کے اسما بھی گنوائے ہیں ۔ لیکن " جاوید نامہ " کا اگر اس نکتہ نظر سے تجزیاتی مطالعہ کیا جائے کہ اس میں جن شخصیات سے اقبالؒ ملے ، ان سے گفتگو کی اور ان سے کچھ حاصل کیا وہ سب کی سب ایسی ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی طور پر اپنے عصر کو یوں متاثر کیا کہ آنے والے ادوار کے لئے بھی ایک خاص نوع کی علامت بن گئیں اس پہ مستزاد ان کی زندگی اور فکر و نظریات میں ایسے تصورات کی موجودگی جو کسی نہ کسی لحاظ سے اقبال کے لئے بھی اثر انگیزی کی صلاحیت رکھتے تھے یوں دیکھیں تو " جاوید نامہ " کی بیشتر شخصیات اپنے مخصوص انداز زیست اور شعار حیات کی بنا پہ نہ صرف یہ کہ اقبال کے لئے باعث کشش ثابت ہوتی ہیں بلکہ فکر اقبال کے تشکیلی عناصر کی تفہیم کے لئے بنیاد بھی مہیا کرتی ہیں ۔ حتیٰ کہ اپنے منفی خصائص کے باوجود ابلیس بھی " جاوید نامہ " کی مانند اقبال کی شاعری میں ایک مخصوص کردار ادا کرتا نظر آتا ہے (اقبال نے جاوید نامہ میں اسے خواجۂ اہل فراق قرار دیا ہے) یہ درست ہے کہ اقبال نے مشرق و مغرب کی جن شخصیات سے کچھ نہ کچھ اثرات اخذ کئے وہ سب کی سب " جاوید نامہ " میں موجود نہیں ہیں لیکن " جاوید نامہ " میں عظیم شخصیات کی جو کہکشاں ملتی ہے اور ان سے اقبال نے جن رموز کی گرہ کشائی کرائی ہے اگر ان سب کا دیگر کتب میں پیش کئے گئے تصورات سے تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معنی خیز نتائج برآمد ہوں گے ۔

(۲)

فکر اقبال کے اس تناظر میں اپنے فکری رویوں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ اقبال فکر کی جن بلندیوں پہ تھے قوم میں بحیثیت مجموعی وہاں تک رسائی کی سکت نہیں ملتی اس نکتہ کی صراحت سے قبل اس امر کا تعین لازم ہے کہ ہمارے فکری رویوں کی اساس کن امور پہ استوار رہی ہے ۔ برصغیر کی تاریخ میں بالعموم اور مسلمانوں کی سیاسی اور اس سے جنم لینے والی تہذیبی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب

بے حد اہمیت کا حامل ہے یہ وہ سال تھا جب برصغیر میں صدیوں پر محیط ایک دور کا اختتام ہی نہ ہوا بلکہ اس سے وابستہ تہذیب و تمدن، فکر و فن اور شعر و ادبیات کی پرکھ کے معائیر بھی تبدیل ہو گئے معائیر کی یہ تبدیلی محض طرزِ بود و ماند کی حد تک نہ تھی کہ اس کی روشنی میں نہ صرف ماضی کو مسترد کیا جا رہا تھا بلکہ حال میں ان تبدیلیوں کا پرچار کیا جا رہا تھا جنھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو کلیتاً تبدیل کر دیا تھا۔ اس عہد کے فکری رویوں کی علامت سر سید احمد خاں کی شخصیت بنتی ہے۔ سر سید اور ان کی تحریک نزاعی تھی، اس زمانے میں بھی اور ایک صدی گزر جانے کے بعد، آج بھی ان پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو محض مسلمان نہ دیکھنا چاہتے تھے بلکہ انھیں "محمڈن" بنانا چاہتے تھے، انھیں بے دین، نیچری، ملحد، موقع پرست، انگریزوں کا آلۂ کار، جاہ پرست اور ذاتی نام و نمود کا طلب گار سب کچھ کہا گیا لیکن آج جبکہ نزاعات کی گرد بیٹھ چکی ہے اور شدید جذبات کے غیظ و غضب کے طوفان تھم چکے ہیں تو ان کی شخصیت پر نگاہ بازگشت ڈالنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ — یہ تو آثار کچھ اس مرد مسلمان میں نہیں!

سر سید کی تحریک کی بنیاد انگریزی اور اس کے حوالے سے مغرب سے فکری استفادہ کے اس تصور پر استوار تھی جو آج متروک ہے مگر اس زمانہ میں اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے موجب بہ ملحدانہ، باغیانہ اور ترقی پسندانہ محسوس ہوتا تھا۔ سر سید کی تحریک اصلاحی تحریک تھی چنانچہ انھوں نے اپنے رفیقوں جیسے حالی، شبلی، آزاد اور نذیر احمد کی امداد سے مذہب، تعلیم، ادب اور سماج میں اصلاح کی ایک لہر دوڑا دی۔ اس کے خلاف ردِ عمل بھی کم شدید نہ تھا چنانچہ اکبر الہ آبادی کی طنزیہ شاعری اس ردِ عمل کی نمایاں ترین مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

سر سید پر گو بہت سے اعتراضات کیے جا سکتے ہیں لیکن اس امر کی صداقت مسلّم کہ یہ سر سید اور ان کی تحریک ہی تھی جس نے برصغیر کے مسلمانوں پر انگریزی کے دروازے کھول کر انھیں مغرب سے بہت کچھ حاصل کرنے کا موقع دیا ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات نے برصغیر میں جس متوسط طبقہ کو جنم دیا اس کی مخصوص ضروریات کی تکمیل اس سے بطریقِ احسن ہو جاتی تھی اسی طبقہ نے بعد ازاں ادیب، سیاست دان اور معلم مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ حصولِ پاکستان کی جنگ کے لیے سپاہی بھی فراہم کیے۔ لیکن اپنی تمام تر توانائی نئے خیالات اور اصلاح پسندی کے باوجود یہ تحریک بنیادی طور پر حالی کی تحریک تھی اور ان کے تمام تصورات کی بنیاد صرف اس امر پر تھی کہ انگریزوں کی حکومت اب ایک طے شدہ معاملہ ہے اور اسے اٹل حقیقت کے طور پر تسلیم کرنے ہی میں مسلمانوں کی فلاح اور بہبود کا راز مضمر ہے۔ چنانچہ سر سید، حالی اور آزاد وغیرہ نے اس کا پرچار کیا یوں کہنے کو یہ مقصد پسندی کی تحریک تھی اب یہ دوسری بات ہے کہ بعد کے حالات نے اس مقصد پسندی کی بنیاد (جیسے حالی کے اس مصرع سے واضح کیا جا سکتا ہے، چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی،) کو غلط ثابت کر دیا۔

اس صدی کے آغاز میں جب اقبال کا تخلیقی شعور نکھر رہا تھا اور ایک خوش کلام شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت کا آغاز ہو چکا تھا تو برصغیر میں سر سید، حالی اور شبلی کی صورت میں اس تحریک کی توانا ترین شخصیات بھی موجود تھیں اور اکبر الہ آبادی کی صورت میں ردِ عمل کی مکمل بھی! اقبال ایسے مقصد پسند شاعر کے لیے مثبت اور منفی کی صورت میں یہ قوی متضاد طلبیں تھیں۔ ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے! لیکن اقبال محض پروانہ نہ تھا اگر اسے کسی چیز سے تشبیہہ دینی ہی ہے تو اقبال کے اپنے ہی الفاظ میں کرمکِ شب تاب

کہنا زیادہ بہتر ہوگا جو نہ صرف اپنی روشنی کا خود منبع ہی ہے بلکہ دوسروں کی راہنمائی بھی کرتا ہے۔

برصغیر کے فکری رویوں میں گو پہلے مقصدپسندی ایک زیریں لہر کی صورت میں موجود رہی مگر سرسید کی تحریک نے اسے پہلی مرتبہ ادب و فن میں اساسی اہمیت دیتے ہوئے قومی احیاء اور ملی سربلندی کے لئے اس سے کام لیا۔ سرسید کے ردعمل میں اکبرالہ آبادی بھی اپنے طنزیہ اشعار کی صورت میں ایک اور نوع کی مقصدیت کا اظہار کر رہے تھے۔ سرسید اور اکبر دونوں کو انگریزوں اور ان کے اثرات سے مثبت اور منفی کے باوجود بنیادی قسم کی دلچسپی تھی اس لئے دونوں کی مقصدیت ایک تصویر کے دو رخوں ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اس صدی کے آغاز تک یہ سب میلانات واضح صورت اختیار کر چکے تھے، اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سرسیدؒ، حالیؒ اور اکبرؒ سے خصوصی طور پر متاثر ہونے کے باوجود انگریزوں اور انگریزیت سے وابستہ اشیاء اور افکار و تصورات کو چنداں اہمیت نہ دی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انھوں نے ان سب کو ہدف تنقید بنایا اس مخالفت میں ان کا انداز نہ تو اکبرالہ آبادی کی مانند جذباتیت میں رنگا ہوا ملتا ہے اور نہ ہی انھوں نے لباس اور اشیاء خورد و نوش کی صورت میں محض سطحی امور تک خود کو محدود رکھا۔ فلسفہ نے اقبال کو جو فکری توانائی بخشی تھی اس کی بنا پر ان میں وہ تخلیلی ذہن اور تجزیاتی نگاہ پیدا ہو گئی کہ وہ اشیاء و توعات اور افکار و تصورات کے داخلی تضادات کو دیکھ سکتے تھے۔ یوں اقبال کے فکری رویوں کی صورت میں برصغیر میں مقصدیت کی دوسری مگر بے حد قوی لہر موجزن نظر آتی ہے اس ضمن میں یہ امر بھی معنی خیز ہے کہ سرسید کی مانند اقبال نے اپنے رفقا کی امداد سے کوئی تحریک نہ شروع کی لیکن افکار کی توانائی اور فلسفہ زیست کے استحکام کا یہ عالم ہے کہ اقبال اپنے وجود میں نہ صرف خود ایک تحریک بنے بلکہ ایسی تحریک جس کے افکار کی توانائی آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے، ان تصورات میں آج بھی راہنمائی کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور ان کے نظریات میں آج بھی مشعلِ راہ بننے کی جوت ہے۔

۱- ملاحظہ ہو نظم "سید کی لوح تربت"

۲- حالی پہ ایک جلسہ میں اقبال نے یہ رباعی فی البدیہہ کہی تھی :

مشہور زمانے میں ہے نام حالی — معمور مے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا — ۳- جاری ہے مرے لب پہ کلام حالی

مزید ملاحظہ ہو نظم "شبلی و حالی"

۳- اکبرالہ آبادی کو ایک خط میں یہ لکھا :

"میں آپ کو اس نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی عقیدت و اہمیت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں"۔

(اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطا اللہ جلد دوم ص ۴۳)

(۳)

اور اس سے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ آج اقبال کی تخلیقی زندگی کی پون صدی کے بعد۔ ان کے انتقال کے ۳۴ برس بعد اور پاکستان کی بیس سالہ زندگی کے بعد ہمارے فکری رویے علامہ کے فکری رویوں سے کس حد تک ہم آہنگ ہیں؟ ان سے کتنی روشنی مستعار لی اور قومی زندگی کے شجر میں ان سے کس حد تک ناوری پیدا ہوئی ہے۔

فکر اور اس سے جنم لینے والے مخصوص رویے یوں ہی خلا میں پیدا نہیں ہو جاتے لیکن یہ بھی ہے کہ پائیں باغ کی کیاری میں من پسند پھولوں کی مانند انھیں لگایا بھی نہیں جا سکتا ہر چند کہ بقدر ہمت اور وسعت سبھی ان پھولوں سے ڈرائینگ روم کی تزئین کی کوشش کرتے ہیں، جن کے اپنے آنگن میں پھول نہیں کھلتے وہ خرید کر لے آتے ہیں، دوسروں سے مانگ لیتے ہیں اور یہ سب کچھ نہ ہو سکے تو درآمد کر لیتے ہیں چنانچہ ہمارے ہاں پچ مچ کے پھولوں سے لے کر ادب، کلچر، تصورات و تخیلات سب کچھ وافر مقدار میں درآمد کیا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ علامہ کے اس شعر کی موجودگی میں کیا جا رہا ہے۔

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

فرد کی مانند افراد اور پھر ان سے جنم لینے والے معاشرہ اور ان معاشروں سے تشکیل پانے والی قوم کا اپنا ایک مخصوص اسلوب حیات ہوتا ہے جو بیشتر امور میں اجتماعی نفسیات سے رنگ افروز ہوتا ہے، جس طرح اپنے مخصوص روایتی میلانات، نسلی خصائص اور شخصیت کے انفرادی رجحانات کی بنا پر فرد میں مخصوص نوعیت کے نفسیاتی الجھاؤ جنم لیتے ہیں اسی طرح اپنے اجتماعی شعور میں ایک قوم بھی فرد ہی کی مانند مخصوص نفسی میلانات کی حامل نظر آتی ہے جب ہم پاکستانی، بھارتی، چینی یا امریکی کو بطور ایک علامت استعمال کرتے ہیں۔ ان کی اجتماعی ذہنیت سے چند مخصوص میلانات کو ہمیشہ مربوط دیکھتے ہیں اور ان ہی کی روشنی میں تعریف یا مذمت کرتے ہیں تو یہ دراصل اسی اجتماعی نفسیات کی بنا پر ہی ہوتا ہے۔

اسی نقطۂ نظر سے اپنی قوم کا تجزیاتی مطالعہ کرنے پر چند مخصوص نفسی میلانات کی اساس دریافت کرنی مشکل نہ ہوگی۔ جن میں غالباً نرگسیت کو سر فہرست قرار دیا جا سکتا ہے، اس نرگسیت نے ہم میں ایک خاص نوع کی جذباتیت پیدا کی ہے ایسی جذباتیت جس کا خارجی سیاسی تعلقات کے انداز سے لے کر قومی سیاست کے آشوب تک کئی جہات پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نرگسیت کے اہم ترین مظاہر میں سے مذہب کے بارے میں ہمارے رویہ نے عجیب پر تضاد صورت حال کو جنم دیا ہے ایک طرف ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ دین اسلام ہی برحق، عظیم اور آفاقی ہے لیکن دوسری طرف خدا کے ساتھ ہمارا تعلق بگڑے بچے ایسا ہے جو شرارت، بدتمیزی اور حکم عدولی کو اپنا جائز حق سمجھتا ہے اور اپنی شخصیت کے اظہار کا طریقہ بھی! ہر چند کہ مسیحی عقیدہ کی مانند اسلام میں خدا باپ کے روپ میں نہیں دکھیا جاتا اور نہ ہی بائبل کی مانند قرآن مجید میں "PRODIGAL SON" ایسا کوئی تصور موجود ہے۔ اس ضمن میں ایک اور دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ جب اسلام کی اپنے گھر میں بات ہو تو ہم حریر و پرنیاں اور جوئے نغمہ خواں ہوتے ہیں لیکن اس کے برعکس صورت حالات میں ہم تیز و تند رو ہوتے ہیں اور دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان! اس اجتماعی طرز احساس کا انفرادی پیکر ہمیں ملا کے

وجود میں نظر آتا ہے اور پاکستان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں ملائیت بطور ایک ادارہ قائم اور فعال ہے کبھی اس معاملہ میں افغانستان بہت بڑھا ہوا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس وقت میدان ہمارے ہاتھ میں ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو ہم مسلمانوں کا اس کے بارے میں ہمیشہ بے حد جذباتی رویہ رہا ہے۔ جس کی تسکین کے لئے قومی سطح پر کسی ایک شخصیت کو بطور ایک علامت بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ بطور ایک SCAPE GOAT چن کر اس کی دل کھول کر مذمت کی جاتی ہے۔ چنانچہ سرسید سے لے کر غلام احمد پرویز تک ایسی کئی شخصیات مل جاتی ہیں۔ اس نوع کی مذمت سے نفسی آسودگی حاصل ہوتی ہے جس طرح گناہ گار وجود کا کیتھارسس ہوتا ہے اور "آلودہ" رہنے کے باوجود جس طرح اپنی "تطہیر" ہوتی ہے اس کی نفسیاتی اہمیت اتنی واضح ہے کہ اسے بطور خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کے بارے میں جس رویہ کا اظہار کیا گیا اس کا نفسیاتی مطالعہ عبرت انگیز ہی نہیں بلکہ ہماری قوم کی تضادات سے پر نفسیات پر ایک نئے زاویہ سے روشنی بھی ڈالتا ہے اقبال کی زندگی میں "شکوہ" ایسی نظموں، ملائیت کی مذمت، تصوف پر اعتراضات اور حافظ کی نکتہ چینی کی بنا پر عام مسلمانوں نے بالعموم انہیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا خواجہ حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی نے تو مذہب کے نام پر اختلافات میں شائستگی کو ملحوظ رکھا مگر ملا نے حسب عادت دین کو مہلک ہتھیار بناتے ہوئے اقبال کی تکفیر کر ڈالی۔ اس کے برعکس ان دنوں اقبال کو صاحب کرامت ولی کا درجہ دیا گیا ہے اور ان کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ بولنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے اقبال کی مخالفت میں مذہبی جنون کا اظہار کیا جاتا تھا مگر اب ان کے حوالہ سے مبالغہ آمیز مذہبی جذباتیت کی تسکین کی جا رہی ہے۔

ہمارے فکری رویوں کی تشکیل اور جذباتی ساخت میں مذہب بے حد اہم کردار ادا کرتا ہے اس لئے مذہب اور اس کے حوالہ سے اقبال کے بارے میں ہیجانی رویوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا۔ یہ مطالعہ مجمل اور صرف چند اشارات تک محدود ہے مگر اس سے وابستہ جزئیات میں کافی سے زیادہ تنوع ملتا ہے ایسی جزئیات جو درخت کی جڑوں کی مانند دور تک نیچے اتر گئی ہیں۔

(۴)

یہ اقبال کے افکار کی گہرائی اور ان کی شاعری کی کشش تھی کہ نہ صرف اقبال کو جلد ہی ملک گیر شہرت حاصل ہو گئی بلکہ ان کے افکار و تصورات کے مطالعات اور تشریحات میں ناقدین کی کئی نسلوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کی ہیں اور اب فکر اقبال کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس پر ناقدین نے خامہ فرسائی نہ کی ہو لیکن اس کے باوجود بسا اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اپنے اقبال شناسوں کی بیشتر تحریریں پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ فکر اقبال ایک طلسمی قلعہ ہے جس میں معانی کی سبز پری مقید ہے مگر اس قلعہ میں داخلہ کے لئے جس اسم اعظم کی ضرورت ہے شہزادہ اسے بھول چکا ہے اور اب وہ ادھر ادھر کے منتر پڑھ کر اپنی خفت مٹا رہا ہے چنانچہ بند دروازوں کے پیچھے معانی کی سبز پری اپنے مقدر پر نوحہ کناں ہے۔

کسی بھی قوم کے اجتماعی فکری رویوں کی عکاسی اس کی تخلیقات اور ان تخلیقات کی ترجمان تنقید سے ہوا کرتی ہے اپنی تمام تر بوقلمونیوں کے باوجود ایک مخصوص عصر کی تخلیقی کاوشوں میں قوم کی سائیکی اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں جلوہ گر ہوا کرتی ہے تخلیق وہ PERSONA ہے جس سے انسانی شخصیت اپنے لئے گھونگھٹ کا انتخاب کرتی ہے اور تنقید دولہا کا وہ دست مشتاق ہے جو اس گھونگھٹ میں چھپی دلہن

کے خد و خال کے حسن کی تحسین کرتا ہے اکثر لوگوں کے ذہن میں تخلیق vs. تنقید قسم کے دنگل کا تصور ملتا ہے، جو غلط ہے کہ نقاد کا کام تخلیق کار کو چاروں شانے چت کرنا نہیں اور نہ ہی وہ تخلیق کار کو اپنی برتری کے سنگ گراں تلے پیسنا چاہتا ہے تخلیق اور تنقید کا حال تو دولہا دلہن کا ہے جس طرح ہنگام وصل نہ کسی کی فتح ہوتی اور نہ کسی کی شکست بالکل اسی طرح تخلیق اور تنقید میں ہوتا ہے۔ حسن معانی اس رابطہ کا ثمر ہے جو فہم و فراست اور دانائی کی نعمتیں عطا کرتا ہے۔ اگر اسی استعارہ کو جاری رکھا جائے تو پھر یہ کہنا پڑتا ہے کہ فکرِ اقبال وہ دلہن ہے جو ابھی تک مشتاق ہاتھوں والے محبوب کے انتظار میں گھونگھٹ میں چھپی بیٹھی ہے بیشمار دل والے آتے ہیں لیکن دلہن کے حسن کی تاب نہیں لا پاتے یوں عرض مدعا کئے بغیر ہی بے نیل و مرام رخصت ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ گھونگھٹ اٹھا نہ پائے، اصل خد و خال دیکھنے سے محروم رہے اس لئے نارسائی کی خفت مٹانے کو دلہن اور اس کے حسن کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہیں اور اس انداز میں گویا لذتِ وصل سے صرف وہی بہرہ یاب ہو سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دلہن سونی سیج پہ منتظر ہے، اب تک سیج کے پھول نہ مرجھائے تو یہ اس کے اپنے وجود کی تازگی کی بنا پر ہے، اب تک اگر اس کے حسن میں مسحور کن کشش ہے تو یہ اس کی اپنی شخصیت کی داخلی توانائی کے باعث ہے۔

میں استعارہ میں دور تک نکل گیا لیکن فکرِ اقبال تک نارسائی کو ریاضیاتی انداز میں بھی بآسانی واضح کیا جا سکتا ہے — مولانا الطاف حسین حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" سے جدید اُردو تنقید کا آغاز کیا جاتا ہے یہ ۱۸۹۳ء میں طبع ہوئی تھی گویا اس صدی کے آغاز میں اُردو تنقید اور اس کے حوالہ سے جن امور کی ترجمانی کی جا سکتی ہے ان کی عمر کل سات برس بنتی تھی اس صدی کے آغاز سے اقبال کی شاعری کا نہ صرف باقاعدہ طور پر آغاز ہو چکا تھا بلکہ وہ ۱۹۰۰ء میں اپنی مشہور نظم "نالۂ یتیم" لکھ چکے تھے۔ اگلے دس برسوں میں اقبال ملک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے ۱۹۱۵ء میں "اسرار خودی" طبع ہوئی اور ۱۹۲۰ء میں پروفیسر نکلسن نے اس کا ترجمہ لندن سے شائع کیا جس سے پہلی مرتبہ اہل مغرب مشرق کے اس مفکر سے متعارف ہوئے چنانچہ اقبال کے اولین مبصروں میں ہربرٹ ریڈ اور ای ایم فارسٹر ایسے معروف ناقدین تھے بالفاظ دیگر اقبال بیس سال میں قومی سے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گئے ایسی حیثیت میں جس میں آنے والے زمانے نے پختگی بھی پیدا کی اور اس میں مزید اضافہ بھی کیا! لیکن ۱۹۲۰ء میں اردو تنقید کس مقام پہ کھڑی تھی؟ ابھی وہ محض لفظی بحثوں عروضی مناقشوں اور ایسے ہی دیگر ٹیکنیکل مسائل میں الجھی تھی اس کے پاس سائنٹفک تصورات نہ تھے لہذا وہ تجزیہ و تحلیل سے نا آشنا تھی ایسی تنقید کی حد کمال محض محاسن گنوانے تک محدود ہوتی ہے چنانچہ "محاسن کلام غالب" کی صورت میں اس تنقید نے نکتۂ عروج حاصل کر لیا۔ یہ کتاب اس وقت چھپی جب مغرب کے دانشور اقبال کے نام سے واقف ہو چکے تھے۔ مالتھس نے آبادی میں اضافے اور وسائل پیداوار میں تناسب کے لئے جو ریاضیاتی فارمولا بنایا تھا اسے اگر فکرِ اقبال کے ارتقا اور اپنی تنقید پر منطبق کریں تو دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس صدی کے آغاز سے لے کر ۱۹۳۸ء تک فکرِ اقبال مسلسل ارتقا پذیر رہا یہی نہیں بلکہ اس کی رفتار بھی بے حد تیز تھی چنانچہ اسے GEOMETRICAL PROGRESSION کے انداز پہ ۱، ۲، ۴، ۸، ۱۶، ۳۲ سے واضح کیا جا سکتا ہے جبکہ ہماری تنقید کا سفر MATHEMATICAL PROGRESSION کے مطابق ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ کی رفتار سے جاری تھا اس لئے علامہ اقبال ایک شہسوار کی رفتار سے فکر کے جس راستہ سے گزر بھی گئے ہماری تنقید ابھی تک گرد راہ میں گم افتاں و خیزاں اس سے بہت

پیچھے نظر آتی ہے۔

جب تخلیق سے بلاواسطہ تعلق رکھنے والی تنقید کا یہ عالم ہے تو باقی امور کا تو ذکر ہی بے کار ہے، جہاں مدتوں سے کوئی حقیقی خلا سفر نہ پیدا ہوا ہو، جہاں کوئی مجتہدِ دین نہیں ہوا اور جو علاقہ طویل مدت سے کسی اور یجنل صوفی کا منتظر ہو وہاں فکرِ اقبال سے کسبِ فیض کیسے ممکن تھا۔ اس لئے اقبال نے اپنی زندگی میں جو بات کی تھی وہ آج اس کے پاکستان میں بھی اتنی ہی درست معلوم ہوتی ہے:

تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!
مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی!
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی
عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

ہم لوگ طبعاً روایت پرست ہیں کہ یہ انداز ہماری سست روی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اسی لئے ہم نئی لکیر بنانے کے مقابلہ میں لکیر کا فقیر بننا زیادہ پسند کرتے ہیں علامہ اقبال کے ساتھ بھی یہاں یہی سلوک کیا گیا ہم نے حسبِ عادت انھیں بھی ایک روایت میں بلکہ یوں کہئے کہ ایک شاندار روایت میں تبدیل کر لیا ہے اور بس!

علامہ اقبال نے زندگی میں یہ کہا تھا:

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کے غاروں میں نظر بند

معلوم ہوتا ہے خدا نے اقبال کی یہ دعا قبول کر لی بھلا افکار کی نظر بندی کے لئے پاکستان سے بڑھ کر بہتر غار اور کہاں دستیاب ہو سکتے تھے؟

مکاتیبِ اقبال کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ

عبداللطیف اعظمی

اُردو زبان اپنے جن اصنافِ ادب پر فخر کر سکتی ہے اور اپنی کم عمری کے باوجود دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی نظروں سے نظریں ملا سکتی ہے، ان میں سے ایک مکتوب نویسی ہے۔ اُردو مکتوب نویسی کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جو خطوط نویسی سکھانے کے لیے فرضی خطوط لکھے گئے ہیں۔ مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اس لئے خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۸ - ۱۹۵۵) پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ دوسری قسم وہ ہے جو کسی مخصوص موضوع پر اظہارِ خیال کے لئے خطوط کا انداز اور اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بھی خطوط کا نہایت قابلِ قدر اور قابلِ لحاظ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، اس ضمن میں قاضی عبدالغفار (۱۸۸۸ - ۱۹۵۶ء) کی کتاب "لیلیٰ کے خطوط" (مطبوعہ: دسمبر ۱۹۳۲ء) اور مجنوں گورکھپوری (پ ۱۹۰۴) کے "پردیسی کے خطوط" (مطبوعہ: جولائی ۱۹۶۱ء) کو بڑی شہرت اور اہمیت حاصل ہے۔ اگر نیاز فتحپوری، (۱۸۸۴ - ۱۹۶۶) کے خطوط بھی، جو "مکتوباتِ نیاز" کے نام سے تین حصوں میں حسبِ ترتیب ۱۹۳۵، ۱۹۴۴، اور ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئے ہیں اسی سلسلے کی کڑی مان لیے جائیں، جیسا کہ بعض نقادوں کا خیال ہے، تو انھیں بھی وہی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی، جو "لیلیٰ کے خطوط" اور "پردیسی کے خطوط" کو حاصل ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جسے نجی خطوط کہتے ہیں، جو چھپنے کے لیے نہیں لکھے گئے ہیں، نہ کسی علمی و ادبی موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے، بلکہ اپنے دل کی بات کسی دوسرے شخص تک پہنچانے کے لیے، یا اپنے ذاتی احوال سے کسی دوسرے شخص کو واقف کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ یہی خطوط دراصل اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع ہیں۔ ان نجی خطوط کے مجموعوں کی تعداد ڈیڑھ دو سو کے لگ بھگ ہو گی، جن کی ایک مکمل وضاحتی فہرست میں نے مرتب کی ہے جو عنقریب شائع ہو گی۔ ان مجموعوں کے حسبِ ذیل مکتوب نگار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ رجب علی بیگ سرور	۱۷۸۶ - ۱۸۶۹ء	۹۔ مولانا حالی	۱۸۳۷ - ۱۹۱۴ء
۲۔ غالب	۱۷۹۷ - ۱۸۶۹ء	۱۰۔ اکبر الہ آبادی	۱۸۴۶ - ۱۹۲۱ء
۳۔ سر سید	۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء	۱۱۔ شاد عظیم آبادی	۱۸۴۶ - ۱۹۲۷ء
۴۔ واجد علی شاہ	۱۸۲۳ - ۱۸۸۷	۱۲۔ مولانا شبلی	۱۸۵۷ - ۱۹۱۴ء
۵۔ خواجہ غلام غوث بیخبر	۱۸۲۴ - ۱۹۰۴	۱۳۔ مولوی عبدالحق	۱۸۷۰ - ۱۹۶۱ء
۶۔ امیر مینائی	۱۸۲۸ - ۱۹۰۰	۱۴۔ مہدی حسن الافادی	۱۸۶۱ - ۱۹۲۱ء
۷۔ داغ دہلوی	۱۸۳۱ - ۱۹۰۵	۱۵۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال	۱۸۷۳ - ۱۹۳۸ء
۸۔ مولانا محمد حسین آزاد	۱۸۳۲ - ۱۹۱۰	۱۶۔ مولانا محمد علی جوہر	۱۸۷۸ - ۱۹۳۱ء

۱۷- خواجہ حسن نظامی	۱۸۷۸ - ۱۹۵۵ء	۲۱- نیاز فتحپوری	۱۸۸۴ء - ۱۹۶۶ء
۱۸- پریم چند	۱۸۸۰ - ۱۹۳۶ء	۲۲- مولانا ابوالکلام آزاد	۱۸۸۸ء - ۱۹۵۸ء
۱۹- چودھری محمد علی ردولوی	۱۸۸۲ - ۱۹۵۹ء	۲۳- صفیہ اختر	۱۹۵۳ء
۲۰- مولانا سید سلیمان ندوی	۱۸۸۴ - ۱۹۵۳ء		

اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ مذکورہ بالا مکتوب نگاروں کے سرتاج غالب ہیں۔ ان کے خطوط پر سو سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے۔ مگر اب تک نہ ان کی تازگی میں فرق آیا ہے اور نہ ان کی مقبولیت میں۔ اب بھی لوگ لطف زبان کے لئے پڑھتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔ تنقید و تحقیق کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ غالب کے بعد جن لوگوں کے خطوط کی بہت زیادہ اہمیت اور افادیت ہے اور اب بھی جن کی کوئی معنویت (Relevance) ہے ان کی تعداد آدھے درجن سے زیادہ نہیں، ان میں ڈاکٹر اقبال کے خطوط شامل ہیں اور اگر سب سے آگے اور سب اہم نہیں تو کسی سے پیچھے اور کم تر بھی نہیں۔ زمانۂ قدیم میں، سر سید سے قبل خطوط کی سب سے بڑی خصوصیت زبان اور اسلوب کے لحاظ سے تھی، مگر بعد میں ان کی جگہ واقعات اور حقائق نے لے لی، اب اچھے اور مفید خط کی پہچان یا تعریف یہ نہیں رہی کہ اس میں زبان میں محاورے کی چاشنی کتنی ہے یا شعر و ادب کے نکات کس قدر اور کتنے اچھوتے بیان ہوتے ہیں، بلکہ اب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں حالات اور زمانے کی عکاسی کتنی ہے اور مکتوب نگار کے جذبات و احساسات اور اس کے افکار و خیالات کا اظہار کتنا ہوا ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے اور اس معیار پر دیکھا جائے تو سر سید، شبلی، اکبر، ابو الکلام اور اقبال کے خطوط سامنے آتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے خطوط ابھی بہت کم شائع ہوئے ہیں، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب (۱۸۹۳-۱۹۷۵) پروفیسر رشید احمد صدیقی (۱۸۹۲-۱۹۷۷) اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی (۱۸۹۲-۱۹۷۷ء) کے خطوط بھی بہت اہم ہو سکتے ہیں، مگر ابھی شائع نہیں ہوئے ہیں اس لیے ان کے بارے میں فی الحال کوئی رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔ اپنی تحقیق اور ذاتی رائے کی بنا پر میرا اپنا خیال ہے کہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں اقبالؔ کے خطوط کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اور تعداد کے لحاظ سے اردو کے تمام مکتوب نگاروں کے مقابلے میں اقبالؔ سب سے آگے ہیں۔ اگر خطوط کے مجموعوں کی تعداد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مولانا ابوالکلام آزادؔ اور اقبالؔ برابر ہیں، مگر خطوط کی تعداد کے لحاظ سے، میرے اندازے کے مطابق، اقبال کی گرد کو بھی کوئی نہیں پہنچتا، اقبالؔ کے خطوط کی تعداد کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱- شاد اقبال (مرتبہ: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ) مطبوعہ ۱۹۴۲ء، تعداد	:		۱۳۳ [1]
۲- اقبال نامہ - حصہ اول (مرتبہ: شیخ عطاء اللہ) مطبوعہ	: ۱۹۴۵	〃	۲۶۷
۳- 〃 حصہ دوم 〃 〃	: ۱۹۵۱	〃	۱۸۷
۴- مکاتیب اقبال بنام خاں محمد نیاز الدین خاں، مطبوعہ	: ۱۹۵۴	〃	۷۷ [2]
۵- مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی 〃	: ۱۹۵۷	〃	۱۷۹
۶- انوار اقبال (مرتبہ: بشیر احمد ڈار 〃)	: مارچ ۱۹۶۷	〃	۱۸۵
۷- مکاتیب اقبال بنام گرامی (مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی 〃)	: ۱۹۶۷	〃	۸۸ [3]
۸- خطوط اقبال (مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی 〃)	: ۱۹۷۶	〃	۱۱۱
		میزان	۱۱۲۵

[1] درست تعداد ۹۴ ہے (ادارہ نقوش)
[2] 〃 〃 ۷۹ 〃
[3] 〃 〃 ۹۰ 〃

مذکورہ بالا مجموعوں کے علاوہ دوسرے مجموعے حسبِ ذیل ہیں، جن میں نئے خطوط نہیں ہیں، بلکہ ان مجموعوں میں سے کسی نہ کسی میں آ گئے ہیں:

۱۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام (مترجمہ: سید مشتاق احمد چشتی) مطبوعہ: ستمبر ۱۹۴۳ء
۲۔ اقبال مرتبہ: عطیہ فیضی (مترجمہ: ضیاءالدین احمد برنی) 〃 : 〃 ۱۹۵۶ء
۳۔ اقبال اور عبدالحق (مرتبہ: ڈاکٹر ممتاز حسن) 〃 : دسمبر ۱۹۷۳ء
۴۔ خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی (مترجمہ: منظر عباس نقوی) 〃 : ۱۹۷۴ء

مذکورہ بالا تعداد ۱۲۵۱ ان خطوط کی ہے جو مجموعے کی شکل میں شائع ہوئے ہیں، لیکن کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جو متفرق رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ "خطوطِ اقبال" (مرتبہ: ہاشمی) میں لکھا ہے کہ: "مہاراجہ [سر کشن پرشاد شادؔ] کے نام اقبال کے مزید پچاس خطوط بعد میں دستیاب ہوئے جنھیں محمد عبداللہ قریشی نے "صحیفہ" ۔ اقبال نمبر میں) شائع کیا ہے، اس کے علاوہ اس کتاب میں "Letters and Writings of Iqbal" کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ: "انگریزی زبان میں اقبال اکیڈمی کراچی کے زیرِ اہتمام نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع شدہ اس کتاب میں اقبال کے ۴۳ خطوط شامل ہیں، ان میں سے ۲۶ خطوط کا اردو ترجمہ اس سے پہلے مختلف مقامات پر شائع ہو چکا ہے، اصل انگریزی خطوط پہلی بار منظرِ عام پر آئے ہیں۔" سہ ماہی "صحیفہ" کے پچاس خطوط اور انگریزی کتاب کے ۴۳ خطوط بھی اگر مذکورہ بالا مجموعی تعداد میں شامل کر لیے جائیں تو ان تمام خطوط کی مجموعی تعداد ۱۲۱۸ ہو جاتی ہے۔ اقبال کے خطوط کی مجموعی تعداد کے بارے میں "خطوطِ اقبال" کے فاضل مرتب کا بھی یہی اندازہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "اقبال کے موجودہ معلوم خطوط کی تعداد گیارہ بارہ سو سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔"[1]

اقبال بنیادی طور پر شاعر تھے، فارسی اور اردو دونوں کے اور ان کی شاعری کے کچھ اعلیٰ مقاصد تھے اور ان کی تمام تر توجہ اور نظر انھیں پر تھی، وہ الفاظ کو مقاصد پر قربان کر سکتے تھے مگر شاعری اور زبان و محاورے کی خاطر مقاصد کو مجروح کرنے کے لیے کسی صورت میں بھی تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اپنے خطوط میں انھوں نے اس کا بار بار ذکر کیا ہے۔ لکھنؤ کے لوگ خاص طور پر اقبال کی زبان اور محاورے وغیرہ پر بہت سخت اعتراضات کیا کرتے تھے۔[2] ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ سے مشہور مزاحیہ ہفتہ وار اخبار "اودھ پنچ" جاری ہوا تو وہ پنجے جھاڑ کر اقبال کے پیچھے پڑ گیا۔ اپنے بے تکلف اور عقیدت مند دوست محمد دین فوقؔ کو اقبالؔ نے اپنے خط مورخہ ۶ مارچ ۱۹۱۷ء میں لکھا کہ: "اودھ پنچ (لکھنؤ) نے جو اعتراضات مجھ پر کیے ہیں، ان کا مجھے علم نہیں، وہ پرچہ تلاش کرنا چاہیے، ممکن ہے کہ ان اعتراضوں میں کوئی کام کی بات ہو۔" اس کے بعد لکھنؤ والوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: "لکھنؤ والے یا اور معترض یہ خیال کرتے ہیں کہ اقبال شاعر ہے، اگر میری

---

[1] رفیع الدین ہاشمی: خطوطِ اقبال صفحہ ۲۲۔ [2] اقبال کی زندگی میں خود لاہور سے "اقبال کی خامیاں" شائع ہوئی تھی جس کے مصنف حضرت جراح تھے اور مرتب نوہر یارام درد نکودری۔ یہ کتابچہ (۸۰ صفحات کا) ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی اقبال کی زبان وغیرہ پر سخت اعتراضات کیے گئے ہیں۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے یہ مضامین اخبار پارس لاہور میں شائع ہو چکے تھے۔

غرض شاعری سے زبان دانی کا اظہار یا مضمون آفرینی نہیں، نہ میں نے آج تک اپنے آپ کو شاعر سمجھا ہے۔ حقیقت میں فن شاعری اس قدر دقیق اور مشکل ہے کہ ایک عمر میں بھی انسان اس پہ حاوی نہیں ہو سکتا، پھر میں کیونکر کامیاب ہو سکتا ہوں جسے روزی کے دھندوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ میرا مقصود گاہ گاہ نظم لکھنے سے صرف اس قدر ہے کہ چند مطالب جو میرے ذہن میں ہیں ان کو مسلمانوں تک پہنچا دوں اور بس" [1]

مولانا شیخ غلام قادر گرامی (۱۸۵۹ء-۱۹۲۷ء) فارسی کے بہت اچھے شاعر اور اقبال کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ اقبال ان سے اکثر و بیشتر اپنے کلام کے بارے میں مشورہ کیا کرتے تھے اور عام طور پر ان کے مشورے مان لیا کرتے تھے، لیکن اگر ان کے مشورے سے ان کا مقصد شاعری مجروح ہوتا تو چاہے زبان و ادب کے لحاظ سے ان کا مشورہ کتنا ہی اچھا ہو، انکار کر دیتے تھے۔ اسی طرح کے ایک مشورے کے بارے میں اقبال لکھتے ہیں: "آپ کی ترمیم سے زبان کے اعتبار سے شعر بہت ستھرا ہو گیا ہے، مگر افسوس کہ اس سے وہ مطلب ظاہر نہیں ہوتا جو میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ نازنین خود تو رخصت ہو گئی ہے، مگر دنیا میں اپنی آہ چھوڑ گئی ہے، جس کو لوگ خوشبو کہتے ہیں۔ آپ کے شعر سے مترشح ہوتا ہے: "وقت بند کشادن آہے سرداد" لہٰذا معانی کے اعتبار سے میں اپنے ہی مطلع کو ترجیح دیتا ہوں جس کو آپ نے پسند فرمایا ہے، لیکن "سرِ دادن آہ" کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔" [2]

اچھے خط کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ بے ساختہ ہو، تصنع اور ریاکاری سے پاک ہو اور لکھنے والے کے دل و دماغ کا صحیح معنی میں ترجمان اور عکاس ہو۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اقبال اُردو کے ان چند مکتوب نگاروں میں سے ہیں جن کی شخصیت اور ذہنیت کو ان کے خطوط کی روشنی میں بڑی آسانی سے سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اقبال انتہائی سادہ اور بے تکلف، لگاوٹ اور تصنع سے دور، دوستوں کے دوست، مخلصوں کے مخلص، خالص پنجابی کی طرح کھرے اور بیباک، جو دل میں وہی قلم پر، جس نے ان کو قریب سے دیکھا ہے یا ان کے سوانح حیات کا غور اور تفصیل سے مطالعہ کیا ہے، وہ تسلیم کرے گا کہ ان کے خطوط ہو بہو ان کی تصویر ہیں۔ اقبال کے "قول" اور "فعل" میں تضاد تھا، وہ اپنی شاعری کے ذریعہ جو پیغام پیش کرتے تھے، ان کی روزمرہ کی زندگی اس کے بالکل مختلف تھی۔ مگر انھیں اپنی اس کمزوری کا اعتراف تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں جو نظم پڑھی تھی [3] اس میں اسی طرف اشارہ ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں، پہلے اعتراض پھر اقبال کی طرف سے جواب:

کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے [4] — عامل روزہ ہے تو اور نہ پابند نماز
تو بھی ہے شیوۂ ارباب ریا میں کامل — دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکر حجاز

---

[1] انوار اقبال صفحہ ۶۴

[2] مکاتیب اقبال بنام گرامی صفحہ ،،

[3] کسی قدر ترمیم کے ساتھ یہ نظم "قطعہ" کے عنوان سے مئی ۱۹۱۱ء کے 'مخزن' (لاہور) میں شائع ہوئی۔ "بانگ درا" میں یہی نظم کافی ترمیم و اضافے کے بعد "نصیحت" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

[4] یہ مصرعہ "بانگ درا" میں یوں ہے: "میں نے اقبال سے ازراہ نصیحت یہ کہا"

جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے ‌ ‌ تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز
کبھی ایراں کے لیے ہو جو دعا کا جلسہ ‌ ‌ عذر تیرا ہے کہ ہے میری طبیعت ناساز[1]
ختم تقریر یہ تری مدحتِ سرکار یہ ہے ‌ ‌ فکرِ روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز
درِ حکام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود ‌ ‌ پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز

اب اقبال کا جواب ملاحظہ ہو:[2]

سن کے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا ‌ ‌ شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز
مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر ‌ ‌ ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز
ڈھب سب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

اقبال کی عمر، ۱۸۷۳ء کی تاریخ پیدائش کے لحاظ سے ۶۵ سال اور ۱۸۷۷ء کے مطابق ۶۱ سال کی تھی۔ اگر اسے تین ادوار میں تقسیم کیا جائے، تو میرے خیال میں یہ تقسیم کچھ اس طرح ہونی چاہیے:

۱۔ ابتدائی دور: ابتدا سے یورپ سے واپسی تک یعنی ۱۹۰۸ء تک۔ ‌ ‌ تقریباً ۲۷ سال

۲۔ دورِ شباب: ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۴ء تک یعنی علالت کے آغاز تک۔ ‌ ‌ ۲۶ سال

۳۔ آخری دور: جنوری ۱۹۳۴ء سے وفات تک یعنی ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء تک

اب ان تین ادوار کے کچھ خطوط نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں جن سے اقبال کی شخصیت اور سیرت پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے افکار و خیالات کو سمجھنے میں قابلِ قدر مدد ملتی ہے۔

پہلا دَور — ۱۸۷۳ء تا ۱۹۰۸ء

اقبال کا قدیم ترین خط جو اب تک دریافت ہوا ہے، وہ ۲۸ فروری ۱۸۹۹ء کا ہے جب وہ ایم اے فائنل (فلسفہ) کے طالب علم تھے۔ انھوں نے یہ خط اپنے استاد بھائی مولانا احسن مارہروی (۱۸۷۶ء - ۱۹۴۰ء) کو لکھا تھا۔ پورا خط ملاحظہ ہو:-

"مکرم بندہ جناب میر صاحب!

السلام علیکم! دونوں رسالے پہنچے، سبحان اللہ! نواب صاحب کی غزل کیا مزے کی ہے۔ افسوس ہے کہ آپ تکمیں نے

۱۔ یہ شعر "بانگِ درا" میں نہیں ہے۔

۲۔ ان اشعار کی جگہ "بانگِ درا" میں بالکل دوسرے ہیں۔

آپ کے گلدستے کو کوئی غزل نہیں دی۔ انشاء اللہ تعالیٰ امتحان کے بعد باقاعدہ ارسال کیا کروں گا۔ ایک تکلیف دیتا ہوں، اگر آپ کے پاس استاذی حضرت داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمایئے گا۔ بہت ممنون ہوں گا۔ اگر آپ کے پاس نہ ہو تو مطلع فرمایئے گا کہ کہاں سے مل سکتی ہے میں نے تمام دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کئے ہیں، چنانچہ انگریزی [؟ انگریز] جرمنی [؟ جرمن] اور فرنچ شعرا کے فوٹوز کے لیے امریکہ لکھا ہے۔ غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس تو حضرت کا فوٹو ضرور ہوگا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو از راہ عنایت جلد مطلع فرمایئے۔ حضرت امیر مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے۔ والسلام

خاکسار

محمد اقبال

از لاہور۔ گورنمنٹ کالج بورڈنگ ہاؤس

۲۸ فروری ۱۸۹۹ء[1]

اب زمانۂ قیام یورپ کے دو خط پیش کئے جاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے اقبال ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو لندن پہنچے ہیں اور تقریباً تین سال کے بعد انگلستان اور جرمنی سے بیرسٹری اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے کر ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو لاہور واپس آئے ہیں۔ پہلا خط اقبال کے دوست اور عقیدت مند منشی محمد دین فوق (۱۸۷۷ء - ۱۹۴۵ء) کے نام ہے جن کی صحافت کا آغاز "پیسہ اخبار" سے ہوا، اس کے بعد ہفتہ وار "پنجہ فولاد"، ماہانہ "کشمیری میگزین"[2] جس نے بعد میں ہفتہ وار "کشمیری" کی صورت اختیار کرلی، رسالہ "طریقت" اور رسالہ "نظام" جاری کئے۔ یہ اُن اخبارات و رسائل میں سے ہیں جن میں اقبال سے متعلق وقتاً فوقتاً مختلف چیزیں چھپتی رہی ہیں اور اقبال کے سوانح نگار کو ان کے مطالعہ سے مفر نہیں ہے۔ اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے، مگر خط کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ لندن پہنچنے کے بعد جلد ہی یعنی ۱۹۰۵ء کے اواخر میں لکھا گیا ہے۔ دوسرا خط اقبال کے وفادار ملازم اور زندگی بھر کے خادم علی بخش کے نام ہے۔ ملاحظہ ہوں :

ڈیر فوق !

آپ کا کارڈ ملا۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ مجھے بھی یہ خیال تھا کہ جاتی [؟ آتی] دفعہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی، افسوس ہے، مجھے اس موقع پر فرصت کم تھی ورنہ کہیں نہ کہیں آپ سے ملنے کو آجاتا۔ اچھا ہوا آپ نے وہ پرچہ اپنی ذمہ داری پر چلانا شروع کیا۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ یہاں سے [کے] مشاغل سے مطلق فرصت نہیں ملتی، ایسے حالات میں مضامین لکھنے کی کہاں سوجھتی ہے، البتہ شعر ہے جو کبھی کبھی خود موزوں ہو جاتا ہے سو شیخ عبدالقادر[3]

---

[1] اقبال نامہ (حصہ اول)، صفحہ ۴

[2] "کشمیری میگزین" جو ۱۹۰۶ء میں جاری ہوا تھا۔

[3] جو اُس وقت وہیں لندن میں ہی تھے اور اقبال سے کچھ پہلے پہنچے تھے۔

(اڈیٹر مخزن) اسے جانتے ہیں، ان سے انکار نہیں ہو سکتا، آپ سے بھی انکار نہیں، اگر کچھ ہو گیا تو حاضر کروں گا[1]

والسلام

محمد اقبال

ٹرنیٹی کالج کیمبرج۔ انگلینڈ

لندن۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۰۷ء

عزیز علی بخش! بعد سلام کے واضح ہو کہ خط تمہارا پہنچا، حال معلوم ہوا۔ میرے آنے میں ابھی چھ سات ماہ کا عرصہ باقی ہے۔ امید ہے کہ اس وقت تک تم فارغ نہ ہو گے اور وہ کمی جو چوری سے ہو گئی ہے اسے پورا کر لو گے۔ مجھے یہ سن کر بڑا افسوس ہوا، اگر میں وہاں ہوتا تو اس موقع پر ضرور تمہاری مدد کرتا۔

تم نے اپنی شادی کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ بہرحال انسان کو شادی سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ بیوی اور بچوں کی پرورش کے واسطے اس کے پاس سامان ہے یا نہیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اپنی محنت سے بیوی کو آسودہ رکھ سکو گے تو ضرور کر لو۔ شادی کرنا عین ثواب ہے اگر بیوی آسودہ رہ سکے۔ اگر کوئی شخص ایسا نہ کر سکتا ہو تو وہ شادی کر کے نہ صرف اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرتا ہے بلکہ ایک بے گناہ کو بھی لے ڈوبتا ہے[2]

محمد اقبال

اقبال ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس آئے تو ۲۷ر جولائی کو لاہور پہنچے اور مستقبل کے لیے کوئی پروگرام طے کرنے سے قبل اپنے وطن سیالکوٹ چلے گئے۔ وہیں سے ۲۹ر اگست (۱۹۰۸ء) کو منشی محمد دین فوق کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:"۔۔۔۔ افسوس ہے کہ میں ابھی کچھ عرصے تک آپ کے لیے کچھ نہ کر سکوں گا، کیونکہ ہمہ تن قانون کی کتب کی طرف متوجہ ہوں۔ چونکہ اس کام کو شروع کیا ہے اس واسطے ارادہ ہے کہ اس کو حتی الامکان پورے طور پر کروں۔ روٹی تو خدا ہر ایک کو دیتا ہے، میری آرزو ہے کہ میں اس فن میں کمال پیدا کروں۔ آپ بھی دعا کریں کہ خدا تعالیٰ اس مہم میں میرا شامل حال ہو۔ انشاء اللہ نومبر[3] میں لاہور چلا جاؤں گا اور مستقل طور پر کام شروع کر دوں گا[4]۔۔۔۔"

---

[1] انوار اقبال صفحہ ۵۳

[2] نوائے وقت۔ لاہور اپریل ۱۹۴۵، نیز اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۲۹۶۔

[3] لاہور میں مستقل قیام کے لئے انارکلی میں ایک کوٹھی کرائے پر لی اور ۲۲ر اکتوبر کو وکیلوں کی فہرست میں اپنا نام شامل کرنے کے لئے لاہور کے چیف کورٹ میں درخواست دی جو منظور کر لی گئی۔

[4] انوار اقبال صفحہ ۵۴۔

دورِ شباب یا دورِ عروج - ۱۹۰۸ء تا ۱۹۳۴ء

اقبال جب اعلیٰ تعلیم کے لیے یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو یورپ کے لیے روانہ ہوئے تو اس وقت تک وہ ملک میں کافی مشہور ہو چکے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں انجمن حمایت اسلام (لاہور) کے جلسے میں پہلی مرتبہ اپنی نظم "نالۂ یتیم" سنائی تو بہت پسند کی گئی اور اصرار کے ساتھ دوسرے دن دوبارہ سنی گئی۔ اس جلسے کے صدر شمس العلماء مولانا نذیر احمد (۱۸۳۶ - ۱۹۱۲ء) تھے، انہوں نے اس نظم کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ: "میں نے دبیر اور انیس کی بہت سی نظمیں سنی ہیں مگر واقعی ایسی دلخراش نظم کبھی نہیں سنی"۔

اپریل ۱۹۰۱ء میں اقبال کے بے تکلف دوست شیخ عبدالقادر (۱۸۷۴ - ۱۹۵۰ء) نے ایک ماہانہ رسالہ "مخزن" نکالا تو اس پہلے شمارے میں اقبال کی مشہور نظم "ہمالہ" شائع ہوئی۔ اس کے بعد اقبال کی تازہ ترین نظمیں اس ماہنامہ میں شائع ہونے لگیں۔ نومبر کے شمارے میں "ہمارا دیس" شائع ہوئی جسے عرف عام میں ہندوستانی ترانہ کہا جاتا ہے اور نومبر میں "ابرِ کوہسار" شائع ہوئی۔ دوسرے سال ۱۹۰۲ء میں "خفتگانِ خاک سے استفسار"، "زبانِ حال"، "شمع و پروانہ"، "میں کون ہوں اور دنیا کیا ہے؟"، "ایک بچے کی فریاد اور شام کی آمد"، "صدائے درد"، "ایک آرزو اور شمع"، "صدائے درد"۔ اور ۱۹۰۳ء میں "سید کی لوحِ تربت"، "ایک صاحبِ دل کی آرزو"، "ایک دردمند دل کی آرزو"، "دردِ عشق"، "دربارِ بہاولپور" اور "عشق اور موت" شائع ہوئیں۔ ۱۹۰۴ء میں "طفلِ شیرخوار"، "صبح کا ستارہ"، "رخصت اے بزمِ جہاں"، "تصویرِ درد"، "نالۂ فراق"، "بلالؓ" اور "سرگذشت آدم"۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ کی روانگی سے پہلے فروری میں "ہندوستانی بچوں کا گیت"۔ مارچ میں "نیا شوالہ" جولائی میں "ایک پرندہ اور جگنو" اور ستمبر میں "بچہ اور شمع" شائع ہوئیں۔ یورپ جانے سے قبل ہی اقبال کی پہلی تالیف "علم الاقتصاد" ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ غرض یورپ جانے سے پہلے ہی اقبال کو ملک گیر شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ زمانۂ قیام یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول میں زیادہ مصروف رہے، کچھ وہاں کی تفریحات اور مختلف مقامات کی سیر میں بھی وقت گذارا ہوگا، اسی لیے اس زمانے میں بہت کم نظمیں کہی ہیں، خود اقبال کے الفاظ میں "بس کبھی کبھی موزوں ہو جایا کرتی تھیں"، چنانچہ ۱۹۰۵ء میں مخزن کے نومبر کے شمارے میں "کنارِ راوی"، مارچ ۱۹۰۶ء میں "حسن و زوال" اور مئی میں "سودیشی تحریک اور رہبرانِ اسلام" ۱۹۰۷ء میں جنوری میں "سوامی رام تیرتھ"۔ فروری میں "پرندے کی فریاد" شائع ہوئیں۔ ۱۹۰۸ء میں اقبال کا مقالہ Development of Meta Physics in Persia. لندن سے شائع ہوا۔ واپسی کے بعد چھوٹی موٹی نظموں کا سلسلہ حسب معمول جاری رہا، مثلاً اگست میں "صقلیہ"۔ اکتوبر میں "پیامِ عشق"۔ اپریل ۱۹۰۹ء میں "بلادِ اسلامیہ"۔ اوائل ۱۹۱۰ء میں "گورستانِ شاہی"۔ ۱۹۱۱ء میں "غرۂ شوال یا ہلالِ عید" اور "خونِ شہداء کی نذر حضور رسالت مآب میں"۔ ۱۹۱۲ء میں "یارب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے" ایک نعت: "نگاہِ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر" ۱۶ اپریل کو انجمن حمایت اسلام میں "شمع و شاعر" سنائی اور ماہنامہ "ادیب" (الٰہ آباد) میں "مرزا غالب" شائع ہوئی۔ مگر اسی عرصے میں چند طویل نظمیں لکھیں جن کی اقبالیات میں بڑی اہمیت ہے، مثلاً اپریل ۱۹۱۱ء میں "شکوہ" ۱۹۱۳ء میں "جوابِ شکوہ"۔ اپریل ۱۹۲۲ء میں "خضرِ راہ" اور ۱۹۳۳ء میں "مسجدِ قرطبہ" اس کے علاوہ مرحوم کے تمام مجموعۂ کلام، سوائے ارمغانِ حجاز کے جو انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا، اس دور میں شائع ہوئے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) ۱۹۱۵ء میں "اسرارِ خودی" (۲) اپریل ۱۹۱۸ء میں "رموزِ بیخودی" (۱۹۴۰ء میں یہ دونوں مثنویاں ایک ساتھ شائع ہوئیں) (۳) اواخر ۱۹۲۳ء میں "پیامِ مشرق" (۴) ستمبر ۱۹۲۴ء میں "بانگِ درا" (۵) جون ۱۹۲۷ء میں "زبورِ عجم" (۶) ۱۹۳۲ء میں "جاوید نامہ" (۷) جنوری ۱۹۳۵ء میں "بالِ جبریل" (۸) جولائی ۱۹۳۶ء میں "ضربِ کلیم" (۹) اور اسی سال ستمبر میں "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" شائع ہوئے۔ اسی دور میں اقبال کے مشہور خطبات کا مجموعہ "Reconstruction of Religious thoughts in Islam" شائع ہوا۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کی اشاعت کے بعد اقبال کو عالمگیر شہرت حاصل ہو گئی تھی، مگر یورپ میں اقبال کا تعارف صحیح معنی میں اس وقت ہوا جب ۱۹۲۰ء میں لندن سے "اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا، چنانچہ اس کے بعد ہی ۱۹۲۲ء میں حکومت نے "سر" کا خطاب نواز کر اقبال کی علمی و ادبی خدمات اور عظمت کا اعتراف کیا۔

جس طرح اقبال کا یہ دورِ ثانی — ۱۹۰۸ء تا ۱۹۳۴ء، ان کی تخلیقات اور شہرت کے لحاظ سے ان کا دورِ شباب یا دورِ عروج تھا اسی طرح خطوط کے لحاظ سے بھی یہ دور ہر لحاظ سے سب سے اہم ہے۔ اقبال کے خطوط کی بڑی تعداد اسی دور سے تعلق رکھتی ہے اور ملک کے اہم ترین لوگوں سے بیشتر خط و کتابت اسی دور میں ہوئی ہے۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں کہ میرے شمار اور اندازے کے مطابق اقبال کے خطوط کی مجموعی تعداد بارہ سو اٹھارہ ہے اور میرے شمار اور اندازے کے مطابق اسی دور کے خطوط کی تعداد ۷۰۶ ہے، گویا نصف سے زیادہ خطوط اسی دور میں لکھے گئے ہیں، نیز مولانا سید سلیمان ندوی، غلام قادر گرامی، اکبر الٰہ آبادی، عطیہ فیضی، مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد، مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے اردو ادب کے اساطین سے اسی دور میں مراسلت شروع ہوئی اور زیادہ تر اسی دور میں ختم ہو گئی۔ خاں محمد نیاز الدین خاں اقبال کے بے تکلف اور مخلص دوستوں میں سے تھے، ان کے نام ۷۹ خط ہیں اور یہ سب کے سب اسی دور میں شروع ہوئے اور اسی میں ختم ہو گئے، یعنی ان کی مدت ۱۹ جنوری ۱۹۱۶ء سے ۱۵ جون ۱۹۲۸ء تک ہے، اسی طرح سید نذیر نیازی کو اقبالیات میں بڑی اہمیت حاصل ہے، وہ اقبال کے عزیز ترین عقیدت مندوں میں سے ہیں، ان کے نام اقبال کے، میرے اندازے اور شمار کے مطابق ۱۷۹ خطوط ہیں، ان میں سے ۳۸ خطوط کا تعلق اسی دورِ ثانی یا دورِ عروج سے ہے۔

طوالت کے خوف سے، نمونے کے طور پر مکمل خطوط پیش کرنے کے بجائے، مختلف خطوط کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ خاں محمد نیاز الدین خاں، رئیس بستی دانشمنداں (جالندھر) کا ذکر اوپر آ چکا ہے، انھیں ۲ مارچ ۱۹۱۷ء کو اقبال لکھتے ہیں: "میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں، مگر زندگی تنہائی کی بسر کرتا ہوں۔"[1] ان ہی کو اسی سال ۲۷ جون کو لکھتے ہیں: "..... 'رموزِ بیخودی' کو میں اپنے خیال میں ختم کر چکا تھا، مگر پرسوں معلوم ہوا کہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ترتیب مضامین کرتے وقت یہ بات ذہن میں آئی کہ ابھی دو تین ضروری مضامین باقی ہیں، یعنی قرآن اور بیت الحرام کا مفہوم و مقصود، حیاتِ ملیہ اسلامیہ میں کیا ہے۔ ان مضامین کے لکھ چکنے کے بعد اس حصہ مثنوی کو ختم سمجھنا چاہیئے، مگر ایسے ایسے مطالب ذہن میں آتے ہیں کہ خود مسلمانوں کے لیے موجب حیرت و مسرت

---

[1] مکاتیب اقبال بنام خاں محمد نیاز الدین خاں مرحوم صفحہ ۷۔

ہوں گے، کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے ملت اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیت کے اصول حقہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرور ایام و اعصار سے متاثر نہیں ہو سکتی۔"[1]

تقریباً پانچ ماہ کے بعد، ۲۷ نومبر (۱۹۱۷ء) کو ان ہی خاں صاحب کو اطلاع دیتے ہیں کہ: "مثنوی ختم ہوگئی، اسے نقل کر رہا ہوں، چند روز کے بعد پریس میں دے دی جائے گی۔"[2]

ڈاکٹر اقبال کو بجا طور پر یہ احساس تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی بیداری میں ان کی نظموں اور مثنویوں کا بڑا دخل ہے اس لیے ۱۹۱۹ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کتاب "تذکرہ" شائع ہوئی اور اس کے مقدمہ میں کتاب کے مرتب فضل الدین مرزا نے مسلمانوں کی اس بیداری کا تمام کریڈٹ مولانا آزاد کے الہلال کو دے دیا تو قدرتی طور پر اقبال کو سخت شکایت پیدا ہوئی۔ فاضل مقدمہ نگار نے لکھا تھا کہ "...الہلال کے ایک ایک مضمون بلکہ ایک ایک سطر نے جیسے جیسے ہوش ربا اثر لوگوں پر ڈالے ہیں، ان کو اگر بیان کیا جائے تو ایک پورا رسالہ بن جائے۔ مثال کے طور پر میں صرف چند محترم ناموں کا ذکر کروں گا۔ طبقۂ علماء میں سے حضرت مولانا محمود الحسن[3] صاحب دیوبندی کا یہ قول خود مولانا ابوالکلام نے ایک مرتبہ مجھ سے نقل کیا تھا کہ "ہم سب اصلی کام بھولے ہوئے تھے، الہلال نے یاد دلایا۔" ..... [جدید] تعلیم یافتہ جماعت میں فدائے قوم مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی اور ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ ان اسلام پرستوں کو مذہب کی راہ اسی نے دکھلائی اور بتدریج اپنے رنگ میں یک قلم رنگ دیا۔ ورنہ ہم لوگوں کو وہ زمانہ بھی اچھی طرح یاد ہے جب نیا نیا الہلال نکلا تھا اور مسلم یونیورسٹی کے متعلق مسٹر محمد علی نے اس کی مخالفت میں مضامین لکھے تھے، تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہی الہلال والی صدا یونیورسٹی کے متعلق انہوں نے بھی بلند کی۔ مسٹر شوکت علی کا تو اس بارے میں عجب حال ہے، وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ "ابوالکلام نے ہم کو ایمان کا راستہ بتلا دیا۔" ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے، اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ اسرار خودی اور "رموز بے خودی" فی الحقیقت 'الہلال' ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔"[4] 'تذکرہ' کے شائع ہوتے ہی ڈاکٹر اقبال مرحوم نے مولانا سید سلیمان ندوی کو اپنے خط مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء میں یہ شکایت کی کہ: "... دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں۔" شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر و انگریزی و اردو موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں، بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انہوں نے ایسا لکھا، مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا۔ تحریک الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان

---

[1] مکاتیب اقبال بنام خاں محمد نیاز الدین خاں مرحوم صفحہ ۹
[2] ایضاً صفحہ ۱۱
[3] صحیح نام محمود حسن ہے بغیر "ال" کے۔
[4] تذکرہ۔ مکتبۂ احباب۔ لاہور صفحہ ۱۳۔

کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے، ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی، اگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزادی کی جائے۔[1] ...."

"نقیب" بدایوں (فروری ۱۹۱۹ء۔ جنوری ۱۹۲۲ء) کے مالک اور اڈیٹر شیخ وحید احمد مرحوم کی ڈاکٹر اقبال سے خط و کتابت تھی، جب "تذکرہ" کی زیر بحث عبارت وحید احمد صاحب کی نظر سے گذری تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کی جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے انھیں[2] لکھا:

"آپ کا حسن ظن میری نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ حقیقت میں میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی نسبت و نیائے شاعری سے کچھ بھی نہیں اور نہ کبھی میں نے serious اس طرف توجہ کی ہے، بہر حال آپ کی عنایت کا شکر گذار ہوں۔ باقی رہا یہ امر کہ موجودہ بیداری کا سہرا میرے سر ہے یا ہونا چاہیے، اس کے متعلق کیا عرض کروں، مقصود تو بیداری سے تھا، اگر بیداری ہندوستان کی تاریخ میں میرا نام تک بھی نہ آئے تو مجھے قطعاً اس کا ملال نہیں لیکن آپ کے اس ریمارک سے مجھے بہت تعجب ہوا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس بات کا شاید کسی کو احساس نہیں۔ مولوی ابوالکلام صاحب آزاد کے تذکرہ کا دیباچہ لکھنے والے بزرگ نے جن الفاظ میں محمد علی، شوکت علی اور میری طرف اشارہ کیا ہے، ان سے میرے اس خیال کو اور تقویت ہو گئی ہے، لیکن اگر کسی کو بھی اس کا احساس نہ ہو تو مجھے اس کا رنج نہیں، کیونکہ اس معاملے میں خدا کے فضل و کرم سے بالکل بے غرض ہوں۔[3]"

اقبال کو آئے دن لوگ اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجا کرتے تھے، مگر یہ کہہ کر کہ میں زبان داں نہیں ہوں اور نہ زبان کی باریکیوں پر میری نظر ہے، اصلاح دینے سے انکار کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب چک جھمرہ ضلع لائل پور کے ایک صاحب شاکر صدیقی نے اس طرح کی خواہش کی تو اقبال نے انھیں لکھا ہے کہ "اردو زبان میں آپ سے زیادہ نہیں جانتا کہ آپ کے کلام کو اصلاح دوں۔ باقی رہے شاعرانہ خیالات و سوز و گداز، یہ سیکھنے سکھلانے کی شے نہیں، قدرتی بات ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ مجھے اپنے مشاغل ضروری سے فرصت کہاں کہ کوئی ذمہ داری کا کام اپنے سر پر لوں۔ میں نے آپ کے اشعار پڑھے ہیں، میری

---

[1] اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۱۱۱

[2] یہ خط اور اسی کے ساتھ دو اور خط اقبال نامہ (حصہ اول) میں عشرت رحمانی صاحب کے نام چھپے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۴۲۵ تا ۴۲۸) مگر "نقیب" کے اڈیٹر اور مالک جناب شیخ وحید احمد بدایونی صاحب نے ۱۴ مارچ ۱۹۶۳ء کو مجھے لکھا کہ: "اقبال نامہ" میں جو خطوط عشرت رحمانی کے نام سے شائع ہوتے ہیں وہ میرے نام ہیں"۔ موصوف کا یہ مکمل خط ماہنامہ جامعہ بابت ماہ اپریل ۱۹۶۳ء میں شائع ہو چکا ہے تفصیل کے لیے اسے دیکھا جائے۔ اس خط میں موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ "سب سے پہلے میں نے ہی ڈاکٹر اقبال کو "تذکرہ" کے دیباچہ نگار کے اس ریمارک کی اطلاع دی تھی"، لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اقبال نے وحید احمد صاحب کو ۳۰ اگست ۱۹۲۱ء کو لکھا ہے اور اسی مسئلہ پر مولانا سید سلیمان ندوی کو تقریباً دو سال پہلے ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء کو لکھ چکے ہیں، جس کا اقتباس اس سے پہلے نقل کیا گیا ہے۔

[3] اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۴۲۸۔

راستے میں آپ اس جھگڑے میں نہ پڑیں تو اچھا ہے۔"[1] مگر بعد میں جب مجبور ہو کر ان میں یہ ناخوشگوار کام انجام دینا پڑا تو ان کے مشوروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زبان اور محاورے کی باریکیوں اور شاعرانہ محاسن پر ان کی بڑی گہری اور وسیع نظر تھی، چنانچہ شاکر صدیقی صاحب کو اپنے مختلف خطوط میں بہت ہی مفید اور اہم مشورے دیئے ہیں۔ مثلاً ۶ر جولائی ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھا:

"....الفاظِ حشو سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ آپ کی نظم میں بہت سے الفاظ حشو ہیں۔ محاورے کی درستگی کا بھی خیال ضروری ہے۔ "سودا" سر میں ہوتا ہے نہ دل میں۔ علیٰ ہذا القیاس 'عہد' کو 'بالائے طاق' رکھتے ہیں نہ 'بالائے بام' وغیرہ اسی طرح مرکب کی 'عنان' ہوتی ہے نہ 'زمام'۔ بہت سے الفاظ مثلاً "چونکہ" "تعاقب" وغیرہ اشعار کے لیے موزوں نہیں ہیں؛ ان سے احتراز اولیٰ ہے "ہے خوش تجھ کو کمال..." الخ کے دوسرے مصرعے میں "ہر" کی "ہ" تقطیع میں گرتی ہے۔ سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ نظم طویل ہے۔"

۱۴ر اگست ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"یعنی مدہوشوں کو تو آمادۂ پیکار کر" اس مصرع میں "پیکار" کا لفظ ٹھیک نہیں ہے، یوں کہہ سکتے ہیں:

یعنی اپنی محفل بے ہوش (یا مدہوش) کو ہشیار کر

اور بھی خامیاں اس نظم میں ہیں جو یقیناً دو چار بار پڑھنے سے آپ کو معلوم ہو جائیں گی، مگر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس نظم کو شائع نہ کریں۔ میرے لیے پرائیویٹ شرمندگی کافی ہے، اس کے علاوہ یہ آپ کے پرائیویٹ تاثرات ہیں، پبلک کا ان سے آگاہ ہونا کچھ ضروری نہیں ہے۔

گذشتہ خط میں جو آپ نے نظم لکھی تھی اس میں ایک لفظ "زمام" تھا، جس پر میں نے اعتراض کیا تھا۔ غالباً میں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ 'زمام' کا لفظ 'ناقہ' یا 'شتر' کے لیے خاص ہے، مرکب کے لیے 'عنان' چاہیئے۔ اس کے بعد میرے دل میں خود بخود شبہ پیدا ہوا کہ زمام کا لفظ مرکب کے لئے بھی آ سکتا ہے۔ گو ناقے کے لیے یہ لفظ خصوصیت سے مستعمل ہوتا ہے۔ صاحب بہارِ عجم نے کوئی سند ایسے استعمال کی نہیں لکھی، مگر چونکہ انہوں نے فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق و تدقیق میں بڑی محنت و جانفشانی کی ہے اس واسطے ان کے بیان بے سند کو بھی قابلِ اعتبار سمجھنا چاہیے۔ یہ اس واسطے لکھتا ہوں کہ آپ اس غلطی میں مبتلا نہ رہیں جو میری لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔"

ایک اور خط میں:

"....تراکیب و الفاظ کی ساخت و انتخاب محض ذوق پر منحصر ہے اور ایک حد تک زبان فارسی کے علم پر۔ آپ فارسی زبان کی کتابیں خصوصاً اشعار پڑھا کریں، مثلاً دیوان بیدل، نظیری نیشاپوری، صائب، جلال اسیر، عرفی، غزالی مشہدی، طالب آملی وغیرہ۔ ان کی مزاولت سے مذاق صحیح خود بخود پیدا ہوگا اور زبان کے محاورات سے بھی واقفیت پیدا

---

[1] انوار اقبال صفحہ ۱۱۰

ہوگی۔ عروض کی طرف خیال لازم ہے۔ اس نظم کا پہلا مصرع ہی باعتبار عروض غلط ہے۔ زنجیر، فقیر، وزیر، عسکری، روکشی، تفسیر، خوانِ مسلم کا خوشہ چیں وغیرہ پست اور خلافِ محاورہ ہیں۔ خوان کا خوشہ چیں نہیں کہتے، خرمن کا خوشہ چیں ہوتا ہے۔ خوانِ کا نالہ ربا کہتے ہیں "ہے شکے "ی" کو طول دینا برا معلوم ہوتا ہے، موسیقیت کے اعتبار سے علیٰ ہٰذا القیاس۔ "آہ" میں "ہ" کی آواز کو چھوٹا کرنا یوں بھی برا ہے۔ ایک ہی مصرع اُردو میں چار اضافتیں بری معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے فارسی والے بھی محترز ہیں"۔

شاکر صدیقی صاحب نے علامہ اقبال سے دریافت کیا تھا کہ: "اشکِ ندامت" کو "کوہ نور" سے تشبیہ دینا درست ہے یا نہیں ؛ علامہ نے لکھا کہ: "میری رائے میں یہ استعارہ درست نہیں"۔ یہ تمام مشورے تو اقبال نے دیے اور کبھی کبھار بعض اشعار پر اصلاح بھی دی، مگر ایک خط میں صاف صاف فرما دیا کہ: "تلمذ سے مجھے معاف فرمائیے"۔ اپنے آخری خط مورخہ ۲ جون ۱۹۳۱ء میں، یہ بھی لکھ دیا کہ: "اصلاح سے معاف فرمائیے کہ نہ فرصت ہے نہ اہلیت[1]"

جہاں تک اہلیت کا تعلق ہے، اوپر کی مثالوں سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ اقبال میں اصلاح شعر کی اہلیت و صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی اور وہ چاہتے تو اسی طرح انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ یہ فرض انجام دے سکتے، جس طرح اُردو کے مشہور اساتذہ نے انجام دیے ہیں، لیکن جن وجوہ سے وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے، ان میں ایک وجہ تو وہی تھی جس کا شاکر صدیقی صاحب کے خط میں وہ ذکر کر چکے ہیں یعنی فرصت کی کمی اور کام کی زیادتی، دوسری وجہ، میرے خیال میں، یہ تھی کہ اس سلسلے میں قدیم اساتذہ بالخصوص پیشہ ور اساتذہ نے جو طریق کار اختیار کیا تھا اور جو روایات قائم کی تھیں، وہ اقبال کی طبیعت اور مزاج کے خلاف تھیں۔

دورِ آخر ـــــ ۱۹۳۴ء-۱۹۳۸ء

یہ دور مدت کے لحاظ سے بہت مختصر ہے، نیز مسلسل علالت کی وجہ سے، جس کا سلسلہ ۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء کو شروع ہوا تھا، خطوط کے جوابات میں اب پہلی جیسی مستعدی اور چستی باقی نہیں رہی تھی، اس لئے قدرتی طور پر اس دور کے خطوط کی تعداد نسبتاً کم ہو جانی چاہیے۔ اسی دور میں ایک اہم بات اور ہوئی ہے۔ اقبال کی ایک آنکھ بچپن سے خراب تھی، ۱۹۲۷ء میں دوسری میں پانی اتر آیا، اس کی وجہ سے اب ان کے لئے لکھنا پڑھنا ممکن نہیں رہا۔ چنانچہ اس زمانے کے خطوط کی ابتدا میں عموماً اپنی علالت، بینائی کی خرابی اور بروقت خط نہ لکھنے کی معذرت کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً ۸ نومبر ۱۹۲۵ء کے خط میں لکھتے ہیں: "آپ کا خط مل گیا، اس سے پہلے بھی ایک خط موصول ہوا تھا، مگر افسوس کہ علالت کی وجہ سے خطوط کا جواب لکھنے میں بہت سست ہو گیا ہوں[2]"۔

۱۲ ستمبر ۱۹۳۶ء کے خط میں لکھتے ہیں: "افسوس کہ گذشتہ دو سال سے علیل ہوں، مشاغل علمی قریباً ترک ہو چکے ہیں اور خط و کتابت بھی شاذ ہی کرتا ہوں[3]"۔

---

[1] اصلاح شعر کے سلسلے کے تمام اقتباسات "انوار اقبال" کے صفحات ۱۱۱ تا ۱۱۷ سے لیے گئے ہیں۔

[2] ایضاً صفحہ ۱۶

[3] ایضاً صفحہ ۲۲۵

۱۹ فروری ۱۹۳۷ء کو لکھتے ہیں: "میں ایک مدت سے صاحب فراش ہوں، خط و کتابت سے معذور ہوں۔"[1]

۱۷ مارچ ۱۹۳۷ء کے خط میں ارشاد ہوا ہے: "میں خرابیٔ صحت اور کمزوریٔ بصارت کی وجہ سے خود نہیں لکھ سکتا، اس واسطے ایک دوست (سے) خط کا جواب لکھوا رہا ہوں۔"[2]

۲۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کو: "افسوس ضعف بصارت کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے، اس لئے یہ خط میں اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکا، اپنے لڑکے جاوید سے لکھوایا ہے، معاف کیجیے گا۔ دیوان کے بہت سے اشعار ایک دوست نے پڑھ کر سنائے ہیں۔"[3]

اقبال نامہ (حصہ اول) میں ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کے نام، جو اقبال کے مخلص عقیدت مندوں میں سے تھے، اقبال کے ۲۹ خط ہیں، مگر آخری ۲۹ واں خط (مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۳۷ء) محمد شفیع صاحب (ایم اے) کے دستخط سے ہے اور انہوں نے لکھا ہے: "جناب من! ضعف بصارت کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے، اس واسطے وہ اپنے دستخط سے آپ کو خط نہ لکھ سکے۔[4] ..."

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء - ۱۹۶۱ء) کے نام اقبال کے ۸ خط ہیں[5]۔ اور یہ سب کے سب اسی آخری دور سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء اور ۱۵ مارچ ۱۹۳۸ء کے درمیانی عرصے کے ہیں۔ ان آٹھ خطوط میں سے صرف دو خط اقبال کے اپنے قلم سے ہیں باقی چھ دوسروں کے قلم سے ہیں۔ "اقبال اور عبدالحق" کے فاضل مرتب ڈاکٹر ممتاز حسین (۱۹۰۷ء - ۱۹۷۴ء) نے لکھا ہے کہ: "چار سید نذیر نیازی کے رقم کردہ ہیں، باقی دو خطوں کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ انھیں کس نے املا کیا تھا۔ ان تمام خطوں پر دستخط اقبال ہی کے ہیں، اگرچہ ان میں تھوڑا بہت فرق دکھائی دیتا ہے۔ جس زمانے میں یہ خطوط لکھے گئے اقبال بیمار رہتے تھے، اس لئے وہ عموماً اپنے پاس آنے جانے والوں کو خطوط املا کرا دیتے تھے۔ دستخطوں کے فرق کی وجہ بھی اقبال کی بیماری ہی معلوم ہوتی ہے[6]۔" آٹھواں اور آخری خط اقبال کے چند آخری خطوط میں سے ہے اور اقبال کی وفات سے صرف ۳۷ یوم قبل یعنی ۱۵ مارچ ۱۹۳۸ء کو لکھا گیا ہے۔ اس کا پس منظر قابلِ ذکر بھی ہے اور دلچسپ بھی؛ اس کی روشنی میں اقبال کے بالکل آخری خطوط کے بارے میں کسی حد تک رائے بھی قائم کی جا سکتی ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ سید نذیر نیازی صاحب اقبال کے مخصوص عقیدت مندوں اور حاضر باش لوگوں میں سے

---

[1] انوار اقبال صفحہ ۲۲۳۔

[2] ایضاً صفحہ ۲۱۵۔

[3] ایضاً صفحہ ۲۹۴۔

[4] اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۲۹۸ خط نمبر ۱۷۲

[5] اقبال نامہ (حصہ دوم) میں ۷ خط ہیں اور "اقبال اور عبدالحق" میں ۸ ہیں۔

[6] اقبال اور عبدالحق صفحہ ۷۔

تھے، ۱۵ مارچ ۱۹۳۸ء کو وہ حسبِ معمول اقبال کی خدمت میں حاضر تھے۔ آگے کی کہانی خود ان ہی کی زبانی سُنیے، لکھتے ہیں:

"حضرت علامہ ناشتہ کر رہے تھے کہ معلوم نہیں کیا خیال آیا، فرمایا: "سارٹن کا ترجمہ کہاں تک پہنچا؟"

میں نے عرض کیا: "چند ابواب باقی رہ گئے ہیں۔"

ارشاد ہوا: "کیوں؟"

میں نے عرض کیا: "پچھلے چند سالوں سے جو حالات ہیں، آپ کو معلوم ہیں۔ جب سے دہلی سے آیا ہوں، موقع ہی نہیں ملا کہ ترجمے کی تکمیل کرتا۔ کچھ مشکلات بھی ہیں۔"

فرمایا: "حالات کا عذر تو خیر ٹھیک ہے، مشکلات کیا ہیں؟"

عرض کیا: "بعض اسما کی تحقیق، عربی و لاطینی عنوانات میں تطبیق کا مسئلہ، چند ایک یونانی اور لاطینی عبارتوں کا ترجمہ اور سب سے بڑھ کر اردو کے حسبِ مزاج مناسب مصطلحات کی تلاش، علیٰ ہٰذا کئی ایک انگریزی الفاظ کے باعتبار لغت اُردو مترادفات، اس کے علاوہ بھی کئی دشواریاں ہیں، مثلاً ریاضی بالخصوص جبر و مقابلہ کی رقوم کہ ان کی تحریر کے لئے کیا اصول اختیار کیا جائے۔"

فرمایا: "یہ کام تو خاصا محنت طلب ہے اور یہاں وہ سہولتیں بھی میسّر نہیں جو مغربی ممالک میں اس قسم کے کاموں کے لیے بآسانی مل جاتی ہیں، مگر اب جو اس کام میں ہاتھ ڈال چکے ہو تو اس کی تکمیل کر دو۔"

میں نے عرض کیا: "مولوی صاحب اکثر ان ہی دشواریوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کتاب بڑی ضخیم ہے اور اس کی طباعت بھی بڑی دشوار اور محنت طلب۔ خرچ بھی کافی ہوگا۔ اگر ان کا ارادہ اس کی فوری اشاعت کا نہ ہو تو چندے اور مہلت دیں۔ انشا اللہ چار چھ مہینے میں تکمیل ہو جائے گی۔"

ارشاد ہوا: "بہتر ہے، میری طرف سے مولوی صاحب کو خط لکھ دو۔"

میں نے خط لکھا، حضرت علامہ نے خط سنا اور دستخط فرمائے۔ میں کاغذ، قلم دان ایک طرف رکھ کر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔"[1]

عمر کے اس آخری دور میں اقبال، ۱۸۷۳ء کی تاریخ پیدائش کے مطابق، ۶۱ سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے اور قویٰ میں اضمحلال اور انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۸ نومبر ۱۹۳۵ء کے خط میں خود لکھتے ہیں: "میں بفضل خدا آجکل اچھا ہوں، اگرچہ پیری کے آثار روز بروز نمایاں ہو رہے ہیں، انحطاط بڑھتا جا رہا ہے اور میں پبلک مشاغل سے علٰحدگی اختیار کر رہا ہوں"[2] مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس دور کے بیشتر خطوطِ اقبال کے مطالعہ کے لئے ازبس ضروری ہیں اور ان کے سوانح نگار کے لئے ان کی بڑی اہمیت ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر اس دور کے دو مکمل خطوط پیش کئے جاتے ہیں، ایک بالکل ابتدا کا دوسرا بالکل آخری۔ یہ دور، جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں، علالت سے یعنی ۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء سے شروع ہوتا ہے اور یہ خط جو نقل کیا جاتا ہے ۱۶ جنوری ۱۹۳۴ء کا ہے اور محمد دین فوق کے نام ہے۔

---

[1] اقبال اور عبدالحق صفحہ ۶۹ - [2] اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۲۹۱ خط نمبر ۱۶۷ -

اقبال کا دعویٰ ہے اور ان کے تمام سوانح نگاروں نے بھی بغیر کسی استثنا کے یہی لکھا ہے کہ ان کا خاندان کشمیری برہمن زادہ ہے اور گوت سپرو ہے۔ عبدالمجید سالک (۱۸۹۴-۱۹۵۹) نے لکھا ہے کہ:

"علامہ اقبال ایک کشمیری خاندان کے شمع و چراغ تھے جو آج سے کوئی ڈھائی سو سال پیش تر سترھویں صدی عیسوی میں مشرف باسلام ہوا۔ یہ خاندان برہمن تھا اس کی گوت سپرو تھی، یہ لوگ سری نگر میں رہتے تھے اور اپنی نیکی اور شرافت کی وجہ سے ہم چشموں میں معزز اور ممتاز تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی سید بزرگ کہیں باہر سے سری نگر تشریف لائے علامہ کے جدِ اعلیٰ ان کی پاک نفسی کے باعث ان کے گرویدہ ہو گئے۔ صحبت و محبت نے اپنا کام کیا۔ برہمن نے سید کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، صالح نام پایا۔ سید صاحب نے اپنے دوست کی صلاحیت کو دیکھ کر اپنی دختر نیک (کذا) سے اس کی شادی کر دی۔ اسلام لانے کے بعد صلاح و تقویٰ کی وہ منزلیں طے کیں کہ بابا صالح کر کے مشہور ہو گئے، رجوع عام ہوا "مزار کشمیر میں ہے لیکن مقام معلوم نہ ہو سکا"۔[1]

ابھی حال میں ایک صاحب، تارا چرن رستوگی نے اس پر شبہ ظاہر کیا ہے کہ اقبال کا خاندان کشمیری برہمن زادہ تھا اور سپرو گوت سے اس کا تعلق تھا۔ وہ لکھتے ہیں: "..... اقبال برہمن نژاد نہ تھے، مزید براں خاندان کی ہندو شاخ کا اب کہیں کوئی وجود نہیں۔ خوش فہمی یا خود فریبی میں مبتلا ہو کر ہم تحقیق کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔ یہ کہنا کہ اقبال نو مسلم برہمن تھے، گوت سپرو تھی، نہ صحیح، نہ ہی استدلال پہ پورا اترتا ہے۔ لفظ گوت ہی غلط ہے۔ میں نے آج تک کسی پڑھے لکھے ہندو بالخصوص برہمن کو گوت کہتے نہیں صحیح لفظ گوتر (गोत्र) ہے جس کے دو معنی ہیں: گائے کے رہنے کا مکانی حصہ اور گہہ علم و دانش، لہٰذا گوتر سے ایک طرف خاندان کا مفہوم اور دوسری جانب ہم کدہ کا مفہوم نکلتا ہے۔ آریہ فکر و عمل کے مطابق دو پیدائشیں۔ ایک جسمانی، دوسری علمی ہوتی ہیں اسی لیے انسان کو "دویج" بتایا گیا ہے۔ ..... بہر کیف ہر گوتر کا سلسلہ کسی نہ کسی ویدک رشی تک پہنچا ہے۔ سپرو نام کا کوئی ویدک رشی ہونا تو درکنار، یہ لغت ہی آریہ ماخذ سے مستنبط نہیں ہے۔ سپرو پریوار ہو سکتا ہے اور ہے بھی: سپرو، نہرو، کچلو، شرما، ورما وغیرہ سب پریواروں کی نشاندہی کرتے ہیں، گوتروں کی نہیں۔ شاستروں میں پریوار کا اصطلاحی مفہوم لیا گیا ہے جو ایک طرح سے شجرۂ نسب و حسب پر محیط کہا جا سکتا ہے، لہٰذا اگر کہا جا سکتا ہے تو اقبال کو سپرو پریوار سے متعلق کہا جا سکتا ہے، گوت یعنی گوتر سپرو نہیں ہو سکتی ...."[2]

ممکن ہے یہ مسئلہ اقبال کے زمانے میں بھی رہا ہو اور اقبال کے دوست اور عقیدت مند محمد دین فوق نے اس کی کوئی توجیہہ یا وضاحت کی ہو، اس کے جواب میں اقبال نے انھیں[3] لکھا:

"ڈیر فوق صاحب!

مجھے معلوم نہیں لفظ سپرو کے معانی کشمیری زبان میں کیا ہیں، ممکن ہے اس کے معنی وہی ہوں

---

[1] عبدالمجید سالک: ذکر اقبال صفحہ ۷

[2] ہفتہ وار "ہماری زبان" (دہلی) مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۷۶ء صفحہ ۴ مضمون: "اقبال سے متعلق چار فیصلہ طلب امور۔"

جو آپ نے تحریر فرماتے ہیں یعنی وہ لڑکا جو چھوٹی عمر میں بڑوں کی سی ذہانت دکھائے البتہ کشمیری برہمنوں کی جو گوت سپرو ہے اس کے اصل کے متعلق جو کچھ میں نے اپنے والد مرحوم سے سنا تھا وہ عرض کرتا ہوں۔

جب مسلمانوں کا کشمیر میں دور دورہ ہوا تو برہمن کشمیر مسلمانوں کے علوم و زبان کی طرف بوجہ قدامت پرستی یا اور وجوہ کے توجہ نہ کرتے تھے۔ اس قوم میں سے پہلے جس گروہ نے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اس میں امتیاز حاصل کر کے حکومت اسلامی کا اعتماد حاصل کیا وہ سپرو کہلایا۔ اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کرے (یا جس نے سب سے پہلے پڑھنا شروع کیا۔) "س" تقدم کے لئے کئی زبانوں میں آتا ہے اور "پرو" کا روٹ وہی ہے جو ہمارے مصدر "پڑھنا" کا ہے۔

والد مرحوم کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے ان بھائی بندوں کو از راہ تعریض و تحقیر دیا تھا جنھوں نے قدیم رسوم و تعلقات قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان و علوم کو سیکھنا شروع کیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ نام ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا ہے۔

دیوان ٹیک چند (ایم اے) جو پنجاب میں کمشنر تھے۔ ان کو تحقیق لسان کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ انبالہ میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ لفظ "سپرو" کا تعلق ایران کے قدیم بادشاہ شاہ پور سے ہے اور سپرو حقیقت میں ایرانی ہیں جو اسلام سے بہت پہلے ایران کو چھوڑ کر کشمیر میں آباد ہوتے اور اپنی ذہانت و فطانت کی وجہ سے برہمنوں میں داخل ہو گئے۔ واللہ اعلم۔[1]

دوسرا خط، جو میرے خیال میں اقبال کا آخری خط ہے، ۱۹ر اپریل ۱۹۳۸ء کو لکھا گیا ہے، یعنی وفات سے صرف دو روز پہلے، بلکہ کہنا چاہیے کہ صرف ایک روز پہلے، کیونکہ ۲۰ر کو حالت خراب ہوئی اور ۲۰ر اور ۲۱ر کی درمیانی شب کے اختتام، مگر طلوع آفتاب سے قبل پانچ ساڑھے پانچ کے لگ بھگ انتقال فرمایا۔ آخری ایام میں ضیق النفس کی شکایت ہو گئی تھی، اس وقت حکیم محمد حسن قرشی کا علاج ہو رہا تھا۔ ان کی تشخیص تھی کہ: "دمہ قلبی ہے اور اس کی وجہ سے ضعف قلب ہے۔"[2] ذیل کے خط میں اس طرف اشارہ ہے۔ پورا خط ملاحظہ ہو:

جاوید منزل ۔ لاہور

۱۹ر اپریل ۱۹۳۸ء

ڈیر ممنون[3]! آپ کا خط کئی روز ہوئے ملا تھا، افسوس کہ شدید علالت کی وجہ سے میں جواب نہ لکھوا سکا۔

---

[1] انوار اقبال صفحہ ۷۷۔ [2] عبد المجید سالک: ذکر اقبال صفحہ ۲۱۹۔

[3] پورا نام ممنون حسن خاں ہے، ریاست بھوپال سے تعلق تھا، ان کے نام اقبال کے دس خط ہیں جو ۱۶ر جولائی ۱۹۳۷ء سے ۱۹ر اپریل ۱۹۳۸ء تک کی مدت پر مشتمل ہیں۔

دمے کے متواتر دوروں نے مجھے زندگی سے تقریباً مایوس کر دیا تھا مگر اب خدا کے فضل سے کچھ افاقہ ہے گو کلی طور پر ابھی صحت نہیں ہوئی آنکھوں کا آپریشن مارچ میں ہونے والا تھا، مگر دمے کی وجہ سے اسے ملتوی کرنا پڑا۔ اب بشرط زندگی انشاء اللہ ستمبر میں ہو گا۔
حیات صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہئے۔ اب آپ کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ کیا آپ اعلیٰ حضرت کی پیشی میں ہیں۔ زیادہ کیا لکھوں۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے [1]

مخلص

محمد اقبال

عمومی تبصرہ

ہر قسم کی تحریر پر، چاہے وہ نثر ہو یا نظم، کتاب ہو یا مضمون، خطبہ ہو یا خط، زمانے اور حالات اور لکھنے والے کی ذہنی کیفیت اور وقتی موڈ کا کسی نہ کسی حد تک اثر ضرور پڑتا ہے، کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ خط کے علاوہ دوسری اصناف وقت زیادہ لیتی ہیں، نیز ترمیم و اصلاح اور بار بار غور و خوض کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے ان میں وقتی اثرات کا اظہار شاذ و نادر یا بہت کم ہوتا ہے، مگر خطوط چونکہ عجلت میں لکھے جاتے ہیں اور عام طور پر فوراً ہی بھیج دئے جاتے ہیں، اس لئے ان میں لکھنے والے کے وقتی جذبات و کیفیات کے اثرات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ اقبال کے خطوط کی مدت ۳۹ سال پر پھیلی ہوئی ہے، یہ مدت مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۹ء) اور سر سید (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) کے بعد، جن کی خط و کتابت کی مدت، حسب ترتیب تقریباً ۵۷ سال اور ۴۹ سال ہے، اُردو کے دوسرے مکتوب نگاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے[2]۔ ۳۹ سال کے اس طویل عرصے میں کافی نشیب و فراز آئے۔ اقبال سے عوام کی عقیدت میں کبھی کمی آئی کبھی اضافہ ہوا، خواص اور احباب کی دوستیوں اور تعلقات میں تبدیلیاں آئیں، ان سب کے اثرات اور عوامل اقبال کے خطوط میں بدرجہ اتم نظر آتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب سیاست اقبال کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد کو اقبال نے لکھا تھا کہ: "پولیٹیکل جلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوا کرتا"[3] مگر گیارہ سال کے بعد مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ

---

[1] اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۳۳۵ خط نمبر ۲۰۱۔

[2] غالباً اس موقع پر اردو خطوط کے بابا آدم غالب (۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ - ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء) کی طرف قارئین کا ذہن ضرور منتقل ہو گا۔ چونکہ غالب کی عمر کا ابتدائی اور بڑا حصہ فارسی میں خط و کتابت پہ گذرا تھا، اس لیے ان کی اردو خط و کتابت کی مدت صرف ۲۱ سال ہے، یعنی اب تک کی تحقیقات کے مطابق ۹ر مارچ ۱۸۴۸ء سے ۱۴ر فروری ۱۸۶۹ء تک ہے۔ البتہ اس لحاظ سے اقبال اور غالب میں ایک مشابہت پائی جاتی ہے، وہ یہ کہ دونوں مکتوب نگاروں نے وفات سے ایک روز پہلے تک خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا، جس کی مثالیں اُردو مکتوب نگاری میں شاذ ہیں۔

[3] اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۱۹۹ خط نمبر ۷۷۔

الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء کی صدارت کی اور ایک ایسا خطبہ پڑھا جسے قرارداد پاکستان (منظور شدہ مارچ ۱۹۴۰ء) کا پیش رو کہا جاتا ہے اور ۱۹۳۷ء کے اواخر تک سیاست میں اس قدر ملوث ہو گئے وہی اقبال جو سیاست سے دور بھاگتے تھے، ۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو جناح کو لکھتے ہیں کہ: "ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لیے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو، جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔"[1]

"اسرار خودی" میں جب اقبال نے حافظ پر تنقید کی تو اس کا رد عمل اتنا سخت ہوا، عوامی سطح پر بھی اور خواص کی سطح پر بھی کہ وہ نظم مجموعے سے خارج کرنی پڑی اس واقعے سے پہلے خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۸ء - ۱۹۵۵ء) سے اقبال کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ ذاتی تعلقات تو تھے ہی، مذہب اور تصوف کے بارے میں ان کی رائے اور واقفیت پر اتنا بھروسہ تھا کہ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں لندن سے خواجہ صاحب کو لکھا تھا کہ: "قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں، ان کا پتہ دیجیے۔"[2]

اور حافظ پر تنقید و اعتراض کے بعد ان سے تعلقات اتنے خراب ہو گئے کہ ان کے بارے میں ایک مشترک دوست اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء - ۱۹۲۱ء) کو ۲۷ جنوری ۱۹۱۶ء کے خط میں لکھا کہ: "..... صوفی ضرور ہیں مگر تصوف کی تاریخ و ادبیات و علوم القرآن سے مطلق واقفیت نہیں رکھتے۔"[3] اچھے خط کی تعریف ہی یہی ہے کہ لکھنے والے کے صحیح جذبات و احساسات کا مکمل آئینہ ہو اور یہ خصوصیت اقبال کے بیشتر خطوط میں موجود ہے۔

اقبال کے خطوط میں جو خصوصیت پورے تسلسل کے ساتھ نظر آتی ہے وہ ہے ان کی طبیعت کی سادگی و انکساری، علم کی تلاش و جستجو، دوسروں کی تنقیدوں اور اعتراضوں پر صبر و تحمل بلکہ ان کا خیر مقدم کرتے تھے۔ اقبال جتنے بڑے شاعر تھے اس لحاظ سے ان میں انانیت بھی بہت بڑی ہونی چاہیے تھی، مگر ان کے خطوط میں شاذ و نادر ہی کہیں اس کا شائبہ نظر آتا ہے۔ اس کی ایک مثال تو وہ ہے جس کا اظہار رموز بیخودی کے سلسلے میں ہوا ہے کہ ایسے ایسے مطالب ذہن میں آئے ہیں جنھیں آج تک اسلامی طبقہ کے سامنے پیش نہیں کیا گیا، اسی طرح کی کچھ اور مثالیں بھی مل جائیں گی، مگر ان کے پڑھنے سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فخر و مباہات سے زیادہ مقصود تحدیث نعمت ہے۔ خطوط کی زبان اور اسلوب بالعموم آسان اور سادہ ہے، بس کہیں کہیں مشکل اور غریب الفاظ آ گئے ہیں، مثلاً تعزز: "آپ کے خاندانی تعزز کا حال معلوم کر کے مجھے مسرت ہوئی۔"[4] "محظوظ": "القصہ فردوس گوش اور کسی قدر جنت نگاہ کے خطوظ اٹھا کر ہم روانہ ہوئے۔"[5] "ارقام": "مسلمانان ہندوستان کی بیداری کے پانچ اسباب جو آپ نے اس ہفتے کے 'توحید' میں ارقام فرمائے ہیں۔"[6] "مرئیات": شاعروں کی بدنصیبی ہے کہ ان کا کام برا بھلا کچھ بھی ہو غیر محسوس

---

[1] اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۲۷ خط نمبر ۱۰ [2] ایضاً صفحہ ۳۵۳ خط نمبر ۱۵۸ -

[3] ایضاً صفحہ ۵۰ خط نمبر ۲۰ -

[4] خطوط اقبال صفحہ ۷۰ خط مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۵ء

[5] " " صفحہ ۱۰۰ خط مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء

[6] اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۳۶۵ خط نمبر ۱۶۸ (بلا تاریخ)

ہوتا ہے اور ظاہر ہیں آنکھیں مرئیات کی طرف قدرتاً زیادہ متوجہ ہوتی ہیں[1]۔ دو لفظ اور ملاحظہ ہوں جو اُن تمام الفاظ سے زیادہ مشکل اور غیر معروف یا غریب ہیں جواب تک پیش کئے گئے ہیں اور چونکہ بہت ہی مشکل اور غیر معروف ہیں اس لیے غلط چھپے ہیں شاید فاضل مرتبین سے بھی پڑھے نہیں گئے ایک ہے "مرور ایام و اعصاد" پچھلے صفحات میں ایک اقتباس میں یہ ٹکڑا آچکا ہے وہ اس طرح ہے: "..... قومیت کے اصول حقہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرور ایام و اعصاد سے متاثر نہیں ہو سکتی[2]" میرے خیال میں "اعصاد" کوئی لفظ نہیں اور غلط چھپا ہے۔ غالباً عصر کی جمع "اعصار" ہوگا، زمانے کے معنی میں، گویا یہاں "ایام" کے مترادف کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ "مرور ایام" تو مروج ہے مگر اس کے ساتھ "اعصار" ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ دوسرا لفظ ہے "ایقاطی"۔ عبارت یوں ہے: "... جذباتِ انسانی کی تخلیق یا بیداری کے کئی ذرائع ہیں، جن میں سے ایک شعر بھی ہے اور شعر کا تخلیقی یا ایقاطی اثر محض اس کے مطالب و معانی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس میں شعر کی زبان اور زبان کے الفاظ کی صوت اور طرز ادا کو بھی بہت دخل ہے[3]۔" میرے خیال میں یہاں لفظ "ایقاطی" نہیں "ایقاظی" ہے "ظ" سے نہ کہ "ط" سے جس کے معنی بیداری کے ہیں۔ میرے یہ قیاسات صحیح ہیں تو یہ دونوں لفظ "اعصار" اور "ایقاظی" بالکل ہی غیر معروف اور انتہائی غریب ہیں، فلسفے کی کسی کتاب یا مضمون میں تو غالباً چل سکتے ہیں، مگر خطوط کی نازک اور ہلکی پھلکی زبان ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

"مکاتیب اقبال بنام گرامی" کے فاضل مرتب محمد عبداللہ قریشی نے اقبال کے خطوط کے اسلوبِ نگارش پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "جہاں تک گرامی کے نام اقبال کے زیر نظر خطوط کا تعلق ہے، ان میں اکثریت ایسے خطوط کی ہے جو اردو نثر کا نہایت شگفتہ نمونہ ہیں، یہ نہ بے رنگ ہیں نہ خشک۔ اقبال کی دیگر علمی تحریروں کی طرح ان کی عبارت میں عیب و دبدبہ بھی ہے اور وزن بھی، فکر کی جولانی بھی ہے اور خیال کی برجستگی بھی۔ بعض بعض جگہ تو نثر شاعری سے ہم آغوش نظر آتی ہے[4]۔" یہ خصوصیت یا خوبی صرف ان ہی خطوط تک محدود نہیں ہے جو حضرت گرامی کو لکھے گئے ہیں، دوسرے خطوط میں بھی موجود ہے مثلاً خواجہ حسن نظامی مرحوم کو ۲۵ را پریل ۱۹۰۶ء کو ایک خط لکھا تھا جس کا آغاز یوں ہوتا ہے: "سر مست سیاح کو سلام! متھرا ہردوار، جگن ناتھ امرناتھ جی سب کی سیر مبارک ہو۔ مگر بنارس جا کر بیلام ہو گئے، کیوں ٹھیک ہے نا۔" اس کے بعد لکھتے ہیں: "میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا بت خانہ ہے کہ ہر بت اس صنم کدے کا رشک صنعت آذری ہے۔ اس پرانے مکان کی کبھی سیر کی ہے۔ خدا کی قسم بنارس کا یاد نہ فراموش کر جاؤ[5]۔"

---

[1] اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۳۶۶ خط نمبر ۲۶۸۔

[2] مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خاں مرحوم صفحہ ۹۔

[3] اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۱۷۳ خط نمبر ۱۷۱۔

[4] مکاتیب اقبال بنام گرامی صفحہ ۸۵۔ [5] اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۳۵۶ خط نمبر ۱۶۰ مورخہ ۲۵ را پریل ۱۹۰۶ء

اقبال زبان کو صرف ترسیل اور ابلاغ کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے نہ کہ قابلِ پرستش کوئی بت۔ چنانچہ ۱۹ راگست ۱۹۲۳ء کو سردار عبدالرب خاں نشتر کو لکھا تھا کہ: "زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اظہارِ مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے، ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاقِ سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے[1]۔" ایک زمانے میں تو اقبال ادب میں ہر طرح کی آزادی کے قائل تھے، یہاں تک کہ بعض نظموں میں اصولِ بحر کا بھی خیال نہیں رکھا، چنانچہ "بادۂ نارسا" اور "مینار" کی غلطی کے اعتراف میں ۳ راپریل ۱۹۱۹ء کے خط میں مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) کو لکھا تھا کہ: "لفظ مینار غلط ہے، صحیح لفظ منارہ[2] (بغیر ی کے ہے) یہ الفاظ اس زمانے کی نظموں میں واقع ہوئے ہیں جس زمانے میں سمجھتا تھا کہ لٹریچر میں ہر طرح کی آزادی ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ بعض نظموں میں میں نے اصولِ بحر کا بھی خیال نہیں کیا او "ادبہ"[3] بعد میں اگرچہ وہ ہر طرح کی آزادی یا بے راہ روی کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، مگر ذیل کے شعر پہ وہ آخر دم تک عمل پیرا رہے:

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض

ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

چنانچہ وہ لکھنؤ اور دہلی کے محاوروں اور تذکیر و تانیث کے چکر میں نہیں پڑتے تھے، وہ جسے صحیح سمجھتے تھے، بلاتکلف لکھتے تھے۔ مثلاً بسترِ بیماری کی ترکیب کو عام طور پر غلط سمجھا جاتا ہے یا "استفادہ" کے ساتھ "حاصل" کے استعمال کو صحیح نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ استفادہ میں حاصل کرنے کا مفہوم خود موجود ہے۔ مگر اقبال نے ان دونوں لفظوں کو اپنے خطوط میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً "کئی دنوں کی بیماری کے بعد کل بسترِ بیماری سے اٹھا ہوں[4]" اور "میں یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ آپ مثنوی مولانائے روم سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں[5]" یا "آپ کے افسانوں اور مثنوی سے میں نے استفادہ حاصل کر لیا ہے[6]" "بلغم" اور "ایڈیشن" مذکر بولے اور لکھے جاتے ہیں، مگر اقبال نے مونث لکھا ہے۔ انگریزی میں لفظ ANY کے ساتھ اسم جمع استعمال ہوتا ہے، مگر اردو میں "کوئی" کے ساتھ اسم جمع ناجائز ہے، مگر بہت سے انگریزی خواں کی طرح اقبال بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً میں نے اپنی کسی تحریر میں کوئی سوالات نہیں کئے[7]" یا "کوئی کاغذات ان کو موصول نہیں ہوئے[8]"

---

[1] اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۵۶ خط نمبر ۲۱

[2] غالباً یہ بحث فارسی یا عربی لفظ کی ہے، اردو میں مینارہ (ی کے ساتھ) ہی صحیح ہے۔

[3] اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۱۰۱ خط نمبر ۶۴ [4] اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۳۵۹ خط نمبر ۱۶۲۔

[5] اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۲۸۴ خط نمبر ۱۶۱ مورخہ ۲۰ رفروری ۱۹۳۵ء

[6] اقبال نامہ صفحہ ۲۸۷ خط نمبر ۱۶۳ مورخہ: ۱۱ رمئی ۱۹۳۵ء۔

[7] انوارِ اقبال صفحہ ۱۷۹ مورخہ: ۲۴ رفروری ۱۹۱۶ء۔ [8] خطوطِ اقبال صفحہ ۲۴۶ خط نمبر ۸۷ مورخہ ۱۳ ردسمبر ۱۹۲۵ء۔

اقبال نے انگریزی کے الفاظ چاہے اردو رسم خط میں ہوں یا انگریزی رسم خط میں، بلا تکلف اور بڑی کثرت سے استعمال کیے ہیں اردو رسم خط کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں: لٹریچر۔ پرائیویٹ۔ شخصیت، پرائیوٹ تعلقات۔ لٹریری نصب العین۔ ریمارک۔ مجالیٔ انٹروڈیوس۔ مثلاً "میری رائے میں شاید اس تصویر میں یورپ کی تصویر انٹروڈیوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"[۱] انگریزی رسم خط کی مثالیں ملاحظہ ہوں: (۱) Pessimistic Literature کبھی زندہ نہیں رہ سکا، قوم کی زندگی کے لیے اس کا اور اس کے لٹریچر کے لیے optimistic ہونا ضروری ہے"[۲]

(۲) "اس (اسلام) کا دشمن یورپ کا Territorial Nationalism ہے جس نے ... ہندوستان کو Pan Indian Democracy کا بے معنی خواب دکھایا۔"[۳]

(۳) یہ ممکن ہے کہ آپ کا ideal مجھ سے مختلف ہو ...... اسلوب بیان کو شاعر کا حقیقی ideal تصور کرنا کسی طرح درست نہیں۔"[۴]

(۴) "آخر اس کے ساتھ Negotiation بند کرنی پڑی۔"[۵] وغیرہ۔

اقبال عام طور پر نہ صرف یہ کہ بہت ہی عجلت میں خطوط لکھتے تھے بلکہ انھیں غالباً دوبارہ پڑھتے بھی نہیں تھے، اس کی وجہ سے ان میں متروکات بہت زیادہ ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ "کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگذشت قلم بند کروں گا۔ جس سے مجھے یقین [ہے کہ] بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا۔"[۶]

۲۔ "جناب کا والا نامہ [ملا] جس کو پڑھ کر ......"[۷]

۳۔ "قرآن کریم پر غور و خوض کرنے [کا] بہتر موقع آپ کو ملتا ہوگا۔"[۸]

۴۔ "...... جبکہ ان لوگوں [کی] درخواستیں ......"[۹]

۵۔ "...... ان ایام [میں] مولانا حالی مرحوم کی سنٹنری پانی پت میں ہوئی۔"[۱۰]

۶۔ "نزلہ سے سخت تکلیف رہی جواب خاصی [کم] ہے۔"[۱۱]

۷۔ "اب میں ہمیشہ ہی اس قسم کا انتخاب کرنے [کو] ہوں"[۱۲]

---

[۱] اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۳۳۲ خط نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۲۷ء [۲-۳] ایضاً صفحہ ۵۶، ۵۷ خط نمبر ۲۲ مورخہ ۱۱ جون ۱۹۱۸ء۔

[۴] ایضاً صفحہ ۳۱۴، ۳۱۵ خط نمبر ۱۲۶ مورخہ: ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء [۵] ایضاً (حصہ اول) صفحہ ۲۳۱ خط نمبر ۱۸۶ مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۳۶ء۔ کتاب میں اس لفظ کی بجے غلط چھپی ہے۔ [۶] انوار اقبال صفحہ ۱۷۶ خط مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء۔

[۷] انوار اقبال صفحہ ۱۸۰ خط مورخہ ۹ مارچ ۱۹۱۶ء۔ [۸] انوار اقبال صفحہ ۱۸۸ خط مورخہ ۶ جنوری ۱۹۲۲ء۔

[۹] انوار اقبال صفحہ ۱۸۹ خط: ۲۱ اگست ۱۹۳۶ء [۱۰] انوار اقبال صفحہ ۱۹۱ خط مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۳۵ء

[۱۱] خطوط اقبال صفحہ ۲۴۴ خط نمبر ۸۸ مورخہ: ۸ فروری ۱۹۳۶ء

[۱۲] خطوط اقبال صفحہ ۷۳ خط نمبر ۴ مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۰۸ء

متروکات کے علاوہ عجلت کی وجہ سے بعض اوقات فاش غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھی جملوں میں الجھاؤ اور تعقید لفظی و معنوی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کی ایک آیت ہے: "ذالک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء" اقبال نے ایک خط میں "یوتیہ" کا املا "ط" سے لکھا ہے یعنی "یوطیہ"[1] اگرچہ دونوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں، مگر اقبال نے جو لکھا ہے وہ قرآن کا املا نہیں ہے۔ ایک فقرہ ہے: "اس کتاب میں آپ کے تمام سوالوں کا جواب (سوائے مسئلہ سود) آجاتے ہیں[2]" خط کشیدہ الفاظ قابل توجہ ہیں۔ اس جملہ میں "جواب" فاعل ہے جو واحد کے طور پر استعمال ہوا ہے اور فعل جمع ہے "آجاتے ہیں"۔ ہونا چاہیے تھا: "آجاتا ہے"۔ ایک اور فقرہ ہے: "وہ کونسی تاریخ ارسال کئے گئے تھے[3]" "کونسی تاریخ" اچھا نہیں معلوم ہوتا، زیادہ بہتر ہے کہ: "کس تاریخ کو ارسال کئے گئے تھے"۔ "ایک اور فقرہ ملاحظہ فرمائیے: "بعض لوگ ان پہ بدظن ہیں[4]"۔ یہاں "پہ" کے بجائے "سے" کا محل ہے۔ ایک اور خط کا ایک جملہ ہے: "ترک دنیا کے پردے میں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں[5]"۔ غالباً کوئی لفظ لکھنے سے رہ گیا ہے، جس کی وجہ سے خط کشیدہ عبارت غیر مربوط ہو گئی اور معنی خبط ہو گئے ہیں۔ "کئی" کے بعد اسم واحد استعمال ہوتا ہے، مگر اہل پنجاب عام طور پر اسم جمع لکھتے اور بولتے ہیں۔ اقبال کے خطوط میں بھی اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، مثلاً: "میں کئی سالوں سے اس کے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں[6]" ہونا چاہیے: "کئی سال سے"۔ یا "کئی روایات میں آیا ہے[7]"۔ زیادہ بہتر ہوتا اگر "کئی" کے بجائے "متعدد" استعمال کیا جاتا۔

انگریزی لفظ میٹر (Matter) کے لئے آج کل عام طور پر "مواد" بولا اور لکھا جاتا ہے۔ پہلے لوگ "مصالحہ" یا "مسالہ" لکھا کرتے تھے۔ اقبال کے خطوط میں یہ تینوں لفظ: مواد، مصالحہ اور مسالہ، استعمال ہوئے ہیں۔ مگر "مسالہ" کا استعمال زیادہ ہے۔ حیدر آباد میں "پتہ" کی جگہ عام طور پر "نشان" لکھتے اور بولتے ہیں۔ اقبال نے بھی "نشان" اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ "مہربانی کر کے ان کا نشان معلوم کر کے انھیں مطلع فرمائیے[8]"۔

اوپر جن خامیوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا مقصد اعتراض کرنا نہیں ہے بلکہ اقبال کے خطوط کے مطالعہ کے دوران میں جو باتیں

---

[1] خطوط اقبال صفحہ ۷۶۔ اقبال نامہ (حصہ دوم) میں یہ لفظ "یعطی" چھپا ہے صفحہ ۳۰۵ خط نمبر ۱۲۱
[2] انوار اقبال، صفحہ ۲۴۵ خط مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۳۲ء
[3] خطوط اقبال صفحہ ۲۴۶ خط نمبر ۸۷ مورخہ: ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۵ء
[4] اقبال نامہ (حصہ دوم) صفحہ ۴۵ خط نمبر ۱۰۸ مورخہ: ۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۵ء
[5] ایضاً (حصہ اول) صفحہ ۴۵ خط نمبر ۱۰۸ مورخہ: ۱۹ر جولائی ۱۹۱۶ء
[6] ایضاً صفحہ ۵۸ خط نمبر ۲۳ مورخہ: ۱۲ مارچ (سنہ ندارد)
[7] " " ۸۸ خط نمبر ۴۱ مورخہ: ۲۰ نومبر ۱۹۱۸ء
[8] " (حصہ دوم) صفحہ ۳۳۶ خط نمبر ۱۴۵ مورخہ: ۲۱ر مئی ۱۹۲۰ء

راقم الحروف کے مشاہدے میں آئیں، ان کا سادہ لفظوں میں صرف ذکر کر دیا گیا ہے اور بس۔ میرے خیال میں یہ خامیاں زیادہ اہم نہیں ہیں اس لیے کہ اقبال نے خطوط کو لکھتے وقت انتہائی بے توجہی اور لا پروائی سے کام لیا ہے، جس کا انہوں نے خود ذکر کیا ہے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں: "مجھے یہ سنکر تعجب ہوا کہ آپ میرے خطوط محفوظ رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی بھی ایسا ہی کرتے ہیں، کچھ عرصہ ہوا، جب انہوں نے میرے خطوط ایک کتاب[1] میں شائع کر دیئے تو مجھے بہت پریشانی ہوئی، کیونکہ خطوط ہمیشہ عجلت میں لکھے جاتے ہیں اور ان کی اشاعت مقصود نہیں ہوتی۔ عدیم الفرصتی تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جس کو پرائیویٹ خطوط میں معاف کر سکتے ہیں۔ مگر اشاعت ان کی نظرثانی کے بغیر نہ ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ میں پرائیویٹ خطوط کے طرز بیان میں خصوصیت کے ساتھ لا پرواہ ہوں[2]۔"

اقبال کے بارے میں عزیز احمد نے لکھا ہے کہ: "کوئی انھیں رجعت پسند کہتا ہے۔ کوئی ترقی پسند، کوئی اشتراکی، کوئی فسطائی، کوئی صوفی، کوئی تصوف دشمن، غرض جتنے منہ اتنی باتیں[3]۔" یہ تضاد یا اختلاف اقبال کی شاعری نے پیدا کیا ہے، اگر ان کے خطوط کا غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کے خیالات و افکار اور نظریات و تصورات میں تضاد نہیں تسلسل اور اتحاد ملے گا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ شاعری میں "فاش تر گفتن خطاست" ہے اور نثر میں بالخصوص خطوط میں "فاش تر گفتن" عین ہنر سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اگر اقبال کو سمجھنا ہے تو ان کے خطوط کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ البتہ مطالعہ کے وقت اقبال کی اسی کمزوری کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ: "میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعے میں گذری ہے اور یہ نقطہ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے، دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطہ نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اردو میں گفتگو کرتے ہوئے میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا[4]۔"

---

[1] غالباً خواجہ صاحب کی کتاب "اتالیق خطوط نویسی" کی طرف اشارہ ہے جو دراصل خطوط نویسی سکھانے کے لیے مرتب کی گئی تھی، مگر اس میں کچھ اصلی خطوط بھی ہیں، جن میں اقبال کے ۱۵ خط ہیں۔ مگر دقت یہ ہے کہ میری تحقیق کے مطابق "اتالیق خطوط نویسی" کا پہلا اڈیشن نومبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا ہے اور اقبال کا یہ زیر بحث خط ۱۹۱۹ء کا ہے، اس لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

[2] مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خاں مرحوم صفحہ ۲۴ خط نمبر ۳۲ مورخہ: ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۹ء

[3] عزیز احمد: "اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ"۔ "ماہ نو" بابت ماہ اپریل ۱۹۶۳ء صفحہ ۸۔

[4] اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۴۷ خط نمبر ۱۹ مورخہ: ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء



ا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
بتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ڈاکٹر صاحب اور چغتائی

عبدالرحیم چغتائی

چغتائی صاحب نے جب آرٹ شروع کیا تو اس وقت ہندوستان میں ہر طرف جدید بنگال اسکول کا چرچا تھا۔ زیادہ تر ان کا آرٹ ہندو دیومالا اور بدھ کی زندگی سے متعلق تھا۔ چغتائی صاحب نے ان خیالات کو اپنی مصوری کا موضوع نہیں بنایا۔ انہوں نے ابتدا ہی سے اسلامی تاریخی۔ تہذیبی۔ ثقافتی یا عوامی مضامین پر تصاویر بنانا شروع کیں۔ شروع شروع میں تصاویر بناتے اور بنا بنا کر پھاڑ دیتے تھے۔ محض اس خیال سے کہ جو تصور صفحہ قرطاس پر اتارنا چاہتے تھے۔ معیار کے مطابق نہیں پاتے تھے۔ پھر بھی ہمت نہیں ہارتے تھے اس لئے بار بار تصویریں بناتے اور ضائع کر دیتے۔ ہمت اس لئے بھی نہیں ہارتے تھے کہ ہمت ہارنا نہیں جانتے تھے۔ جس کام اور جس کھیل کو شروع کیا اسے عروج پر پہنچا کر چھوڑا۔ کرکٹ کھیلنے لگے تو اس قدر کامیاب کرکٹر ثابت ہوئے کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ گیند کرنے میں زیادہ کمال حاصل تھا اس قدر زور کی بالنگ کرتے تھے کہ بڑے بڑے کھلاڑی گھبرا جاتے اکثر اوقات ایسا بھی ہوا کہ وکٹ ٹوٹ گئی۔ پتنگ بازی کا شوق ہوا تو اس قسم کی پتنگ بازی کی کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خود پتنگ بناتے تھے آج تک کوئی ایسی پتنگ نہیں بنا سکا۔ ان کی پتنگ خاص وضع قطع اور طرز کی ہوتی تھی اور پھر اس میں ڈیزائن ایسے اختراع کئے تھے کہ لوگ دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ اس وقت کے بڑے بڑے کھلاڑی جو پریڈ کے میدان میں شاہی مسجد کے جنوبی جانب روزانہ یہ شغل فرماتے تھے ان کی پتنگ حاصل کرنا فخر سمجھتے تھے۔ جس طرح ان کا آرٹ چغتائی آرٹ کے نام سے پہچانا اور پکارا جاتا ہے اسی صورت ان کی پتنگ چغتائی کی پتنگ سے پہچانی جاتی تھی۔ اسی صورت مچھلی اور بندوق کے شکار میں بھی کمال حاصل تھا۔ فوٹو گرافی شروع کی تو اس میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ اس وقت کے نامی گرامی فوٹو گرافر ان کو بہترین فوٹو گرافر تسلیم کرتے۔ فوٹو گرافی کا فن کچھ ایسا تھا چاہتے تو اس پر مطمئن ہو کر بقایا زندگی آرام سے گذار سکتے تھے۔ اس لئے بھی کہ اس زمانہ کے مطابق اس میں کافی آمدنی تھی مگر قدرت کو جو کچھ منظور ہوتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔ اس لئے باوجود ہر فن میں کمال حاصل ہونے کے طبیعت کسی بات پر نہیں ٹھہرتی تھی

کوئی اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ چغتائی نے آرٹسٹ بننے کی خاطر کس قدر محنت اور مشقت کی ہے۔ ایک شاعر اپنے ابتدائی کلام کو خواہ وہ کس قدر بُرا ہی کیوں نہ ہو ضائع کرنے کی جرأت نہیں کرتا مگر چغتائی صاحب نے اپنی ابتدائی تخلیقات کو ضائع کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ اپنی تخلیقات کو ضائع کرنا اور پھر بنانا اور دوبارہ اور سہ بارہ بنانا ان ہی کا کام تھا۔ اس توڑ پھوڑ سے یہ فائدہ ہوا کہ ان کو ڈرائینگ میں ایسا کمال حاصل ہوا کہ آج یورپین نقاد اور مصور بھی ان کی ڈرائینگ کو قدیم چینی ایرانی اور مغل استادوں کے ہم پلہ گردانتے ہیں۔ ایک یورپین نقاد نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ یورپین طلبہ کو ان کی ڈرائینگ سے استفادہ کرنا چاہیے۔

ابتدا میں بہت سی تصاویر بنائی ہوں گی مگر جو تصاویر خود مصور نے لوگوں کو دکھلانا پسند کیں وہ ڈاکٹر اقبال کے اشعار پر بنی ہوئی تھیں۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کا کلام گھر گھر پڑھا اور سنا جاتا تھا۔ خاص طور پر ان کا ملی ترانہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

ہر مسلمان بچے کی زبان پر تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا کلام رسالہ 'مخزن' میں پڑھنے کو یا انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں سننے میں آتا تھا۔ جن لوگوں نے انجمن کے اجلاس میں 'نالہ یتیم' اور 'شمع اور شاعر' جیسی نظموں کو سنا ہے۔ اس وقت کی اسلامی، قومی اور ملی کیفیت کو وہی جان سکتے ہیں ــــ تمام مسلمان بچوں کی مانند چغتائی صاحب پر بھی یہ اسلامی قومی اور ملی جذبات بڑی حد تک اثر انداز تھے اور ان سے متاثر ہو کر انہوں نے ان خیالات پر طبع آزمائی کی تھی ــــ چغتائی صاحب کی تصاویر جب پہلی بار عوام میں روشناس ہوئی ہیں تو وہ ماہوار انگریزی رسالہ ماڈرن ریویو کلکتہ اور ہندی رسالہ سرسوتی کی وساطت سے ہوئی ہیں۔ کیونکہ بنگال اسکول آف کلکتہ کی تصاویر انہیں رسائل کے ذریعہ دیکھنے میں آتی تھیں چنانچہ چغتائی صاحب نے بھی انھیں رسائل کے ذریعے اپنی تصاویر چھپوانے کی جرأت کی تھی۔ ۱۹۱۶-۱۷ء کی بات ہے جو تصاویر ان رسائل میں طبع ہوئی ہیں وہ ڈاکٹر اقبال ہی کے اشعار پہ مبنی ہوتی تھیں ــــ وہ تصویر جو نظم شمع اور شاعر کے اس شعر پہ بنائی گئی تھی ؎

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر میری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہو کے پروانوں کو ہو سودا تیرا

اور خصوصیت سے وہ تصویر جو اس شعر کی ترجمانی کرتی ہے ؎

جینا وہ کیا جو ہو نفس غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے

آخر الذکر تصویر کا انگریزی نام FAME رکھا تھا تصویر میں ایک عورت سر پہ شمع اٹھائے ہوئے ہے۔ چہرے پر نقاب پڑا ہے۔ ایک بلڈنگ کے اندر بیٹھی ہے۔ یہ اظہار کرنا مقصود تھا کہ ایک فرد بغیر کسی محنت و مشقت کے آسانی سے شہرت حاصل کرنی چاہتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ لوگ بغیر سوچے سمجھے اس کے گرویدہ اور پروانہ بن جائیں۔ چہرہ نقاب سے ڈھکا ہوا ہونے سے مطلب تھا کہ اس کی اپنی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور پھر دانستہ طور پہ عورت بنائی ہے یہ تصویر بیحد مقبول ہوئی۔ انگریزی اور ہندی دونوں رسالوں میں چھپی تھی۔ اس کی مقبولیت کے باعث چغتائی صاحب کو یہ تصویر کئی بار بنانا پڑی۔ بار بار بنانے سے بھی تصویر کے ڈیزائن طرح بندی اور عنوان بندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ تصویر کے رنگوں اور عورت کے پیکر میں ضرور پختگی اور صفائی آتی گئی۔ مطلب یہ کہ تصویر ہر بار "PERFECTION" اختیار کرتی رہی ہے۔ یوں تو اور کئی تصاویر جو چغتائی صاحب نے دوبارہ بنائی ہیں وہ محض اس غرض سے بنائی ہیں کہ ان میں کوئی تبدیلی کرنا مقصود ہوتی تھی۔ یا نقاش ثانی بہتر کشد زاول کے مصداق بنائی ہیں۔ مگر اس تصویر کو جب اور جس وقت دوبارہ بنایا محض رنگوں کی صفائی یا اور دیگر PERFECTION کے طور پہ بنایا ہے۔ یہ تصویر چغتائی صاحب کو خود بھی دل سے پسند تھی۔ چنانچہ اس تصویر کو ڈاکٹر اقبال صاحب کے مصور ایڈیشن عمل چغتائی میں بھی نمایاں جگہ دی ہے اور یہ اس تصویر کی آخری تکمیل شدہ صورت ہے۔

اس دور کی ایک اور تصویر قابلِ ذکر ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے اس شعر پر بنائی گئی ہے ؎

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائی، سوزِ تمام آیا تو کیا

اور یہ وہ تصویر ہے جو سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزاری گئی۔ اس تصویر کا مضمون یہ ہے کہ ایک مقبرے کا اندرونی حصہ ہے جس میں اسلامی ثروت کا کچھ نشان پایا جاتا ہے۔ مقبرے کے اندر ایک قبر ہے اور ایک عورت سوگوار صورت مزار پر کھڑی ہے۔ مزار کی پائنتی ایک اور عورت سوگوار سر جھکائے بیٹھی ہے۔ جس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ جب یہ تصویر ڈاکٹر صاحب نے دیکھی تو فوراً تجویز کیا کہ مزار پر قرآن کی یہ آیت لکھی جائے تو تصویر کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ آپ نے تجویز کیا مزار پر لکھا جائے: "وان اللہ یبعث من فی القبور"۔ مطلب یہ کہ مردے پھر دوبارہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ یا اٹھیں گے۔" اتفاق سے ابھی تک چغتائی صاحب نے مزار پر خود کچھ نہیں لکھا تھا۔ چنانچہ بعد میں یہ آیت مرحوم حاجی دین محمد سے لکھوائی گئی اور اس کے بعد تصویر شائع ہونے کو بھیجی گئی۔ یہ تصویر بھی ان میں سے ایک ہے جو چغتائی صاحب نے کئی بار دوبارہ سہ بارہ بنائی اور یہ بھی محض PERFECTION کی غرض سے۔ یہ تصویر جو سب سے پہلے بنی تھی رسالہ سرسوتی ہندی الٰہ آباد میں طبع ہوئی تھی۔ لیکن سب سے پہلے پبلک میں ۱۹۲۰ء میں پیش ہوئی۔ جب لاہور میں پنجاب فائن آرٹ کی نمائش منعقد ہوئی۔ اس نمائش میں جدید بنگال اسکول کی تصاویر بھی نمائش کی خاطر آئی تھیں اور چغتائی صاحب اور دیگر اہلِ پنجاب کو انھیں اصل صورت میں دیکھنے کا موقع ملا۔ اور ادھر چغتائی صاحب کی تصاویر بھی پہلی بار پبلک کے سامنے آئیں۔ ہندوستان کے دیگر بڑے شہروں، کلکتہ، بمبئی، مدراس اور شملہ میں آرٹ کی نمائشیں باقاعدہ اور سالانہ منعقد ہوا کرتی تھیں۔ پنجاب میں فائن آرٹ کی یہ پہلی نمائش تھی جو یہاں منعقد ہوئی۔ اس نمائش میں چغتائی صاحب کو ان کی امید سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی۔ جو تصاویر کی فروخت اور پسندیدگی دونوں اعتبار سے منفرد تھی۔ ہر مذہب و ملت کے افراد نے چغتائی صاحب کی تصاویر کو سراہا اور پسند کیا تھا۔ فروخت کی رُو سے چغتائی صاحب کی تصاویر جدید بنگال اسکول سے زیادہ فروخت ہوئیں۔ اگرچہ ان کی قیمت بنگال اسکول کی تصاویر سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کی تمام تصاویر فروخت ہو گئیں۔ خرید کرنے والوں میں مرحوم نواب صاحب بہاولپور، مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ کپورتھلہ اور لالہ ہرکرشن لعل کے نام نمایاں تھے۔ خریداروں میں یورپین بھی تھے۔ مگر مرحوم نواب صاحب بہاولپور نے سب سے زیادہ تصاویر خریدی تھیں چنانچہ مذکورہ بالا تصویر بھی نواب صاحب نے ہی خریدی تھی۔ حال ہی میں ان کے صاحبزادے سابق گورنر جناب عباسی سے معلوم ہوا کہ وہ ان کے محل میں چغتائی صاحب کی دیگر تصاویر کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ اس تصویر کی ایک نقل مہارانی کوچ بہار، مہارانی بڑودہ اور مہاراجہ ہردواں کے پاس بھی ہو گی۔ مگر اس کی آخری اور تکمیل شدہ صورت مرحوم نواب سالار جنگ بہادر کے عجائب خانہ حیدرآباد دکن میں چغتائی صاحب کی دیگر تصاویر کے ساتھ موجود ہے یہ تکمیل شدہ صورت وہی ہے جو ہم نے سالنامہ کارواں کے دوسرے نمبر میں شائع کی۔

جب ڈاکٹر صاحب کو چغتائی صاحب کی مصوری سے دلچسپی پیدا ہوئی تو اکثر تصاویر ان کی نظر سے گزاری جاتی رہی ہیں۔ خاص طور پر ایک اور تصویر کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں اور وہ تصویر ہے چاند سلطانہ کی۔ چاند سلطانہ کی تصویر جب ڈاکٹر صاحب کو دکھلائی گئی تو اس موقع پر بھی ڈاکٹر صاحب نے قرآن کی ایک آیت تصویر پر لکھنے کی تجویز کی۔ جس کا مطلب ہے کمزوروں

اور مظلوموں کی امداد کے لئے تلوار اٹھانی چاہئے۔ یہ تصویر اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے جب چاند سلطانہ نے اکبر کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے۔ تصویر اندرونِ محل کا منظر پیش کرتی ہے۔ چاند سلطانہ زرہ بکتر پہن کر اور تلوار سونت کر جنگ کی خاطر رخصت ہو رہی ہے۔ محل کی دیوار پر یہ آیت لکھی گئی ہے۔ یہ آیت چغتائی صاحب نے خود ہی لکھی تھی۔ یہ تصویر بھی نواب صاحب بہاولپور مرحوم کے مجموعہ میں موجود ہے اور یہ بعد میں خرید کی تھی۔ ابتدا میں چغتائی صاحب کی سرپرستی میں نواب صاحب بہاولپور کا بہت ہاتھ رہا ہے نواب صاحب کے پاس ایک اور ایسی تصویر بھی ہے جو ڈاکٹر صاحب کے کسی شعر پر بنی ہے اور اس پر ڈاکٹر صاحب کے اپنے ہاتھ سے وہ شعر لکھا ہوا ہے جس پر یہ تصویر بنی ہے۔

اب چغتائی صاحب کا آرٹ بلندی کو چھو رہا تھا۔ اب ان کا آرٹ اپنی منزل کی طرف پوری قوت سے گامزن تھا۔ اب چغتائی صاحب نے بھی ہندوستان کی دیگر نمائشوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ جہاں ان کو شہرت کے ساتھ ساتھ مالی اعتبار سے بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوتی رہی اور ان کا آرٹ پروان چڑھتا رہا اور ان کو پوری دلجمعی سے آرٹ کرنے کا موقع ملا۔

چغتائی صاحب نے ایک تصویر اسرارِ خودی کے نام سے بنائی اور یہ نیرنگ خیال کے تیسرے نمبر میں ستمبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی یہ تصویر بھی چغتائی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے شعر پر بنائی تھی۔ اس وقت تک جس قدر ملاقاتیں ڈاکٹر صاحب سے ہوئی تھیں ان میں بڑی حد تک ادب ملحوظ رہا ہے۔ لیکن جب سے بے تکلفانہ ماحول پیدا ہوا اس کا باعث وہ ملاقات ہے جو مرحوم مولوی محمد بشیر ابن مولوی احمد الدین وکیل کی معرفت ہوئی ہے مولوی احمد الدین صاحب وکیل مرحوم وہ بزرگ ہستی ہیں جنہوں نے سب سے پہلے کلامِ اقبال شائع کیا۔[1] اگرچہ مولوی صاحب اور ڈاکٹر صاحب میں پیشہ کی رُو سے اور دوستانہ اعتبار سے بہت بڑی حد تک بے تکلفی پائی جاتی تھی مگر جس وقت مولوی احمد الدین صاحب نے کلامِ اقبال کتابی صورت میں شائع کیا تو ڈاکٹر صاحب نے ذاتی طور پر ان کے اس فعل کو پسند نہیں کیا تھا چنانچہ نہایت سختی کے ساتھ اس کی اشاعت کو رکوا دیا۔ مولوی احمد الدین صاحب کا یہ فعل اس بات کا محرک ہوا کہ بعد میں ڈاکٹر صاحب کو خود اپنا کلام بانگِ درا کے نام سے شائع کرنے کی تحریک ہوئی ——— مرحوم مولوی بشیر صاحب چغتائی صاحب کو ایک دن ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں انارکلی والے مکان میں سکونت پذیر تھے۔ وہیں رہائش تھی اور اسی جگہ وکالت کا دفتر بھی تھا۔ اسی مکان میں مولینا گرامی مرحوم آکر کئی کئی دن ٹھہرا کرتے تھے اور دیگر ملنے جلنے والے اصحاب بھی رونق افروز ہوا کرتے۔ ڈاکٹر صاحب سے پیشتر اس مکان میں سر محمد شفیع مرحوم کا دفتر تھا۔ جس وقت چغتائی صاحب مولوی بشیر صاحب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت مرحوم نواب سر ذوالفقار علی صاحب آف مالیر کوٹلہ بھی اتفاق سے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے بھی ڈاکٹر صاحب کے اشعار پر بنائی ہوئی تصاویر سے متعلق اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ کافی دیر تک تصویر اسرار خودی پر بات چیت ہوتی رہی کیونکہ یہ تصویر تازہ تازہ شائع ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحب نے اس بات کا اظہار کیا کہ عبدالرحمٰن میں نے ایک تازہ کتاب فارسی میں پیام مشرق کے نام سے لکھی ہے اس میں مختلف موضوعات پر رباعیات۔ غزلیں اور نظمیں ہیں۔ تم ان میں سے کسی پر طبع آزمائی کرو۔ (ڈاکٹر صاحب چغتائی صاحب کو ہمیشہ عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر عبداللہ کو ماسٹر کہہ کر مخاطب کرتے تھے) پھر فرمایا اس کتاب میں میں نے ایک نظم میلادِ آدم کے نام سے لکھی ہے میں چاہتا ہوں کہ

[1] سب سے پہلے علامہ کا کلام "کلیاتِ اقبال" کے نام سے محمد عبدالرزاق نے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا تھا۔ مولوی احمد دین نے "اقبال" کے نام سے جو کتاب لکھی ۱۹۲۶ء میں اس میں اقبال کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے جس میں ضمناً کلامِ اقبال بھی آگیا ہے البتہ اسے کلامِ اقبال کی کتابی صورت کہنا درست نہیں۔ (ادارہ)

اس کو شعور کیا جائے اور ایک طرف فارسی اور دوسری طرف اس کا انگریزی ترجمہ ہو اور اس کے ساتھ تمہاری تصاویر ہوں۔ پھر فرمایا در اصل یہ کتاب میں نے جرمنی شاعر گوئٹے کی کتاب دیوان مشرق کے جواب میں لکھی ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کو یورپ میں صورت میں پیش کیا جائے۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد چغتائی صاحب نے عرض کیا میں فارسی نہیں جانتا۔ ڈاکٹر صاحب بولے اس کی فکر نہ کرو میں تم کو اس کا مطلب اُردو میں سمجھا دوں گا۔ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے چغتائی صاحب نے مزید بحث میں جانے کی جرأت نہیں کی اور اس بات کی ہامی بھری کہ وہ نظم میلاد آدم پر ضرور تصویر بنائیں گے۔ چنانچہ کئی دن کے بعد چغتائی صاحب نظم میلاد آدم سے متعلق چھ سات سکیچ بنا کر ڈاکٹر صاحب کو دکھلانے کی غرض سے لے گئے۔ ان کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب دیر تک اپنی رائے اور تجویز کا اظہار کرتے رہے۔ ان کی تجاویز اور رائے کے مطابق چغتائی صاحب دوبارہ سہ بارہ ان میں تبدیلیاں اور کبھی نئے سکیچ بناتے رہے اور دکھاتے رہے۔ نہ معلوم کن وجوہ کی بنا پر وہ اسکیم پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ وہ سکیچ آج بھی میرے پاس موجود ہیں۔

اب ڈاکٹر صاحب سے میل جول کا سلسلہ کافی بے تکلفانہ ہو چکا تھا۔ خصوصیت سے ہمارے بھائی ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے۔ ان کا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت گذاری ان کے فرائض میں شامل ہو گئی تھی۔ اس کا باعث ایک اور بات بھی تھی۔ وہ یہ کہ جب ڈاکٹر صاحب کی شادی ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی والدہ سے ہوئی تو اسی دوران دوسری شادی لدھیانہ میں مشہور فیملی نولکھی والوں کے ہاں ہوئی۔ عبداللہ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں لدھیانہ میں پہلے سے موجود تھے اور اس فیملی سے ان کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ یہ بات بھی تھی کہ عبداللہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ہوتے گئے۔ عبداللہ کا ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ہونا اور بے تکلف ہونا اس لئے بھی تھا کہ اکثر اوقات علمی ادبی ضروریات مثلاً کوئی کتاب وغیرہ مہیا کرنی یا کسی علمی ادبی مشہور و معروف شخصیت سے ملاقات وغیرہ کا انتظام انجام دینا یہ عبداللہ ہی سر انجام دیا کرتے تھے..... اسی دوران تاثیر صاحب اور چغتائی صاحب کی دوستی کے سبب بھی چغتائی صاحب کا ڈاکٹر صاحب کے ہاں بے تکلفانہ آنا جانا ہوتا رہتا تھا اور گھنٹوں ان کی صحبت سے مستفید ہوا جاتا۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں کسی قسم کا رکھ رکھاؤ یا تکلف نہیں تھا۔ ہر قسم کے آدمی آتے جاتے رہتے ان کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے تھے۔ جو چاہے آتے اور جتنی دیر چاہے بیٹھے کسی قسم کی ممانعت نہیں تھی۔ ان تک پہنچنے کے لئے کسی کی بھی اجازت یا کسی کارڈ وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں غیر ملکی آتے تھے تو وہ معلوم کر کے اور اجازت لے کر حاضر خدمت ہوتے تھے۔ ان سب کی سربراہی علی بخش کے سپرد تھی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دیتا اور کرسی وغیرہ کا انتظام کرتا۔

آرٹ کی رو سے اب چغتائی صاحب کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اور ان کے آرٹ میں اب پہلے سے بہت زیادہ پختگی اور سلجھاؤ آ گیا تھا۔ چغتائی صاحب میو اسکول آف آرٹ سے ۲۴-۱۹۰۳ء تک منسلک رہے ہیں اس کے بعد آزادانہ زندگی گزاری حالانکہ اس کے کئی سال بعد ان کو اسی میو اسکول آف آرٹ کی اور حیدر آباد دکن اور مدراس اسکول آف آرٹ کی پرنسپلی پیش ہوتی رہی۔

۲۸-۱۹۲۷ء کی بات ہے میری تحریک پر اور تاثیر صاحب کی تائید سے چغتائی صاحب نے دیوان غالب کو مصوّر کیا۔ مصوّر دیوان غالب کی اشاعت کی بات بہت لمبی داستان ہے اور اس کی بابت چغتائی صاحب خود اپنی قلم سے ماہِ نو اور دیگر رسائل

میں تحریر بھی کر چکے ہیں۔ تاہم باہزارہ خرابی ہم مرقع چغتائی شائع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مرقع چغتائی شائع کرنے میں جو کامیابی ہمیں حاصل ہوئی اس سے متعلق ہم خود بھی متوقع نہیں تھے۔ اس کا ایک خاص ایڈیشن ۲۱۰ جلدوں کا فی جلد ایک سو دس روپیہ قیمت کا شائع کیا۔ اگرچہ یہ خالص اُردو کی کتاب تھی لیکن اس کی خریداری کے لیے ہر مذہب و ملت کے افراد نے اس کا خیر مقدم کیا اور کتاب اشاعت سے پہلے ہی فروخت ہو گئی۔ اُردو کی یہ کتاب آج بھی ہندوستان اور یورپ کی لائبریریز اور عجائب خانوں میں موجود ہے۔ نقادانِ فن نے اس پر سیر حاصل تبصرے کیے۔ بعض یورپین رسائل اور اخبارات نے یہاں تک لکھا کہ ہندوستان آج تک ایسی خوبصورت، دیدہ زیب اور حسین کتاب کسی زبان میں بھی شائع نہیں کر سکا۔ اس کے لیے خاص قسم کا کاغذ اور دیگر طباعت کا سامان ہم نے یورپ سے منگوایا تھا اور اس کی تصاویر کی طباعت جرمن کی ایک مشہور و معروف فرم سے کروائی تھی۔ یہ بات جان کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اس کے اردو متن کے تمام بلاکس اور تمام ڈیکوریشن وغیرہ کے بلاکس چغتائی صاحب، میں نے اور ہمارے ماموں زاد بھائی معراج الدین مرحوم نے مل کر بنائے تھے اُردو کا متن مرحوم منشی اسد اللہ صاحب کاتب نے لکھا تھا۔ چغتائی صاحب فوٹو گرافی اور بلاکس سازی کے فن سے پورے طور پر واقف تھے۔ ایک خاص مشین اس کی پرنٹنگ کی خاطر لنڈن سے منگوائی تھی اور یہ بات بھی حیرت کا موجب ہو گی کہ تمام کتاب میں نے اور ہمارے ماموں زاد بھائی معراج الدین نے مل کر طبع کی تھی۔ حالانکہ ہم اس سے پیشتر پرنٹنگ کے کام سے واقف نہیں تھے۔ جب ہم یہ کتاب چھاپ رہے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر اور ڈاکٹر نذیر چوبیس گھنٹے ہمارے آبائی مکان محلہ چابکسواراں میں خوش گپیوں میں مصروف رہتے اور بھی دیگر دوست اور احباب دن بھر آتے جاتے رہتے۔ مگر ہم برابر کام میں مصروف رہتے کبھی کبھی ڈاکٹر تاثیر فکر مند ہو جاتے تھے کہ یہ ناتجربہ کار ہیں کہیں تمام کیا کرایا تباہ نہ ہو جائے۔ — جب کتاب تیار ہوئی تو اس کے خاص ایڈیشن کی قیمت کا سوال زیرِ بحث تھا۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب کا کہنا تھا کہ کوئی اُردو کی کتاب اِس قیمت پر خرید نہیں کرے گا۔ اس لئے بھی کہ اس سے پیشتر مولانا شبلی کی سیرت النبی جو لکھائی، چھپوائی کاغذ اور سائز کے اعتبار سے بہترین اشاعت سمجھی گئی تھی نہایت قلیل قیمت پر فروخت ہوئی تھی اور کافی عرصہ لگا۔ چنانچہ دوست احباب نے بھی اس بات کی پُر زور طور پر مخالفت کی۔ لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ چغتائی صاحب کسی طور بھی متفق نہیں ہوئے اور اپنی بات پر اڑے رہے۔ — خیال کیا جائے تو اِس زمانے کا ایک صد روپیہ آج کے دس ہزار کے برابر ہے۔

مرقع چغتائی کے پیش لفظ میں چغتائی صاحب نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ بہت جلد وہ، ڈاکٹر اقبال صاحب کے کلام کو مصور کریں گے — یہ اس بات کا بدلہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مرقع چغتائی کا تعارف نامہ لکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے از راہ محبت اور چغتائی صاحب کی استدعا پر یہ کام کیا تھا۔ بلکہ چغتائی صاحب کی فرمائش پر غالب کے اشعار کا ایک انتخاب بھی کیا تھا جو آج بھی مرقع چغتائی کے آخر میں موجود ہے۔ کتاب تمام چھپ چکی تھی اور انتخاب بھی چھپ چکا تھا اور اس پر "انتخاب از ڈاکٹر سر محمد اقبال" بھی چھپ چکا تھا کہ کسی بد خواہ نے عین وقت پر ڈاکٹر صاحب کو یہ کہہ کر بہکا دیا کہ آپ کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے حکم سے یہ عبارت کہ "انتخاب از ڈاکٹر سر محمد اقبال" حذف کرنا پڑی۔ ویسے وہ

اشعار جو ڈاکٹر صاحب نے انتخاب کئے تھے اور جن پر نشان لگائے تھے وہ آج تک میرے پاس موجود ہیں۔ جب انتخاب کی بات ڈاکٹر صاحب سے ہوئی تھی تو ڈاکٹر صاحب نے تاثیر صاحب سے کہا تھا کہ تم اشعار منتخب کر لاؤ میں ان پر نشان لگا دوں گا۔ چنانچہ تاثیر صاحب نے ایک کاپی پر اپنی سمجھ کے مطابق بہت سے اشعار پیش کئے تو آپ نے اپنی پسند کے مطابق اشعار پر اپنی قلم سے نشان لگا دیئے۔ ان نشان شدہ اشعار ہی سے انتخاب شائع کیا تھا۔

مرقع چغتائی کی اشاعت کے بعد چغتائی صاحب اور عبداللہ صاحب ۱۹۳۰-۳۱ء میں یورپ تشریف لے گئے۔ چغتائی صاحب آرٹ گیلریز اور عجائب خانے دیکھنے اور دیگر آرٹ کی اصناف کا مطالعہ کرنے کی غرض سے۔ خصوصیت سے ایچنگ کا آرٹ دیکھنا چاہتے تھے۔ اتفاق سے انھیں دنوں لنڈن میں راؤنڈ ٹیبل کانفرس منعقد ہوئی اور اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کو بھی لنڈن جانا پڑا۔ وہاں بھی چغتائی صاحب اور عبداللہ صاحب کا واسطہ ڈاکٹر صاحب سے رہا۔ چغتائی صاحب کا زیادہ تر وقت ڈاکٹر صاحب ہی کی صحبت میں گزرتا تھا۔

عملِ چغتائی کی اکثر تصاویر بر مثال کے طور پر داستان گو۔ شرف النساء۔ شہزادہ سلیم۔ قلندر۔ خلیفہ ہارون الرشید۔ شہرت اور بہت سی دیگر تصاویر ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھیں اور بعض ایسی بھی تھیں جو ان کے مطالعہ میں بھی رہی تھیں۔ خصوصیت سے داستان گو والی تصویر تو ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ میں کئی ماہ تک رہی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ زبورِ عجم میں جو نظم "در فنِ تعمیرِ مردانِ آزاد" موجود ہے وہ اس داستان گو کو دیکھ کر لکھی گئی ہے اور ڈاکٹر صاحب کے مجموعۂ خطوط میں جو خطوط ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے نام ہیں ان میں کہیں کہیں یہ بات جھلکتی ہے کہ تصاویر ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ میں رہی ہیں۔ کتاب شائع ہونے میں اس قدر عرصہ لگ گیا تھا کہ بعض تصاویر درمیان میں ادھر اُدھر ہو جاتی رہیں اور دوبارہ سہ بارہ بنانی پڑیں۔ اس کا سبب اپنے حالات کا مقابلہ کرنا بھی تھا۔ چنانچہ اس دوران جو جو تکالیف پیش آتی ہیں ان کی داستان بہت طویل ہے۔ کتاب پر ہم دونوں بھائیوں کے پندرہ بیس سال کے شب و روز صرف ہوئے ہیں اور کم و بیش تین لاکھ روپیہ خرچ آیا ہے۔ ایسی کتابیں شائع کرنا حکومت اور اداروں کے کام ہوا کرتے ہیں۔ لیکن یہ عظیم کام ہم نے تن تنہا اور اکیلے انجام دیا ہے۔ کتاب شائع ہونے سے وہ وعدہ جو چغتائی صاحب نے مرقع چغتائی کے دیباچے میں کیا تھا اور وہ وعدہ جو آپ نے ڈاکٹر اقبال سے ان کے بسترِ مرگ پر کیا تھا پورا ہوا ہے۔ حکیم الامت شاعرِ مشرق۔ علامہ اقبال کے افکارِ عالیہ نے ملتِ اسلامیہ میں تہذیبی۔ معاشرتی۔ ثقافتی۔ فکری اور ذہنی شعور پیدا کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے اور انسان کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب تمام فنونِ لطیفہ کو زندگی کے تابع سمجھتے تھے۔ ان کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ ڈانٹے۔ گوئٹے اور شیکسپیئر کی مانند ان کا کلام بھی مصور اور ایک جامع ایڈیشن کی صورت میں شائع ہو تاکہ آنے والی نسلیں اور اقوامِ عالم ان کے فلسفیانہ۔ فکری اور ذہنی افکار سے مستفید ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس خواہش کو عملی صورت دینے کی غرض سے چغتائی صاحب نے اپنے دامن کو ہر قسم کی تحریص و ترغیب سے بچا کر اور اپنی صدہا قیمتی سے قیمتی خواہشات کو پسِ پشت ڈال کر اس کی اشاعت کو مقدم سمجھا۔ اس عرصہ میں وہ عمر خیام کا ایڈیشن شائع کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے جو تصاویر اور تزئین کی رُو سے بالکل مکمل موجود ہے۔ وہ اپنے آرٹ کی ایک کتاب ART of Chughtai بھی شائع کر سکتے تھے جس کی یورپ اور امریکہ میں سخت ضرورت ہے۔ وہ

اپنی ہندوستانی تصاویر کی کتاب بھی شائع کر سکتے تھے اور کارِ چغتائی کے نام سے جو غالب کا ایک اور ایڈیشن تیار ہے جس کی تمام تصاویر اور تصاویر پر نوٹ ان کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے موجود ہیں شائع ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی تخلیقات۔ مثلاً ایچنگ کی کتاب پنسل ڈرائنگ اور کشمیر سے متعلق بھی ایک کتاب شائع کرنے کا ارادہ تھا۔

عملِ چغتائی میں رنگین اور سادہ سو کے قریب تصاویر ہیں۔ جو یورپ سے چھپوائی گئی ہیں۔ قدیم ایرانی اور مغل مرقعوں کی مانند رنگین اور جمیل صفحات طبع ہوئے ہیں۔ اردو۔ فارسی اور انگریزی مواد چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ تمام تصاویر پر چغتائی صاحب نے خود نوٹ لکھے ہیں تاکہ تصویر سمجھنے میں آسانی پیدا ہو اور اس سلسلے میں ایک اختراع کی ہے وہ یہ کہ ایک تصویر کے لیے مختلف اشعار کا انتخاب کیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ تصویر مختلف اشعار کا احاطہ کرتی ہے۔ ولایتی کاغذ خوش خط۔ دیدہ زیب۔ حسین و جمیل طباعت کے ساتھ عملِ چغتائی شائع ہوا ہے۔ ابتداً میں اس کتاب کا ایک خاص ایڈیشن محدود تعداد میں دو سو پچھتر (۲۷۵) جلدوں کا طبع ہوا ہے تاکہ عوام بھی شاعرِ مشرق کی حیات افروز شاعری اور مصورِ مشرق کی پُرکیف مصوری سے مستفید ہو سکیں۔ کوئی پبلشر ایسی حسین و جمیل اور دیدہ زیب کتاب اس قیمت پر شائع نہیں کر سکتا۔

ایرانی آرٹ کا حسن و جمال۔ مغلوں کا شان و شکوہ اور ہندوستانی آرٹ کی نزاکت۔ رنگوں کا امتزاج خطوط کی روانگی۔ ہر وہ چیز جو قدرت نے چغتائی صاحب کو عطا کی ہے وہ عملِ چغتائی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کی اشاعت ہمارے آرٹ اور طباعت اور اشاعت میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مرقعِ چغتائی آپ کے آرٹ کا ابتدائی کارنامہ تھا اور زمانے اور وقت کی رُو سے اس کی اہمیت منفرد تھی۔ عملِ چغتائی آپ کے تیس چالیس سال کے تجربے اور کاوش کا نچوڑ ہے۔ مشرقی تہذیب و تمدن۔ ثقافت، ہماری روایات اور قدریں۔ شاعر کا کمال اور مصور کا فن اس ایڈیشن میں پورے عروج پر جلوہ گر ہیں۔ چغتائی صاحب کا نظریہ ہے آرٹ کوئی بھی ہو ثقافتی۔ فنی۔ تہذیبی اور روایتی قدروں کے ذریعے ملت اور انسانیت کے لیے ایک غیر فانی مقام پیدا کرتا ہے۔ شعر تخلیق ہوتا ہے تو ہزاروں بار پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔ تصویر تکمیل کے مختلف مراحل سے گزرتی ہے تو تصویر کہلاتی ہے۔

عملِ چغتائی کا ایک ایڈیشن یورپین ممالک کے لئے شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ جناب جسٹس ایس۔ اے رحمان صاحب نے شب و روز غیر معمولی محنت اور کاوش فرما کر ایک ایسا مسودہ تیار کیا ہے جو سر تا سر انگریزی میں ہے۔ اس سے پیشتر بھی عملِ چغتائی کا پیش لفظ جو انگریزی میں ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کی زندگی پر ادبی اور علمی۔ ادبی اور شاعرانہ نشو و نما پر جو مبصرانہ اور بصیرت افروز انداز میں تبصرہ موجود ہے وہ رحمٰن صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے اور آج تک ڈاکٹر صاحب کے کلام کے جس قدر تراجم انگریزی[1] میں ہو چکے ہیں ان کا انتخاب بھی آپ ہی نے انجام دیا ہے۔

اردو فارسی کلام سے قطع نظر یہ تمام ایڈیشن سر تا سر انگریزی میں ترتیب دیا گیا ہے۔ پیش لفظ اور تراجم کے علاوہ تصاویر پر نوٹ۔ تصاویر سے متعلق اشعار کا ترجمہ بھی انگریزی میں ہر تصویر کے اوپر نہایت خوب صورت طریق پر ترتیب دیا ہے۔ رحمٰن صاحب نے یہ خدمت ازراہ محبت خلوص اور عقیدت کے جو ان کو چغتائی صاحب اور ڈاکٹر صاحب سے ہے بلا کسی معاوضے اور لالچ کے انجام دی ہے جناب جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب خود ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر ہیں۔ اردو فارسی انگریزی علم و ادب کی جو خداداد بصیرت اور سوجھ بوجھ آپ کو حاصل ہے اس کی بنا پر انہوں نے یہ ایڈیشن ترتیب دیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں ان سے بہتر کوئی دوسرا آدمی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا۔ یہ تمام انگریزی مسودہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ ایڈیشن یورپین ممالک کے لئے شائع کیا جائے۔ تاکہ اقوامِ عالم بھی علامہ کے علمی۔ ادبی۔ ذہنی اور فکری افکارِ عالیہ سے مستفید ہو سکیں۔۔

جہاں گورنمنٹ ڈاکٹر صاحب کے سلسلے میں لاکھوں روپے خرچ کر رہی ہے اگر یہ کام بھی اس کی وساطت سے انجام پا جائے تو ایک بہت بڑی خدمت انجام پا سکتی ہے۔ اور پھر یہ کام گورنمنٹ کے لیے بہت بڑی عزت اور شہرت کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ آنے والی نسلیں اور اقوامِ عالم اس بات کا اندازہ کر سکتی ہیں کہ گورنمنٹ پاکستان کو اپنے محبوب اور قومی شاعر سے کس قدر عقیدت اور محبت ہے، اور ان کی شخصیت کا مقام کیا ہے۔

ہم اس ایڈیشن کو بھی شائع کر سکتے تھے بلکہ یہ اسی کام کی خاطر ہی ترتیب دیا گیا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ایک ناقابلِ برداشت گرانی موجود ہے اور اس قسم کے کام کے لیے ایک گرانقدر سرمائے کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہم اپنے آپ میں اس کام کی استعداد نہیں پاتے۔

(باقی آئندہ)

شاہ ولی اللہ اور اقبال

اختر راہی

(اقبال اردو کانفرنس اسلام آباد منعقدہ ۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے لئے لکھا گیا)

مسلمانانِ پاک و ہند کی تاریخ میں شاہ ولی اللہ ایک اہم نام ہے۔ شاہ صاحب اسلامی ہندوستان کے دارالحکومت اور علم و حکمت کے مرکز دہلی میں ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے چار سال بعد اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہوا اور وہ تمام خرابیاں سامنے آگئیں جو عالمگیر کی پُر وقار اور اعلیٰ منتظم شخصیت کی وجہ سے دبی ہوئی تھیں۔ حکومت کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ مرہٹوں اور سکھوں کے جتھوں نے امن و امان لُوٹ لیا۔ مسلمان امراء اور باہمی سازشوں میں مصروف ایک دوسرے کو نیچا دکھا رہے تھے اور شاہانِ وقت رنگین محفلوں اور حُسن و جمال کے بازاروں میں دادِ عیش دے رہے تھے۔

عوام کی اخلاقی و مذہبی حالت نہایت درجہ گر گئی۔ فسق و معصیت اور بدعقیدگی و بدعملی کے مظاہر عام ہو گئے۔ کتاب و سنت سے رابطہ کٹ گیا اور قرآنِ مجید کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ صوفیوں کی خانقاہیں روحانیت سے خالی اور مدرسے جمود اور تعطل کا شکار تھے صوفیہ اصلاحِ اخلاق اور طہارتِ نفس کے بجائے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے فلسفیانہ مباحث میں الجھے ہوئے تھے شطحیات کی دلفریب تعبیریں کی جا رہی تھیں۔ علماء منطق اور فقہ کی فرسودہ اور لاطائل بحثوں میں غرق تھے۔ اس ماحول میں شاہ صاحب نے اسلام کے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ پیش کر کے حالات کا رُخ بدلا۔

شاہ صاحب نے بنیادی طور پر ملت کو قرآن فہمی کی طرف راغب کیا اور باہم دست بہ گریباں گروہوں کو صلح و آشتی سے رہنا سکھایا۔ انہوں نے تفسیر و حدیث، فقہ و کلام اور تصوف کے صدیوں پر پھیلے ہوئے سرمایہ کا جائزہ لیا اور اس کا لب لباب اپنی تصنیفات کی صورت میں مدوّن کیا۔ انہوں نے صوفیوں کے افتراق و انتشار کو اس طرح ختم کرنے کی کوشش کی کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات میں تطبیق دے کر ان کا ظاہری تناقص دور کیا۔ فقہی مذاہب کے اختلافات کی حقیقت سامنے لا کر علما کو باہم قریب لانے کی کوشش کی۔ اسی طرح انہوں نے زندگی میں ایسی راہیں تلاش کیں جن سے متحارب فریقین متفق ہو گئے۔ شاہ صاحب کی تجدیدی و اصلاحی مساعی کے پیشِ نظر علامہ شبلی نعمانی نے بجا طور پر لکھا ہے:

> "ابن تیمیہ اور ابن رُشد کے بعد بلکہ خود انہیں کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا اس کے لحاظ سے یہ اُمید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہو گا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں جب اسلام کا نفس بازپسیں تھا۔

شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔"

شاہ صاحب کی تجدیدی فکر سے ایک تحریک نے جنم لیا جو انیسویں صدی کی مذہبی کشمکش میں ہماری سب سے بڑی ڈھال رہی ہے۔ یہ اُسی تحریک اور خاندان کے افراد کا فیض تھا کہ جب اسلام پر مسیحی مشنریوں اور مادہ پرستوں نے حملے کئے تو برصغیر کے مسلمان اپنے دین سے واقف تھے۔ اس سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ ذہنی سطح پر مخالفوں کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے تھے۔

موجودہ صدی میں مادی ترقیات اور حسی فلسفوں کی چکا چوند نے ایک بار پھر فکری اور علمی سطح پر مسلمان اہل علم کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس دور میں جن مسلم اہل فکر نے حسی فلسفوں کی یلغار کو روکا اُن میں حکیم الامت علامہ اقبال کا نام سر فہرست ہے موصوف اس بات کا شدید احساس رکھتے تھے کہ جدید دور میں "مذہب اسلام زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔"

علامہ اقبال نے احیائے دین کے سلسلہ میں تدبر قرآن پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اُن کے نزدیک یہی زندہ کتاب ہے جس نے زندگی کے سارے اسرار بیان کئے ہیں۔ انہوں نے توحید و رسالت اور زندگی بعد موت پر پختہ یقین رکھنے کی تلقین کی ہے۔ اُن کے خیال میں کوئی آئیڈیل سوسائٹی اسلامی اصولوں کو نظر انداز کر کے وجود میں نہیں آ سکتی۔ علامہ نے مغرب کے فلسفوں پر بھرپور تنقید کی ہے اور اسلام پر اعتراضات کے جواب میں مناظرانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے اسلامی اصولوں کی مثبت تشریح کی ہے جس میں ضرورت کے مطابق مغربی افکار سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

علامہ کی زندگی کے آخری بیس سال اسی جدوجہد میں بسر ہوئے۔ اس زمانہ میں انہوں نے Reconstruction of Religious Thought in Islam کے شہرہ آفاق خطبات لکھے۔ ضرب کلیم، بال جبریل، جاوید نامہ اور زبور عجم جیسی کتابیں دیں اور آخری دو سالوں میں "مسلمانان عالم کے ـــ اپنی بہترین پیش کش" "Introduction to The Study of Quran" کی داغ بیل ڈالی۔ ان ہی سالوں میں انہوں نے شاہ ولی اللہ کے رشحات فکر کا مطالعہ شروع کیا۔ اُس زمانہ کے خطوط میں شاہ صاحب اور اُن کی کتابوں کا ذکر ملتا ہے :۔

۱۹۲۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

> "ایشیا کے قدیم مذاہب کی طرح اسلام بھی زمانۂ حال کی روشنی میں مطالعہ کئے جانے کا محتاج ہے۔ پرانے مفسرین قرآن اور دیگر اسلامی مصنفین نے بڑی خدمت کی ہے مگر اُن کی تصانیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو جدید دماغ کو اپیل نہ کریں گی، میری رائے میں بحیثیت مجموعی زمانۂ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اُن کی کتب زیادہ تر عربی میں ہیں مگر شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔"

"خطبات" میں حجۃ اللہ البالغہ کے اثرات واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں :

"ہم مسلمانوں کو ایک بہت بڑا کام درپیش ہے۔ ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ فکر از سرِ نو غور کریں۔ یہ غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جنہوں نے سب سے پہلے ایک نئی روح کی بیداری محسوس کی تھی[6]"

شاہ ولی اللہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" کا سببِ تالیف اِن الفاظ میں لکھا تھا اور اِسی کی طرف علامہ کا اشارہ ہے کہ :

"اب وقت آگیا ہے کہ شریعت مصطفویہ دلائل و براہین کے مکمل لباس میں ملبوس کر کے میدان میں لائی جائے گی[7]"

یہ طریقِ کار جمال الدین افغانیؒ اور فکرِ ولی اللہی کے ترجمان دوسرے اہلِ فکر نے اپنایا ہے۔ علامہ اقبال بھی اِس عظیم الشان کام کی اہمیت کا پورا پورا احساس رکھتے تھے۔ اُن کے الفاظ میں :

"اب ہمارے سامنے کوئی راستہ ہے تو یہ ہے کہ ہم علم حاضر کے احترام اور قدر و منزلت کے باوجود اپنی آزادئ رائے برقرار رکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلامی تعلیمات کی تعبیر اب علم حاضر کے پیشِ نظر کس رنگ میں کرنی چاہیے خواہ ایسا کرنے میں ہمیں اپنے اسلاف سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو[8]"

شاہ صاحب نے طبعی موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں یہ تصور غلط قرار دیا ہے کہ نفسِ انسانی (نفسِ ناطقہ) موت کے بعد جسم (مادہ) سے بالکل جدا ہو جاتا ہے۔ اُن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نفسِ انسانی کے دو مادے ہیں۔ ان میں سے ایک اصل ہے جسے نَسمہ یا روحِ ہوائی (cosmic body) کہتے ہیں اور دوسرا عارضی جسے مادۂ ارضی کہا جاتا ہے جب آدمی مرتا ہے تو مادۂ ارضی کے چھوٹ جانے سے اُس کے نفسِ ناطقہ کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ وہ نسمہ کے ساتھ جُڑا رہتا ہے اور بالکل اسی طرح رہتا ہے جیسے کسی ماہر خوشنویس کے ہاتھ اگر کٹ بھی جائیں تو اس کا ملکۂ کتابت اس میں بدستور رہتا ہے اِسی طرح نفس و روح انسانی کا حال ہے کہ وہ مادۂ ارضی کے بغیر نسمہ سے وابستہ رہتی ہے[9]

علامہ نے چوتھے خطبہ "خودی، جبر و قدر، حیات بعد الموت" میں زندگی کا تسلسل ثابت کرتے ہوئے شاہ صاحب کے اِسی نظریہ کا ذکر کیا ہے :

"فلاسفۂ اسلام اور علمائے الٰہیات کے درمیان جو مسئلہ مختلف فیہ ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی بعثتِ ثانیہ پر کیا اُس کا جسم بھی پھر سے زندہ ہو جائے گا۔ اس میں زیادہ تر خیال یہ ہے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی رائے بھی۔ جن کی ذات پر الٰہیاتِ اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ یہی تھی کہ حیات بعد الموت پر ایسا کوئی مادی بکیہ ناگزیر ہے جو خودی کے نئے ماحول میں اُس کے مناسب حال ہو[10]"

خطبات کی تالیف کے بعد علامہ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہ صاحب کی کتابوں میں پہلے سے بھی زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ سید سلیمان ندویؒ کے نام خطوط میں بعض کتابوں کے بارے میں اُن کی بے تابی کا احساس ہوتا ہے۔ "البدور البازغہ"

شائع ہونے پر لکھتے ہیں :

"میں نے سُنا ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب بدور البازغہ چھپ گئی ہے ۔ مہربانی کرکے اُس کا ایک نسخہ وی ۔ پی مجھے ارسال فرمائیے اگر آپ کے ہاں نہیں ہے تو مہربانی کرکے جہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے وہاں سے منگوا دیجئے یا اُن کو لکھ دیجئے کہ ایک نسخہ میرے لئے وی ۔ پی کر دیا جائے ۔ مجھے معلوم نہیں کہاں چھپی ہے اور کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے ۔ اسی واسطے آپ کو تکلیف دی گئی ہے ۔"[11]

ایک دوسرے خط میں تفہیمات الٰہیہ کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"۔۔۔۔۔ ایک ضروری بات یاد آ گئی یہاں ایک صاحب کے پاس شاہ ولی اللہ کی تفہیمات الٰہیہ کی دوسری جلد ہے جو عاشق حسین (شاگرد شاہ ولی اللہ) کی لکھی ہوئی ہے ۔ کیا ندوہ کے کتب خانہ میں یہ کتاب موجود ہے ۔ مولوی نواب صدر یار جنگ کے ہاں جو نسخہ ہے وہ پہلی جلد ہے یا دوسری یا دونوں؟ کیا کسی نے اس کتاب کے اُردو ترجمہ کا انتظام کیا ہے ۔"[12]

۱۹۳۶ء میں علامہ نے INTRODUCTION TO THE STUDY OF QURAN کے نام سے ایک اہم کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ابتدائی خاکہ بنا کر کام شروع کر دیا تھا اور بطورِ خاص شاہ ولی اللہ کی کتابیں پیش نظر تھیں ۔ مولانا احمد رضا خان بجنوری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"کیا آپ کسی ایسے بزرگ کا نام تجویز فرما سکتے ہیں جن کی نظر فقہ اسلام و اصولِ فقہ پر وسیع ہو اور جو شاہ ولی اللہ کے فلسفے اور اُن کی کتابوں پر پوری بصیرت رکھتے ہوں ۔ اگر کوئی ایسے بزرگ مل جائیں تو میں اُن کو اپنی کتابوں کے سلسلے میں کچھ مدت کے لئے اپنے پاس رکھ لوں گا اور اس مدد کا جو مجھے اُن سے ملے گی مناسب معاوضہ دوں گا ۔"[13]

افسوس کہ علامہ کی زندگی نے وفا نہ کی اور Introduction to the Study of Quran نہ لکھی جا سکی ۔ اگر یہ کتاب لکھی جاتی تو اِس میں فکرِ ولی اللٰہی کا پرتو خطبات کی نسبت کہیں زیادہ ہوتا ۔

علامہ نے شاہ صاحب کی کتابوں میں سب سے زیادہ اہمیت "حجۃ اللہ البالغہ" کو دی ہے ۔ اُن کے الفاظ میں "حجۃ اللہ البالغہ منجملہ اُن تصنیفات کے ہے جنہوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ کی رہنمائی کی ۔"[14]

تفہیمات الٰہیہ ۔ جس میں زیادہ تر تصوف سے متعلق مقالات ہیں انھیں پسند نہ آئی سید سلیمان ندوی صاحب کو اپنے تاثر سے آگاہ کرتے ہوئے اُن کی رائے دریافت کرتے ہیں ۔

"شاہ ولی اللہ کی کتاب تفہیمات الٰہیہ میں نے ڈابیل سے منگوائی ہے اِس کتاب سے مجھے بہت مایوسی ہوئی آپ کی رائے اِس کی نسبت کیا ہے ؟"[15]

سید نذیر نیازی صاحب نے علامہ کی ایک گفتگو نقل کی ہے کہ :

"شاہ صاحب کی شخصیت بڑی عظیم ہے مگر اُن کی حقیقی عظمت کا اظہار حجۃ اللہ البالغہ میں ہوا۔ باقی تصنیفات بھی غنیمت ہیں لیکن تصوف میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے میں اُس کا قائل نہیں مثلاً افادات (تفہیمات ؟) ہی ہیں ...... کوئی خاص بات نہیں[۱۱]۔"

علامہ شاہ صاحب کے متصوفانہ خیالات سے اس لئے اتفاق نہ کر سکے کہ علامہ فلسفۂ وحدت الوجود کے ناقدین میں سے ہیں جبکہ شاہ صاحب اسے حضرت مجدد الف ثانی کے تصورِ وحدت الشہود کے ساتھ تطبیق دے کر درست قرار دیتے ہیں۔

شاہ صاحب اور علامہ اقبال کے تصورات کا تقابلی مطالعہ کرنے سے حیرت انگیز مماثلت نظر آتی ہے۔ عبادت، مطالعہ کائنات، دُعا کی ضرورت اور اس کا فلسفہ اور نظریہ ارتقاء کے بارے میں علامہ کی تحریریں پڑھنے سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ شاہ صاحب نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں جس علمی و کلامی روایت کی بنیاد رکھی تھی علامہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ مختصر مقالہ ان اُمور کی تفصیلات کا متحمل نہیں ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ شاہ صاحب اور اقبال کے افکار کا مطالعہ کیا جائے اسی طرح دوسرے مسلمان متکلمین اور فلاسفہ کے ساتھ علامہ کا رابطہ و تعلق اور اتفاق و اختلاف کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔ اس طرح مسلمانوں کے فکری ارتقاء کے بہت سے گوشے پہلی بار سامنے آنے کی توقع ہے۔

حواشی

۱ تاریخ علم الکلام ص: ۱۰۹۔

۲ اقبالنامہ حصہ اوّل ص: ۴۹۔

۳ ایضاً ص: ۳۵۸۔

۴ حجۃ اللہ البالغہ کا پہلا ترجمہ مولانا عبدالحق حقانی نے کیا جو پہلی بار ۱۸۹۳ء میں مطبع رحمانی پٹنہ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد مولوی خلیل احمد اسرائیلی کا ترجمہ "آیات اللہ الکاملہ" ۱۸۹۷ء میں لاہور سے چھپا۔ کچھ عرصہ بعد مولوی خلیل احمد اسرائیلی کے ترجمہ کی نقل، "شموس اللہ البازغہ" از مولوی عبدالحق ہزاروی بھی لاہور سے شائع ہوا۔ ایک نامکمل ترجمہ محمد بشیر کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ مولانا محمد اسماعیل گودھروی نے "برہانِ الٰہی" کے نام سے ترجمہ کیا اور لاہور سے چھپا۔ ان کے علاوہ ایک سادہ اور سلیس ترجمہ مولانا عبدالرحیم کلاچوی نے بھی کیا ہے جو لاہور ہی سے دو بار طبع ہو چکا ہے۔

۵ خطوطِ اقبال ص: ۱۶۳ - ۱۶۴۔

۶ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص: ۱۴۵۔

۷ حجۃ اللہ البالغہ (ترجمہ) ص ۴۔

۸ے تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۴۶ ۔

۹ے حجۃ اللہ البالغہ (موت کی حقیقت، عالمِ برزخ میں لوگوں کے مختلف احوال) ص ۹۸ - ۹۹ ۔

۱۰ے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۸۴۔

۱۱ے اقبالنامہ حصہ اوّل ص ۱۹۸ ۔

۱۲ے اقبالنامہ حصہ اوّل ص ۱۸۸ ۔

۱۳ے اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۴۱-۲۴۲ ۔

عبدالرشید طارق نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ میں نے Introduction To The Study of Quran جو وہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، کے متعلق تذکرہ چھیڑا تو فرمانے لگے ہاں، ذرا صحت اچھی ہو تو لکھنا شروع کروں گا۔ چاہتا ہوں کہ کوئی پڑھا لکھا وسیع النظر اور صحیح المشرب فاضلِ دیوبند میسر آجائے۔ مجھے حوالجات تلاش کر کے دیتا رہے اور لکھتا جائے۔ انگریزی سے واقف ہو تو نہایت ہی اچھی بات ہے میں تنخواہ بھی دینے کو تیار ہوں۔" ملفوظاتِ اقبال ص: ۳۱۰

۱۴ے اقبال کے حضور میں ص ۳۴۳ ۔

۱۵ے نوادرِ اقبال۔ سہ ماہی اقبال" لاہور بابت اکتوبر ۱۹۷۶ء

۱۶ے اقبال کے حضور میں ص ۳۰۱ ۔

اقبال ۔ شاعرِ عالمِ انسانی

پروفیسر ملک حسن اختر

علامہ اقبال کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں مگر یہ بات درست نہیں ہے اور محض تعصب پر مبنی ہے ۔ غیر متعصب غیر مسلموں نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ اقبال ساری انسانیت کا شاعر ہے ۔ سر تیج بہادر سپرو لکھتے ہیں :-

" میرے خیال میں اقبال کے ساتھ وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر تھا ۔ یہ کہنا اس کے دائرۂ اثر کو محدود کرنا ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ ، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی نے آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا یا کالیداس کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا ، ان کے اثر کو محدود نہ کیا اور نہ مذہب کے لوگوں نے اس وجہ سے ان کی قدردانی میں کمی کی "

اگر اس وجہ سے کسی شاعر کی آفاقیت سے انکار کیا جائے کہ وہ فلاں مذہب یا ملک سے تعلق رکھتا ہے تو اس طرح دنیا کا کوئی شاعر بھی ساری انسانیت کا شاعر نہ کہلا سکے گا ۔ شیکسپیئر جسے دنیا کا عظیم شاعر سمجھا جاتا ہے بھی انگلستان کے بادشاہوں کے قصے سناتا ہے اور اپنی مذہبی اور تاریخی روایات سے آزاد نہیں ہے چنانچہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ کسی شاعر کا مذہب یا اس کے تاریخی روابط اسے آفاقیت کے تاج سے محروم نہیں کر سکتے ۔

دوسرے شاعروں کی نسبت علامہ اقبال کو صرف مسلمانوں کا شاعر قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی شعائر کا پرچار شدت سے کیا ہے لیکن اقبال دوسرے شاعروں سے اس طرح مختلف ہے کہ اس نے ایک اچھا معاشرہ تخلیق کرنے کے لئے ایک خاص فلسفہ پیش کیا ۔ وہ شاعر ہی نہیں بلکہ فلسفی بھی ہے اور اس نے ساری دنیا میں مروج نظاموں کا جائزہ لے کر اسلام کو پسند کیا ہے وہ اس لئے اسلام کا پرچارک نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا تھا اور یہ بھی بڑے ظلم کی بات ہوگی کہ انسان جس مذہب کی گود میں پرورش پائے اس کے معاشرتی نظام کا مقابلہ دوسروں سے نہ کرے ۔ وہ ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں :

" میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوتِ طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطعِ نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید ذات پات رتبہ و درجہ ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے ۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں بھی نہایت ژرف نگاہ ہے اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی

لذا نُذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے اور حسنِ معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسائیوں کے بارے میں اسی قسم کا رویہ اختیار کیا جائے، یورپ اس گنجِ گراں مایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیض سے حاصل ہو سکتی ہے۔"

اور علامہ اقبال ہی نہیں غیر مسلموں کی بھی اسلام کے متعلق یہی رائے ہے مشہور مصنف بریفالٹ نے اپنی کتاب "تعمیرِ انسانیت" میں لکھا ہے:

"آزادی، مساوات، اخوت، مشورہ اور عوامی رائے دہندگی کے بلند اصول جنہوں نے فرانسیسی انقلاب اور اعلانِ حقوقِ انسانی میں روح پھونکی۔ جنہوں نے امریکی آئین کی راہ نمائی کی اور لاطینی امریکہ کی جدوجہد آزادی کو تقویت بخشی وہ اصول مغربی ایجاد نہیں بلکہ ان تمام کا منبع قرآن ہے۔ یہ امرِ واقعی ہے کہ عربوں کے بغیر موجودہ مغربی تہذیب جنم ہی نہ لیتی۔ اس قدر تو یقینی ہے کہ عرب نہ ہوتے تو اس تہذیب پر وہ رنگ اور نکھار نہ آتا جس کی وجہ سے یہ سابقہ تہذیبوں سے سبقت لے گئی۔"

اسی طرح کونٹ آسٹر ورگ نے ۱۹۲۷ء میں لندن یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"منطقی ساخت کے نقطۂ نگاہ سے اسلامی قانون ایک نایاب کمال کا حامل ہے اور آج تک وہ قانون کے طالب علم سے اپنا سکہ منواتا ہے جب قبول کر لیا جائے کہ محمدؐ کو وحی آتی تھی جو جو نتائج اس وحی سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ان کی منطق اور ان کی صرف و نحو ایسی بے عیب ہے کہ انسان نہ صرف تعریف کرتا ہے بلکہ حیران رہ جاتا ہے کہ نویں صدی عیسوی کے ان مشرقی مفکرین نے اپنے دین کی بنیاد پر آج کل کے مشہور انسانی حقوق کو بالکل انہی الفاظ میں بیان کیا جن الفاظ میں وہ آج کل بیان ہوتے ہیں۔ انہوں نے جنگ کا قانون ایسا وضع کیا جس کو بڑھ کر ہماری گزشتہ عالمی جنگ میں حصہ لینے والے کچھ فریق شرمائیں گے اور انہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ سلوک کے ایسے فیاضانہ اصول وضع کئے کہ مغرب نے اس قسم کے اصول قبول کرنے میں ایک ہزار سال کی دیر کر دی۔"

جن اصولوں اور قوانین کی وجہ سے ان مغربی مفکرین نے اسلام کی تعریف کی ہے ان کا منبع قرآن ہے اور اسلامی حکومت میں قرآن کو آئین کا درجہ حاصل ہے جسے حکومت یا پارلیمنٹ یا کوئی بھی با اختیار ادارہ یا شخص تبدیل نہیں کر سکتا۔ حقوقِ انسانی کی حفاظت خدائی حکم ہے اور اسے نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ علامہ اقبال نے جاوید نامے میں "حکومتِ الٰہی" کے عنوان سے جو شعر کہے ہیں ان سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین مخصوص مفادات کے حامل ہوتے ہیں مگر خدا کا بنایا ہوا قانون سارے انسانوں کے مفادات کا محافظ ہوتا ہے۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام — نے غلام او را نہ او کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس — ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق — زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق
عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ
غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود زور ور بر ناتواں قاہر شود

اقبال کے نزدیک وہ تمام آئین بادشاہوں اور آمروں کے آئین ہیں جو غریب کو غریب تر بنانے چلے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ انسانیت کی خدمت نہیں بلکہ انسانیت کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے مترادف ہے۔

حاصلِ آئینِ دستورِ ملوک
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

چنانچہ علامہ اقبال اگر اسلامی آئین یعنی قرآن کے حامی ہیں تو اس لئے کہ وہ انسانیت کی خدمت کا کام دوسروں کی نسبت بہتر طریق پر سرانجام دیتا ہے۔ انہوں نے مغربی جمہوریت کو اس لئے رَدّ کیا کہ یہ بادشاہی کی ہی بدلی ہوئی صورت ہے۔ جب انسان اپنے حقوق سے آشنا ہوا تو ہوشیار امراء نے جمہوریت کے نام پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نظام میں کبھی کوئی غریب پارلیمان کا ممبر نہیں بن سکتا کیونکہ اشتہار بازی اور الیکشن کی مہم چلانے کے لئے کافی روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے نیز اس میں ممبری کے خواستگار کے کردار پر نظر نہیں رکھی جاتی چنانچہ پارلیمان کے ممبر زیادہ تر اپنے ہی حقوق کا تحفظ کرتے ہیں۔ اقبال اس چیز کو انسانیت کے بنیادی تقاضوں کے خلاف سمجھتے ہیں چنانچہ ان کی نظم " ابلیس کی مجلسِ شوریٰ " میں ابلیس کا ایک مشیر کہتا ہے :

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

ابلیس ہی کی زبان سے وہ اسلام کی خصوصیات کو گنواتے ہیں جن کی وجہ سے اسلام ابلیسی نظام کے لئے خطرہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ان اشعار کے مطالعہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اسلام کو اس کی اصلی حالت میں دیکھا جائے تو وہ انسانیت کا علمبردار ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اس کے رُخِ زیبا کو عریاں کرنے کی کوشش نہیں کی اور بے کار بحثوں میں الجھ کر اس دین کو ناکارہ بنا دیا ہے۔ اقبالؔ اس دین کی حقیقی صورت کے شیدا ہیں جسے دیکھ کر ابلیس کانپ اٹھتا ہے اور کہتا ہے :

الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر حافظِ ناموسِ زن مرد آزما مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب　　یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے　　یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اسلام انسانیت کا مذہب ہے۔ وہ رنگ، نسل اور جغرافیائی حدود میں قید نہیں ہے بلکہ وہ خالص انسانی بنیادوں پر استوار ہوا ہے چنانچہ اقبال بھی اسلام کی طرح انسانیت کا شاعر ہے اور اس نے بھی رنگ، نسل اور جغرافیے کے امتیازات کو مٹا دیا ہے۔ انہوں نے مغرب کے وطنیت کے سیاسی تصور کی اس لئے مخالفت کی کہ یہ ایک قوم کو دوسری قوم سے لڑا دیتا ہے اور انسانیت کو بھلا کر اقوام کا پرستار بنا دیتا ہے ؎

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند　　بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند　　نوعِ انساں را قبائل ساختند
ایں شجر جنت ز عالم بردہ است　　تلخیٔ بیکار بار آوردہ است
مردمی اندر جہاں افسانہ شد　　آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند　　آدمیت گم شد و اقوام ماند

اسلام دینِ فطرت ہے اور فطرت انسانوں کی ملکیت ہے فطرت کا مقصود اور مسلمانی کا تقاضا دونوں ایک ہیں۔

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

اسلام اسی محبت کے رشتے میں باندھ کر ساری انسانیت کو ایک پلیٹ فارم پر لانا چاہتا ہے اور ملتِ اسلامیہ کو ملتِ آدم کے مترادف سمجھتا ہے کیونکہ وہ عزت و امارت، بلندی و پستی اور رنگ و نسل کے امتیاز کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ اقوامِ متحدہ کی بجائے جمعیتِ آدم کو وجود میں لانا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام　　پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود　　اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام　　جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

اخوت اور محبت تمام عالمِ انسانی کو ایک ملت بنا سکتی ہیں۔ ان کے سوا انسان کا انسان سے کوئی رشتہ نہیں۔ اگر ایک طبقہ، ملک یا قوم کے لوگ دوسرے طبقہ، ملک یا قوم سے نفرت کریں تو وہ انسانی برادری کے فرد نہیں ہو سکتے کیونکہ انسانیت کا مذہب محبت اور اخوت ہے۔ جب انسان انسان سے ملتا ہے تو بندہ و آقا کا فرق مٹ جاتا ہے اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کرے تو وہ انسانیت کی توہین

کرتا ہے بقول اقبال

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اسی بنیاد پر انہوں نے سوشلزم کی تعریف کی کیونکہ اس کے ذریعے غریبوں اور مزدوروں کو اپنی طاقت کا اندازہ ہوا، ورنہ وہ سوشلزم کو کلی طور پر قبول نہیں کرتے اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ جبر سے کام لیتا ہے اور انسان کی انسانیت کا احترام نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کی سوچ پر تالے لگا دیتا ہے اور حکمران طبقہ کے خلاف آواز بلند کرنے کی اجازت نہیں دیتا یعنی طریق کوہکن نے بھی پرویزی حیلے اختیار کر لیے ہیں۔ جہاں انسان کو پیٹ بھر کر روٹی چاہیئے وہاں آزادی کی زندگی بھی چاہیے مگر افسوس کہ سوشلزم نے صرف پیٹ کی مساوات پر اپنی بنیاد رکھی۔

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

علامہ اقبال نے خضرِ راہ میں مزدوروں کے متعلق جو اشعار خضر کی زبان سے کہے ہیں۔ وہ ان کی مزدور دوستی کا بین ثبوت ہیں۔ انہوں نے ان اشعار میں مزدوروں کے استحصال کی تمام صورتوں کی بھی نشاندہی کر دی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسلامی مساوات کے اس پیغام کو جو حضرتِ خضر نے دیا ہے پیامِ کائنات قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا پیغام اور کائنات کا پیغام دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ حضرتِ خضر کا یہ پیغام دراصل انسانیت کی پکار ہے:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے، یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش — اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ — خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے — سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ایک دوسرا مظلوم طبقہ کسانوں کا ہے۔ علامہ اقبال نے جو نظم "فرمانِ خدا" کے نام سے کہی ہے اس میں غریبوں اور کسانوں کی بڑے زوردار انداز میں حمایت کی گئی ہے۔ اتنی زوردار نظم کسی اور انسان دوست کے قلم سے نہیں نکلی۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

اس نظم میں علامہ اقبال نے کہیں بھی مسلم اور غیر مسلم کی تمیز نہیں کی۔ مزدور اور کسان خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ان کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے اور جو لوگ ان پر ظلم کرتے ہیں وہ انسان دوست نہیں ہیں اور نہ انھیں خدا دوست ہی کہا جا سکتا ہے اس نظم میں جہاں مٹی کا حرم بنانے کا ذکر ہے وہاں پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دینے کا حکم بھی دیا گیا ہے تاکہ خدا اور مخلوق میں براہِ راست رابطہ قائم ہو سکے۔ کلیسا، حرم اور دیر کا ذکر ایک ساتھ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ علامہ اقبال ساری انسانیت کی وکالت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ساری دنیا کے غریب ان کے نزدیک عزت اور احترام کے مستحق ہیں اور ساری دنیا کے ظالم ان کی نفرت کا نشانہ بنتے ہیں۔

علامہ اقبال نے انسان اور خدا کا رشتہ مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ جب یہ رشتہ مضبوط بنیادوں پہ استوار ہوگا، تو استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انھوں نے ان تمام جذبات و احساسات کو بھی بیان کیا ہے جو انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں خدا نے انسان کو زمین کا مالک بنا کر بھیجا مگر اس نے یہاں آ کر کیا کیا۔

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا!
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا؟

خدائی میں مشکلات ہیں مگر بندگی خدائی سے بھی زیادہ دوبھر ہے۔ علامہ اقبال نے اس کا اظہار ایک رباعی میں بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے:

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے — خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ — یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

اور انسان کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہے کہ جب خدا ہر چیز پہ قادر ہے تو پھر دنیا میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا ذمہ دار اسے کیوں ٹھہرایا جاتا ہے:

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا — مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی — خطا کس کی ہے یا رب لامکاں تیرا ہے یا میرا
اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر — مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

انسان خدا کے ہنر کا شاہکار ہے اگر یہ پستی میں گر گیا تو یہ چیز انسان سے زیادہ خدا کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی کیونکہ اس نے انسان کو بڑے فخر سے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا تھا اور فرشتوں کی مخالفت کی بھی پروا نہ کی تھی۔

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

انسان کی حفاظت اس لئے بھی ضروری ہے کہ فرشتوں کی نسبت اس نے خدا کی زیادہ خدمت کی ہے۔ مقامِ شوق قدسیوں کے بس کا نہیں ہے، اس کا امین انسان ہی ہے اس لئے وہ فرشتوں سے زیادہ اہم ہے۔ اس نے اس زمین کو آباد کرنے کے لئے بڑی محنت کی ہے۔ فرشتے تو اس کے مقابلے میں بڑے تن آسان ہیں۔

قصوروار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ وہ تیرا جہانِ بے بنیاد

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

مگر اس کے باوجود اللہ نے انسان کو بڑی مختصر عمر عطا کی ہے۔ اگر خدا اسے عمرِ جاوداں عطا کرتا تو انسان اس سے بھی زیادہ ذوق و شوق کا مظاہرہ کرتا۔ اسے ہمیشہ یہ گلہ رہتا ہے کہ ابھی اس کا کام مکمل نہیں ہوا۔

کہ پہلے مجھ کو زندگیٔ جاوداں عطا — پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بیقرار کا

چلیئے حیاتِ مختصر ہی سہی اس تھوڑی سی زندگی میں بھی انسان نے بڑے کام کئے ہیں مگر یہ بات علامہ اقبال کو خون کے آنسو رلاتی ہے کہ مردانِ ہنرمند اکثر خوار و ذلیل رہتے ہیں۔ انسانوں میں بھی فرقِ مراتب ضروری ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں۔

یا رب یہ جہانِ گذراں خوب ہے لیکن — کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند؟

مگر یہ بے انصافی تو خود انسانوں نے انسانوں کے ساتھ روا رکھی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال انسانوں کے ان طبقوں پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں جو دوسروں کا استحصال کرتے ہیں۔ انہوں نے ملا۔ فقیہ اور واعظ کے ساتھ ساتھ کلیسا و دیر کے نگہبانوں کی بھی خبر لی ہے۔ جو بھی انسانیت کے تقاضے پورے نہ کرے اقبال اسے معاف نہیں کرتے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے　　فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی　　سماتی کہاں اس فقیری میں میری

بہ پیرانِ کلیسا و حرم اے وائے مجبوری　　صلہ ان کی کد و کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے　　خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے
رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی　　فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا
نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ
یہی شیخ ہے حرم جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو　　یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد
فقیہہ شہر کی تحقیر کیا مجال مری　　مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈ رہا ہوں دل کی کشاد
رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم　　عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

آخری شعر میں انہوں نے کس خوبصورتی سے ہندوؤں کے لئے اسلامی تلمیح کو استعمال کیا ہے۔

اقبال انسانیت کی بھلائی کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی طاقت ور کی خوشامد نہیں کی اور نہ اس وجہ سے مسلمانوں کی تعریف کی کہ وہ مسلمان ہیں۔ حافظ اور محی الدین ابن عربی پر انہوں نے تنقید کی تو ان کے بہت سے دوست بھی ناراض ہو گئے مگر انہوں نے ان کی خاطر اس بات کو چھپایا نہیں جسے وہ سچ سمجھتے تھے۔ وہ اپنے متعلق کہتے ہیں:

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند

انہوں نے صرف اشعار میں یہ بات نہیں کہی بلکہ عمل سے بھی اسے ثابت کر دیا۔ وہ ہمیشہ سچائی کی تلاش میں رہے اور جہاں بھی اسے پایا حاصل کر لیا۔ ان کی رائے سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر ان کی نیت پہ شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے گوتم، نانک اور رام کی تعریف کی تو ایک مولوی نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دے دیا مگر انہوں نے اس کی پروا نہ کی اور جہاں بھی اچھائی نظر آئی اس کی بدستور تعریف کرتے رہے چنانچہ اسرارِ خودی کے دیباچے[1] میں انہوں نے ایک بار پھر رام اور کرشن کے اندازِ فکر کو سراہا۔

"بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کلی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے بلکہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دلبستگی نہ ہو۔ سری کرشن کے بعد سری رام نوج بھی اسی راستے پر چلے مگر افسوس کہ جس عروسِ معنی کو سری کرشن اور سری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے سری شنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا۔"

انہوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی ترکش کے زہریلے تیر چلائے ہیں کیوں کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو غلام بنا لیا تھا مگر ان کی قوتِ عمل کی بھی تعریف کی ہے۔ اسرارِ خودی کے دیباچے میں ہی وہ آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"حق یہ ہے کہ انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں حسِ واقعات اور اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دماغ بافتہ فلسفیانہ نظام جو واقعاتِ متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہوا انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیاتِ عالم میں خاص درجہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ اس سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظرِ ثانی کریں۔"

ان اقتباسات سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال متعصب مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ انسانیت کو چاہنے والے ہیں۔

[1] یہ دیباچہ صرف طبع اول میں شامل ہے بعد میں نکال دیا گیا۔ (ادارہ)

اور پوری انسانی برادری میں جہاں انھیں خوبی اور اچھائی نظر آتی ہے، اس کی تعریف کرتے ہیں۔
انہوں نے نطشے کی تعریف بھی اسی لئے کی ہے کہ اس کا دل انسان کی پستی پر کڑھتا تھا۔

از مستیٔ عناصرِ انساں دلش تپید
فکرِ حکیم پیکرِ محکم تر آفرید
افگند در فرنگ صد آشوبِ تازہ
دیوانہ بکار گہِ شیشہ گر رسید

اسی طرح آئن سٹائن کی عالمِ انسانی کے لئے خدمات کی وجہ سے تعریف کی۔

من چہ گویم از مقامِ آں حکیمِ نکتہ سنج
کردہ زردشتے ز نسلِ موسیٰ دہارون ظہور

اقبال انسانی عظمت کے قائل ہیں۔ اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے تن آسان قدسیوں سے انسان کا مرتبہ بلند بتایا ہے۔ ان کے نزدیک تو انسان کا سینہ عرشِ معلی سے کم نہیں ہے۔

عرشِ معلی سے کم سینۂ آدم نہیں — گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہر کبود
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا — اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود

علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" لکھی ہے اس میں انہوں نے فرشتوں کی زبان سے فطرتِ انسانی کو بیان کیا ہے:۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی — خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن — تیری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی — اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی

اور روحِ ارضی انسان کا استقبال کرتے ہوئے اس کی عظیم صلاحیتوں کا ذکر یوں کرتی ہے:

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

انسان کی بیتابی، کوششِ پیہم اور جفا طلبی اُسے نئی دنیاؤں کی تسخیر پر اکساتی رہتی ہے چنانچہ اقبال انسان سے کہتے ہیں کہ اس کے سامنے سیکڑوں جہان ہیں جن کو وہ اپنی محنت، ہمت، کوشش سے (جو عشق کے کارندے ہیں) فتح کر سکتا ہے:۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں "
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اور جب یہ شاہین پرواز کرتا ہے تو ستارے سہم جاتے ہیں کیونکہ وہ بھی اس کی زد میں ہیں:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

مگر مسلمانی ہو یا دیر کی دربانی جب تک انسان نعرۂ مستانہ مار کر آگے نہیں بڑھتا اور جرأت رندانہ سے کام نہیں لیتا اس وقت تک وہ عروج کی منزلیں طے نہیں کر سکتا۔

یا شرعِ مسلمانی یا دیر کی دربانی
یا نعرۂ مستانہ کعبہ ہو کہ بت خانہ
میری فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

انسان کی عظمت کے ساتھ ساتھ اقبال اس کی آفاقیت پر بھی یقین رکھتے ہیں کیونکہ انسان اگر کسی ملک میں محدود ہو کر رہ جائے تو دوسرے انسان کا دشمن بن جائے گا۔

نہ چینی و عربی وہ، نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

انسان کی آفاقیت میں جغرافیائی حدود حائل ہوتے ہیں یا پھر رنگ، نسل اور خون انسان کو انسان سے لڑا دیتے ہیں۔ وہ ان امتیازات کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

انسان کی عظمت اور آفاقیت کے بعد وہ انسانی آزادی کے بھی اسی شدت سے قائل ہیں کیونکہ آزادی کے بغیر انسان ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ انسان اگر انسان کا غلام ہو تو یہ بہت بری بات ہے چنانچہ علامہ نے غلامی کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ ایک انسان کے ایک انسان اور ایک قوم کے ایک قوم کو غلام بنانے کو سخت ناپسند کرتے ہیں کیوں کہ غلامی میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے اور وہ بتدریج ناخوب کو خوب سمجھنے لگتی ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انگریزوں کے خلاف اتنا کچھ لکھا اور آزادی کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ وہ تو انسانوں کو انسان کے قانون کا بھی غلام نہیں دیکھنا چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں

کہ سارے انسان خدائی قانون کی پابندی کریں جو انسانوں کو آزادی عطا کرتا ہے کیونکہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی خواہشات اور خیالات کا غلام بنا لینا چاہتا ہے۔ آئینِ خداوندی انسانوں کو انسانوں کے جبر سے نجات دلاتا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال نے حکومتِ الٰہی کے عنوان سے کچھ شعر جاوید نامے میں لکھے ہیں جن کو ہم پہلے نقل کر آئے ہیں "خضرِ راہ" کے یہ شعر ملاحظہ ہوں جن میں اقبال نے کہا ہے کہ حکمرانی صرف خدا کے لائق ہے لہٰذا انسان سب برابر ہیں اور اس کے بندے ہیں:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے　　حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن　　تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

چنانچہ صوفی و ملا کی غلامی بھی درست نہیں ہے۔ ہم براہِ راست خدا تک پہنچ سکتے ہیں:

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی

رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

مذہب کے ٹھیکیداروں کی غلامی کو توڑ کر دنیا داروں کی غلامی میں آ جانا اس سے بھی بری بات ہے۔ اقبال امیروں کے در پہ سجدہ کرنے اور اپنے ضمیر کا سودا کرنے کو درست نہیں سمجھتے:

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں　　غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن　　کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

جو شخص حکمرانوں کے ساتھ مل بیٹھتا ہے یہ سمجھتا ہے کہ وہ ان کا شریکِ حکم ہو گیا ہے۔ یہ اس کی غلط فہمی ہوتی ہے کیونکہ اُمرا اور بادشاہ اس کے ادراک کو خرید لیتے ہیں بقول اقبال:

مگر یہ بات چھپائے سے چھپ نہیں سکتی　　سمجھ گئی ہے اسے ہر طبیعتِ چالاک

شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے　　خریدتے ہیں فقط ان کا جوہرِ ادراک

غلامی میں انسان ذوقِ حسن و زیبائی سے محروم ہو جاتا ہے اور پھر اس کی کوئی رائے درست نہیں ہوتی کیونکہ وہ اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کی بجائے دوسروں کی آنکھ سے دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی　　جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر　　کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے زیبا

جب انسان دنیوی ضرورتوں کا غلام ہو جائے گا تو وہ آزادی کی نعمت کھو بیٹھے گا۔ انسان کا کام دنیا کی غلامی نہیں بلکہ اس پر حکومت کرنا ہے اور اگر اس میں حکومت کرنے کی سکت نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ دنیا سے ہی کنارہ کش ہو جائے۔

دنیائے دوں کی کب تک غلامی

یا راہبی کر یا پادشاہی

غلامی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی ہمت پہ بھروسہ کرے اور دوسروں کا محتاج نہ ہو۔ وہ اپنی ہمت اور محنت سے زمانے

کے سمندر سے گوہر فردا نکال سکتا ہے۔

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

اگر انسانوں کو اپنی صلاحیتوں کا پتہ چل جائے اور انھیں اپنی ہمت پر یقین ہو تو بھر کمزور بھی طاقت وروں سے لڑ جاتے ہیں۔ اسی لئے تو علامہ نے کہا ہے:

گر ماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

غلامی کی ایک اور شکل یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو تقدیر کے سامنے مجبورِ محض خیال کرتا ہے۔ تقدیر کا یہ تصور انسانی آزادی پر بہت بڑی ضرب ہے چنانچہ علامہ اقبال نے اس بات پر بڑا زور دیا کہ انسان ہر قسم کے جبر سے آزاد ہے اور وہ تقدیر کا غلام نہیں بلکہ تقدیر شکن ہے۔

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

اقبال اس بات کی بھی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ انسان کی تقدیر ستاروں سے وابستہ ہے۔ لوگوں کا یہ عقیدہ کس قدر عجیب ہے کہ بے جان ستارے جو خود اپنی تقدیر کے بھی مالک نہیں ان کو انسانوں کی تقدیر متعین کرنے والا سمجھا جائے۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

اور ستارہ تو کیا علامہ اقبال کہتے ہیں کہ خود خدا بھی ہماری مرضی میں دخل انداز نہیں ہوتا۔ وہ اپنے انگریزی خطبات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جب عمل کی ایک سے زیادہ راہیں میرے سامنے ہوں تو خود خدا بھی میرے لئے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کر سکتا نہ وہ میرے لیے محسوس کر سکتا ہے یا فیصلہ کر سکتا ہے۔" (ص ۱۰۰)

انسان اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے بلکہ اس کا عمل ہی اس کی راہیں متعین کرتا ہے۔ وہ خود ہی اپنی زندگی کو جنت یا جہنم بنا سکتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بہر حال علامہ اقبال انسان کی آزادی کو اس کی سب سے بڑی صفت قرار دیتے ہیں۔ اگر انسان آزاد نہیں تو پھر وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ انسان کی عظمت، آفاقیت اور آزادی کے بعد اس کی ابدیت کے بھی قائل ہیں۔ اگر انسان تھوڑے عرصہ بعد فنا کا جام نوش کر کے معدوم ہو جانے والی چیز ہو تو پھر ظاہر ہے کہ وہ کوئی اعلیٰ ہستی نہ ہو گی۔ علامہ کہتے ہیں:

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

پنی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" میں وہ اس حقیقت کو زیادہ واشگاف انداز میں بیان کرتے ہیں ؎

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
مدت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں
جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

مگر اپنے خطبات میں اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ انسانی فطرت میں ابدیت کی صلاحیت موجود ہے مگر اسے انسان کو خود کمانا پڑتا ہے یعنی ہر انسان ابدی نہیں ہے بلکہ وہ ابدیت حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اس کے اعمال اسے ابدیت یا فنا کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہاں بھی وہ آزاد محض ہے، اس پہ فنا ہو جانے یا بقائے دوام حاصل کرنے کی پابندی نہیں ہے۔ وہ اپنے چوتھے خطبے میں لکھتے ہیں۔

"گویا زندگی وہ فرصت ہے جس میں خودی کو لاانتہا مواقع میسر آتے ہیں اور جس میں موت اس کا پہلا امتحان ہے تاکہ وہ دیکھ سکے کہ اسے اپنے اعمال کی شیرازہ بندی میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ اعمال کا نتیجہ نہ تو لطف ہے اور نہ درد۔ اعمال یا تو خودی کو سہارا دیتے ہیں یا اس کی ہلاکت اور تباہی کا سامان پیدا کرتے ہیں لہٰذا یہ امر کہ خودی فنا ہو جائے گی یا اس کا کوئی مستقبل ہے، عمل پہ موقوف ہے اور اس لئے خودی کو برقرار رکھیں گے تو وہی اعمال جن کی بنا اس اصول پہ ہے کہ ہم بلا امتیاز من و تو خودی کا احترام کریں[1] لہٰذا بقائے دوام انسان کا حق نہیں۔ اس کے حصول کا دار و مدار ہماری مسلسل جد و جہد پہ ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم اس کے امیدوار ہیں۔" (ترجمہ نذیر نیازی)

علامہ اقبال کے اس بیان سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ انسان کے عمل اس کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں چنانچہ بے عمل انسان سے باعمل انسان بدرجہا بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودی کا سب سے بڑا ہتھیار انہوں نے عمل کو قرار دیا ہے۔ عمل کی تخلیق کا ایک بڑا ذریعہ عشق ہے اس لئے علامہ اقبال نے عشق کی بے حد تعریف کی ہے[2]۔ عمل کی بنیاد آرزو پہ ہے۔ اسی سے نئے نئے مقاصد تخلیق ہوتے ہیں اور عمل کا قدم آگے بڑھتا رہتا ہے چنانچہ علامہ اقبال نے اپنے فلسفۂ زندگی میں آرزو کو بڑی اہمیت دی ہے:

---

[1] آدمیت احترامِ آدمی — باخبر شو از مقامِ آدمی

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں راقم کی کتاب "اطرافِ اقبال" کا باب "اقبال کا تصورِ عشق"۔

گرم خوں انساں ز داغِ آرزو
آتش ایں خاک از چراغِ آرزو
از تمنائے بجام آمد حیات
گرم خیز و تیزگام آمد حیات
زندگی مضمونِ تسخیر است و بس
آرزو افسونِ تسخیر است و بس

اقبال کا فلسفۂ خودی انسانیت کو اس کی اصلیت سے آگاہ کرتا ہے اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں مدد دیتا ہے جس میں کوئی شخص کسی کا محتاج نہ ہو اور یہی انسانیت کی معراج ہے بقول اقبال ؎

نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس
کس نہ باشد در جہاں محتاجِ کس

چنانچہ ثابت یہ ہوا کہ اقبال کا فلسفۂ زندگی تمام کا تمام انسانیت کی بھلائی کے لیے ہے اور مسلمانوں سے مخصوص نہیں ہے۔ البتہ مسلمان بھی عالمِ انسانی کا ایک حصہ ہیں اور ان کی بھلائی و بہتری کیلئے سوچنا عالمِ انسانی کی بھلائی اور بہتری کے لئے ہی سوچنا ہے خصوصاً اس وقت جبکہ مسلمانوں کا مذہب اسلام تمام دنیا کے قوانین اور نظاموں سے زیادہ انسانیت کی بھلائی پر یقین رکھتا ہے۔ علامہ اقبال نے خود بھی یہ کہا ہے کہ ان کا دل انسانوں کی زبوں حالی پہ کڑھتا ہے اور انہوں نے کئی راتیں انسان کی بھلائی کے متعلق سوچنے میں صرف کر دیں تب کہیں جا کہ انھیں زندگی کا راز معلوم ہوا اور انہوں نے اسے اپنے فلسفیانہ افکار اور اشعار میں انسانیت کی بھلائی کے لئے پیش کر دیا۔

بہرِ انساں چشمِ من شب ہا گریست — تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
از درونِ کارگاہِ ممکنات — برکشیدم سرِ تقویمِ حیات

پنجابی زبان وثقافت اور اقبالؒ

پروفیسر نور احمد ثاقب

پنجاب کا نام سنتے ہی ذہن میں ایک ایسے خطے کا تصور رینگ آتا ہے۔ جسے فطرت نے اپنے فیاضانہ اظہار کے لئے بطورِ خاص چن لیا ہو یا پنج پانیوں کی یہ سرزمین لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیتوں، گنگناتے جھرنوں، برف پوش پہاڑوں، چیل اور دیودار کے دیوزاد درختوں، موجیں مار کر بہتے ہوئے مستانہ دریاؤں، سبزہ زاروں، دھان اور گندم کے دور دُور تک پھیلے ہوئے کھیتوں، مارو تھل اور حدِ نظر تک وسیع ریت کے سمندر "چولستان" کے نظاروں کی زمین ہے، یہ ہل چلاتے، ڈھور چراتے، فصلیں کاٹتے، واڑے میں بیٹھ کر حقے کے کش لگاتے، دہکتے چہروں والے کسانوں ہر کڑے وقت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جانے والے بہادر عسکری نوجوانوں، جیالوں اور وسیع دلوں کے مالک گبھروؤں کا وطن ہے۔ اُن غیور عوام کی سوہنی دھرتی جو ہمیشہ غیر ملکی حملہ آوروں کے سامنے سینہ سپر رہے اپنے دیس کی آزادی کی حفاظت اپنے لہو کے چراغ روشن کر کے کی اور بدیسی لٹیروں کے خلاف آزادی کی دلہن کی مانگ میں افشاں اپنے خون سے بھری ـــــ اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں جو خطۂ ارض انگریزوں کے سامنے سب سے آخر میں، وہ بھی محض اپنے داخلی نفاق وانتشار اور گھریلو سازشوں کی وجہ سے سرنگوں ہوا، وہ بھی یہی پنجاب ہی تھا۔

یہ وہ مَردم خیز علاقہ ہے جہاں مجددِ عصر اقبال نے جنم لیا۔ وہی اقبال جس نے پاکستان کا خواب دیکھا جو مصورِ پاکستان ہے۔ دنیا میں بے شمار زبانوں میں اقبال پہ کام ہوا ہے۔ ہو رہا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جتنا بڑا شاعر ہوگا اتنا ہی اس کے کلام کی ہمہ گیر حیثیت ہوگی۔ مگر اس آفاقیت کے باوصف ہم ایک بنیادی نکتہ فراموش کر دیتے ہیں وہ یہ کہ اقبال سرزمینِ پنجاب کے ایک معروف شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہ یہیں پلے اور بڑھے اور انہوں نے تمام عمر پنجاب میں ہی بسر کی۔ سیالکوٹ شہر کی گلیوں میں ان کا بچپن گزرا۔ ان کا گھر پنجاب کے روائتی کلچر کا گہوارہ تھا۔ سادہ، بے تکلف اور سیدھی سادی طرزِ زندگی انھیں اپنے والدین سے ورثہ میں ملی تھی۔ گھر کا ماحول صاف ستھرا، پاکیزہ اور بھرپور پنجابیت کا آئینہ دار تھا۔ اقبال کا ڈیل ڈول اور جُثہ بھی پنجاب کے روائتی گبھرو اور کڑیل جوانوں کی یاد دلاتا تھا۔ مرزا جلال الدین اقبال سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

> "اقبال کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی، ان کے چہرے کے خد و خال کی موزونیت ان کے قد و قامت کا تناسب اور ان کے جسم کی ساخت انہی انفرادی خصوصیات کی حامل تھیں، جن کی وجہ سے پنجابی ہر جگہ ممیز کئے جاتے ہیں۔"[1]

اقبال کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ ان کا ذہن کلاً مشرقی، مزاج پنجابی اور فکر اسلامی تھا اور آج کے معمولی ولایت پلٹ لوگوں (جن

کو علم و ثقافت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں) سے قطعی مختلف ہے اور ہم حیران ہوتے ہیں کہ علومِ مغربیہ کے فاضل اجل، انگریزی زبان کے بہترین انشاپرداز اور یورپ کی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہونے کے باوجود وہ مغربی طرزِ زندگی سے حیرت انگیز طور پر محفوظ تھے۔ اس سلسلہ میں ـــــــ حجاب امتیاز علی تاج کے بیان کا حوالہ بے جا نہ ہوگا۔ وہ لکھتی ہیں:

"مسلم لیگ ایجوکیشن کانفرنس نے علامہ صاحب کو پنجاب سے جنوبی ہند چند اہم لیکچر دینے کے لئے کالے کوس بلایا تھا۔ میں اپنے والد کے ساتھ مدراس سے ایک اسٹیشن دور ان کا استقبال کرنے کے لیے جا پہنچی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک انگریزیت میں رچا بسا تھا۔ تعلیم، معاشرت، زمین۔ آسمان سبھی کچھ انگریزی میں ہوتا تھا۔ میرا لباس انگریزی تھا۔ شوق و ولولہ کے ساتھ میں تصوراتی دنیا میں غرق تھی، خیال تھا۔ صبح کا وقت ہے علامہ صاحب ایک اعلےٰ درجے کے ہلکے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ہوں گے۔ نکٹائی بھی میچ کر کے لگا رکھی ہوگی۔ انگلیوں میں موٹا سا سگار سلگ رہا ہوگا۔ ٹرین پلیٹ فارم پہ آ کر رکی۔ ہم سب فسٹ کلاس کے ڈبوں میں جھانک جھانک کر دیکھتے رہے۔ مگر خلاف توقع علامہ صاحب سیکنڈ کلاس میں تھے۔ مجھے ذہنی دھچکہ لگا، اتنا عظیم آدمی اور سیکنڈ کلاس میں ـــــــ شاعرِ مشرق، استقبال کے لئے آئے ہوئے میزبانوں سے ہاتھ ملانے اور رسمی باتیں کرنے لگے میں ورطۂ حیرت میں غوطہ زن ایک کونے میں کھڑی انھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ یعنی اپنے بچپن کے گیتوں کے ہیرو کو ـــــ وہ نہ اعلیٰ درجے کے ہلکے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ نہ اُن کی انگلیوں میں موٹا سگار جل رہا تھا۔ انہوں نے پنجابی شلوار پہن رکھی تھی اور کرتے پہ واسکٹ۔ پاؤں میں دیسی جوتی جو کہانی کی کتابوں میں، میں نے جادوگروں کو پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے تصورات کی جنت پارہ پارہ ہوگئی۔ وہ تو خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے کے الف لیلوی کردار نکلے۔"[۲]

اقبال کا لباس ہمیشہ وہی رہا جو پنجاب کے عام لوگوں کا لباس تھا۔ عدالت میں جاتے تو سُوٹ پہن لیتے لیکن جتنی دیر سوٹ پہنے رہتے کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آتے۔ اور گھر واپس آتے ہی علی بخش کو آواز دیتے کہ سب سے پہلے یہ جامہ اتروا ؤ اور انسانوں کے سے کپڑے پہناؤ۔ پرائیویٹ لباس یہ تھا۔ سر پہ ترکی یا کلپاک ٹوپی۔ سردیوں میں پشاوری ٹکا، قمیص، شلوار، چھوٹا کوٹ، پاؤں میں دیسی جوتی۔ گھر پہ گرمیوں میں صرف بنیان اور تہمد یا شلوار۔ سردیوں میں ان دونوں کپڑوں پہ صرف ایک قمیص کا اضافہ ہو جاتا۔ البتہ پشمینے کا دُھسہ اوڑھے رہتے۔ جرمن خاتون جنھیں گھر میں چھوٹے بڑے سب آپا جان کہتے تھے، جب بچوں کے لیے گورنس کی حیثیت سے لاہور آئیں تو بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی:

"گھر میں پہلے ہی روز کھانے پر پورے یورپین کپڑے پہن کر آئے اور انہوں نے دستر خوان کے وہ آداب محفوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے گھرانوں میں نظر آتے ہیں۔ پھر مجھ پر کچھ ایسا اعتماد ہوا کہ انہوں نے بڑی صفائی اور بڑے ہی لطف سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کو اس تکلف سے مستثنےٰ کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ صرف بنیان اور تہمد پہنے کھانے پہ چلے آتے۔"[۳]

اقبال کی رہائش گاہ میورروڈ کی کوٹھی کے سحرانگیز ماحول سے متعلق سید الطاف حسین رقمطراز ہیں :

"میورروڈ کی کوٹھی کے صحن میں ایک پلنگ پر تہمد اور سفید بنیان زیب تن کئے ہوئے تھے ۔ایک ملازم شانے داب رہا تھا۔ کوٹھی کے ایک جانب سرکنڈوں کی قطار تھی۔ جن کا سایہ صحن کے سامنے کافی دور تک پڑ رہا تھا۔ روشنی وغیرہ نہیں تھی۔ چاندنی رات کا سماں، سرکنڈوں کا خاموش اور دراز سایہ، مکان کی پرسکوتی — ایک عجیب منظر تھا، جس کی کیفیت آج تک دل میں باقی ہے۔" [۴]

اقبال کی سادہ اور بے تکلف طرزِ زندگی کے بارے میں مولانا خضر تمیمی ہمیں بتلاتے ہیں :

"ڈیوڑھی میں ایک کھری چارپائی بچھی ہے۔ جس کے سرہانے چھوٹا سا تکیہ دھرا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ پائنتی کی طرف کوئی کپڑا نہ تھا۔ حضرت اقبال صرف سادہ سے کرتے اور شلوار میں ملبوس تھے ۔ آخرالذکر پنجاب کی پانچ گزی شلوار اور پاجامے کے بین بین تھی۔" [۵]

اور اقبال اسی کھری چارپائی پر نیم دراز ہوتے۔ گاؤ تکیہ کا سہارا لیے ہوئے وہ علم و معرفت کے موتی بکھیرتے رہتے اور لوگ اپنے اپنے ظرف کے مطابق جھولیاں بھر بھر کے لے جاتے۔ اس سارے عرصہ میں اس سوہنی دھرتی کی محفلوں کی روح رواں حقّہ ساتھ رکھا رہتا۔ حقّہ پیتے اور دنیا جہان کے موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے جاتے —— حقّہ کے لئے تمباکو علی العموم میاں نظام الدین کے کھیتوں سے آتا۔ پھر اقبال کے کھانا کھانے کا انداز، جیسا کہ عبدالمجید سالک نے ہمیں بتایا ہے، یہ تھا :

"علی بخش ایک سینی میں سالن کی ایک رکابی اور دو تین ہلکی چپاتیاں رکھ کر لے آیا ۔اقبال بستر پر سیدھے ہو بیٹھے۔ علی بخش نے بستر ہی پر ایک رومال بچھا کر اس پر سینی رکھ دی ۔ علامہ نے پاس بیٹھے ہوئے دوستوں کو صلا دی اور کھانا شروع کر دیا ۔ علی بخش پانی لیے بیٹھا رہا۔ ایک آدھ چپاتی کھا کر علامہ نے فرمایا "اٹھاؤ" علی بخش نے سینی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ سلفچی آفتابہ آگے کر دیا اور علامہ کے ہاتھ دھلوا دیئے :" [۶]

گھریلو مشاغل میں اقبال ہمیں اُنہی مشاغل میں مصروف دکھائی دیتے ہیں جو پنجاب میں عام نظر آتے ہیں ۔ انھیں بٹیریں پالنے کا شوق رہا ۔کبوتر بھی اڑاتے تھے ۔ اکھاڑے میں ورزش بھی کرتے تھے اور اپنے فرزند جاوید کو بھی اکھاڑہ میں ورزش کرنے کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ دلاور حسین لودھی نے ایک بار جب اقبال سے جالندھر وائی ایم سی اے ایسوسی ایشن کی جانب سے منعقد کیے جانے والے ایک مشاعرے کی صدارت قبول کرنے کو کہا تو جواب ملا "برخوردار! چھوڑو مشاعروں کو، کبڈی کے میچ کا یا دنگل کا انتظام کرو۔" —— پھر انٹرنس کا امتحان دینے کے بعد جب ان کا گجرات کے دولت مند خاندان، خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد خان کی بڑی لڑکی سے رشتہ ہوا اور بارات سیالکوٹ سے گجرات جانے کے لئے تیار ہوئی تو اقبال کو سہرا باندھا گیا جو پنجاب کی کلچرل زندگی کا جزو لاینفک ہے! اقبال ایلوپیتھی طریقِ علاج کی بجائے یونانی طریقِ علاج کے زیادہ قائل تھے [۹] اور گرمیوں میں چائے کی جگہ لسّی نوش کرتے تھے [۱۰] —— الغرض اقبال کو جو ماحول بچپن میں ورثہ میں ملا ، وہ سرتاپا، سراسر پنجابی بلکہ بھرپور پنجابیت لئے ہوئے تھا۔ جس کی چھاپ ہمیں ان کی زندگی پر نہایت گہری نظر آتی ہے۔ زمانہ طالب علمی میں اقبال کو شمس العلماء مولوی

میر حسن جیسے متبحر عالم کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع ملا۔ مولوی صاحب کو عربی، فارسی اور پنجابی کے ہزاروں شعر یاد تھے۔ اور جب وہ طالب علموں کو پڑھاتے اور دورانِ تدریس فارسی کا شعر پڑھتے تو اس کے ساتھ ہی مترادف اُردو اور پنجابی شعر[۱۱] بھی پڑھ دیتے۔ ظاہر ہے پنجابی ہونے کے ناطے اقبال کو لاشعوری طور پر پنجابی زبان و ادب سے پیار کو، اس سے بھی جلا ملی ہو گی۔

وطن سے محبت انسانی مزاج کا خاصہ ہے اور یہ قانونِ فطرت ہے کہ انسان جس دھرتی پر جنم لے، اس سے محبت اس کے خون خمیر میں رچ بس جاتی ہے اور اس کا پرتو، لاشعوری طور پر اس کی تخلیقات میں جھلکتا ہے۔ پنجاب، اقبال کے دور میں متحدہ ہندوستان کا حصہ تھا اور پروفیسر شریف کنجاہی کی یہ رائے نہایت صائب معلوم ہوتی ہے کہ:

"جب اقبال نے ہندوستانی بچوں کے لئے قومی گیت لکھا تو اس گیت میں بیشتر حوالے اسی پنجاب کے تھے اور بانگِ درا کی سب سے پہلی نظم میں ہر چند ہمالیہ کو فصیلِ کشورِ ہندوستان کہا گیا ہے، لیکن اس کے سر پر برف کی باندھی ہوئی دستارِ فضیلت کہ کلاہِ مہرِ عالمتاب پر خندہ زن تھی، اقبال نے اسی علاقے میں دیکھی؛ جسے اس کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔"[۱۲]

اقبال نے سیاست کے خارزار میں طبع آزمائی کی تو یہ شرف پنجاب ہی کو میسر ہوا۔ اور جب وہ پنجاب کونسل کے ۱۹۲۳ء میں رکن چنے گئے تو وہاں پنجاب کی مقننہ میں بعض انتہائی سود مند تجاویز پیش کیں۔ جن کا تعلق دیہاتی پنجابی معاشرے سے تھا۔ ان میں چھوٹے زمینداروں کو مالیہ کی معافی سرِ فہرست تھی۔ انسدادِ شراب نوشی کے حق میں بھی اقبال نے ہی پنجاب کونسل میں پوری قوت سے آواز اٹھائی تھی اور دیسی طریقِ علاج کی بھی انہوں نے حمایت کی ـــــ تو یہ تھا ایک تاثر اور معاشرت کا ایک رویہ جو شاعرِ مشرق کو اپنے جغرافیائی وطن پنجاب سے ملا تھا۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ہمیں یہ نکتہ ذہن میں رکھنا ہو گا کہ اقبال نے ساری زندگی نجی محفلوں میں، مہمانوں کے ساتھ اور احباب و اعزہ کے ساتھ، اپنے گھر میں اور پرائیویٹ لائف میں ہمیشہ پنجابی زبان میں گفتگو کی۔ خالد نظیر صوفی "اقبال درونِ خانہ" میں اپنی یادداشتوں کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علامہ عام طور پر گفتگو پنجابی زبان میں کرتے۔ البتہ جب کوئی دقیق اور فلسفیانہ مسئلہ درپیش ہوتا تو اُردو اور انگریزی وغیرہ کو اظہارِ مطلب کا ذریعہ بناتے۔ گھر میں ہمیشہ پنجابی اور وہ بھی ٹھیٹھ سیالکوٹی میں بات کرتے۔"[۱۳]

اسی ضمن میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"آپ اپنی مادری زبان، پنجابی، سیالکوٹ کے مخصوص محاورے اور تلفظ کے ساتھ بولنے پر بڑی سختی سے عمل پیرا تھے۔ 'فالودہ' کو ہمیشہ 'پھلودہ' بولتے۔ اگر دالدہ جاوید 'فالودہ' کہنے کے لئے کہتیں تو فرماتے 'میری ماں نے تو مجھے یہی سکھلایا ہے۔ میں اپنی ماں کی تعلیم کو فراموش نہیں کر سکتا۔' سیالکوٹ میں واسکٹ کو کرتی کہا جاتا ہے۔ لیکن اہلِ لاہور زنانہ قمیص کو کرتی بولتے ہیں۔ ایک دفعہ نانا جان قبلہ نے گھریلو ملازمہ سے کہا کہ 'اندر

سے کرتی ہے "اُوُ"۔ وہ بے چاری بھی لاہور کی زنانہ قمیص اُٹھا لائی۔ تو والدہ جاوید کہنے لگیں: "اب تو یہ سیالکوٹی بولی چھوڑ دیجئے"۔ آپ نے فوراً جواب دیا "جب آپ اپنی لاہوری زبان نہیں چھوڑ سکتیں تو آخر میں کیوں اپنی مادری زبان بھول جاؤں"۔ اتنا عرصہ لاہور میں رہنے کے باوجود انہوں نے کبھی "ہے گا اسے" یا "ہے گی اد" کا استعمال نہ کیا۔ بلکہ سیالکوٹ کے لہجے میں "نہے جے" "یا "ہے وے" ہی کہتے رہے۔"[۱۳]

"جاوید بچپن میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ چلا چلا کر تقریر کیا کرتے تھے۔ اس وقت وہ بمشکل پانچ چھ برس کے ہوں گے۔ لیکن بڑے بڑے مقررین کی طرح بلاجھجک اور پُراعتماد طریقے سے خود ہی ترتیب دیئے ہوئے چند جملے بولتے چلے جاتے۔ حضرت علامہ کو ان کی یہ تقریر اور اندازِ بیان اس قدر پسند تھا کہ بار بار سنا کرتے۔ وہ جس وقت کہتے "چلو جاوید! ذرا اپنی شیر والی تقریر تو سناؤ"، جاوید ماموں فوراً اُٹھ کھڑے ہوتے اور بڑے جوش و خروش سے ہاتھ ہلا ہلا کر پنجابی میں بولنا شروع کر دیتے۔ "او بھراؤ! میں تہانوں پیا کہنا واں، جاگدے رہو۔ جہڑا جاگدا روے گا، اوہنوں شیر نہیں کھاوے گا تے جہڑا سوں جاوے گا۔ اوہنوں شیر کھا جاوے گا۔ ایس لئی جاگدے رہو۔ او بھراؤ! میں تہانوں پیا کہنا واں......"[۱۴]

اقبال کا پنجابی زبان کو اپنے مخصوص مادری لب و لہجہ کے ساتھ بولنے پر اصرار اور جاوید کی پنجابی زبان میں تقریر کو بار بار سننے کی فرمائش — ان ہر دو رویّوں سے جہاں پنجابی سے ان کے والہانہ پیار کا اظہار ہوتا ہے وہاں ہم محسوس کئے بنا نہیں رہ سکتے کہ یہ شوق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جواں، ہر دم جواں ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اقبال کے نجی محفلوں میں ہمیشہ پنجابی زبان میں گفتگو کرنے سے متعلق ہمیں بہت سی شہادتیں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر سعید اللہ اپنے مضمون "اقبال کے ہاں ایک شام" میں لکھتے ہیں:۔

"ڈاکٹر صاحب گفتگو ہمیشہ پنجابی میں کرتے۔ اگر کوئی ایسے بزرگ تشریف لاتے جو پنجابی سے واقف نہ ہوتے تو حسبِ ضرورت اردو، فارسی اور انگریزی میں گفتگو فرماتے۔"[۱۵]

ایک بات مدِ نظر رہے کہ یہ گفتگو علمی، ادبی، سائنسی، تحقیقی غرضیکہ تمام مروجہ علوم زمانہ سے متعلق ہوا کرتی تھی۔ نیز یہ نشستیں محض خشک اور سپاٹ نہیں ہوا کرتی تھیں۔ اقبال کے مزاج میں مزاح و تفنّن بھی تھا۔ پنجاب کی روایتی بذلہ سنجی ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اچھے لطیفے کی قدر کرتے تھے اور خود بھی لطائف و ظرائف سے ہم نشینوں کو محظوظ کیا کرتے تھے۔ ان کی گفتگو نہایت دلنشیں ہوتی تھی۔ دورانِ گفتگو پھلجھڑیاں چھوٹتیں، مسکراہٹیں بکھرتیں تو طویل قہقہوں میں تبدیل ہو جاتیں۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اس سلسلہ میں یہ واقعہ نقل کیا ہے:

"پنجاب کے جلیل القدر اربابِ سیاست میں چوہدری سر شہاب الدین کی شخصیت بہت ممتاز تھی۔ رنگ کالا، گرانڈیل جسم، بالا قامت، کھانے پینے میں دُور دُور تک حریف نہ رکھتے تھے۔ علامہ قریب قریب ہر ملاقات میں ان پر ایک آدھ پھبتی کہہ دیتے۔ ایک دفعہ شاہدرہ میں پارٹی ہوئی۔ بہار کا موسم تھا۔ چوہدری صاحب اور علامہ صاحب دونوں موجود تھے۔ چوہدری صاحب نے از سرتاپا سفید لباس پہن رکھا تھا۔ علامہ نے بے اختیار

پنجابی میں کہا: "اوہ دیکھو! کیہ وچ کُتّا وڑ گیا جے"[۱۶]

لیکن یہ سمجھنا زیادتی ہوگی کہ اقبال کی پنجابی زبان میں گفتگو محض بذلہ سنجی تک محدود ہوا کرتی تھی۔ بلکہ انھیں پنجابی زبان میں علم و حکمت کے موتی بکھیرتے دیکھ کر اکثر لوگ حیران ہوتے تھے اور انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ یہی وہ اقبال ہیں جو شاعرِ مشرق ہیں اور جنہوں نے اردو زبان کو نیا آہنگ دیا ہے، جن کی فارسی دانی مسلّم ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں میاں بشیر احمد۔ اقبال سے وابستہ اپنی یادوں کو مرتب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جیسے اقبال ۱۹۳۸ء میں اپنے سالِ وفات میں تھے۔ ویسے ہی وہ سترہ سال پہلے ۱۹۲۱ء میں تھے۔ وہی حُقّہ، وہی ان کا نوکر علی بخش، اسی طرح شلوار قمیص پہنے، چارپائی پر بیٹھے ہیں قمیص کے گلے کا اوپر کا بٹن کھلا ہے۔ عموماً پنجابی میں باتیں کرتے تھے اور دنیا بھر کی باتیں۔ بڑے سے بڑے مضمون پر، چھوٹی سی چھوٹی بات پر ہو رہی ہیں۔ جو آئے، آجائے جو چاہے کہے جو اُن کا خیال ہے وہ بیان کر رہے ہیں۔ بے تکلفی سے بات چیت ہو رہی ہے۔ معلومات کا خزانہ ہے کہ سب کے لئے کھلا ہے۔ لیکن کسی کو یہ احساس نہیں کہ عقلمندی کے موتی بکھیر رہے ہیں۔"[۱۷]

خالد نظیر صوفی اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ حضرت علامہ کی تمام تر گفتگو پنجابی زبان میں ہوا کرتی تھی اور اس گفتگو کا ڈھب ایسا دلنشین ہوتا کہ انہی خالد نظیر صوفی کے بقول:

"آسان موضوع ہوتا یا دقیق مسئلہ، وہ بلا تکان بولتے چلے جاتے۔ ایسے معلوم ہوتا کہ خیالات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بھرا ہے۔ جس میں حاضرین بہے جا رہے ہیں اور کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں۔ ان کا جواب اس قدر جامع ہوتا کہ اس موضوع پر مزید سوالات کی گنجائش مشکل ہی سے پیدا ہوتی۔"[۱۸]

یہ بات کہی جا چکی ہے کہ اقبال کی یہ ساری گفتگو صرف پنجابی میں ہوتی تھی۔ ہاں مسائل کی سنگینی کی وجہ سے اس گفتگو میں بیشمار انگریزی الفاظ بھی داخل ہو جاتے۔ لیکن ان کا اسلوب ہمیشہ سلجھا ہوا ہوتا۔ اُردو بالکل پنجابی لہجے میں بولتے تھے اور اکثر اہلِ زبان حضرات کو ان کی ملاقات سے ایک گونہ تنفر پیدا[۱۹] ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا!

"ایک روز لکھنؤ اور دلّی کی شاعری کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا: اب دلّی و لکھنؤ سے وہ لوگ رخصت ہوتے جا رہے ہیں جن کے دم سے اُردو شاعری کے ان دو دبستانوں کی خصوصیات قائم تھیں اور چند سال کی بات ہے۔ لکھنؤ۔ دلّی۔ لاہور۔ حیدرآباد سب ایک سطح پر آجائیں گے۔ علامہ نے کہا میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جب میں پہلے پہل لکھنؤ گیا تو وہاں کے مشہور شاعر پیارے صاحب رشید زندہ تھے۔ لکھنؤ کے بعض سخن فہم احباب نے میری آمد پر شعر و سخن کی ایک مجلس منعقد کی۔ جس میں پیارے صاحب رشید بھی تشریف لائے۔ حاضرین سے میرا تعارف کرانے کے بعد میرِ مجلس نے فرمائش کی کہ میں اپنا کلام سناؤں۔ چنانچہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں، میں نے اپنی چند نظمیں سنائیں۔ مجھے وہ منظر اب تک نہیں

بھولتا کہ میں اپنا کلام سنا رہا تھا۔ اور میرے ہر شعر پر پیارے صاحب رشید کے چہرے سے حیرت و استعجاب و انقباض اور دل گرفتگی کے مخلوط جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ کبھی ان کی بھنویں تنتیں اور ڈھیل جاتی تھیں۔ کبھی آنکھیں یکبارگی کھلتیں اور بند ہو جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ جب میں اپنا کلام سنا چکا تو اُن کے پاس بیٹھ کر ادب سے پوچھا "آپ کے سامنے شعر پڑھنا ہے تو گستاخی۔ لیکن جو کچھ عرض کیا ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا" انہوں نے کسی قدر تامل سے جواب دیا "ہاں صاحب! سُنا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو ایسی اُردو ہم نے آج تک پڑھی ہے نہ سنی ہے۔ حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اردو یا کوئی اور زبان ہے"۔ ڈاکٹر صاحب یہ لطیفہ بیان کر کے دیر تک ہنستے رہے۔" ۲۰

اقبال بہرحال اہلِ زبان نہ تھے۔ وہ پنجاب میں پیدا ہوئے، وہ پنجاب ہی میں جوان ہوئے۔ اہلِ پنجاب کا عسکری مزاج۔ مردانہ وجاہت و شکوہ، لہجے کا کھُرا پن اور پنجابی ماحول انھیں وراثت میں ملا۔ ایسے میں پنجاب کے جَم پل اور مردِ جوان و توانا اقبال سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ اردو بولتے وقت وہی نزاکت، وہی لئے دیئے رہنے کا انداز، وہی تکلف اور نسائی لہجہ اختیار کرتے جو لکھنؤ اور دلی کے مزاج کا خاصہ ہے۔ چنانچہ بالکل تعجب نہیں ہوتا جب ہم "اقبال کی زندگی کا ایک گم شدہ ورق" کے تحت صالحۃ الکبریٰ عرشی کی یہ تحریر دیکھتے ہیں جس میں وہ رقمطراز ہیں:

"علامہ اقبال کا انگریزی تلفظ کچھ اچھا نہ تھا۔ شیلے کو شیلی کہتے تھے اور اُردو اور فارسی بھی حد درجہ پنجابیت لئے ہوئے لہجہ میں بولتے تھے یعنی قاف کو کاف، اور حُقہ کو حکہ۔ اسی بنا پر مولانا نیاز فتح پوری نے اپنی مشہور ڈائری میں اقبال کی شکل و صورت کو نہایت ہی غیر شاعرانہ بیان کیا ہے۔" ۲۱

تہذیبی برتری کے شکار، ادب کے پروہتوں کی جانب سے اقبال کی ذات پر اِس حملے سے ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ خدا لگتی بات ہے کہ اقبال کی زبان پر پنجابی ہونے کے ناطے لکھنوی اور دہلوی حضرات، جنھوں نے اُردو زبان کو ہمیشہ اپنی ذاتی جاگیر اور اپنے گھر کی لونڈی سمجھا، اقبال کے لب و لہجہ اور زبان کی پنجابیت پر ہمیشہ معترض رہے۔ شاید وہ نہیں جانتے تھے کہ برصغیر کی پوری مسلمان قوم کے لئے آئندہ کی معیاری اردو کو پنجاب میں ڈھلنا تھا اور اِس ضمن میں اگر اقبال کی زبان پر پنجابی اثرات کا سایہ موجود تھا تو اول تو یہ قابلِ اعتراض نہ تھا اور دوم اقبال کو خود اپنی بعض ایسی غلطیوں کا اعتراف بھی تھا لیکن الفاظ کے پنجابی مزاج کی تذکیر و تانیث کو انہوں نے جوں کا توں برقرار رکھا۔ میاں بشیر احمد کہتے ہیں۔

"ایک روز میں نے عرض کی کہ ایک نقاد دوست نے آپ کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے کہ لفظ 'مینا' مونث نہیں مذکر ہے مجھے بھی اِس اعتراض پر تعجب ہوا کیونکہ 'مینا' شکل و صورت سے اور آواز سے مونث معلوم ہوتا ہے۔ علامہ نے علی بخش سے کہا کہ رسالہ تذکیر و تانیث لاؤ، دیکھا اور کہا ہاں ایسی غلطیاں مجھ سے ہو جاتی ہیں۔" ۲۲

اقبال جو اردو کے لئے سرمایہ افتخار ہیں اُن پر ایسے اعتراض کرنے والے اصل میں تنگ نظری کا شکار تھے کسی بھی غیر اہلِ زبان

کا کسی خاص زبان میں شاعری کرنا کہ جو اُس زبان کو نیا رنگ، نیا روپ بخش دے، اہل زبان حضرات کے لئے باعث مسرت ہوتا ہے۔ تاریخ میں ایسی کئی مثالیں مل جاتی ہیں۔ جاپانی زبان کے مشہور شاعر نگوچی کو ہی لیجئے اس نے انگریزی زبان میں بھی شاعری کی ہے اور حالانکہ اس کی طرز ادا میں جاپانیت ہے، مگر کسی اعلےٰ درجے کے انگریز یا امریکی نقاد نے اس کی زبان اور بیان پر اعتراض نہیں کیا۔[۲۳] یہی حال ٹیگور اور خلیل جبران خلیل کا ہے۔ اس سلئے جن لوگوں نے اقبال کی زبان اور محاورے پر اعتراض کیا ہے انہوں نے درحقیقت تنگ نظری کا مظاہرہ کیا ہے۔

دنیا کے ہر ادب میں کسی خاص خطۂ زمین اور قوم کا رنگ و آہنگ موجود ہوتا ہے۔ پھولوں کی خوشبو تو فضاؤں میں ہر جہار جانب پھیلتی رہتی ہے۔ مگر پودوں کی جڑیں زمین میں کسی ایک مقام پر پیوست ہوتی ہیں۔ ہر ملک اور ہر قوم اپنا ایک مخصوص جغرافیائی اور سماجی ماحول رکھتی ہے اور ادیب یا تخلیق کار اُسی ماحول سے اپنی تخلیق کے رنگ چنتا ہے۔ اگر وہ اپنے ماحول سے عدم وابستگی یا اپنے تجربات و احساسات کو اپنی تخلیق میں نہیں نباہ سکتا۔ تو اُس کے ہاں فنی خلوص کی کمی ہے۔ اس امر کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ تسلیم کرنے میں کیا قباحت ہے کہ وہی اقبال جس نے اُردو کو لہجہ کی مردانگی عطا کی۔ اُسے نیا شکوہ، نیا وقار، نئی وجاہت اور جاہ و جلال بخشا۔ اُسے نئی تمکنت دے کر نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ اُس نے جب اپنی تخلیقات کو اپنے وطن کے رنگوں سے مکمل کرنا چاہا۔ (اور لامحالہ اِس تخلیقی عمل میں پنجاب اور پنجابی زبان کے اثرات اُردو زبان پر مرتب ہوئے جو کہ ایک ناگزیر تاریخی عمل تھا) تو پنجابی زبان کے الفاظ و تراکیب اور لب و لہجے کو ارتقاً اُردو اسالیب میں سمونے کا الزام بھی اردو ادب کی تاریخ میں پہلی دفعہ اقبال کی ذات پر ہی عاید ہوا۔ اقبال کے ہاں اردو نظم میں پنجابی لب و لہجے کی پرچھائیں پیدا ورتو اوراں کے پرانے دوست اور فاضل علم و ادب، علامہ سید سلیمان ندوی کو بھی یک گونہ اعتراض تھا۔ چنانچہ رموزِ بے خودی اور اسرارِ خودی پر تبصرہ کرتے ہوئے اپریل ۱۹۱۸ء کے معارف میں وہ یہ تحریر کئے بغیر نہ رہ سکے۔

"زبان کے لحاظ سے ڈاکٹر اقبال کو ان شعراء میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلے میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے۔"

اسی طرح "تنقید ہمدرد" کے نام سے کسی نے جب یہ لکھا کہ، اقبال اردو کو اُلٹی چھُری سے ذبح کر رہے ہیں، تو آپ نے رسالہ مخزن بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۲ء کے شمارے میں اس کا بھرپور انداز سے جواب دیا۔ آپ فرماتے ہیں۔

"ہمارے دوست 'تنقید ہمدرد' اِس بات پر مُصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اُردو کے مروج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اِس صوبے میں اِس زبان کا رواج ہی نہ ہو۔ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے۔ جو زبان بہرِ وجوہ کامل ہو اور ہر قسم کے اداے مطالب پر قادر ہو، اُس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اِس قسم کا معیار خود بخود قائم ہو جاتا ہے لیکن جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس کے الفاظ و محاورات جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وقتاً اختراع کئے جا رہے ہوں۔ اُس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدم صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے، اُردو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک محدود تھی مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اِس میں بڑھنے کا مادہ تھا۔ اس واسطے اِس بولی نے ہندوستان کے

دیگر حصّوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کر دیا اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیرِ نگیں ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اِس کا رواج ہو۔ وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت، اُن کے تمدنی حالات اور اُن کا طرزِ بیان اِس پر اثر کئے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اِس اصول کے عمل کو روک سکے۔ تعجب ہے کہ میز، کمرہ، کچہری، نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمہ کو بلا تکلف استعمال کرو۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی اُردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پُر معنی پنجابی لفظ استعمال کر لے تو اُس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو —— اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصوص ہے کہ اُردو کی چھوٹی بہن یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں نہ گھسنے پائے یہ قید ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے جس سے اردو الفاظ و محاورات اخذ کئے جائیں تو آپ کا عذر بیجا ہوگا۔ اُردو ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ، بدمعاش، بازار، لوٹ، چالان وغیرہ کے لئے ہیں اور ابھی روز بروز لے رہی ہے،،[۲۳]

اردو زبان میں پنجابی الفاظ و محاورات اور تراکیب کو سمونے کے ضمن میں ایک دفعہ اقبال اور اسد ملتانی کے مابین بات چیت ہوئی۔ جس میں اقبال نے وضعِ الفاظ و محاورات کے سلسلہ میں اپنے خیالات کو پیش کیا۔ اِس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اختر راہی اپنے مضمون 'اسد ملتانی کے روزنامچے کے چند اوراق' میں لکھتے ہیں:

"میں (اسد ملتانی) نے کہا کہ بالعموم جدتِ ترکیب و استعارہ پر اعتراض نہیں ہوتا بلکہ اس امر پہ ہوتا ہے کہ ایک غیر اہلِ زبان، اظہارِ خیال کے لئے کوئی نیا لفظ یا محاورہ پیدا کرتا ہے۔ حالانکہ اصل زبان میں اس کے لئے پہلے بھی لفظ یا محاورہ موجود ہوتا ہے۔ تو (اقبال) کہنے لگے' ہاں جب زبان میں اس کے لئے پہلے بھی لفظ اُسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے موجود ہو تو نیا لفظ تراشنا غیر ضروری ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا کر بھی دے اور لفظ صوتی لحاظ سے غیر موزوں بھی نہ ہو تو میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ نیا لفظ کسی ہم جنس زبان کا ہو۔ جیسے اُردو میں عربی، فارسی، پنجابی وغیرہ کا لفظ تو کھپ سکتا ہے مگر لاطینی وغیرہ کا نہیں[۲۴]۔"

ساری آزاد اور متمدن دنیا میں بچوں کو اُن کی اپنی مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ خود یونیسکو کے ماہرین تعلیم نے بھی اِس اصول کو تسلیم کیا ہے۔ جس کی بڑی وجہ مادری زبان کا بچے کے ماحول سے منطبق ہونا ہے۔ یہ زبان اُسے والدین کی جانب سے ورثے میں ملتی ہے۔ اقبال اِسی لئے اردو زبان میں پنجابی زبان کے الفاظ سمونے کے زبردست حامی تھے۔ کہتے ہیں:

"میرا ہمیشہ ایسا خیال رہا ہے کہ پنجاب میں طُلبا کے لئے جو اُردو کورس ہوں، اُن میں حسبِ ضرورت پنجابی کے لفظ استعمال ہونے چاہئیں۔ مثلاً مولانا آزاد نے اپنے قاعدے میں ایک جگہ لکھ دیا ہے "لیزم ہلاؤ" دلی میں تو یہ لفظ بچے، بآسانی سمجھ سکتے ہیں مگر پنجاب میں بچے تو کیا سمجھیں گے۔ استاد بھی اس کے معنی دریافت کرتے رہتے

ہیں۔ اگر اس کی بجائے کوئی ایسا نام استعمال ہوتا جو اردو کا نہ سہی لیکن پنجاب میں عام ہوتا تو یقیناً مفید رہتا۔ اسی امر کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ زراعت کی کتابوں میں بالخصوص پنجابی کے الفاظ بے تکلف استعمال کئے جائیں۔" ۲۴

اقبال بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دیئے جانے کے زبردست حامی اور مبلغ تھے۔ 'مخزن' بابت ماہ جنوری ۱۹۰۲ء میں بچوں کی تعلیم و تربیت' کے عنوان کے تحت آپ کی یہ رائے کتنی صائب ہے:

"الفاظ کو یاد رکھنے کے لئے بچے کا حافظہ حیرتناک ہے۔ اپنی مادری زبان کی پیچیدگیاں کس آسانی سے سیکھ جاتا ہے اور یاد کر لیتا ہے۔ معلم کو لازم ہے کہ اپنے شاگردوں کو عمدہ عمدہ اشعار اور نظمیں یاد کرائے اور پڑھے ہوئے سبقوں کے مضامین کی طرف بار بار اشارہ کرے۔" ۲۹

عوام الناس کو تاریخ اسلامی سے روشناس کرانے کے لئے اور اپنی قومی روایات سے نابلد طبقے کی راہنمائی میں پنجابی زبان کے رول کو اقبال کتنی اہمیت دیتے تھے۔ ۱۱ر جون ۱۹۳۲ء کو ایک جلسہ عام میں دیئے گئے خطبۂ صدارت سے اس کا اندازہ لگایئے۔

"فلسطین کی موتمر اسلامی میں میں نے دیکھا کہ وہاں نوجوان مقررین کی داڑھیاں منڈی ہوئی تھیں اور وہ کوٹ پتلون میں ملبوس نظر آرہے تھے اور انھیں علم و فضل اور جوشِ عمل کے اعتبار سے علمائے کرام پر فوقیت حاصل تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان میں تاریخِ اسلامی کی تدریس کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ لہٰذا میں ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے یہ درخواست کروں گا کہ تاریخِ اسلامی سے ناواقف اور روایاتِ قومی سے نابلد طبقے کی راہنمائی کے لئے اسلامی تاریخ کے لیکچروں کا خاص بندوبست کرے۔ وہ لیکچر خواہ آسان اردو میں ہوں یا پنجابی میں مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کو اسلامی تاریخ سے آگاہی ہو جائے۔ اگر لاہور میں یہ انتظام ہو گیا تو میں امید کرتا ہوں کہ پنجاب کے دوسرے شہر بھی لاہور کی تقلید کریں گے۔" ۲۵۔

واضح رہے کہ اسلام کی تعلیمات کو سہل انداز میں پنجاب کے دیہات تک پہنچانے کے لئے محکمہ اوقاف کے زیرِ اہتمام آج بھی جمعہ کے خطبات کی شکل میں کتابچے شائع کر کے پھیلائے جا رہے ہیں۔ یہ کام یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ لیکن پنجاب کی ۸۰ % آبادی واقعتاً آج بھی اردو زبان میں قرآنی تعلیمات کو سمجھنے کی اس قدر قابل نہیں ہو سکی جس قدر جلد پکی روٹی اور نجات المومنین کے وسیلے سے اخلاقی تعلیمات کو پنجابی دیہاتی ذہن قبول کر لیتا ہے۔ اگر اقبال کے مشورے کے مطابق آج بھی محکمہ اوقاف اسلامی تاریخ اور اسلامی تعلیمات کو آسان پنجابی زبان میں دیہاتی علماء ہی کے ذریعے پنجاب کے دور دراز دیہاتی خطوں میں پھیلانے کا بندوبست کرے تو نہ صرف اقبال کی ایک دیرینہ خواہش پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔ بلکہ لوگ سہل اور سادہ اسلامی تعلیمات کی روح سے اپنی مادری زبان میں بآسانی واقف بھی ہو سکتے ہیں۔

دیس پنجاب کے باسیوں کی یہ صدیوں پرانی روایت ہے کہ اپنا کام ختم کر کے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد سورج کی تمازت سے بچ کر چوپال یا پھر کسی گھنے پیڑ کی چھاؤں میں مل بیٹھتے ہیں۔ جہاں دنیا جہان کی باتوں کے ساتھ ساتھ حقے کا دور چلتا رہتا ہے۔ پھر اچانک

کسی کے ہونٹوں پر ہیر وارث شاہ یا کسی اور پنجابی شاعر کے بول متحرک جاتے ہیں۔ ایسے میں محفل پر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ ہیر، خواجہ فرید کی کافیاں، سیف الملوک یا یوسف زلیخا جیسی عظیم تخلیقات کو کسی پڑھے لکھے خوش الحان گبھرو کی زبانی سنا جاتا ہے۔ جسے سن کر نوجوان جاٹ مست و بے خود ہو جاتے ہیں۔ بوڑھے بھی کہیں دور افق میں کھو جاتے ہیں۔ ان کے چہروں کی جھریاں چمک اٹھتی ہیں۔ اور کسی قصہ پارینہ کی یاد میں ان کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ ناچنے لگتی ہے۔ یہ محفلیں آج بھی پنجاب کی روایات کی امین ہیں۔ اور اقبال کے زمانے میں تو ایسی محفلیں اپنے پورے جوبن پر تھیں۔ بھلا اقبال ان سے کس طرح پہلو تہی کر سکتے تھے۔ خالد نظیر صوفی، اقبال کی بھاوجہ کے حوالے سے بتاتے ہیں :

"انھیں بچپن سے ہی شاعری سے لگاؤ تھا۔ بڑے خوش گلو اور پر سوز آواز کے مالک تھے۔ بچپن میں وہ ہمیں منظوم قصے بڑے پیارے لحن کے ساتھ سنایا کرتے تھے ——— اکثر اوقات قصے پڑھتے پڑھتے اپنی طرف سے بھی کوئی فقرہ (مصرع) اس میں جوڑ دیتے اور ان کا فقرہ (مصرع) ایسا پر اثر اور خوبصورت ہوتا کہ ہم سب انھیں بے ساختہ داد دیا کرتیں۔ اس وقت ان کی عمر قریباً دس بارہ برس تھی۔" ۲۶

یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ یہ منظوم قصے پنجابی ادب کے وہ کلاسیک تھے جنہیں ان دنوں گھر گھر پڑھا جاتا تھا۔ وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ اقبال کا یہ شوق فزوں تر ہوتا گیا۔ شمس العلماء مولوی میر حسن جیسے استاد نے اسے جلا بخشی اور ہم دیکھتے ہیں کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں قیام کے دوران بھی پنجابی شاعری سے یہ فطری لگاؤ اقبال کا حرزِ جان بنا رہا۔ اور وہ اسے ایک مقدس امانت کی طرح سینے سے لگائے رہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ہمیں بتاتے ہیں :

"علامہ کبھی کبھی گورنمنٹ کالج کے ماحول کا بھی ذکر کیا کرتے تھے اور مسکرا مسکرا کر کہا کرتے تھے اس کالج میں جہاں اب مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ اس کے قرب میں ایک خانقاہ کسی بزرگ کی ہے جہاں سال میں ایک مرتبہ عرس ہوتا تھا اور لوگ جو اس میں شرکت کرتے، زیادہ تر ہیر وارث شاہ پڑھا کرتے تھے۔ علامہ نے زمانہ طالب علمی میں ایسی کئی مجالس دیکھی تھیں۔ ویسے میں نے خود بھی ایسی مجالس آج سے پچاس سال قبل دیکھی ہیں۔ جن میں مولوی غلام رسول جیسے عظیم پنجابی شاعر شامل ہوتے تھے۔" ۲۷

دنیا کی تمام قوموں کے مزاج کا رنگ ان کے ادب میں جھلکتا نظر آتا ہے، یہ مزاج ایک دن میں نہیں ڈھلا کرتا۔ یہ ایک تدریجی عمل ہے اور صدیوں کے عوامل، اور تاریخی عناصر اس میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ پنجاب کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو اس دھرتی کے بیٹوں کو زندگی کے ہر دور میں کسی نہ کسی غیر ملکی طاقت کے خلاف سرگرم عمل رہنا پڑا، انھوں نے اپنے وطن کی آزادی کی خاطر ہمیشہ اپنے لہو کا نذرانہ پیش کیا آزادی کی خاطر ان کی قربانیاں تاریخ کا روشن باب ہیں۔ غیر ملکی اقوام کے آئے دن کے حملوں کی وجہ سے ان کی زندگی سپاہیانہ بنتی چلی گئی۔ یہ عسکری پن آج بھی پنجاب کے باسیوں کے مزاج کا جزو لاینفک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی زبان میں مادرِ وطن سے پیار کے سیکڑوں گیت ملتے ہیں اور حب الوطنی کا جذبہ پنجابی ادب کا ایک توانا پہلو ہے سچا ادب ہمیشہ عوام کی تہذیبی روایات، ان کی جدوجہد اور دکھ سکھ سے جنم لیتا ہے۔ یہ تہذیبی روایات وہاں کے لوک ادب کی صورت میں زندۂ جاوید ہو جاتی ہیں۔ پنجابی زبان اس لحاظ سے دنیا کی خوش قسمت ترین زبان ہے۔ اس کا دامن لوک ادب سے مالا مال ہے۔ اس کی جڑیں عوام کے دلوں میں اور اس دھرتی میں دور دور تک پیوست

ہیں۔ اس کی شاعری، عوام کی شاعری ہے اور عوام کے لئے ہے۔ جس کا میروں اور وزیروں سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس کے برعکس اُردو چونکہ دربار کی زبان رہی اس لئے اس میں عوامی لوک ادب کی کوئی روایت راہ نہ پا سکی۔ یوں دونوں زبانوں کے مزاج میں بنیادی فرق نمایاں ہے۔
اقبال کی پنجابی شاعری پر گہری نظر تھی، پنجابی رسالہ "سارنگ" بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء کے ایڈیٹر مسٹر ایس۔ ایل۔ پراشر کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا :

"پنجابی شاعری اعلیٰ پائے کی شاعری ہے اور خاص طور پر جذبات سے بھیگی ہوتی ہے۔ پنجابی شاعری کی زبان بڑی سیدھی سادی، نرم اور میٹھی ہوتی ہے۔ جذبات سچے ہوتے ہیں۔ اور بڑے کھلے الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں عشق کے رموز پنجابی میں خوب بیان کئے جا سکتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پنجابی شاعری میں صرف مجازی عشق ہی ہوتا ہے۔ نہیں، بلکہ عشق حقیقی زیادہ ہوتا ہے۔ نیز یہ تصوف کے خزانوں سے مالا مال ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں تصوف کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ پنجابی شاعری میں ایک اور خصوصیت ہے۔ اس میں وطن کی محبت کے متعلق بڑے پرجوش گیت ملتے ہیں۔ فوجی گیتوں کی بھی کمی نہیں۔ عام لوگوں کے گیتوں کی تو حد ہی نہیں۔ اُردو میں تصوف کی شاعری ہے ہی نہیں۔ صرف ایک میر درد کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں وطن کی محبت کی شاعری اور فوجی گیت بھی نہیں ہیں۔ اس کی عشقیہ شاعری میں بناوٹ زیادہ اور جذبات کا زور کم ہے۔ عام لوگوں کے گیت تو اس میں بالکل ہی نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو شاعری درباروں امیروں اور مصاحبوں کے ہاتھوں میں پلی پھولی ہے۔ وہ لوگ یا تو ایرانی تھے یا ایرانی مذاق کو پسند کرتے تھے۔ ان کا میل جول عام لوگوں سے نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اُردو شاعری میں امیرانہ رنگت آ گئی۔ وہ لوگ شعر کہنے کو ایک فیشن کہتے تھے۔ شعر گوئی پر قدرت حاصل کرنا ہی شاعر کی خوبی سمجھی جاتی تھی۔" ۲۸

اقبال کا پنجابی اور اردو شاعری کا یہ تقابلی جائزہ ان دونوں زبانوں کے مزاج کے واضح فرق کو متعین کرتا ہے۔ یہ امر علی الخصوص مدِ نظر رہے کہ کلاسیکی پنجابی شاعری کی بنیاد جہاں عام لوگوں کی زندگی پر ہے وہاں قدیم اُردو شاعری کی بنیاد امیروں اور مصاحبوں کی زندگی پر ہے اردو نے سرکار دربار سے پرورش پائی جب کہ پنجابی شاعری چوپال اور ترنجن میں پلی پھولی، اسی لئے پنجابی میں ہمیں قصیدہ گو شاعر کوئی نہیں ملتا۔ ہاشم شاہ پنجابی زبان کے معروف شاعر ہیں۔ رنجیت سنگھ کے دربار سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے سسّی پنوں کا رومان بے مثال انداز میں نظم کیا۔ دوہڑے اور ڈیوڑھے۔ رمل اور طب کے موضوعات کو شعر کا پیرایہ عطا کیا۔ مگر قصیدہ (نہ دربار کی فرمائش پر اور نہ اپنی مرضی سے) ایک بھی نہیں لکھا۔ اور اس کے پیچھے درحقیقت پنجابی زبان کے شاعر کی روایتی اَنکھ تھی۔ جبکہ اردو کے بیشتر شاعر درباروں سے وابستہ رہے۔ انہوں نے شاہانِ وقت کی شان میں قصیدہ گوئی کو اپنا شعار بنایا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جس دربار میں ایک سے زاید شاعر موجود تھے۔ ان میں آپس میں رنجشیں بھی رہیں چشمکیں بھی چلیں۔ شاید اسی لئے جب ایک بار اردو شاعری پر بحث کے دوران غالب جیسے عظیم شاعر کا ذکر آیا۔ تو اقبال نے اپنی جو رائے دی ۔۔۔ "اقبال کے حضور میں" میں سیّد نذیر نیازی کی زبانی سنیئے :

"حضرت علامہ نے فرمایا۔ غالب واقعی بڑا شاعر تھا۔ لیکن محض پنشن میں اضافے کے خیال سے سرکارِ انگلشیہ کی مدح میں قصائد لکھنا بڑے افسوس کی بات ہے۔ غالب کی اس روش سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ جب وہ لکھتے ہیں۔ ع

خود روزگار ہا نتواند شمار یافت

'نتواند شمار یافت' کے الفاظ کس قدر تکلیف دہ ہیں۔ معاذ اللہ!" ۳۱

یہ بات کہی جا چکی ہے کہ دنیا کے ہر ادب میں کسی خاص خطۂ زمین اور قوم کا رنگ و آہنگ جھلکتا ہے اور قوموں کے مزاج کی چھاپ ہر ادب پر نہایت گہری اور واضح ہوتی ہے۔ عبدالمجید سالک نے جب اقبال سے اس موضوع پہ بات کی تو اقبال نے جو ثقہ رائے دی۔ عبدالمجید سالک اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ علامہ اقبال سے مختلف قوموں کے افسانہ ہائے عشق کا ذکر آیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ ان افسانوں سے ہر قوم کی کیفیتِ مزاج کا سُراغ بہت آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ چونکہ اردو زبان کی ادبی روایات زیادہ تر فارسی کی نقالی پہ مبنی ہیں اور اس زبان (اردو) کی عمر بھی قلیل ہے۔ اس لئے ابھی تک اس کے ادبا و شعرا قیس و لیلےٰ اور شیریں و فرہاد کے چکر سے نجات نہیں پا سکے اور ظاہر ہے کہ یہ عاشقانہ داستانیں عرب و ایران کے باشندوں کی مزاجی کیفیات ہی ظاہر کر سکتی ہیں۔ برِاعظم ہند کے ساکنوں کا مزاج اس سے مختلف ہے میں (سالک) نے عرض کیا کہ جس زمانے میں مجھے وزیرستان میں چند مہینے رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نے پٹھانوں کی عاشقانہ داستانوں کا کسی قدر مطالعہ کیا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ ان قصّوں کو کم از کم نثرِ اردو ہی میں قلمبند کر دوں تاکہ اردو کے 'ادیب' ان سے مستفید ہو سکیں۔ علامہ نے فرمایا 'یہ ارادہ بہت مبارک ہے کیونکہ سرحدی انسانوں میں شجاعت، غیرت، بیباکی، حرکت و حرارت کا عنصر بے حد غالب ہے اور ان کا اردو میں منتقل ہونا بہر حال ہمارے ادب میں تازہ اور صحت مند روح پھونکنے میں معاون ہو گا ـــــ میں نے گذارش کی کہ اس اعتبار سے تو پنجاب کی عاشقانہ داستانیں بھی بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، سسّی پنوں اور دیگر افسانوں میں پنجابیوں کی بے خوفی، شدتِ احساس اور قربانی کے ولولہ انگیز واقعات میں بھی نظر آتا ہے۔ جیسے سوداؔ کے ہاں

سنایا رات کو قصّہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے شعرا و ادبا اِن داستانوں سے بالکل بے خبر ہیں علامہ نے فرمایا 'جی ہاں! میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اردو کے شعرا کا روائتی سرمایہ زیادہ تر مستعار ہے۔ وہ ہیر رانجھا کی بجائے شیریں فرہاد اور کوئل کی بجائے بلبل ہی کو اپنا سرمایہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پنجاب کی عاشقانہ داستانیں لازماً اردو ادب و شعر میں منتقل ہونی چاہئیں۔ فارسی زبان کے شعرا نے اس معاملے میں کبھی وہ بیگانگی نہیں برتی جو

اُردو شعرا نے اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ فارسی میں متعدد مثنویاں وغیرہ ان داستانوں کے متعلق موجود ہیں۔"[۳۲]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال پنجابی زبان کی مثنویوں کی ادبی و ثقافتی اہمیت کے قائل تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری کے لئے اردو اور فارسی کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ جس کی بڑی وجہ (جیسا کہ انہوں نے خود بتایا ہے) یہ تھی کہ ان کی تعلیم و تربیت ہی کچھ ایسی ہوئی تھی اور فارسی میں لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُردو میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھیں اس کی تنگیٔ داماں کا احساس بھی ہوا ـــ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اپنی مادری زبان کے متعلق انہوں نے اس توقع کا اظہار بھی کیا تھا کہ ہو سکتا ہے، پنجابی زبان کو بھی کوئی گوئٹے جیسا آدمی مل جائے جو اسے دنیا کی مسلمہ عظیم الشان زبان بنا دے۔ یہ بات تسلیم کہ پنجابی زبان میں اقبال کا کوئی معروف کلام نہیں ملتا۔ تاہم یہ کہنا بھی کسر غلط ہے کہ انہوں نے پنجابی زبان میں کبھی کوئی شعر موزوں ہی نہیں کیا۔ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ابھی سیالکوٹ کے اسکول ہی میں تعلیم پا رہے تھے کہ انھیں شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ پہلے انہوں نے اپنی مادری زبان پنجابی میں شاعری شروع کی تھی لیکن بدقسمتی سے اس دَور کی شاعری کے نمونے محفوظ نہیں رکھے جا سکے یا اب تک حاصل نہیں کئے جا سکے۔ اقبال نے پنجابی زبان میں جو کچھ موزوں کیا وہ ہمارے لئے متبرک سوغات سے کم نہیں ہے، چاہے اقبال منزل سیالکوٹ میں گھریلو محفل میں بُجھوائی گئی یہ پہیلی ہی کیوں نہ ہو:

ایس گبھرو دے کم کوتے
رہندا رناں وے دوتے
پگ تہ بنھدا، ٹوپی پاندا
رن پیراں تھیں، گھروا جاندا (۳۳) (سیدھا برقعہ)

خالد نظیر صوفی اس سلسلہ میں مزید لکھتے ہیں:

"جاوید کو بچپن میں کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا۔ ایک روز دوپہر کو علامہ صاحب کھانا کھانے کے بعد پلنگ پر نیم دراز تھے کہ جاوید ان سے کہانی کی فرمائش کرنے لگا۔ انہوں نے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ مگر جاوید ٹلنے والا کہاں تھا۔ کہنے لگا۔ تو پھر کوئی پہیلی ہی سہی، چچا جان مان گئے اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد فرمایا:

اک جناور ایسا
جیہدی چنج تے پیسا
اوہدیاں ہڈیاں حلال
اوہدا شوربا حرام

جاوید کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ایک دم بولا "نہرو دی پوٹ"۔ اس پر چچا جان خوب ہنسے اور فرمایا بالکل صحیح پہچانا ہے۔ دراصل ان دنوں نہرو رپورٹ کا بہت چرچا تھا۔ جاوید چونکہ ہر وقت اسی کا تذکرہ سنتا رہتا تھا۔ اس لئے وہی کہہ دیا۔[۳۴]"

"ایک بار جاوید کے ہاتھ بکری کا بچّہ آیا۔ علامہ صاحب باہر سے آئے تو جاوید کو اس سے کھیلتے دیکھ کر وہیں بیٹھ گئے اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ والدۂ جاوید کہنے لگیں 'آپ نے بے شمار شعر کہے ہیں، لیکن میرے جاوید پہ کبھی کچھ نہیں لکھا' علامہ علیہ الرحمتہ مسکرائے اور فرمایا 'یہ کونسی مشکل بات ہے۔ لو ابھی کہہ دیتے ہیں۔'"

اور پھر بے ساختہ جو کچھ موزوں کیا۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی مادری زبان ہی کا سہارا لیا اور یہ شعر فی البدیہہ کہے:

اک سی بّبا بکری والا   ہتھ وچ رکھدا ڈنڈا
نانی جواہنوں پھڑن لگی   نسیا مار چھپنڈا

بھابی ببّا بکری والا

نالے کھاندا توس تے انڈا   نالے کھاندا حلوہ منڈا

بھابی ببّا بکری والا ۳۵

اقبال کو پنجابی شاعری سے جو تعلقِ خاطر تھا اور خاص طور پر پنجابی زبان کے صوفی شعرا سے انھیں جو عقیدت تھی یہ اس کا اثر تھا کہ ان صوفی شعرا کا کلام اکثر ان کے ورد زبان رہتا تھا۔ علی بخش کے علاوہ ان کے ایک دوسرے ملازم دیوان علی کو خدا تعالےٰ نے گلا بہت اچھا دیا تھا۔ سید نذیر نیازی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دیوان علی کے آنے سے اسے (علی بخش) کو خاصا اطمینان ہوگیا ہے۔ حضرت علامہ کا اصرار تھا کہ رحما کے علاوہ ایک اور آدمی کا انتظام کر لینا چاہیے تاکہ ملازمین باری باری سے آرام کر سکیں۔ دیوان علی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ پنجابی کے صوفی شعرا کا بہت سا کلام اسے حفظ ہے۔ آواز بھی غنیمت ہے۔ اس سے اکثر بلّھے شاہ کی کافیاں، اسی حرفی ہدایت اللہ، یوسف زلیخا اور بعض دوسرے پنجابی شاعروں کا کلام سُنا جاتا ہے۔" ۳۶

پنجابی زبان و ادب سے ان کی یہ دلچسپی یہاں تک بڑھی کہ عام گفتگو میں وہ اکثر پنجابی شعرا کے کلام سے حوالے بھی دیا کرتے تھے۔ سید نذیر نیازی ان کی بیماری کے ایام میں ۴ مارچ ۱۹۳۸ء کی نشست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نو بجے کے قریب پھر حاضرِ خدمت ہوا۔ حضرت علامہ کی طبیعت قدرے بہتر پائی۔ چوہدری صاحب، راجہ صاحب، م۔ ش اور راجہ سید اکبر حاضرِ خدمت تھے۔ راجہ سید اکبر تو صرف مزاج پُرسی کے لئے آئے تھے۔ چند منٹ بیٹھے اور چلے گئے۔ وہ گئے تو قریشی صاحب آگئے۔ انہوں نے نبض دیکھی اور حضرت علامہ کا مزاج پوچھا۔ تو علامہ صاحب نے فرمایا 'بلّھے شاہ کا ایک مصرعہ ہے ؏

'سچ آکھاں تے بھانبڑ مچدا اے'

اور پھر یہ کہتے کہتے بڑے رقت آمیز لہجے میں فرمایا 'جی چاہتا ہے، سب کچھ کہہ ڈالوں، مگر کیسے اور کس سے؟'" ۳۷

اسی طرح ایک بار انہوں نے جب علی بخش اور چوہدری صاحب کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا "علی بخش کو چوہدری صاحب سے وہی نسبت ہے جو سوہنی کو مہینوال سے ۳۸"۔ علامہ صاحب کے دوست چوہدری محمد حسین سے روایت ہے کہ علامہ ایک بار غلام رسول

(مشہور پنجابی شاعر) کی چٹھیاں سن کر رو پڑے تھے۔

سید نذیر نیازی نے ایک بار صوفی تبسم کو اقبال کا پیغام دیا کہ یاد فرما رہے ہیں۔ "علامہ اقبال سے ایک ملاقات" میں صوفی تبسم اس بارے میں لکھتے ہیں :

"مزاج پرسی کے بعد میں نے عرض کیا۔ قبلہ آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔ کیا ارشاد ہے؟ کچھ دیر تامل کے بعد بولے ہاں یاد آیا۔ وہ نوجوان کہاں ہے؟ میں نے پوچھا، کون نوجوان؟ وہ جس نے مجھے نظمیں سنائی تھیں، وہ پھر ہو سکتا ہے میں نے کہا، کیوں نہیں، جب آپ فرمائیں، حاضر ہو جائے گا۔" فرمایا۔ اسے ضرور بلائیے اور جلدی بلائیے۔ مجھے اس کا گانا بہت پسند ہے ..... وہ اس طرح شعر پڑھتا ہے جیسے خود بھی محسوس کر رہا ہو۔ اس کی آواز دل سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پھر اسے فارسی، اردو، پنجابی سبھی نظمیں یاد ہیں۔ اس روز عرشی کی جو پنجابی نظم اس نے سنائی تھی۔ بہت خوب تھی۔ میں عرشی کو محض مولوی سمجھتا رہا۔ یہ پتہ نہ تھا کہ اس کے سینے میں بھی ایک درد مند دل ہے۔ اچھی نظم لکھی ہے۔ اب وہ آہستہ آہستہ یہ مصرعے گنگنانے لگے ؎

اساں ہنجوآں دا ہار پرونا، دُکھ تینوں نہیں اودسنا
تیرے سامنے بیٹھ کے رونا، دُکھ تینوں نہیں اودسنا

اس پر پنجابی شاعری کی گفتگو کا سلسلہ چلا۔ فرمانے لگے۔ پنجابی ہماری مادری زبان ہے۔ اس میں جو بات پیدا ہو سکتی ہے وہ کسی اجنبی زبان میں ممکن نہیں۔ اس زبان کو جب کبھی بڑا شاعر ملا۔ تو اس نے شاہکار پیدا کیا۔ وارث شاہ کی ہیر۔ فضل شاہ کی سوہنی مہینوال۔ اور ہاشم شاہ کے دوہڑوں سے چل کر بات خواجہ غلام فرید چاچڑاں والے کی شاعری تک پہنچی۔ ڈاکٹر صاحب بولے افسوس کہ خواجہ صاحب کی شاعری ایک علاقے تک محدود ہو کر رہ گئی ان کا کلام ایک گہرے مطالعہ کا محتاج ہے۔ مجھے تو اس میں بین الاقوامی حیثیت واہمیت کے عناصر نظر آتے ہیں۔" ۴۶

اسی طرح انجمن حمایتِ اسلام کے اسٹیج سے جب چودھری سر شہاب الدین نے مسدسِ حالی کا پنجابی روپ پیش کیا۔ تو اہلِ پنجاب کو لوٹ پوٹ کر دیا اور حاضرینِ جلسہ کی طرف سے انھیں زبردست ستائش دی گئی۔ اسی جلسہ میں ڈاکٹر اقبال اور شیخ سر عبدالقادر نے انھیں پُرزور الفاظ میں تاکید فرمائی کہ وہ تمام مسدسِ حالی کو پنجابی کا چولا پہنائیں اور آج مسدسِ حالی کا جو پنجابی روپ ہمیں ملتا ہے۔ اس کی تکمیل کے ایک محرک ــ اقبال بھی تھے ــ اقبال در اصل پنجابی زبان کو مختلف ہم جنس زبانوں کے علمی و ادبی ذخیروں سے مالا مال دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اپنے وقت کے مشہور پنجابی شاعر بابو کرم کا جب ان سے تعارف کروایا گیا۔ تو اقبال کی فرمائش پر بابو کرم نے اپنی چند پنجابی نظمیں سنائیں۔ جو انھوں نے بہت پسند کیں اور کہا :

"بابو صاحب! آپ کی پنجابی زبان بڑی ستھری اور ٹھیٹ ہے۔ آپ اگر مولانا روم کی مثنوی کی کچھ حکایات خالص پنجابی میں منتقل کریں تو ضرور کامیاب ہوں گے۔ صوفی صاحب آپ کو موزوں حکایات بتا سکتے ہیں، یہ فارسی اور

پنجابی، دونوں زبانوں کی بہت بڑی خدمت ہوگی — انہوں (بابو کرم) نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ پنجابی نظم میں تصوف کے بڑے بڑے ذخیرے پنہاں ہیں۔ خصوصاً فرید کے دوہے۔ فارسی کے بعد شاید یہ دوسری زبان ہے جو تصوف سے مملو ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بابا فرید کا یہ دوہا سنایا: ؎

اٹھ فریدا سُتیا، جھاڑو دے مسیت
توں سُتا، رب جاگدا تیری ڈاہڈے نال پریت ۴۰

خیال ہے کہ صوفی شعرا میں ضلع جھنگ کے مشہور درویش اور پنجابی زبان کے معروف شاعر، سلطان العارفین حضرت سلطان باہو کا کلام بھی اُن کے ضرور پیشِ نظر ہوگا۔ اور اقبال نے حضرت سلطان باہوؒ کے کلام سے ضرور خوشہ چینی کی ہوگی، دونوں شاعروں کے ہاں، صدیوں کے فاصلے کے باوجود خیالات و اظہار کی کتنی گہری مماثلت موجود ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

سلطان باہوؒ:
پڑھ پڑھ حافظ کرن تکبّر، ملّاں کرن وڈیائی ہو
ساون ماہ دے بدلاں وانگوں پھرن کتاباں چائی ہو
جتھے ویکھن چنگا چوکھا، اُتھے پڑھن کلام سوائی ہو
اوہ دوہیں جہانیں مُٹھے باہو جنہاں کھادھی ویچ کمائی ہو

اقبالؒ:
یہی شیخِ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

سلطان باہوؒ:
جس منزل نوں عشق پچاوے، ایمان نوں خبر نہ کائی ہو
میرا عشق سلامت رکھیں باہو ایماناں دیاں دھروئی ہو

اقبالؒ
اگر ہے عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

سلطان باہوؒ: ع
ناں میرا دل دوزخ منگے، نہ شوق بہشتیں راضی ہو

اقبالؒ: ع
حور و خیام سے گذر، بادہ و جام سے گذر

سلطان باہوؒ ‌ ؏ ایہہ تن رب سچے دا حجرہ، اندر پا فقیرا جھاتی ہو

اقبالؒ ‌ ؏ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

اسی طرح کی اور بھی کئی مثالیں مل جائیں گی "ابیاتِ سلطان باہوؒ" میں سلطان الطاف علی اس ذیل میں اپنی مختصر بحث میں لکھتے ہیں:

"یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ شاعرِ مشرق کے کلام میں سلطان باہو کی تعلیمات کا ذکر اکثر ملتا ہے ..... سلطان باہو کا مثالی پیرِ پروانہ شہباز ہے جو علاقہ کا شاہین ہے۔ اور سلطان باہو کی طرح علامہ اقبال نے بھی صوفیانہ رنگ میں جو الفاظ و اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ مثلاً شہبازہ، عشق، فقیر، فقر، فقیری، عارف، مرشد، ملّا، زاہد، عاشق، عالم وغیرہ۔ وہ دونوں شاعروں کے ہاں ایک ہی مفہوم رکھتی ہیں۔ علامہ اقبال کے کلام میں جا بجا اس قسم کے خیالات اور بعینہٖ ایسی اصطلاحات انہی معنوں میں دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ علامہ صاحب نے جہاں رومیؒ سے فیض حاصل کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے افغانستان، ایران، پاک و ہند کے صوفیائے کرام کے کلام کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہوگا۔ چنانچہ اپنے اس خیال کی تصدیق کے لئے میں نے لاہور میں جب شورش کاشمیری سے ۱۹۶۴ء میں ان کے دفتر ہفت روزہ چٹان میں ملاقات کی تو میرے استفسار کرنے پر شورش کاشمیری نے فرمایا: علامہ صاحب نے یقیناً حضرت سلطان باہوؒ کے کلام کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس سے اثرات بھی حاصل کئے ہیں۔ اس کے بعد شورش کاشمیری نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک بار علامہ صاحب حضرت سلطان باہو کے پنجابی ابیات پڑھ رہے تھے، جب یہ مصرعہ پڑھا:

؏ "تاڑی مار اڈا نہ باہو اسیں اگے ای اڈن ہارے ہو

تو علامہ صاحب بے تحاشا رونے لگے۔"[۱۴]

پنجابی زبان و ادب سے اقبال کی اس دلچسپی کی جڑیں دوران کے بچپن تک ہماری راہنمائی کرتی ہیں۔ جب وہ اپنے گھر میں منظوم قصے سنایا کرتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں اس شوق کو مولوی میر حسن جیسے استاد کی علمی صحبتوں سے مہمیز ملی اور یہ شوق زندگی کے آخری لمحے تک ان کے ساتھ رہا۔ اقبال کے مرض الموت کے آخری ایام کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقیوم کا بیان ہے:

"رات کے بارہ بجے تک کافی لوگ وہاں موجود تھے۔ اور باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ لیکن علامہ مرحوم زیادہ تر خاموش ہی رہے اور صرف 'ہوں' 'ہاں' ہی میں کسی کسی بات کا جواب دیا۔ ہاں جس چیز کا انہوں نے اس رات بار بار ذکر کیا۔ وہ پنجابی زبان کی کوئی نعت تھی۔ جو آپ نے کبھی سنی تھی، اس کے متعلق آپ کا فرمانا تھا کہ ویسی نعت انہوں نے اُردو، فارسی، عربی میں نہ تو کہیں پڑھی اور نہ ہی کبھی سنی ہے۔ وہ اپنے احباب سے اس پنجابی نعت کی تعریفیں کرتے رہے کہ پنجابی زبان کی وہ نعت اس قدر بلند پایہ ہے کہ اپنی ساری زندگی میں کوشش کے باوجود وہ خود بھی اس کے ہم پلّہ کوئی نعت نہیں کہہ سکے۔ آپ کی شدید خواہش تھی کہ ایک دفعہ پھر وہ نعت اسی آدمی کی زبانی سنیں جس سے کہ پہلے سنی تھی، اس خواہش کا اظہار بار بار انہوں نے اپنے دوستوں سے کیا۔ چنانچہ ایک ایک کرکے

سارے دوست جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ یہ وعدہ کر کے چلے گئے کہ وہ اس نعت خواں کو لے کر آتے ہیں۔ علامہ مرحوم دمِ واپسیں تک اس نعت خواں کے منتظر رہے مگر صد افسوس! کہ شاعرِ مشرق کی آخری خواہش تشنۂ تکمیل ہی رہی۔"[۴۲]

یہ اقبال کی زندگی کی آخری شام کی بات ہے۔ مشہور صحافی میاں محمد شفیع (م۔ش) اپنے مضمون "میں نے اقبال کو مرتے دیکھا" میں اپنی یادداشتوں کو مرتب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی ارغوانی شعاعیں علامہ مرحوم کے مکان کو چھوتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ علامہ کا بستر ان کے دیوان خانے میں بچھا دیا گیا۔ اس موقعہ پر ایک تانگہ راستہ سے گذرا۔ تانگے والا ایک غمگین پنجابی گیت الاپ رہا تھا۔ شاعر نے جب اس کی درد بھری آواز سنی تو ایک آہ سرد بھری اور چھت کو گھورنے لگے۔"[۴۳]

پنجابی شاعری سے اقبال کو کس قدر دلچسپی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ دمِ آخر انہوں نے کچھ سننے کی فرمائش کی تو وہ پنجابی زبان کی نعت تھی اور اپنی موت سے صرف چند گھنٹے قبل انہوں نے اگر کچھ سننا پسند کیا تو وہ بلھے شاہ کی پنجابی کافیاں تھیں۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ اقبال کی چارپائی کے قریب علی بخش، دیوان علی اور میاں محمد شفیع (م۔ش) بیٹھے ہوئے تھے۔ اقبال نے انہیں اونگھتے ہوئے دیکھا، تو کسی وجدانی احساس کے تحت فرمایا "صرف تمہیں آج ہی رات جاگنے کی تکلیف گوارا کرنا ہوگی۔ م۔ش کہتے ہیں:

"اس کے بعد انہوں نے دیوان علی سے کہا کہ وہ انہیں پنجابی گیت سنائیں۔ دیوان علی خوشی سے گانے کے لئے راضی ہو گئے اب شاعر کی موت کو صرف چار گھنٹے باقی تھے۔ لیکن اب بھی اُن کے ہوش و حواس قائم تھے۔ دیوان علی نے پنجاب کے مشہور شاعر بلھے شاہ کے گیت الاپے، ان گیتوں سے شاعر بہت متاثر دکھائی دیتے تھے اور بالآخر میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔"[۴۴]

حوالہ جات (REFERENCES)

۱۔ محمود نظامی مرتب، ملفوظاتِ اقبال، لاہور، سیکرٹری حلقۂ نقد و نظر، بار اول ص ۵۸

۲۔ صوفی، خالد نظیر، اقبال درونِ خانہ۔ لاہور، بزمِ اقبال ۱۹۷۱ء ص ۱۸۸-۱۸۷

۳۔ صدیقی، رشید احمد، اقبال۔ شخصیت اور شاعری۔ لاہور۔ اقبال اکیڈمی۔ ص ۲۴

۴۔ محمود نظامی مرتب، ملفوظاتِ اقبال، لاہور، سیکرٹری حلقۂ نقد و نظر، بار اول ص ۱۶۵۔

۵۔ ایضاً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ص ۱۹۲۔

۶۔ سالک، عبدالمجید، ذکرِ اقبال۔ لاہور۔ بزمِ اقبال کلب روڈ۔ ص ۲۲۹۔

۷۔ جاوید اقبال، میرا باپ۔ محورہ۔ مجلہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۶ء ص ۴۷۔

۸- دلاور حسین لودھی، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور- ستمبر ۱۹۷۷ء صـ ۱۱۱ -

۹- محمود نظامی مرتب- ملفوظاتِ اقبال- بار اوّل- لاہور- سیکرٹری حلقہ نقد و نظر- صـ ۱۴۷ -

۱۰- سالک، عبدالمجید- ذکرِ اقبال- لاہور- بزمِ اقبال کلب روڈ- صـ ۲۲۷ -

۱۱- ایضاً ″ ″ ″ صـ ۲۷۴ -

۱۲- شریف کنجاہی- اقبال اور پنجاب: روزنامہ مساوات، لاہور، ۱۶ر جولائی ۱۹۷۷ء -

۱۳- صوفی، خالد نظیر- اقبال درونِ خانہ- لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۷۱ء صـ ۲۱ -

۱۴- ایضاً ″ ″ ″ ″ صـ ۳۳ -

۱۴ الف- ایضاً ″ ″ ″ ″ صـ ۷۹ -

۱۵- محمود نظامی مرتب، ملفوظاتِ اقبال- بار اوّل- لاہور، سیکرٹری حلقہ نقد و نظر صـ ۱۰۲ -

۱۶- سالک، عبدالمجید، ذکرِ اقبال- لاہور- بزمِ اقبال کلب روڈ- صـ ۲۷۰- ۲۶۹ -

۱۷- محمود نظامی مرتب، ملفوظاتِ اقبال- بار اوّل- لاہور، سیکرٹری حلقہ نقد و نظر صـ ۲۶ -

۱۸- صوفی، خالد نظیر، اقبال درونِ خانہ- لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۷۱ء صـ ۲۱ -

۱۹- سالک، عبدالمجید- ذکرِ اقبال- لاہور- بزمِ اقبال، صـ ۲۳۴ -

۲۰- رشید، غلام دستگیر مرتب آثارِ اقبال- حیدر آباد، دکن، سید عبدالرزاق، تاجر کتب، ۱۹۴۶ء صـ ۳۸، ۲۷

۲۱- عرشی، صالحۃ الکبریٰ- اقبال کی زندگی کا ایک گم شدہ ورق- اقبال ریویو- مجلہ اقبال اکیڈمی لاہور- جنوری ۶۲ء صـ ۷۱

۲۲- محمود نظامی ملفوظاتِ اقبال- بار اوّل- لاہور سیکرٹری حلقہ نقد و نظر- صـ ۲۹ -

۲۳- اختر راہی- 'اسد ملتانی کے روزنامچے کے چند اوراق'- اقبال- جلد نمبر ۲۳- شمارہ نمبر ۲- اپریل ۱۹۷۶ء صـ ۷۵

۲۴- ایضاً ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ صـ ۷۵

۲۵- افضل، محمد رفیق، گفتارِ اقبال، لاہور، ادارہ تحقیقاتِ پاکستان دانش گاہ پنجاب ۱۹۶۹ء صـ ۱۵۲ -

۲۶- صوفی، خالد نظیر- اقبال درونِ خانہ، لاہور- بزمِ اقبال، ۱۹۷۱ء صـ ۱ -

۲۷- چغتائی، ڈاکٹر عبداللہ 'علامہ اقبال کا گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلق'- راوی- اقبال نمبر، مجلہ گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۷۴ء صـ ۱۸

۲۸- رشید- غلام دستگیر مرتب- آثارِ اقبال- حیدر آباد دکن، سید عبدالرزاق تاجر کتب، ۱۹۴۶ء صـ ۴۶- ۴۷ -

۲۹- معینی، سید عبدالواحد مرتب- مقالاتِ اقبال- لاہور، شیخ محمد اشرف، ۱۹۶۳ء صـ ۶ -

۳۰- ایضاً ″ ″ ″ صـ ۲۰- ۲۱ -

۳۱- نذیر نیازی، اقبال کے حضور میں: نشستیں اور گفتگوئیں- جزو اوّل- کراچی، اقبال اکادمی، ۱۹۷۱ء- صـ ۲۷۸ -

۳۲- باقر، ڈاکٹر محمد- "پنجابی قصے فارسی زبان میں"- مقدمہ از عبدالمجید سالک- لاہور پنجابی ادبی اکیڈمی ۱۹۵۷ (مقدمہ سے اقتباس)

۳۳۔ صوفی، خالد نظیر، اقبال درونِ خانہ۔ لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۷۱ء صـ۶۱۔
۳۴۔ ایضاً " " " " " " صـ۶۶۔
۳۵۔ ایضاً " " " " " " صـ۵۷۔
۳۶۔ نذیر نیازی، اقبال کے حضور میں: نشستیں اور گفتگوئیں۔ جزو اوّل، کراچی اقبال اکادمی ۱۹۷۱ء صـ۲۷۷۔
۳۷۔ ایضاً " " " " " " " " صـ۲۶۴۔
۳۸۔ ایضاً " " " " " " " " صـ۲۷۲۔
۳۹۔ شہاب الدین۔ حالی دی مسدس۔ (مسدسِ حالی دا پنجابی ترجمہ) لاہور، تاج بکڈپو، ۱۹۴۲ء صـ۱۵۔
۴۰۔ محمود نظامی مرتب ملفوظاتِ اقبال۔ بار اوّل۔ لاہور، سیکرٹری حلقہ نقد و نظر۔ صـ۲۱۷۔
۴۱۔ سلطان الطاف علی مؤلف۔ ابیاتِ باہو۔ لاہور، حاجی محمد اشفاق قادری کریم پارک، ۱۹۷۵ء صـ۵۰۔
۴۲۔ صوفی خالد نظیر، اقبال درونِ خانہ، لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۷۱ء صـ۱۷۱۔
۴۳۔ میاں محمد شفیع (م۔ش) 'میں نے اقبال کو مرتے دیکھا': ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور۔ مارچ ۱۹۷۷ء صـ۱۱۱
۴۴۔ ایضاً " " " " " " صـ۱۱۲
۴۵۔ ماہنامہ "ماہِ نو" ستمبر ۱۹۷۷ء ادارہ مطبوعات پاکستان لاہور . . . . صـ ۳۴۵

۴۶* "آثارِ اقبال" میں حامد علی خان نے علامہ اقبال کے انٹرویو کو پنجابی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس میں درج ہے کہ علامہ اقبال کے دوست چوہدری محمد حسین سے روایت ہے کہ ایک بار علامہ مشہور پنجابی شاعر غلام قادر کی چٹھیاں سن کر رو پڑے تھے۔ اس جگہ غالباً کتابت کی غلطی کی وجہ سے مشہور پنجابی شاعر غلام رسول کی جگہ غلام قادر چھپ گیا۔ چٹھیاں پنجابی ادب میں صرف غلام رسول کی ملتی ہیں۔

اقبال کی دعائیں

کسریٰ منہاس

اقبال کے شعری تصورات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ دعاؤں پر مشتمل ہے۔ دعا کے لغوی معنی جانے اور پکارنے کے ہیں اصطلاح میں بارگاہِ قاضی الحاجات میں مقصد و حاجت بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ اقبال چونکہ ایک پہلودار شاعر ہیں۔ اس لئے ان کی دعاؤں میں بھی گونا گونی اور بوقلمونی کی کوئی حد نہیں۔ وہ کبھی ذاتِ احدیت کو عارفانہ انداز سے مخاطب کرتے ہیں کبھی سرورِ کائنات، خلاصۂ موجودات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتجی ہوتے ہیں کبھی اپنی ذات کے لئے دعائیں مانگتے ہیں اور بزرگوں کے آستانوں پر حاضری دیتے ہیں۔ کبھی مسلمانوں کی پس ماندگی اور ان کی ناگفتہ بہ حالت کا رونا روتے ہیں۔ کبھی جوانوں کو اپنے دعائیہ اشعار میں ابھارتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کے دلوں میں "میرا نورِ بصیرت عام" ہو جائے۔ کبھی شاہین بچوں کو موضوعِ دعا بناتے ہیں۔ کبھی مسلمانوں کو مسجد قرطبہ اور غزنین کے خرابے میں لے جاتے ہیں کبھی ساقی نامہ کی صورت میں دعائیہ انداز کو اپناتے ہیں۔ کبھی انقلاب کے لئے دست بدعا ہوتے ہیں اور ایک انوکھی اور مؤثر التجا کا انداز اختیار کرتے ہیں کبھی ہمدم کے لئے درخواست کرتے ہیں۔ کبھی اپنے لختِ جگر جاوید کے لئے دعا کرتے ہیں کبھی فریاد کے رنگ میں اپنا مافی الضمیر پیش کرتے ہیں۔ کبھی التجائے مسافر کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ کبھی کافر اور مسلمان دونوں کے لئے رحمت عطا کرنے کی دعا کرتے ہیں۔ کبھی دعا میں شیطان کے لئے طنزیہ طرزِ اظہار اختیار کر کے چند نکات سے مخاطب کو روشناس کراتے ہیں کبھی وہ اپنے اعمال کے حساب کے لئے التجا کرتے ہیں کہ یہ پوشیدہ طور پر لیا جائے کبھی وہ مغربی تعلیم سے حاصل کی ہوئی تعلیمات کے لئے رہبر کو تلاش کرتے ہیں۔ غرضکہ اقبال کی دعائیں جس قدر ان کے کلیاتِ فارسی و اردو میں ملتی ہیں۔ ان کا انداز لطیف اور والہانہ ہے۔ ان کی دعا جب شعر کی زبان میں ڈھل جاتی ہے۔ تو دل پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی قلبی واردات نے ان کو یہ دعائیہ اشعار کہنے پر مجبور کیا ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم چند دعاؤں پر ذیل میں اظہار خیال کرتے ہیں تاکہ اقبال کے دعائیہ اندازِ فکر کے سمجھنے میں مدد مل سکے۔

باری تعالیٰ کے حضور میں ڈاکٹر اقبال نے کثرت سے اپنے دل کے درد کو پیش کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس کی رحمت کے دروازے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں۔ جس کے قبضے میں موت و حیات ہیں چونکہ دعا فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے اور اقبال بھی ایک انسان تھے۔ اس لئے انہوں نے پہلے حمد کے اشعار کہے ہیں۔ پھر بارگاہِ الٰہی میں دعا کی ہے یہ دعا اسرار خودی میں ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔

اے خدا! تو اس کائنات کا روح و رواں ہے۔ یہ دنیا تیرے ہی سہارے قائم ہے۔ تیرے ہی فیض و کرم سے ہم زندہ ہیں

اگر موت تیری راہ میں آجائے تو اس پہ ہزاروں زندگیاں قربان۔ ہم التجا کرتے ہیں کہ ہم تہی دستوں سے اپنے رخِ روشن کو پوشیدہ نہ کر۔ ہمارے دلوں میں حضرت سلمانؓ اور حضرت بلالؓ کا سا ایمان پیدا کر دے۔ ہم کو چشم بے خواب اور دلِ بے تاب کی دولت سے مالا مال کر دے اور ہمیں فطرتِ سیماب عطا فرما دے۔ ہمیں وہ روشن نشانیاں عنایت فرما دے کہ جن کے سامنے دشمنوں کی گردنیں جھک جائیں۔ مسلمان جو اس وقت کاہ کی مانند ہیں۔ یعنی ضعیف اور کمزور ہیں۔ ان کو آگ برسانے والے پہاڑ کی مانند کر دے۔ تاکہ وہ باطل خداؤں کا نام و نشان تک مٹا دیں۔ پھر دُکھے ہوئے دل سے کہتے ہیں۔ اے خدا! ہماری قوم متحد نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں گرہیں پڑ گئی ہیں۔ ہم دنیا میں ستاروں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل بیگانہ۔ اس لئے ہمارے دلوں کو پھر محبت و اخلاص کا آئین بخش دے تاکہ ہم سربلند ہو سکیں۔ ہمیں منزلِ تسلیم و رضا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان کی طاقت عنایت فرما دے تاکہ ہم توحید کے حقیقی مفہوم کو سمجھ سکیں اور باطل کا مقابلہ کر سکیں ؎

اے چو جاں اندر وجودِ عالمی — جانِ ما باشی و از ما می رمی

نغمہ از فیضِ تو در عودِ حیات — موت در راہِ تو محسودِ حیات

از تہی دستاں رخِ زیبا مپوش — عشقِ سلمانؓ و بلالؓ ارزاں فروش

چشمِ بے خواب و دلِ بے تاب دہ — باز مارا فطرتِ سیماب دہ

آیتے بنما ز آیاتِ مبین — تا شود اعناقِ اعدا خاضعین

کوہِ آتش خیز کن ایں کاہ را — ز آتشِ ما سوز غیر اللہ را

رشتۂ وحدت چو قوم از دست داد — صد گرہ بر روئے کارِ ما فتاد

ما پریشاں در جہاں چوں اختریم — ہمدم و بیگانہ از یک دیگریم

باز ایں اوراق را شیرازہ کن — باز آئینِ محبت تازہ کن

رہرواں را منزلِ تسلیم بخش — قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش

عشق را از شغلِ لا آگاہ کن
آشنائے رمزِ الا اللہ کن

(کلیاتِ اقبال فارسی ص ۲۱۲-۷۵)

دعا کے عنوان سے ایک فلسفیانہ نظم تین شعروں پر مشتمل پیامِ مشرق میں ہے۔ یہ نظم معنی خیز اور فلسفیانہ انداز لئے ہوئے ہے۔ عام طور سے انسان اپنی فلاح و بہبود کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ عزت و دولت اور مدارج کی بلندی یا خیر و عافیت کے حصول کے لئے سپاس گزاری میں مشغول رہتے ہیں۔ بعض طولِ حیات کے ساتھ نجات کے طالب رہتے ہیں۔ لیکن اقبال کی دعا اپنے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے ہے۔ وہ خدا سے التجا کرتے ہیں کہ اے مولائے کریم تو نے میرے جام (یعنی دل) کو خم خانۂ فطرت (یعنی عشق) سے معمور کر دیا ہے۔ وہ عشق جو تو نے مجھے بخشا ہے۔ اس کی گرمی میری ذات کو گداختہ کر دے یعنی میرے دل میں سوائے تیرے اور کسی کی محبت نہ ہو۔ میری

فریاد کی گرمی کو عشق کے واسطے سرمایہ بنا دے۔ مفہوم یہ ہے کہ میں عشقِ حقیقی کی جن منازل سے آشنا ہوں۔ اس کا مقام دنیا والوں کو واضح کر دے اور اس کی تاثیر کو باطل کے لئے سراپا آتش بنا دے۔ یعنی میرے شعلے سے باطل کو خاکستر کر دے۔ آخری شعر میں اپنے دل کی درد بھری دعا کے لئے یہ خواہش کرتے ہیں کہ اے خدا! میں تمنا کرتا ہوں کہ جب اس دنیا سے اُٹھ جاؤں تو میری خاکِ لحد سے لالہ کا پھول پیدا ہو تاکہ وہ داغ جو میرے دل و جگر میں ہے لالے کی صورت میں دوبارہ جلوہ گر ہو اور دنیا والوں کو میرے دل کے پیغام سے ہمیشہ روشناس کرتا رہے ؎

اے کہ از خُمخانۂ فطرت بجامم ریختی
زآتشِ صہبائے من بگداز مینائے مرا
عشق را سرمایہ ساز از گرمیِ فریادِ من
شعلۂ بے باک گرداں خاکِ سینائے مرا
چوں بمیرم از غبارِ من چراغِ لالہ ساز
تازہ کن داغِ مرا، سوزاں بصحرائے مرا

(کلیاتِ اقبال، فارسی ص۲۵۴)

ایک قطعے میں اسی مضمون کو اس طرح فرماتے ہیں ؎

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست ؎ (کلیاتِ اقبال، فارسی ص۲۰۷)

مسلمان کا شیوۂ زندگی ہر لحظہ یہی ہونا چاہیے کہ وہ اپنی موجودہ حالت سے کبھی مطمئن نہ ہو۔ بلکہ اس کی زندگی ہر وقت بلندیوں کی دھن میں سرگرمِ کار رہے۔ اور ہر گھڑی نئے نئے نقش صفحۂ کائنات پر مرتسم کرتی رہے۔ اگر تیرے حال اور ماضی میں کوئی فرق نہیں تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تو زندہ نہیں مردہ ہے۔ اسی طرح کا ایک شعر اردو میں بھی ہے ؎

نشاں یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا — کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

زبورِ عجم میں ایک دعائیہ نظم ملتی ہے۔ جو اسرار و رموز سے مملو ہے۔ حضورِ باری میں عرض کرتے ہیں کہ اے خدا! میرے سینے میں ایک باخبر دل عطا فرما۔ تاکہ جس کی بدولت میری نظر اس قدر تیز اور دور رس ہو جائے کہ میں شراب میں نشہ تک کو دیکھ سکوں۔ مجھے دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنا عار ہے۔ مجھے اپنی محبت سے نواز تاکہ میری زندگی چمکتی ہوئی صبح کی مانند ہو جائے۔ میں تو ایک سیلاب کی طرح ہوں۔ مجھے کم مایہ ندی کی طرح نہ رکھ بلکہ مجھے ہر وادی، کوہ و کمر میں بہنے کی توفیق عطا فرما۔ یعنی میرے دل سے جو خیالات نکلے ہیں ان کو ساری کائنات میں پھیلا دے تاکہ ہر قوم اُن سے یکساں طور پر فیض یاب ہو سکے۔ یارب مجھے سمندر کی مانند موجوں کا اضطراب بھی

بخش اور سکون بھی۔ سمندر میں موجیں چونکہ مضطرب رہتی ہیں لیکن اس کی تہ پُر سکون ہوتی ہے اس لئے یہ اشارہ اُسی کیفیت کا حال ہے۔ (میرے خیالات) یہ وہ شاہین ہیں جنھیں شیروں کو شکار کرنا ہے۔ اس لئے ان کو بلند سے بلند تر فرما۔ اور ان کو پنجے تیز عطا فرما۔ کیونکہ وہ بامِ حرم کے پرندوں کے شکار کے لئے جا رہے ہے اور انھیں ایسے تیر مرحمت فرما۔ جو ترکش سے نکلے بغیر ہی نشانے پر بیٹھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ میری خاک سے داؤد کے نغمے نکلیں اور میرے ہر ذرے سے چنگاریوں کی سی آب و تاب پیدا ہو جائے۔

یارب! درونِ سینہ، دلِ باخبر بدہ — در بادہ نشہ را نگرم، آں نظر بدہ

ایں بندہ را کہ با نفسِ دیگراں نزیست — یک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ

سیلم، مرا بجوئے تنک مایہ مپیچ — جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ

سازی اگر حریفِ یم بیکراں مرا — با اضطرابِ موج، سکونِ گہر بدہ

شاہینِ من بصیدِ پلنگاں گزاشتی — ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ

رفتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار — تیرے کہ ناگفندہ فتد کارگر بدہ

خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤد بر فروز

ہر ذرۂ مرا پر و بالِ شرر بدہ (کلیاتِ اقبال فارسی صفحہ ۳۹۹)

زبورِ عجم میں اقبال کی اس دعا کا انداز نرالا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے خدا! تو نے عشق کی گرمی میں اضافہ کر دیا ہے۔ میں التجا کرتا ہوں کہ میری شاعری میں وہ تاثیر پیدا فرما دے کہ ہزار سال کے مردوں میں بھی زندگی پیدا ہو جائے۔ اے خدا! جب تو نے مجھے زندگی بخشی ہے تو میرے دل کو مرکزِ عشق بنا دے۔ میرے کلام میں اس قدر تاثیر بخش دے کہ انسانوں کے دلوں سے افسردگی دور ہو جائے اور ان میں زندگی کے آثار نمایاں ہو جائیں۔ میں تیری محبت میں دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو چکا ہوں۔ مجھے ساغرِ محبت عنایت فرما اور اپنا دیوانہ بنا دے۔ میں دنیا میں تیرے سوا کسی کا دست نگر نہ ہوں اور کسی کا محتاج نہ ہوں۔ اس نظم میں ناز و نیاز اور شوخ اسلوبِ بیان قابلِ غور ہے۔

اے کہ ز من فزودۂ گرمیِ آہ و نالہ را — زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را

با دلِ ما چہا کنی! تو کہ بہ بادۂ حیات — مستیِ شوق می دہی آب و گلِ پیالہ را

غنچۂ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے — تازہ کن از نسیمِ من داغِ درونِ لالہ را

می گزرد خیالِ من از مہ و مہر و مشتری — تو بکمیں چہ خفتۂ صید کن ایں غزالہ را

خواجۂ من! نگاہ دار آبروئے گدائے خویش

آنکہ ز جوئے دیگراں پُر نکند پیالہ را (کلیاتِ اقبال فارسی صفحہ ۳۹۹)

زبورِ عجم کی ایک دعائیہ نظم کا انداز حکیمانہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے خدا! مجھے وہ دل عنایت فرما جس میں تو ہی تو ہو۔ یعنی میرا دل محبتِ خدا سے مملو ہو اور وہ دل جو کسی دوسرے کے تصور میں دھڑکتا ہو۔ وہ بیکارِ محض ہے۔ مجھے اس دل کی خواہش نہیں۔ خداوندا! مجھے وہ دل مرحمت کر جس میں کائنات کو مسخر کرنے کی طاقت ہو۔ مجھے ایسا دل درکار نہیں کہ جس میں سود و زیاں سوچنے کی عادت

ہو۔ میں دعا کرتا ہوں کہ مجھے تقدیر کے ترکش سے باہر نکال اور اپنی مشیت کی کمان میں جوڑ کر ناز و کر۔ تاکہ وہ دلوں میں بیٹھ سکے۔ آخری شعر میں انہوں نے مسلمانوں کو جو پیغام دیا ہے۔ اس کا مفہوم ایک حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اے مسلمان! اس حقیقت کو تو پوری طرح سے سمجھ لے کہ تسخیر کائنات سے تم خستہ و درماندہ نہیں ہو جاؤ گے۔ بلکہ اس جہاں کو فتح کرنے کے بعد تمہارے ارادے اور مضبوط ہو جائیں گے اور تم اس عالم سفلی کے بعد عالم علوی تک پہنچنے کی خواہش میں پہلے سے زیادہ چاک و چوبند ہو جاؤ گے۔

بدہ آں دل کہ مستی ہائے او زبادہ خویش است
بگیر آں دل کہ از خود رفتہ و بیگانہ اندیش است
بدہ آں دل بدہ آں دل کہ گیتی را فرا گیرد
بگیر ایں دل بگیر ایں دل کہ در بند کم و بیش است
مرا اے صید گیر از ترکش تقدیر بیروں کش
جگر دوزی چہ می آید ازاں تیرے کہ در کیش است
نگردو زندگانی خستہ از کار جہاں گیری
جہانے در گرہ بستم جہانے دیگرے پیش است

(کلیات اقبال فارسی صفحہ ۴۳۶)

زبور عجم کی اس نظم کا انداز دوسری نظموں سے قدرے مختلف ہے۔ اقبال اس نظم میں حضور باری میں اس طرح پیش ہوتے ہیں۔

اے خدا! مجھے وہ جام شراب عطا فرما کہ جس سے میرا دل جذبات محبت سے بھر جائے اور میری مشت خاک اس دنیا کے باغ میں موسم بہار کی ہواؤں میں مخلوط ہو جائے یعنی میں کائنات میں تیرے نام کو بلند کر سکوں جو علوم و فنون میں نے یورپ میں سیکھے ہیں۔ ان کے اثرات نے میرے دل کو غیر اسلامی بنا دیا ہے۔ یعنی مغربی تعلیم نے میرے دل کو شک و شبہ میں گرفتار کیا ہوا ہے خداوندا! میرے دل کو اسلامی عشق کی رہبری عطا فرما تاکہ میں اپنے اصل کی طرف لوٹ آؤں اور اپنے ایمان کی کمزور بنیادوں کو استوار کر سکوں۔ میرے اوہام کو یقین سے بدل دے۔ میرے دل میں خواہشات پیدا ہوتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں۔ مجھے دیرپا آرزو سے ہمکنار کر دے مادہ پرستی کے جو انکار پیدا ہو گئے ہیں انھیں خدا پرستی سے بدل دے۔ یعنی کبھی میں انکار خدا کے فلسفے کی طرف مائل ہو جاتا ہوں اور کبھی اقرار خدا کی کیفیت طاری و ساری ہو جاتی ہے۔ اے خدا مجھے اس کشمکش سے رہائی بخش دے۔ اے پالنے والے۔ مجھے تو نے دنیا میں سربلندی کے راز سے واقف فرمایا ہے اور میرے ہاتھ میں قلم دیا ہے۔ اس لئے میں درخواست کرتا ہوں کہ مجھے وہ جبین بھی عطا فرما دے کہ جس پر جو حقائق و معارف مجھے بخشے گئے ہیں تحریر کر سکوں یعنی ایک ایسی قوم بھی عنایت فرما دے کہ جو میرے پیغام کو سمجھ سکے اور اسے پورا کرنے کی جدو جہد کرے۔

ازاں آبے کہ در من لالہ کارد ساتگینے دہ
کف خاک مرا ساقی بباد فرودینے دہ
زمینائے کہ خوردم در فرنگ اندیشہ تاریک است
سفر در زیدۂ خود را نگاہ راہ بینے دہ
چو خس از موج ہر بادے کہ می آید ز جا رفتم
دل من از گماں ہا در خروش آمد یقینے دہ
بجانم آرزو ہا بود و نابود شرر دارد
شبم را کوکبے از آرزوئے دل نشینے دہ

بدستم خامہ دادی کہ نقشِ خسروی بند د
زقم کش ایں چنینم کرد ، لوحِ جبینے دہ (کلیاتِ اقبال فارسی ۱۸۱)

جاوید نامہ کے شروع میں مناجات کے عنوان سے ایک نظم ستاون اشعار کی ملتی ہے جس کے چھ بند ہیں۔ ابتدا اس طرح سے ہے ؎

آدمی اندر جہان ہفت رنگ — ہر زماں گرم فغاں مانندِ چنگ
آرزوے ہم نفس می سوزدش — نالہ ہاے دل نواز آموزدش

پہلے بند میں انسان کی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ کیا انسان عالم پر حکمران ہے یا عالم انسان پر اور اسی بند میں ایک لطیف اشارہ کیا ہے کہ انسان کو ہم نفس کی خواہش رہتی ہے۔ دوسرے بند میں خواہش کرتے ہیں ؎

اے خدا روزی کن آں روزے مرا
وارہاں زیں روزِ بے سوزے مرا

یعنی مجھے مادی روزِ بے سوز سے نجات بخش۔

تیسرے بند میں انسان کی فضیلت قرآن حکیم کے فرمان کے مطابق منضبط کرتے ہیں۔ پانچویں اور چھٹے بندوں میں دعائیں ہیں۔ چھٹے بند میں جو دعائیں ہیں ان کا مفہوم یہ ہے کہ اے خدا! تو تو جاودانی روشنی کا مالک ہے۔ میں تو ایک مستعار شرارے کی مانند ہوں۔ ابھی چمکا ابھی گم ہو گیا یعنی ایک معمولی چنگاری ہوں۔

اے خدا! جو پیدا ہوا ہے اُسے ایک دن مرنا ہے۔ تجھکو تو معلوم نہیں کہ موت کیا ہے اور حیات کیا؟ لیکن میرے مالک اس جہان میں کچھ تیرے بندے ایسے بھی ہیں جو تجھ پر رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تیرے جن بندوں میں آفاق گیری اور ناصبوری کے صفات ہیں وہ حیاتِ ابدی چاہتے ہیں انہیں دُوری اور حضوری دونوں ناپسند ہیں۔ مجھے جاودانی کر دے اور میرے لئے زمین و آسمان مسخر کر دے مجھے شریعتِ اسلامیہ پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور میرے کردار اور گفتار آئینِ اسلام کے ماتحت ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ یہ انوکھا بیان ہے۔ یہ کتاب جو میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کا آسمان دوسرا ہے۔ یہ کتاب ایک گہرا سمندر ہے۔ اور بہت کم ایسے غوطہ زن ہیں جو جو اس سے موتی نکالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ایک زمانے نے میرے ساحل پر آرام کیا لیکن کنارے ہی سے موجوں کو دیکھتے رہے۔ میں اپنی قوم کے بوڑھوں سے نااُمید ہوں۔ کیوں کہ میں جو کچھ کہتا ہوں۔ وہ ایک دوسری دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی یہ تو آنے والے وقت کا بیان ہے۔ یعنی میرا پیغام ان کے ماحول اور وقت کے مطابق نہیں۔ آخری شعر میں جوانوں کے لئے دعا کرتے ہیں کہ اے خدائے لایزال ان میں ایسی صلاحیتیں عطا فرما کہ وہ میری بات کو آسانی سے سمجھ سکیں اور اس پر عمل پیرا ہو سکیں ؎

تو فروغِ جاوداں ما چوں شرار — یک دو دم داریم و آں ہم مستعار
اے تو نشناسی نزاعِ مرگ و زیست — رشک بر یزداں برد ایں بندہ کیست
بندۂ آفاق گیر و ناصبور — نے غیاب اورا خوش آید نے حضور
آنچنان من جاودانی کن مرا — از زمینی آسمانی کن مرا

ضبط در گفتار و کردارے بدہ — جادہ ہا پیداست رفتارے بدہ
آنچہ گفتم از جہانے دیگر است — ایں کتاب از آسمانے دیگر است
بحرم و از من کم آشوبی خطاست — آں کہ در قعرم فرو آید کجاست
یک جہاں بر ساحلِ من آرمید — از کراں غیر از رمِ موجے ندید
من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن — دارم از روزے کہ می آید سخن

برجواناں سہل کن حرفِ مرا
بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

(کلیاتِ اقبال فارسی ص ۵۹۹، ۵۹۸)

اقبالؔ نے ایک دعا "ہمدم" عطا کرنے کے لئے نہایت خشوع وخضوع سے مانگی ہے۔ یہ دعا اسرارِ خودی کے آخری بند میں ہے۔ جاوید نامہ میں بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے جو بیان ہو چکا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اے خدا! میں دوسروں کے لئے شمع کی مانند جلتا اور پگھلتا رہا۔ میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ میں اپنی قوم کے درمیان اکیلا ہوں۔ مجھ سے لوگ ملاقات کے لئے آتے ہیں۔ لیکن ان کے مقاصد جدا ہیں۔ یا رب! میرا ندیم کہاں ہے۔ نہ ہی کوئی کلیم ہے جو مجھ پہ وارد ہونے والی تجلّی کو دیکھے۔ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا کہ اس شعلے کی پرورش کی۔ جس سے میرے ہوش و حواس باختہ ہو گئے۔ جس نے عقل کو دیوانگی سکھلائی اور علم کی ہستی کے سامان کو خاکستر بنا دیا۔ میں شبنم کی طرح آنسو بہا بہا کر اس پوشیدہ آگ کا امین بنا ہوں۔ شمع کا جلنا تو ظاہر ہے۔ لیکن میں تو اندر ہی اندر گھل رہا ہوں اور دنیا کو اس کی خبر تک نہیں۔ میری رگ رگ سے شعلے نکل رہے ہیں میرا ہر موئے بدن جل رہا ہے۔ میرے طائرِ فکر نے ان چنگاریوں کو دانے سمجھ کر چگا اس لئے میرے گیتوں میں آگ کی گرمی پیدا ہو گئی۔ اے خدا! اس زمانے کے مسلمان تیرے عشق سے بیگانہ ہو گئے۔ مجنوں کیوں نہ تڑپے کہ محمل خالی ہے۔ شمع آخر کب تک اکیلی جلتی رہے جبکہ اس پہ فدا ہونے کے لئے ایک پروانہ بھی نہیں۔ ایک غمگسار کے انتظار میں آخر میں کب تک رہوں اور ایک راز دار کے لئے کب تک سرگرداں رہوں۔ یا تو میرے دل میں جو آگ پوشیدہ ہے اس کو بجھا دے یا ایک ہمدم عطا فرما جو میری کیفیت میں میرا ساتھی ہو یعنی جو میرے پیغام کو سمجھ سکے اور عمل کر سکے۔ اے خدا! سمندر کی موجیں تک تنہا نہیں۔ ایک کے پہلو میں دوسری موج لہراتی اور بل کھاتی ہوئی ہم آغوش ہوتی ہے آسمان پر ستارے ایک دوسرے کے ندیم و ہمدم ہیں۔ چاند رات کی آغوش میں آسودہ ہے۔ دن کے لئے رات اور آج کے لئے کل ہے۔ ایک ندی دوسری ندی سے مل جاتی ہے۔ ہوا کی موج بُو میں گم ہو جاتی ہے۔ دیوانے دیوانوں کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔ اگرچہ میں اپنی ذات میں اکیلا ہوں۔ لیکن اکیلا رہنا مجھے پسند نہیں۔ تو نے بھی ایک عالم کو آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ غرضیکہ کائنات کی ہر چیز اپنا رفیق و ہمدم رکھتی ہے لیکن میں ہوں کہ میرا کوئی ہمدم نہیں۔ لالۂ صحرا کی طرح اکیلا ہوں۔ اے خدا! مجھ پر کرم فرما اور ایک فرزانہ ہمدم بخش۔ جو میری فطرت کا محرم راز ہو۔ اور جو دنیا کے جھگڑوں اور بکھیڑوں سے علیحدہ ہو کر میرا اور فقط میرا ہو جائے تاکہ میں اس کو اپنے جذبات و خیالات ودیعت کر دوں اور پھر اس کی ذات میں اپنا عکس اور اس کے دل کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھوں۔ پھر اپنی مشتِ خاک سے اس کا ایک پیکر بناؤں اور اس کا پرستار بن جاؤں ؎

منکہ بہرِ دیگراں سوزم چو شمع — بزمِ خود را گریہ آموزم چو شمع
دل بدوش و دیدہ بر فرداشتم — درمیانِ انجمن تنہاستم
"ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من — از درونِ من نجست اسرارِ من"
در جہاں یارب ندیمِ من کجاست — نخلِ سینایم کلیمِ من کجاست
عقل را دیوانگی آموختہ — علم را سامانِ ہستی سوختہ
ہم چو شبنم دیدۂ گریاں شدم — تا امینِ آتشِ پنہاں شدم
شمع را سوزِ عیاں آموختم — خود نہاں از چشمِ عالم سوختم
شعلہ ہا آخر ز ہر مویم دمید — از رگِ اندیشہ ام آتش چکید
عندلیبم از شررہا دانہ چید — نغمۂ آتش مزاجے آفرید
سینۂ عصرِ من از دل خالی است — می تپد مجنوں کہ محمل خالی است
شمع را تنہا تپیدن سہل نیست — آہ یک پروانۂ من اہل نیست
انتظارے غم گسارے تا کجا — جستجوے راز دارے تا کجا
اے ز رویت ماہ و انجم مستنیر — آتشِ خود را ز جانم بازگیر
ایں امانت بازگیر از سینہ ام — خارِ جوہر برکش از آئینہ ام
یا مرا یک ہمدمِ دیرینہ دہ — عشقِ عالم سوز را آئینہ دہ
موج در بحر است ہم پہلوے موج — ہست با ہمدم تپیدن خوے موج
بر فلک کوکب ندیمِ کوکب است — ماہِ تاباں سر بزانوے شب است
روز پہلوے شبِ یلدا زند — خویش را امروز بر فردا زند
ہستیِ جوے بجوے گم شود — موجۂ بادے ببوے گم شود
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص — می کند دیوانہ با دیوانہ رقص
گرچہ در ذاتِ خود یکتاستی — عالمے از بہرِ خویش آراستی
من مثالِ لالۂ صحراستم — درمیانِ محفلے تنہاستم
خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے — از رموزِ فطرتِ من محرمے
ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ — از خیالِ این و آں بیگانۂ
تا بجانِ او سپارم ہوے خویش — باز بینم در دلِ او روے خویش

سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش
ہم صنم او را شوم ہم آزرش

(کلیاتِ اقبال فارسی ص ۷۰-۷۱)

اقبال جب اس بسیط کائنات میں اپنے کو تنہا پاتے ہیں۔ تو اپنی دعا میں حضورِ باری سے اس طرح عرض کرتے ہیں کہ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔ میرا کوئی ہمدم و ہمنوا نہیں۔ میں نے ایک ہم صفیر کے لیے اس فراغ زمین کے کوہ و بیاباں چھان مارے۔ سمندروں میں ڈھونڈا۔ میں نے چاند اور ستاروں کو مخاطب کیا اور کوئی جواب نہ پایا اے خدا میں تیری بارگاہ میں فریاد لے کر آیا ہوں کہ تیری یہ دنیا میرے رہنے کے قابل نہیں۔ میں سراپا دل ہوں۔ لیکن تیری دنیا اس کی قدر و منزلت سے بالکل خالی ہے۔ تنہائی کی انتہا ہوگئی ہے

شدم بہ حسرتِ یزداں گرفتم از مہ و مہر کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہاں تہی ز دل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل چمن خوش است ولے درخورِ نوایم نیست

تبسمے بہ لبِ او رسید و ہیچ نہ گفت

بال جبریل کی ایک نظم انتہائی بلیغ ہے۔ جس میں وہ بزرگ و برتر خدائے تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں۔ اس نظم کے سات شعر ہیں ہم انھیں ادب و شعر کے سبع سیارہ کہہ سکتے ہیں۔ نظم کا مفہوم یہ ہے۔ پہلے شعر میں حقیقت اور مجاز دونوں پائے جاتے ہیں۔ کہ اے خدا! تو اپنی تجلیات قدرت کو اس شدت سے میرے قلب و نظر پر نازل فرما کہ میں سراپا تیرے جلووں میں غرق ہو جاؤں اور مجھے تیرے سوا اور کوئی چیز اس کائنات میں نظر نہ آئے۔ یعنی ماسویٰ سے بیگانہ ہو جاؤں۔ دوسرے شعر میں اپنی خواہش کا والہانہ انداز میں اظہار کرتے ہیں کہ اگر حسن اور عشق دونوں حجاب میں ہوں۔ یہ کیونکر مستحسن ہے۔ یا تو اپنا جلوہ مجھے دکھا۔ کیونکہ تیری صفت ہے کہ تجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے دوسری صورت یہ ہے کہ مجھے ظاہر فرما یعنی مجھے شہرتِ دوام عطا فرما۔ یعنی اپنے فضل و کرم سے مجھے وہ شعور عطا کر دے کہ میں تیری عظمت بیان کرنے کے صلے میں دنیا میں مشہور ہو جاؤں۔ تیسرے شعر میں اپنی بے بضاعتی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اے خدا تو ایک محیط بیکراں ہے ایسا سمندر جس کی تھاہ نہیں اور میں ایک ذرا سی نہر۔ یا تو مجکو اپنی آغوش میں لے لے یعنی اپنے میں جذب کر لے۔ یا مجھ میں بھی غیر محدودیت کی صفت پیدا کر دے۔ یہ شعر انتہائی بلیغ ہے۔ چوتھے شعر میں کہتے ہیں کہ اگر میں صدف ہوں تو اس میں جو موتی ہے اس کی آبرو تیرے ہاتھ میں ہے اور اگر وہ خزف یعنی ریزۂ سفال (ٹھیکری) ہے۔ تو اپنے فضل و کرم سے اس کو گوہرِ شاہوار کر دے۔ مراد یہ ہے کہ اگر مجھ میں کوئی خوبی ہے تو اسے برقرار رکھ اور اگر مجھ میں کوئی خوبی نہیں تو مجھے خوبیاں عطا فرما یعنی روحانیت و یقین کی دولت سے مالا مال کر دے۔ پانچویں شعر میں کہتے ہیں کہ اگر نغمۂ نو بہار میری قسمت میں نہیں تو مجھے طائرک بہار کر دے۔ یعنی میں التجا کرتا ہوں کہ مجھے اسلام کی بہار کی خوشخبری سنانے والا بنا دے۔ یعنی میں اُس عروجِ اسلام کی خوشخبری ملتِ اسلامیہ تک پہنچا دوں کہ جس کی یاد سے ان کے دل بیگانہ ہو گئے ہیں۔ چھٹے شعر میں جنت سے حضرت آدم علیہ السّلام کے اخراج کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ تیری مشیت کے مطابق حضرت آدم جنت سے اس دنیا میں تشریف لائے۔ اس دنیا کا کاروبار تو بہت وسیع ہے۔ جب تک یہ دنیا ختم نہ ہو جائے۔ تب تک میری حاضری جناب کی درگاہ میں ناممکن ہے۔ اس شعر میں نیاز کی بجائے ناز کا رنگ غالب ہے۔ اور آخری شعر میں ناز کا رنگ گہرا ہو گیا ہے کہ اے خدا! جب قیامت کے دن میرا دفترِ اعمال پیش ہو۔ تو براہ کرم اس سے چشم پوشی فرما۔ کیونکہ گناہوں کی کثرت سے مجھے شرمندگی ہوگی۔ اے خدا میں نہایت عاجزی اور فروتنی سے عرض کرتا ہوں کہ میرے حساب کتاب سے درگذر فرما اور اسے پوشیدہ رکھ۔ نہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ میں بھی شرمسار ہوں گا اور تو بھی۔ یعنی مجھے دولت

رحم و کرم سے نوازنا اور میرے گناہوں کا حساب نہ لے۔ یہ دعا اقبال کی دعائیہ نظموں میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو میں ہوں خزف تو تُو مجھے، گوہرِ شاہوار کر
نغمۂ نوبہار اگر، میرے نصیب میں نہ ہو اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر
باغِ بہشت سے مجھے، حکمِ سفر دیا تھا کیوں کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھکو بھی شرمسار کر

خدا سے شکوہ و شکایت کرنا۔ شوخیاں اور ناز و نیاز کرنا۔ اقبال کے کلام کا خاصہ ہے انہوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی مثال مشرق اور مغرب کے شعرا کے کلام میں شاذ ہی مل سکتی ہے۔ غالب نے جو کچھ کہا ہے دبی زبان میں کہا ہے۔ اسی طرح خیام کی رباعیات میں بھی کہیں کہیں یہ انداز پایا جاتا ہے۔ لیکن جس پائے کے شوخیانہ شعر اقبال کے کلام میں ملتے ہیں۔ دوسروں کے ہاں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں اقبال نے اس موضوع کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ اس کے تتبع کی کہیں گنجائش نظر نہیں آتی۔ اس قسم کی سب سے اہم تصنیف "شکوہ" ہے جس میں شکوہ و شکایت کے دفتر موجود ہیں۔

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں
طعنِ اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

جب شکوہ کی تشہیر ہوئی۔ تو بہت سے شعرا نے اس کے جواب لکھے لیکن جو انداز جواب شکوہ میں ہے اس کا بدل ان تمام شعرا کا کلام نہیں ہو سکتا۔ شکوہ و شکایت کا تجزیہ کرنے کے بعد اقبال نے جواب کا جو اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ یہی شکوہ میں اس دعائیہ مسدس کو پڑھئے۔ جس میں فکرِ اقبال نے دعا کا رنگ دے کر ایک حقیقت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کر دے

جنسِ نایاب محبت کو پھر ارزاں کر دے   یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

جوے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بانگِ درا میں ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم دعا کے عنوان سے ہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے زندہ تمنا کی خواہش کرتے ہیں کہ جس سے ان کے دلوں میں حرارت پیدا ہو جائے اور جو ان کی روح کو تپیدہ کر دے۔ ان کی روحانیت کو جلا بخشے۔ وہ آگ جو اقبال کے دل میں روشن ہے۔ ان کے دلوں کو بھی منور کر دے۔ مسلمان گم کردہ راہ ہیں ان کو بانیٔ اسلام کی محبت بخش دی جائے۔ ان کا عشق درجۂ کمال تک پہنچ جائے۔ ان کے داغِ دل میں چاند ایسی دلکشی پیدا ہو جائے۔ ان کے ارادوں میں بلندی اور غیرت و خودداری کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ ان کے قلوب پاکیزہ اور خالص محبت سے بھر جائیں اور نورِ ایمان سے منور ہو جائیں۔ انھیں اپنی مصیبتوں کا احساس ہو جائے اور وہ ان کے لئے مفید انتظام کر سکیں۔ وہ آج کے ہنگاموں میں کل کے متعلق سوچ سکیں۔ کیونکہ جو آئندہ کے لئے تیاری نہیں کرتا وہ عین وقت پر کچھ کر نہیں سکتا۔ آخر میں کہتے ہیں کہ میں تو ایسے گلستان کا بلبل ہوں جو اجڑا ہوا ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ میرے کلام کو مؤثر بنا دے تاکہ میری قوم اسے سمجھ سکے سہ

یا رب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے   جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکا دے   پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے   دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل   اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر   اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلیٰ دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو   وہ داغِ محبت دے، جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہم دوشِ ثریا کر   خودداریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے
بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو   سینوں میں اجالا کر، دل صورتِ مینا دے
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا   امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

اسی مفہوم سے ملتی جلتی اقبال کی ایک اور دعا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے خدا! میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ میرے کلام میں تاثیر بخش تاکہ وہ مسلمان جو سو چکے ہیں ان کے واسطے بانگِ درا کا کام دے اور ان نیند کے ماتوں کو جگا دے۔ وہ احساسِ زیاں کرنے لگیں۔ پھر وہ بھولا ہوا پیمانِ وفا باندھیں اور اسلام اور قرآن کی محبت ان کے دلوں میں پھر راسخ ہو جائے اور پھر وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر سکیں۔ آخر آخر ٹیپ کے بند میں فرماتے ہیں کہ میں نے اپنا پیغام شعر کی شکل میں پیش کیا۔ یہ پیغام اگرچہ اُردو زبان میں ہے۔ لیکن ان میں جو خیالات اور جذبات ہیں ان کا منبع قرآن حکیم ہے۔ نغمہ تو ہندی ہے۔ لیکن اس میں لے حجازی ہے۔

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں — جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں — پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خُم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لَے تو حجازی ہے مری

بال جبریل کے ابتدائی حصوں میں اقبال نے دعائیہ انداز اختیار کیا ہے۔ اکثر نظمیں مختلف اثرات کی حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو نئے نئے ڈھنگ سے مخاطب کیا ہے۔ ان نظموں میں ایک نظم ایسی ہے جس کا پیرایۂ بیان اچھوتا ہے۔ ساقی کو مخاطب کرتے ہیں اور اپنا ما فی الضمیر بیان فرماتے ہیں۔ اسے خدا! میں اپنا مقام بھول گیا ہوں۔ مجھے پھر اسی عظمت دیرینہ سے آشنا کر دے جو اسلام کی ابتدا میں تھی۔ تین سو سال سے ہندوستان کے مے خانے بند ہو چکے ہیں اب یہی مناسب ہے کہ تیرا فیضِ عام جاری ہو جائے۔ یعنی مسلمان جذبۂ حریت سے سرشار ہو جائیں۔ یہاں کا ملّا تنگ نظر ہے۔ میں غزل کے رنگ میں جو تھوڑا بہت کہتا ہوں وہ اسے حرام کہتا ہے۔ مسلمانوں میں تحقیق و تدقیق ختم ہو گئی۔ اور جن میں کچھ شعور ہے وہ ملّا اور صوفی کے غلاموں میں سے ہیں۔ یعنی یہ اس مقام سے ناآشنا ہیں۔ عشق کی تیغِ خارا شگاف تو اڑا لی گئی۔ اب خالی نیام ہاتھ میں رہ گیا ہے۔ یعنی علم اب مفقود ہو رہا ہے اور عشق ناپید۔ اگر سینہ میں نورِ ایمان ہو تو جو بات منہ سے نکلے گی مؤثر ہوگی اور وہ قوم کے واسطے پیغام بن جائے گی۔ اور اگر ایسا نہیں ہے۔ تو پھر سخن مرگِ دوام ہے۔ اسے خدا! تو میری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ۔ تیرا پیمانہ تو ایسا ہے کہ اس میں ماہِ تمام ہے یعنی تو میرے دل کو الہام کی روشنی بخش دے کیونکہ تیرے کرم و جود کی حد اور حساب نہیں۔ تو خیر و برکت کا سرچشمہ ہے۔ میرے پیمانے کو رشد و ہدایت کی شراب سے بھر دے تاکہ میں وہی شراب اہلِ عالم کو پلا کر سرشار کر سکوں ؎

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی! — ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی!
تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند — اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!
میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی — شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی — رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام اے ساقی!
عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے — علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات — ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی!

ڈاکٹر اقبال کی ایک مناجات غزنی کے ویرانہ میں کہی گئی ہے۔ اس کا مضمون اور اس کے نکات سمجھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'مثنوی پس چہ باید کرد' اور 'مسافر' یک جا شائع ہوئی ہیں۔ مناجات مسافر میں طبع ہوئی ہے۔ اقبال کا دل قومی درد سے مملو ہے۔ وہ قوم کو ابھارتا ہے اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ اُسے یقین ہے کہ دنیا کی نجات اسلام میں ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ

کی بارگاہ میں کثرت سے دعائیں مانگی ہیں۔ وہ مسلمانوں کی پسماندگی سے ہمیشہ پریشان رہے ہیں۔ غزنی کے ویرانے میں جو مناجات انہوں نے کہی ہے۔ اس دنیا اور خاص کر مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس طرف نگاہ جاتی ہے۔ فتنہ وفساد برپا ہے۔ بدامنی کا دور دورہ ہے۔ سچائی اور محبت کا کہیں نام ونشان نہیں۔ اے خدا تو نے دنیا کا انتظام اقوام مغرب کے حوالے کر رکھا ہے لیکن نوعِ بشر کو ان کے ظلم و استبداد نے تباہ کر دیا ہے۔ وہ روشن ضمیر مردِ حق جو تیرا نائب تھا۔ مال و زر اور فرزند و عورت کی محبت میں از خود رفتہ ہو چکا ہے۔ یہ مسلمان کس سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے دل سوز سے خالی ہو چکے ہیں۔ زار و نزار ہیں اور زندگی کے راستے میں ان کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ کافروں کی طرح وہ موت کو فنا سمجھے ہوئے ہیں۔ ان کی آستینوں میں لات و منات ہیں۔ اس لئے دعا ہے کہ ان کی خاک سے شعلے پیدا کئے جائیں۔ اور ان کو طلب و جستجو کی لذت سے پھر آشنا کیا جائے تاکہ ان میں وہی سوز یقین پیدا ہو جائے۔ جو اس قوم کو اس مقام پر پھر پہنچا دے کہ اس کی ہیبت سے پہاڑ لرزنے لگیں اور اہلِ مشرق کی زندگیاں پھر سے استوار ہو جائیں۔

اے خدا! اے نقش بندِ جان و تن — با تو ایں شوریدہ دارد یک سخن
فتنہ ہا بینم دریں دیرِ کہن — فتنہ ہا در خلوت و در انجمن
عالم از تقدیرِ تو آمد پدید — یا خدائے دیگر او را آفرید
ظاہرش صلح و صفا باطن ستیز — اہلِ دل را شیشۂ دل ریز ریز
صدق و اخلاص و صفا باقی نماند — آں قدح بشکست و آں ساقی نماند
چشم تو بر لالہ رویانِ فرنگ — آدم از افسونِ شاں بے آب و رنگ
از کہ گیرد ربط و ضبطِ کائنات — اے شہیدِ عشوۂ لات و منات
مردِ حق آں بندۂ روشن نفس — نائبِ تو در جہاں او بود و بس
او بہ بندِ نقرہ و فرزند و زن — گر توانی سومناتِ او شکن
ایں مسلماں از پرستارانِ کیست — در گریبانش سے کے ہنگامہ نیست
سینہ اش بے سوز و جانش بے خروش — او سرافیل است و صورِ او خموش
قلبِ او نامحکم و جانش نژند — در جہاں کالائے او نا ارجمند
در مصافِ زندگانی بے ثبات — دارد اندر آستیں لات و منات
مرگ را چوں کافراں داند ہلاک — آتشِ او کم بہا مانندِ خاک
شعلہ از خاکِ او باز آفریں — آں طلب آں جستجو باز آفریں
باز جذبِ اندروں او را بدہ — آں جنونِ ذو فنوں او را بدہ
شرق را کن از وجودش استوار — صبحِ فردا از گریبانش برآر

بحرِ احمر را بچوب او شگاف
از شکوہش لرزۂ افگن بہ قاف

مسلمانوں کے فردوسِ گم شدہ اندلس میں جب ڈاکٹر اقبال ۱۹۳۳ء میں تشریف لے گئے۔ تو مسجد قرطبہ کی زیارت سے بھی فیض یاب ہوئے یہ زیارت ایک سیاح کی نہ تھی۔ بلکہ مسلمان مردِ مومن کی تھی۔ جس کی نظروں میں مسلمانوں کا ماضی جگمگا رہا تھا مسجد قرطبہ پر انہوں نے جو نظم کہی وہ صوری اور معنوی محاسن سے لبریز ہے۔ اقبال کی ان نظموں میں یہ نظم ہے کہ جس کی افادیت کبھی کم نہ ہوگی۔ جب بھی کوئی دردِ دل رکھنے والا اس کا مطالعہ کرے گا تو ضرور متاثر ہوگا۔ اقبال کے جذبات بحیثیت اس نظم کی تعمیر میں جس خوبی سے ڈھلے ہیں ان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ چونکہ یہ نظم ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لئے ہم اس دعا کا تعارف کراتے ہیں جو اس مسجد میں بیٹھ کر اقبال مرحوم نے کہی۔ یہ نظم گیارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔

پہلے تین اشعار میں فلسفۂ دعا پر شاعرانہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ نماز مسلمانوں کی بہت بڑی عبادت ہے اور عبادت کا مقصدِ وحید دعا میں پوشیدہ ہے۔ شرط یہ ہے خلوصِ دل سے اپنے مالکِ حقیقی کو پکارا جائے اور جو خواہش کی جائے وہ دل کی گہرائیوں سے پیش کی جائے لیکن خلوص کی دولت اہلِ صفا کی صحبت سے میسر آتی ہے۔ جب تک اہلِ صفا کی صحبت نہ ملے نعمت خلوص دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ دعا میں اس وقت اجابت کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ جب دعا مانگنے والا اللہ کے فضل و کرم پر یقینِ واثق رکھتا ہو۔ اس کا دل جذبات محبت سے معمور ہو۔ اقبال آرزو کو جذبۂ عشق و محبت کے معنی میں کہہ رہے ہیں۔ پھر چار اشعار میں حضور باری تعالیٰ میں عرض کرتے ہیں۔ اے خدا! میں ایک بندۂ عاجز و مسکین ہوں۔ میں امیروں اور وزیروں کی درگاہ پر تکیہ نہیں رکھتا۔ میرا تو ہی سہارا ہے۔ اور میرا تیرے سوا دوسرا کوئی نہیں۔ تیرے ہی فضل و کرم سے میرا سینہ صبح نشور کا مطلع ہے اور اسی کی وجہ سے "اللہ ہو" کا نعرہ میرے لبوں پر ہے تیرے ہی فیض سے میری زندگی سوز و گداز اور کیفیتِ سرمستی سے عبارت ہے۔ تو ہی میری آرزو ہے اور فقط تو ہی میری آرزو۔ اگر تو میرے پاس نہیں یعنی میرا مددگار نہیں تو میری دنیائے شعر و ادب ویران ہے اور اگر تو میرے ساتھ ہے تو میرا یہ اجڑا ہوا کاشانہ نعمتوں سے مالا مال ہے۔ یعنی میری شاعری کی آبادی تیرے فضل سے قائم ہے۔ اب دعائیہ اشعار کہتے ہیں کہ اے خالق و مالک مجھے اپنے گناہوں کا اعتراف ہے۔ مجکو ایمان اور یقین کی نعمتیں عطا فرما جن کو میں نے کوتاہیِ عمل سے ضائع کر دیا ہے۔ اے میرے مولا! میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ میری قوم کے تمام افراد جو دنیاوی کاموں میں مشغول ہیں اور وہ جو تنہائی کے گوشے میں تجھ سے لو لگائے ہوئے ہیں ان سب پر نگاہِ لطف و کرم فرما۔ آخری سے پہلے شعر میں اقبال کا اظہار خیال طنزیہ ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ادب کے ساتھ تیری بارگاہ میں عرض پرداز ہوں کہ تو خود تو لامکان ہے لیکن میرے لئے حدود یعنی مجھے بھی لامکانی صفت سے نواز۔ یعنی اقبال چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے کرم سے زمان و مکان کی قید سے آزاد کر دے۔ آخری شعر میں کھُل کر اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں کہ میں نے جو کچھ اس نظم میں کہا ہے۔ ایک جذباتی کیفیت ہے۔ یہ دعا فلسفیانہ ہے اور رمز و کنایہ کے محاسن اس میں پوشیدہ ہیں۔ اس میں وہی آرزو ہے جو روبرو نہیں کہی جا سکتی۔

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو ۔۔۔ میری نواؤں میں ہے، میرے جگر کا لہو

صحبتِ اہلِ صفا، نور و حضور و سرور — سرخوش و پُرسوز ہے لالۂ لبِ آبِ جو
راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق — ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو
میرا نشیمن نہیں، درگہِ میر و وزیر — میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا، مطلعِ صبحِ نشور — تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ھُو
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ — تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو
پاس اگر تو نہیں، شہر ہے ویراں تمام — تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو
پھر وہ شرابِ کہن، مجھ کو عطا کر کہ میں — ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو
چشمِ کرم ساقیا، دیر سے ہیں منتظر — جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو
تیری خدائی سے ہے، میرے جنوں کا گلہ — اپنے لئے لامکاں، میرے لیے چار سو

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا؟
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رُو بہ رو

اقبال کی ایک نظم 'ساقی نامہ' کے عنوان سے بالِ جبریل میں ہے۔ جس کے سات بند ہیں اور اشعار کی تعداد چوراسی ہے۔ یہ نظم مثنوی کی صنف میں ہے اور اقبال کی ان نظموں میں سے ہے۔ جن کو فنی اعتبار سے بہترین کہا جا سکتا ہے۔ صوری و معنوی محاسن سے لبریز ہے۔ تمہید میں موسمِ بہار کے مناظر کی شاعرانہ مصوری ہے۔ مسلمانوں کی کسمپرسی اور حالاتِ حاضرہ پر تنقید ہے۔ زندگی کی ماہیت اس کے خصوصیات، مقامِ خودی اور انسان سے تخاطب پر حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس نظم کے تیسرے بند میں دعائیہ اشعار ہیں دوسرے بند کی ٹیپ ہے ۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اس کے بعد دعائیہ کلمات شعر کی زبان میں کچھ اس طرح ہیں۔ اے خدا! —— عقل کو غلامی سے آزاد فرما۔ جوانوں کو پیروں کا استاد بنا دے۔ تیرے کرم سے قوم کی شاخ میں نم یعنی تازگی ہے۔ تیرے ہی فیض سے ہم میں زندگی کے آثار ہیں۔ قوم کے درد میں تڑپنے کی توفیق عطا فرما۔ خداوندا! تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر ہو۔ زمین پر جو تیری عبادت کر رہے ہیں۔ ان کا بھی بھلا ہو۔ جوانوں میں سوزِ جگر عنایت فرما اور میرا عشق اور نظر ان کو مرحمت کر۔ میری قوم کی کشتی منجدھار میں پھنسی ہوئی ہے اسے اس گرداب سے نجات دے یعنی ساحلِ مراد تک پہنچا پھر دعا کا انداز بدل کر کہتے ہیں کہ اے مولائے کریم! میرا دل کا سوز ان کو بخش۔ میرے دل میں جو تڑپ ہے ان کو عطا کر، میری خلوت اور جلوت کے گداز سے ان کو آشنا کر۔ میری خواہشیں ان میں بیدار کر۔ متاعِ فقیر تو یہی ہے کہ فقیری میں ان کو امیری کا لطف بخش میری بے خوابیاں، اختر شماریاں۔ آہ و زاریاں۔ کیفیت سوز و گداز اور جستجو کی وہی لگن جو میرا سرمایۂ حیات ہے ان جوانوں کو عطا فرما۔

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا

خرد کو غلامی سے آزاد کر　　جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے　　نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر　　تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر　　زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے　　مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر　　یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات　　کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں　　مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز　　مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری　　امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار　　غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل، مری رزم گاہِ حیات　　گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر!　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے مجھے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے مجھے

ابھرنے والی نسلوں ہی میں وہ قوت ہوتی ہے جو قوموں کی قسمت بدل دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال دعاؤں میں ان ہی کو مخاطب کرتے ہیں اور متمنی ہیں کہ یہ اپنی طاقت اور کوہ شکن ارادوں سے قوم کو اس کا کھویا ہوا اقتدار واپس دلانے میں سینہ سپر ہوں۔ یہی طبقہ ہمیشہ ان کی امیدوں کا مرکز رہا ہے اور ان کی آرزوؤں کا محور۔ فرماتے ہیں ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

فریادِ امت کے عنوان سے ایک طویل نظم ڈاکٹر اقبال مرحوم نے انجمن حمایت اسلام کے اٹھارھویں جلسے میں یکم مارچ ۱۹۰۳ء کو پڑھی تھی۔ یہ ایک عاشقانہ فریاد ہے جو حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں کی گئی۔ یہ نظم پہلے ابرِ گہر بار کا عنوان لئے ہوئے تھی لیکن ۱۹۱۳ء میں اسے فریادِ امت کے نام سے چھپوا دیا گیا۔ یہ نظم باقیاتِ اقبال کے صفحہ ۱۳۹ سے ۱۶۲ تک پھیلی ہوئی ہے اور بارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ نظم کا پہلا شعر ہے ؎

دل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اُسے لاؤں کیونکر
ہو چھپانے کی نہ جو بات چھپاؤں کیونکر

مخاطبہ کچھ اس طرح سے ہے ؎

تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں   آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا
علم و حکمت کے مدینے کی کشش ہے مجکو   لطف دے جاتا ہے کیا مجکو مُسلماں ہونا
امرا جو ہیں سنتے نہیں اپنا کہنا   سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا
ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا   ورنہ آتا ہے ہمیں حرفِ تمنّا کہنا
شکوہ منت کشِ لب ہے، کبھی منت کشِ چشم   میرا کہنا جو ہے رونا تو ہے رونا کہنا
قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے   یہ اگر راہ پہ آ جائیں تو پھر کیا کہنا
ہم نے سو بار کہا قوم کی حالت ہے بُری   پر سمجھتے نہیں یہ لوگ ہمارا کہنا

دیکھتے ہیں یہ غریبوں کو تو برہم ہو کر
فقر تھا فخر ترا شاہِ دو عالم ہو کر

پھر فرماتے ہیں ؎

داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے   ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنا تجھ سے

ذاتِ احدیت کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ جس کے وسیلے سے دعائیں شرفِ قبولیت پاتی ہیں۔ اقبال اس نظم کے آخری بند میں دعا کے اظہار کے لئے دوسرا اسلوب بیان منتخب کرتے ہیں۔ اور استفہامیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے اپنے دردِ دل کے مداوے کے متعلق اس طرح گویا ہوتے ہیں۔ اس نظم کا آخری شعر دعائیہ ہے جو اس بند کے مفہوم کو پوری طرح سے ادا کر رہا ہے۔

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے   یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے
جس کی تاثیر سے ہو عزتِ دین و دنیا   ہائے اے شافعِ محشر وہ دعا کون سی ہے
جس کی تاثیر سے یک جان ہو امت ساری   ہاں! بتا دے ہمیں وہ طرزِ وفا کون سی ہے
جس کے ہر قطرہ میں تاثیر ہو یک رنگی کی   ہاں بتا دے وہ مئے ہوش ربا کون سی ہے
قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا   ناقہ وہ کیا ہے، وہ آوازِ درا کون سی ہے
اپنی فریاد میں تاثیر نہیں ہے باقی   جس سے دل قوم کا پگھلے وہ صدا کون سی ہے
سب کو دولت کا بھروسہ ہے زمانے میں مگر   اپنی امید یہاں تیرے سوا کون سی ہے
اپنی کھیتی ہے اجڑ جانے کو اے ابرِ کرم   تجھ کو جو کھینچ کے لائے وہ ہوا کون سی ہے
ہے نہاں جس کی گدائی میں امیری سب کی   آج دنیا میں وہ بزمِ فقرا کون سی ہے
تیرے قرباں کہ دکھا دی ہے یہ محفل تو نے   میں نے پوچھا جو اخوت کی بنا کون سی ہے

راہ اس محفلِ رنگیں کی دکھا دے سب کو
اور اس بزم کا دیوانہ بنا دے سب کو

ارمغانِ حجاز میں بہت سے قطعات ایسے ہیں۔ جن سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اسی ایک قطعے سے عشقِ نبیؐ کی کیفیت جو اقبال کے دل میں ہے واضح ہو جاتی ہے۔ وہ حجاز کے روحانی سفر کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں کہ اے خدا! آپ کعبے میں اپنے خاص بندوں سے ملاقات کریں۔ میری منزل یہ نہیں۔ میں تو مدینہ کا قصد کر رہا ہوں ؎

بدوں واماندہ و جانم درتگ و پوست — سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز — کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

اسی قطعے کے ساتھ ایک اور قطعہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ میرے گناہوں کا حساب حضور صلعم کے سامنے نہ لیا جائے کہ انھیں میرے اعمال اور گناہوں سے شرمندگی ہو گی ؎

بپایاں چو رسد ایں عالمِ پیر — شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہؐ مارا — حساب من زچشمِ او نہاں گیر

دعا کا ایک اور اسلوب بھی قطعات میں ملتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے میرے آقا نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں میں جو میرے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ آپ ان پر میری بے تابانہ فطرت کے طفیل نگاہ کرم فرمائیے۔ میں نے مسلمانوں کو اپنے دردِ دل سے واقف کرنے کی پوری کوشش کی۔ ان کو پیغام دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے میرے پیغام کو نہ تو توجہ سے سنا ہے اور نہ ہی اس پر عمل پیرا ہوئے ہیں۔ میرا دل اب بھر گیا ہے! میرے آقا میں تنہائی کے خوف سے گھلا جا رہا ہوں۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں میں درخواست کرتا ہوں کہ میرے دل کو آپ اپنے جلوؤں سے معمور کر دیں یعنی آپ میرے دل میں تشریف لے آئیں۔ تاکہ مجھے سکون و اطمینان میسر آ سکے۔ میرے آقا۔ میں التجا کرتا ہوں کہ میری زندگی کو مسلمانوں کے لئے بابرکت اور مفید بنا دے۔ تاکہ میرے پیغام بیداری سے مسلمانوں کی زندگیاں سنور جائیں اور مسلمانوں کے دلوں میں وہی جذبات پیدا ہو جائیں۔ جن کی میرے دل میں خواہش ہے۔ اگر میں تیغِ علیؓ کے قابل نہیں۔ تو مجھ کو وہ نظر بخش دے جو حضرت علی کی تلوار کی طرح تیز ہو ؎

بصدقِ فطرتِ رندانۂ من — بسوزِ آہِ سبے تابانۂ من
بدہ آں خاک را ابرِ بہارے — کہ در آغوشش گیرد دانۂ من
دلے بر کف نہا وم دلبرے نیست — متاعے داشتم غارت گرے نیست
درونِ سینۂ من منزلے گیر — مسلمانے ز من تنہا ترے نیست
گلستانے زخاکِ من بر انگیز — نمِ چشمم بخونِ لالہ آمیز
اگر شایاں نیم تیغِ علیؓ را — نگاہے دہ چو شمشیرِ علیؓ تیز

رموزِ بے خودی کے آخر میں مرحوم اقبال نے ایک دعا بحضور رحمتہ للعالمینؐ مانگی ہے۔ دعا طویل ہے۔ شروع میں نعتیہ اشعار ہیں اور مسلمانوں کی حالتِ زار بیان کی گئی ہے۔ کچھ اپنی خدمات پر بھی دبی زبان میں روشنی ڈالی ہے۔ ؎

از غمِ پنہاں نگفتن مشکل است — بادہ در مینا نہفتن مشکل است
مسلم از سرِ نبیؐ بیگانہ شد — باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد
از منات و لات و عزیٰ و ہبل — ہر یکے دارد بُتے اندر بغل
شیخ ما از برہمن کافر تر است — زانکہ او را سومنات اندر سر است

دوسرے بند کا مفہوم دعائیہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ میں گنہ گار ہوں میں مدتوں عشقِ مجازی میں گرفتار رہا۔ شراب اور معشوقانِ سیم بر سے متمتع رہا۔ میں نے مدتوں تشکیک کی ظلمت میں بھی عمر بسر کی ہے۔ میرے دامن سے فلسفے کے کانٹے الجھے رہے ہیں۔ لیکن ایک آرزو رکھتا ہوں کہ جس کے اظہار کرنے میں بھی شرم محسوس کرتا ہوں۔ چونکہ آپؐ دونوں جہان کے لئے رحمت ہیں۔ آپ کی شانِ رحمت سے یہ بعید نہیں کہ میرے گناہوں سے چشم پوشی فرما کر مجھے اس کفرستان سے لے جائیں اور میری موت مدینہ میں واقع ہو۔ پھر مدینہ کی تعریف میں کہتے ہیں کہ اس شہر کی برکتوں کا کیا ٹھکانا جہاں حضورؐ آرام فرما رہے ہیں۔ آپ مجھے خوش نصیب بنا دیں۔ تاکہ میری بھٹکی ہوئی بے تاب روح کو اطمینان اور آرام مل جائے اور میں اس کج رفتار آسمان سے کہہ سکوں کہ تم نے میرا آغاز بھی دیکھا تھا۔ اب انجام بھی دیکھ لیجئے۔ ؎

مدتے بالالہ رویاں ساختم — عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم — بر چراغِ عافیت داماں زدم
برق ہا رقصید گرد حاصلم — رہزناں بردند کالائے دلم
سالہا بودم گرفتارِ شکے — از دماغِ خشک من لا ینفکے
ایں تمنا در دلم خوابیدہ ماند — در صدف مثلِ گہر پوشیدہ ماند
شرم از اظہارِ او آید مرا — شفقتِ تو جرأت افزاید مرا
ہست شانِ رحمتت گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز
فرخا شہرے کہ تو بودی در آں — اے خنک خاکے کہ آسودی در آں
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش — مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بے تابِ من — بستگی پیدا کند سیمابِ من
با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغازم انجامم نگر

افسوس کہ ان کی مدینے میں مرنے کی یہ دعا پوری نہ ہو سکی۔

برگِ گل کے عنوان سے ان کی ایک طویل نظم حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزارِ مبارک پر آویزاں کی گئی۔ یہ نظم انہوں نے اس وقت کہی جب ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے مخالفین نے ان پر ایک سنگین فوجداری مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ آخر دشمنوں کو منہ کی کھانا پڑی اور معاملہ رفع ہو گیا۔ یہ نظم حضرت خواجہ حسن نظامی کو بھیجی گئی تھی کہ حضرت محبوب الٰہی کے مزار شریف کے دروازے پر آویزاں کی جائے۔ یہ نظم ستمبر ۱۹۰۲ء کے مخزن میں طبع ہوئی تھی اور باقیات اقبال میں بعد کو شائع ہوئی۔ یہ نظم تین بندوں پر مشتمل ہے اور اس کے بیالیس اشعار ہیں۔ چند شعر یہ ہیں ؎

کیوں نہ ہوں ارماں مرے دل میں کلیم اللہ کے   طور در آغوش ہیں ذرے تری درگاہ کے
شانِ محبوبی ہوئی ہے پردہ دارِ شانِ عشق   واہ کیا رتبے ہیں اس سرکارِ عالی جاہ کے

محوِ اظہارِ تمنا ہے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبالؔ کا ہم نام ہوں

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے   کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہر بار سے
اک نظر میں خسروِ ملکِ سخن خسرو ہوا   میں کہیں خالی نہ پھر جاؤں تری سرکار سے
ہاں قسم دیتا ہوں میں مدفونِ یثرب کی تجھے   کر دعا حق سے کہ میں چھٹ جاؤں اِن آزار سے

سخت ہے میری مصیبت سخت گھبرایا ہوں میں
بن کے فریادی تری سرکار میں آیا ہوں میں

کیمیا سے بھی فزوں ہے تیری خاکِ در مجھے   ہاں عطا کر دے مرے مقصود کا گوہر مجھے
تو ہے محبوبِ الٰہی! کہہ دعا میرے لئے   یہ مصیبت ہے مثالِ فتنۂ محشر مجھے
اس بڑی سرکار کے قابل مری فریاد ہے   چل حضوری میں شہِ یثرب کی تو لے کر مجھے
واسطہ دوں گا اگر لختِ دلِ زہراؓ کا میں   غم میں کیونکر چھوڑ دیں گے شافعِ محشر مجھے
رونے والا ہوں شہیدِ کربلا کے غم میں میں   کیا درِ مقصد نہ دیں گے ساقیِ کوثر مجھے
دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشقِ اہلبیت   ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِ دامنِ حیدرؓ مجھے

آہ تیرے سامنے آنے کے ناقابل ہوں میں
منہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں

بانگِ درا میں اقبال کی ایک اور نظم بھی سوز و گداز سے پُر ہے جس کا عنوان التجائے مسافر ہے یہ نظم انہوں نے اس وقت کہی جب یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور دہلی میں حضرت محبوب الٰہی کے آستانہ مبارک پر حاضری دی اور نہایت عقیدت سے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ نظم حصولِ علم کی خاطر یورپ جانے کے موقع پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے روضۂ مبارک پر جا کر سنائی۔

---

[1] خواجہ محمد اقبال حضرت کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔

نظم کا والہانہ انداز اور دعائیہ اسلوب قابلِ قدر ہے۔ اس نظم میں دو بند ہیں پہلا بند پانچ اشعار پر اور دوسرا سولہ اشعار پر مشتمل ہے مخاطبہ کا انداز یہ ہے۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا — بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم — نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی — مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی — بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ زارِ توام
وگر کشادہ جبینم، گلِ بہارِ توام

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل — ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجکو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجکو
فلک نشیں، صفتِ مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجکو
مقام ہمسفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ سمجھے منزلِ مقصود، کارواں مجکو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجکو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر — تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجکو
پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں — کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجکو
وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی — رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجکو
دعا ہے یہ کہ خداوند آسمان و زمیں — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجکو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

سپاسِ جنابِ امیرؒ کے عنوان سے اقبال کی ایک نظم مخزن لاہور جنوری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی یہی نظم رضا کار ۱۶ / جنوری ۱۹۵۶ء میں بھی چھپی۔ کتابی شکل میں حیدر آباد دکن سے بھی اور کراچی سے اقبال بہ آستانۂ شاہِ ولایت کے عنوان سے سلیمان عاشق نے ترجمہ کے ساتھ شائع کی ہے یہی مطبوعہ نظم ہمارے سامنے ہے۔ اس نظم میں مناجاتی رنگ غالب ہے۔ مناجات لغت میں سرگوشی کرنے کے معنوں میں آیا ہے مجازاً وہ دعا جو حاضر ناظر سمجھ کر پڑھی جائے۔ اقبال مرحوم اس مناجات کو عموماً صبح کے وقت پڑھا کرتے تھے۔ یہ دعا کچھ اس طرح ہے:

اے وہ ذات جس کی تعریف میں مخلوق کی زبانیں مصروف ہیں اور اے وہ ذات جو روحوں اور جانوں کے قافلے کا یوسف یعنی سردار اور راہ دکھلانے والا ہے۔ اے شہرِ محبت کے دروازے اور اے راہِ خدا میں محبت کی کشتی کے نوح یعنی ناخدا۔ اے

میرے باطل کے نقش مٹانے والے۔ میرے قلعۂ خیبر کو فتح کرنے والے۔ اے خالق و مخلوق کی درمیانی حد کا راز۔ ہمارے قرآن مجید کے سورے آپ ہی کی تفسیر ہیں۔ اے عشق الٰہی کے مذہب کے لئے نماز اور اے وہ ذات جس کا سینہ رازِ خداوندی کا امانت دار ہے۔ اے نبوت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصلی چھپے ہوئے راز۔ اے وہ ذات جس کی تعریف حقیقت میں خود رسول کی مدح ہے۔ یہ آسمان جو بلندی پر قائم ہے آپ کی بلندی اور عظمت کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ بغیر آپ کے خدا تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اور بغیر خدا کے آپ تک بھی رسائی نہیں ہو سکتی۔ جنت آپ کے وجود کی وجہ سے ایک چمن لئے ہوئے ہے اور آپ کی شان کے سامنے حیرت و تعجب آئینہ کی طرح کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ میری جاں آپ کی غلامی پر خوش ہے اور میں آپ کے غلام قنبر کے گریباں سے منہ نکالے ہوئے ہوں یعنی اسی غلامی کے رشتہ میں بندھا ہوا ہوں۔ میں آپ کی شراب محبت میں بے ہوش ہوں اور آپ کے پیروں کے نیچے اس طرح ہوں جیسے قدموں کے نیچے آدمی کا سایہ۔ میں ہوش میں نہیں رہا۔ مگر پھر ہوش میں ہوں۔ اگر تم کہو کہ میں انھیری ہو گیا ہوں۔ تو یہ سن کر چپ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ادب کا تقاضا یہی ہے کہ راز چھپا رہے اور خاموشی کے پردہ میں اظہار محبت ہو لیکن کیا کروں کہ تولا کی شراب تیز ہے اور جام سے (یعنی میرے دل سے) ابل پڑتی ہے۔ اب میں قیامت کے خوف اور ڈر سے آزاد ہو گیا ہوں کہ میں نے آل اطہار کے غم کی جنس کو خرید لیا۔ میرے پاؤں کے چھالوں میں کتنے کانٹے کھٹک رہے ہیں اور سیکڑوں لالہ کے پھول میرے قدم کے نیچے اگ چکے ہیں میری حاجتوں میں گرہ لگی ہوئی ہے اور میں اپنے غبار عصیاں کے دامن سے شرمندہ ہوں۔ میں اس تلاش اور جستجو میں منزل تک نہ پہنچنے کے غم سے شکستہ حال تھا کہ میری عقدہ کشائی کر دی اور جو گرہ لگی ہوئی تھی کھول دی آپ کے عشق نے مجھے فنا اور بقا کے راز سے واقف کر دیا اور میری عقل و فکر کو حقیقت سے آشنا کر دیا۔ آپ کی محبت نے میری ہستی کو ہوا میں اڑا دیا۔ میں اس شراب عشق میں ایسا بدحواس ہو گیا۔ جس طرح ہر چیز کا عکس اس سے الگ ہوتا ہے۔ میں حقیقت کو سمجھ گیا اور میری خاک کو عرش کی بلندی تک پہنچا دیا۔ آخر میری کشتی کنارے سے مل گئی اور میری برائی اور بدصورتی حسن و جمال کا ایک طوفان بن گئی۔ اس عشق کے افسانے کے سوا اور میرے پاس کچھ نہیں اور میں اس عشق میں کسی کی مذمت و ملامت کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ میں اصل معرفت کی وجہ سے محبت کی حقیقی آگ میں جل رہا ہوں۔ آنسو بہا رہا ہوں۔ تڑپ رہا ہوں اور پگھل رہا ہوں ؎

اے محوِ ثنا ے تو زباں ہا　　　اے یوسفِ کاروانِ جاں ہا
اے بابِ مدینۂ محبّت　　　اے نوحِؑ سفینۂ محبت
اے ماحی نقشِ باطلِ من　　　اے فاتحِ خیبرِ دلِ من
اے سرِ خطِ وجوب و امکاں　　　تفسیرِ تو سورہاے قرآں
اے مذہب عشق را نمازے　　　اے سینۂ تو امینِ رازے
اے سترِ نبوتِ محمدؐ　　　اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ
گردوں کہ بہ رفعت ایستاد است　　　از بامِ بلندِ تو فتاد است
بے تو نتواں باو رسیدن　　　بے او نتواں بتو رسیدن

فردوس ز تو یک چمن در آغوشش ۔۔۔ از شان تو حیرت آئینہ پوشش
جانم بہ غلامیِ تو خوشتر ۔۔۔ سر بر زدہ ام ز جیبِ قنبر
ہشیارم و مستِ بادۂ تو ۔۔۔ چو سایہ ز پا فتادۂ تو
از ہوش شدم مگر بہ ہوشم ۔۔۔ مگوئی کہ نصیری، خموشم
دانم کہ ادب بہ ضبطِ راز است ۔۔۔ در پردۂ خامشی نیاز است
امّا چہ کنم کہ سے تو نا ۔۔۔ تند است بروں فقد ز مینا
زاندیشۂ عاقبت رہیدم ۔۔۔ جنسِ غمِ آلِ تو خریدم
در دشتِ طلب بسے دویدم ۔۔۔ داماں چو گرد باد چیدم
در آبلہ خارہا خلیدہ ۔۔۔ صد لالہ تہ قدم دمیدہ
افتادہ گرہ بروے کارم ۔۔۔ شرمندۂ دامنِ غبارم
واماندہ ز دردِ نا رسیدن ۔۔۔ در آبلۂ شکستہ دامن
عشقِ تو دلم ربود ناگاہ ۔۔۔ از کار گرہ کشود ناگاہ
آگاہ ز ہستی و عدم ساخت ۔۔۔ بت خانۂ عقل را حرم ساخت
چوں برق بہ خرمنم گزر کرد ۔۔۔ از لذّتِ سوختن خبر کرد
بربادِ متاعِ ہستیم داد ۔۔۔ جامے ز مئے حقیقتم داد
سرمست شدم ز پا فتادم ۔۔۔ چوں عکس ز خود جدا فتادم
پیراہنِ ما و من دریدم ۔۔۔ چوں اشک ز چشمِ خود چکیدم
خاکم بہ فرازِ عرشش بُردی ۔۔۔ زاں راز کہ باد لم سپُردی
واصل بکنارِ کشتیم شد ۔۔۔ طوفانِ جمالِ زشتیم شد
جز عشق حکایتے ندارم ۔۔۔ پروائے ملامتے ندارم

از جلوۂ عام بے نیازم
سوزم۔ گریم۔ تپم۔ گدازم

اس مناجات کے بعد ان کی ایک مختصر سی دعا ہے۔ دریا کو کوزے میں بھر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

اسی حقیقت کو ضربِ کلیم میں کھل کر بیان کرتے ہیں کہ اے مسلمان تو نے یہ بھی کبھی سوچا ہے کہ تلوار ہوتی کیا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھ کو فقر کی تلوار سے نوازے اور جب تیرے ہاتھ میں یہ تلوار آ گئی۔ تو پھر تو سمجھ کہ تجھ میں وہی جرأت اور مردانگی پیدا ہو جائے گی۔ جو جانباز خالدؓ میں تھی اور یا جو شیرِ خدا حیدرؓ کرار میں ہے

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے ـــــ کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں ـــــ پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ ـــــ اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالدِ جانباز ہے یا حیدرؓ کرار

اقبال کے کلام میں چند دعائیں ایسی بھی ہیں جو انھوں نے خود تو نہیں بلکہ دوسروں کی زبان سے مانگی ہیں۔ ان دعاؤں میں سے ایک دعا طارق بن زیاد کی زبان سے بھی ہے یہ دعا "طارق کی دعا" کے نام سے بالِ جبریل میں ہے۔ یہ دعا ان جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ جو طارق نے آغازِ جنگ سے پہلے اپنے مجاہدوں کا دل ابھارنے کے لئے کی تھی۔ یہ جنگ سرزمینِ اندلس میں لڑی گئی۔ طارق کی زیرِ کمان مجاہدین کی تعداد پہلے سات ہزار اور پھر بارہ ہزار تک جا پہنچی۔ راڈرک شاہ اسپین نے ایک لاکھ جوانوں کو اس معرکے میں حصہ لینے کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن انھوں نے شکست کھائی۔ طارق نے اپنے سرفروشوں کے سامنے اس وقت جو تقریر کی تھی۔ اس کو علامہ مغفور نے طارق کی زبان سے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے ـــــ جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا ـــــ سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو ـــــ عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن ـــــ نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی!
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے
کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا ـــــ خبر میں، نظر میں اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو ـــــ وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو ـــــ ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے ـــــ وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

اقبال مرحوم نے پہلے لختِ جگر مسٹر جاوید اقبال کو اپنی تصنیف جاوید نامہ میں سب سے پہلے مخاطب کیا ہے۔ یہ نظم کلیاتِ فارسی اقبال میں صفحہ ۵۹۰ سے صفحہ ۵۹۶ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا عنوان خطاب بہ جاوید (سخنے بہ نژادِ نو) ہے۔ اس نظم کے تیرہ بند ہیں۔ اور ایک سو چھتیس اشعار پر مشتمل ہے۔ ہر بند کی خصوصیت جدا جدا ہے۔ پہلے بند میں توحید کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے بند میں لا الہ الا اللہ کہنے سے مطلب پورا نہیں ہوتا۔ یہ کلمہ زبان سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں راسخ ہونا چاہیے۔ تیسرے بند میں مسلمانوں کی حالت زار، چوتھے میں ان کی بے حسی پر ماتم اور افسوس۔ پانچویں میں ایشیائی اقوام کی ناگفتہ بہ حالت پر اظہار خیال۔ چھٹے میں اپنی علمی خدمات کا تذکرہ۔ ساتویں میں نوجوانوں کی موجودہ حالت۔ آٹھواں نقد و نظر کی اہمیت اور نصائح۔ نواں بند حقیقتِ دیں۔ دسویں میں مزید پند و نصائح۔ گیارھواں بند فقر کی اہمیت اور نوجوانوں کی زرپرستی پر تنقید۔ بارھویں بند میں مسلمانوں کے تین طبقوں علما، صوفیہ اور افرنگ زدہ مسلمانوں پر تبصرہ اور آخری بند میں نصائح بھی ہیں اور دعائیں بھی۔ فرماتے ہیں کہ انسان کامل مشیتِ ایزدی کے مطابق تشریف لاتا ہے۔ مشرق و مغرب اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ ہم تو اندھیرے میں ہیں اور وہ کائنات کے کاموں کا مہتمم ہوتا ہے وہ کلیمؑ و مسیحؑ و خلیلؑ و محمدؐ کی روحانی کرامات کا وارث اور ان کے صفات کے نور سے عالم میں روشنی ہوتی ہے۔ پہلے وہ تجھے یا سوز عطا کرتا ہے اور پھر سلطانی کا گر سکھلاتا ہے۔ اے مسلمان نوجوان زمانے میں ہر طرف مادیت کا دور دورہ ہے۔ سب لوگ مادہ پرستی کا دم بھر رہے ہیں۔ اس حال میں وہ مردِ حق آگاہ نظروں سے چھپ جاتا ہے لیکن موجود تو ہوتا ہے لیکن اسے ظاہر بیں آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔ اگر اے نوجوان تجھ کو کسی رہبرِ کامل کی صحبت میسر آسکے اور ایسے راہ نما کو تو حاصل نہ کر سکے۔ تو میں نے جو اپنے بزرگوں سے کشف کیا ہے۔ وہ مجھ سے لے لے یعنی مولانا رومؒ کو اپنا مرشد بنا لے یعنی مثنوی مولانا روم کا مطالعہ کر اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی توفیق اپنے میں پیدا کر تیرے دل میں بھی سوز و گداز کا رنگ پیدا ہونا ممکن ہے۔ عشقِ الٰہی اختیار کر اور اپنے دل کو حرص و ہوا سے پاک نفسِ امارہ کے حکم سے سرتابی کر اور دنیاوی لذتوں سے احتراز۔ غم آدھا بڑھاپا ہے۔ غم انسان کو ضعیف کر دیتا ہے۔ حرص فقرِ حاضر ہے یعنی حریص کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ اللہ کی محبت میں راسخ رہو۔ دینِ محمد مصطفیٰؐ کا راز یہی ہے۔ اگر تم یہ نکتہ سمجھ جاؤ۔ تو میں پھر تمہیں مرنے کے بعد قبر میں بھی دعائیں دوں گا ؎

مردِ حق از آسماں افتد چو برق — ہیزم او شہر و دشتِ غرب و شرق
ما ہنوز اندر ظلامِ کائنات — او شریکِ اہتمامِ کائنات
او کلیمؑ و او مسیحؑ و او خلیلؑ — او محمدؐ او کتاب جبرئیلؑ
آفتابِ کائناتِ اہلِ دل — از شعاعِ او حیاتِ اہلِ دل
اوّل اندر نارِ خود سوزد ترا — باز سلطانی بیاموزد ترا
ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں — در بدن غرق است و کم داند زجاں
چوں بدن از قحطِ جاں ارزاں شود — مردِ حق در خویشتن پنہاں شود
در نیابد جستجو آں مرد را — گرچہ بیند روبرو آں مرد را

تو بگیر ذوقِ طلب از کف مدہ   گرچہ در کارِ تو افتد صد گرہ
گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر   از اب و جد آنچہ من دارم بگیر
پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز   تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
تا ز نارِ حرص و غم سوزد جگر   جاں برقص اندر نیاید اے پسر
ضعفِ ایماں است و دلگیری است غم   نوجوانا! نیمۂ پیری است غم
می شناسی؟ حرص فقرِ حاضر است   من غلامِ آنکہ بر خود قاہر است
اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب   تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب

سرِ دینِ مصطفیٰ گویم ترا
ہم بہ قبر اندر دعا گویم ترا

اس نظم میں جاوید کے خطاب میں اپنی قوم کے نوجوانوں کو نصیحتوں کے رنگ میں ابھارا ہے۔ ایک دوسری نظم جس کا عنوان "جاوید کے نام" ہے بالِ جبریل میں ملتی ہے۔ اس کا انداز اس پہلی نظم سے مختلف ہے۔ سازِ خودی اور سوزِ خودی کی تراکیب فلسفۂ خودی سے متعلق ہیں فلسفۂ خودی کے خالق اقبال ہیں بعد میں انہوں نے اس لفظ کو قسم قسم کے معانی پہنائے ہیں اور انسان کو اس کے مقام کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جاوید کو سمجھاتے ہیں کہ خودی کی صحیح تربیت میں ابدی زندگی کا راز ہے۔ اگر خودی کا عرفان ہو اور اس کی صحیح تربیت کی جائے تو طمانیت خاطر مل سکتی ہے۔ زاغ کی صحبت نے شاہیں بچوں کی خصلتیں خراب کر دی ہیں یعنی رذالوں کی صحبت نے شریفوں کی سرشت تک بدل دی ہے۔ اے میرے لختِ جگر زمانے کی آنکھوں میں حیا نہیں ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ تیری جوانی بے داغ رہے۔ اس شعر میں مغربی طرزِ تعلیم کا عریانی پسند ادب مراد ہے مغربی تہذیب کی حشر سامانیوں کی جانب اشارہ ہے جس کی وجہ سے بے حیائی عام ہو چکی ہے۔ آخری شعر میں ایک عمیق نکتہ پیش کرتے ہیں کہ میں خدا کے فضل سے ظریف۔ دانا۔ ذہین اور خوش فکر ہوں اس لئے خانقاہ میرے قیام کی جگہ نہیں یعنی خانقاہوں میں میرے ذہن و فکر کی تربیت کے لئے کچھ نہیں ؎

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ   خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود   ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی   خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی   خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبالؔ
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

جاوید کے نام لندن سے ایک منظوم خط لکھتے ہوئے اقبال مرحوم نے نصیحتیں کی ہیں ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر   نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو — سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں — سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

ضربِ کلیم میں ایک اور نظم "جاوید سے" کے عنوان سے ہے

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ — ہے اس کی نہاد کافرانہ
لیکن یہ دورِ ساحری ہے — انداز ہیں سب کے جادوانہ
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو — ہے اس کا مذاق عارفانہ
جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف — تعلیم ہو گو فرنگیانہ
شاخِ گل پہ چہک ولیکن — کر اپنی خودی میں آشیانہ
وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا — ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانہ

"غافل منشیں نہ وقت بازی ست
وقتِ ہنر است و کار سازی ست"

جاوید کے نام جو کچھ اقبال مرحوم نے کہا ہے یہ نصیحتیں یا دعائیں پدرانہ شفقت کی آئینہ دار ہیں۔ وہ اپنے نورِ نظر میں جن محاسنِ اخلاق کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا بیان انہوں نے نہایت بلیغ انداز میں کیا ہے۔ بظاہر یہ نظمیں انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے کہی ہیں۔ لیکن دَرپردہ انہوں نے اپنی قوم اور ملّت کے نونہالوں سے خطاب کیا ہے انہیں پند و نصائح بھی کئے ہیں اور دعائیں بھی دی ہیں۔ ارمغانِ حجاز میں ایک نظم "دوزخی کی مناجات" ہے۔ یہ مناجات دوسری دعاؤں اور مناجاتوں سے معانی کے اعتبار سے بہت مختلف ہے۔ یہ نظم تمثیلی انداز کی ہے اور ایک دوزخی کے جذبات کو اقبال مرحوم نے وقت کی پکار کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک دوزخی خدا کے حضور میں دعا مانگتا ہے کہ اے خدا! یہ دنیا غرض مندوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ تجھے نہیں بلکہ بتوں کو پوجتے ہیں اور تیری یاد اس وقت آتی ہے جب یہ بتوں سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ پوجا پاٹ اور نمازوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ دنیا والے تجھے چھوڑ کر اپنی خواہشات کے تابع ہو گئے ہیں اور طاقتور اقوام نے ان پہ غلبہ پا کر ان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے اگرچہ حکمرانوں کی عمارتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور ان کے محلات رفیع الشان ہیں لیکن ان کی حقیقت ایک آباد ویرانے سے زیادہ نہیں۔ مزدور کی محنت کا ثمر سرمایہ دار کی قسمت میں ہے یہ کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ تیشے کی گردش سے پرویز تو سیراب ہو لیکن فرہاد تشنہ ہے۔ اس بلیغ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ سرمایہ دار غریب مزدور کا خون چوستا ہے۔ یہ علم و حکمت یہ سیاست اور تجارت نظامِ ملوکیت کو تقویت دینے اور غریبوں کو غلامی کے پنجے میں دبوچنے کے سوا کچھ نہیں۔ پھر آخری شعر میں دعائیہ انداز میں نہایت پُر درد لہجے میں ایک دوزخی کے جذبات کی تصویر کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے خدا تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ جہنم میں سوداگرانِ یورپ کی حکمرانی نہیں ہے

اس دیرِ کہن میں ہیں غرض مند پجاری — رنجیدہ بتوں سے ہوں تو کرتے ہیں خدا یاد
پوجا بھی ہے بے سود، نمازیں بھی ہیں بے سود — قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد
ہیں گرچہ بلندی میں عماراتِ فلک بوس — ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانہ آباد
تیشے کی کوئی گردشِ تقدیر تو دیکھے — سیراب ہے پرویز، جگر تشنہ ہے فرہاد
یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت — جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد
اللہ! ترا شکر کہ یہ خطۂ پُر سوز — سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

دوزخی کی مناجات کے بعد ایک طنزیہ دعا سے اقبال نے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں: اے خدا اگر تیری مشیت ہو تو شیطان کو اب دنیا والوں کے ورغلانے کے فرائض سے سبکدوش کر دے۔ وہ ایک لمحہ بھی چین سے نہیں بیٹھتا اور اس کا جینا دوبھر ہو رہا ہے۔ اب شیطان بہت عمر رسیدہ ہو چکا ہے۔ اس کے تصورات اور تخیلات بھی اب پرانے ہو چکے ہیں۔ اب اس کے ورغلانے میں کوئی جدت باقی نہیں رہی قدیم گناہوں کو دہراتا ہے اور نئے گناہ اب اس کی زنبیل میں نہیں اور پھر پھر کر یہ انہی گناہوں کی ترغیب دے رہا ہے۔ جن میں اب کوئی دلکشی نہیں رہی۔ اے خدا اب اس کو موجودہ کارِ جہاں سے فارغ کر دے۔ دعا کا یہ فلسفیانہ اور طنزیہ انداز اقبال کی شوخیٔ طبع کا ایک نمونہ بھی ہے

فراغت دے اسے کارِ جہاں سے
کہ چھوٹے ہر نفس کے امتحاں سے
ہوا پیری سے شیطاں کہنہ اندیش
گناہِ تازہ تر لائے کہاں سے

اس قطعے کے بعد ایک اور قطعہ بھی اقبال کی شوخیٔ طبع پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ قطعہ بھی دعائیہ ہے فرماتے ہیں کہ اے خدا! "اس دنیا کا نظام دگرگوں کر دے۔ اے خدا! میں اس کافرانہ نظام میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ غلاموں کی زندگی اور اس کی عبادت ہی کیا۔ اے خدا میں التجا کرتا ہوں کہ میری بے حضور نماز اور بے ذوق سجدوں سے پرہیز فرما مطلب یہ ہے کہ میں غلاموں کی زندگی بسر کر رہا ہوں اور میرا رہنا سہنا غلاموں ہی کی مانند ہے۔ میرے دل میں نہ سوز ہے نہ ذوق۔ میرے سجدوں میں دل کی تڑپ شامل نہیں۔ اس لئے میرے سجدوں سے [illegible] فرما۔ کیونکہ ان سے تیری عبادت کی توہین ہوتی ہے اس لئے اس ابلیسی نظام یعنی غیر اسلامی حکومت کو زیر و زبر کر دے"

دگرگوں عالمِ شام و سحر کر
جہانِ خشک و تر زیر و زبر کر
رہے تیری خدائی داغ سے پاک
مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر

زبورِ عجم کی ایک نظم میں آرزوئے انقلاب کو دعائیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اقبال کے جذبات دعائیہ انداز میں اس خوبی سے ڈھل گئے ہیں جو تعریف سے بالاتر ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اے خدا! یا تو مسلمانوں کو ہتھیلی پر سر رکھنے کا حکم عطا فرما۔ یا ان کے بجھے ہوئے دل میں سرفروشی کی روح پھونک دے یعنی ان کے دلوں میں ایک تازہ ولولہ پیدا کر دے۔ یا ان برہمن نما مسلمانوں کو حکم دے کہ وہ کوئی دوسرا خدا تراش لیں جو ان کو بے عملی اور تن آسانی کی زندگی گزارنے کی کھلی چھٹی دے دے۔ یا ان کے دلوں میں تو اپنا ٹھکانا بنا یعنی اپنی قدرت کے جلوؤں سے ان کے دلوں کو منور کر دے۔ اے خدا! یا تو ایک ایسا آدم پیدا فرما کہ جو ابلیس کے سامنے سرِ تسلیم جھکا دے یا ایسا ابلیس پیدا کر دے جو آدم کے سامنے سجدہ کرے۔ صدیوں سے آزمائش کا یہی طریقہ ان چلا آ رہا ہے یعنی حق و باطل کا مقابلہ ایک ہی طرح کے محاذ پر ہو رہا ہے۔ اے خدا! اِس امتحان کے طریقے کو بدل دے یا پھر اس کشمکش جس سے ساری دنیا لپیٹ میں ہے اس کو تبدیل فرما دے۔ اے خدا! وہ فقر عطا فرما جس میں سربلندی ہو یا وہ عقل و شعور عنایت فرما جو فطرتِ روح الامین ہو یعنی قرآنِ حکیم کی تعلیم سے ہمیں نوازے۔ آخری شعر میں اقبال کا تصور نہایت واضح ہے۔ فرماتے ہیں۔ اے خدا! یا تو اُس خواہش کو جو میرے دل میں انقلاب کی آرزو میں تڑپ رہی ہے اس کو فنا کر دے یا پھر اُس کش مکش سے نجات بخش جو اس دنیا میں ہر طرف جاری و ساری ہے۔

اقبال اس دنیا کی روش سے کُلی بیزار ہیں۔ وہ انقلاب چاہتے ہیں تاکہ مسلمان جذبۂ حریت سے سرشار ہو کر مجاہدوں کی طرح زندہ رہیں۔ وہ جہاد کریں۔ کافر بھی اپنے پرانے بتوں سے بیزار ہو چکے ہیں یہ بھی اپنے لئے نئے بُت تراشیں۔ اب ابلیس اور آدم کی کش مکش میں کوئی اثر بظاہر نظر نہیں آ رہا۔ اب تو آدم ابلیس کا استاد بن چکا ہے۔ اب کسی نئے ابلیس کی ضرورت ہے جو آدم سے زیادہ طاقتور ہو۔ اب قدیم آزمائشوں کو بدل دیا جائے اور پرانی کیفیتوں کو آزمایا نہ جائے یا پھر زمین و آسمان کی بنیادوں کو تبدیل کر دیا جائے اور ان کی جگہ دنیا کو نئے سرے سے تعمیر کیا جائے۔

یا مسلماں را مدہ فرماں کہ جاں بر کف بنہ ۔۔۔ یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں
یا چناں کُن یا چنیں

یا برہمن را بفرما نو خداوندے تراش ۔۔۔ یا خود اندر سینۂ زناریاں خلوت گزیں
یا چناں کُن یا چنیں

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک ۔۔۔ یا دگر ابلیس بہرِ امتحانِ عقل و دیں
یا چناں کُن یا چنیں

یا جہانے تازۂ یا امتحانے تازہ ۔۔۔ می کنی تا چند با ما آنچہ کردی پیش ازیں
یا چناں کُن یا چنیں

فقر بخشی؟ با شکوہِ خسرو پرویز بخش ۔۔۔ یا عطا فرما خرد با فطرتِ روح الامیں
یا چناں کُن یا چنیں

یا بکش در سینۂ من آرزوے انقلاب　　یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں

قوم کے جسور اور غیور نوجوانوں کو اقبال نے اپنی تصانیف میں بہت یاد کیا ہے۔ شاہیں بچوں کا جہاں بھی تعارف کرایا ہے اس سے مراد نونہالانِ اسلام ہیں۔ کہیں کہتے ہیں ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے　　ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔

———

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے　　سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں پاکبازی کا

———

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں　　اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

———

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

———

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا　　لہو گرم کرنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں　　کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

———

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو　　فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور　　کہ شاہینِ شہ لولاک ہے تو

حضرت علامہ نے جہاں بھی شاہین کا لفظ اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔ اِس سے نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے۔ مجاہدینِ اسلام کو ابھارا ہے۔ وہ اپنی قوم کی صلاحیتوں سے "نا امید نہیں ہوتے۔ ان کو امید کے پیغام دیتے ہیں۔ ملت کی کشتِ ویران کا نم نوجوانوں ہی کے لئے کہا ہے۔ شاہین ایک جنگ جُو پرندہ ہے جو کمزور پرندوں کا شکار کرتا ہے۔ لیکن اس میں چند خصوصیات ایسی بھی ہیں جو علامہ مغفور کو دل سے پسند تھیں۔ مثلاً اس کی خودداری۔ غیرت مندی۔ آشیانہ بنانے سے لاپروائی خلوت گزینی۔ تیز نگاہی اور دوسروں کے　　کئے ہوئے شکار سے گریز۔ غرضکہ اس پرندے کے اوصاف وہ اپنے نوجوانوں میں دیکھنے کے متمنی رہے ہیں۔ اقبال مرحوم کی ایک نظم پیامِ مشرق میں" شاہین و ماہی "کے عنوان سے ہے اس سے متعدد نکات مرتب ہو سکتے ہیں۔ نظم کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شاہین بچہ سمندر کے کنارے کھڑا ہے اور ایک ماہی بچہ نے اسے دیکھ کر کہا۔ دیکھو! سمندر کوئی معمولی چیز نہیں اس میں بلا کے طوفان اٹھتے ہیں۔ گرداب پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں سیکڑوں قسم کی آفتیں ہیں۔ اس کی تہ میں گراں قیمت چمکدار موتی ہیں۔ جب سمندر میں تلاطم آتا ہے۔ تو پھر کسی میں طاقت نہیں کہ اس کے سامنے ٹھہر سکے اور اپنی جان اس کے تھپیڑوں سے سلامت لے جا سکے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس پر گردشِ زمانہ سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ شاہین بچے نے سن کر ہنستے ہوئے جواب دیا اور پروں کو حرکت دی اور فضا میں بلند ہو گیا اور کہا کہ کیا تو واقف نہیں ہے جو مجھے اس سمندر کی عظمت سے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔

اے ناداں! تجھے معلوم نہیں کہ میں زمین کے رہنے والا نہیں۔ میں تو شاہین ہوں۔ اس سمندر کی حقیقت ہی کیا ہے؟ ساری دنیا میرے پروں کے نیچے ہے۔ بحرِ ظلمات ہو یا صحرائے افریقہ۔ دنیا کی کوئی شے مجھے مرعوب نہیں کر سکتی۔ اگر تو بھی اس بلندی سے آشنا ہونا چاہتا ہے تو پانی کی سطح سے اپنے آپ کو فضائے آسمانی میں لے آ۔ پھر تجھے معلوم ہو جائے گا۔ کہ سمندر کی حقیقت کیا ہے۔ سمندر کی آفات۔ اس کی موجیں۔ گرداب، نہنگ یہ سب بستی میں رہنے والوں کے لئے خطرے کا موجب ہیں۔ فضائے آسمانی کے مکین ان خطرات کو خاطر میں نہیں لاتے ؎

بگذر ز سرِ آب و بہ پہنائے ہوا سازد
ایں نکتہ نہ بیند مگر آں دیدہ کہ بیناست

شاہین بچوں کو جو اقبال نے دعائیں دی ہیں وہ اصل میں قوم کے فرزندوں کے لئے ہیں فرماتے ہیں:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

کبوتر بچہ، خود را چہ خوش گفت کہ نتواں زیست با خوئے حریری
اگر "یا ھو" زنی از مستیٔ شوق کلہ را از سرِ شاہیں بگیری

ترا نادان امید غمگساریہا ز افرنگ است دلِ شاہیں نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

علامہ اقبال زندگی میں دردِ گردہ میں ایک دفعہ مبتلا ہو گئے۔ اس مرض کی شدت نے ان کو بے حال کر دیا خدا سے مخاطب ہو کر اس تکلیف کی نجات کے لئے دعا فرماتے ہیں۔ اور دری زبان میں اپنے زندہ رہنے کے لئے دعا کے ساتھ دلیل بھی پیش کرتے ہیں اور اپنی اہمیت بھی جتاتے ہیں یہ دعا باقیاتِ اقبال میں اس طرح ہے ؎

دہ مرا فرصتِ ہُو حق دو روزے دگرے کہ دریں دیرِ کہن بندۂ بیدار کجاست
میر و مرزا بسیاست دل و دیں باختہ اند جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست
حرفِ ناگفتہ مجالِ نفسے می خواہد ورنہ ما را بہ جہاں تو سر و کار کجاست

اقبال ایک دعا میں طالب علم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے مسلمان طالب علم میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تجھے کسی طوفان سے ہم کنار کر دے یعنی تیری زندگی میں انقلاب آ جائے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تجھ میں سربلندی حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہیں۔ تیرے سمندر کی لہریں ساکت و جامد ہیں۔ تو ہمیشہ کتابیں ہی پڑھتا رہے گا اور سبق رٹنے میں منہمک رہے گا تجھے اس شغل سے کبھی فراغت نصیب نہیں ہوگی۔ اس سے تو "کتاب خواں" تو بن جائے گا مگر صاحب کتاب ہونا کبھی تیرے مقدر میں نہیں ہوگا۔ تو غیر اسلامی کتابیں پڑھ کر ان کے معانی سمجھنے کی اہلیت تو پیدا کر لے گا۔ لیکن تو الہامی کتابوں سے مستفیض نہیں ہوگا۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو　　　　کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

"غلاموں کی نماز" کے عنوان سے ضربِ کلیم میں ایک دعائیہ قطعہ ہے۔ یہ نظم اس وقت کہی گئی تھی۔ جب ترکی سے ہلالِ احمر کا ایک وفد لاہور آیا۔ اور شاہی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی۔ پیش نماز نے طویل سجدے کئے۔۔ وفد کے سربراہ نے اقبال مرحوم سے ان طویل سجدوں کے متعلق استفسار کیا۔ خدا جانے انہوں نے اس قائد کو کیا جواب دیا۔ البتہ ایک نظم دعائیہ رنگ میں اس مضمون کی "کلیاتِ اقبال" میں موجود ہے فرماتے ہیں کہ ترکی وفد کے رئیس نے نماز کے بعد مجھ سے پوچھا کہ تمہارے امام صاحب کیوں لمبے لمبے سجدے کرتے ہیں۔ اس سادہ مزاج آزاد مردِ مومن کو اس کی خبر نہ تھی کہ غلام کی نماز کیا چیز ہوتی ہے۔ مردانِ آزاد کو دنیا میں ہزاروں کام ہوتے ہیں کیونکہ ان ہی مجاہدوں سے قوموں کی ترقی۔ کے کام سرانجام پاتے ہیں۔ ان ہی کی قوت اور برکت سے قوم کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف غلام میں عملی قوت نہیں ہوتی اور ان کی زندگی کے لمحات ایک ہی طرح سے بسر ہوتے ہیں۔ نہ ان میں تڑپ ہوتی ہے نہ حرکت۔ اگر اس امام نے نماز میں طویل سجدے کئے ہیں تو اس میں حیرانگی کی کیا بات ہے۔ غلاموں کے سجدے ہمیشہ لمبے ہوتے ہیں آخری شعر دعائیہ ہے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہندوستان کی مساجد کو ایسے امام عطا فرمائے جن کی بدولت قوم زندہ ہو جائے یعنی ان کے سجدوں میں وہ سوز اور تڑپ ہو کہ جن کے فیض سے مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کر سکیں۔

کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز　　　　طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام
وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد　　　　خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام
ہزار کام ہیں مردانِ حر کو دنیا میں　　　　انھیں کے ذوقِ عمل سے ہیں امتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم　　　　کہ ہے مرور غلاموں کے روز و شب پہ حرام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے　　　　ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

بالِ جبریل میں ایک دردبھری فریاد سے دعائیہ اسلوب اختیار فرماتے ہوتے کہتے ہیں کہ اے خدا! میں ایک بندۂ آزاد ہوں۔ میں ایک فریاد لے کر تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں۔ یہ فریاد اثر کرے یا نہ کرے آپ اسے سن تو لیں۔ اے خدا! انسان ناتواں ضعیف ہے اس کی حقیقت ہی کیا۔ دنیا حوادث اور آفات کی آماج گاہ ہے۔ انسان ناقص اور اس کی قوتیں محدود ہیں یہ ان مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ سوال یہ ہے کہ سب کچھ "کرم ہے یا ستم یا تیری لذتِ ایجاد" انسانی زندگی ناپائدار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کلیاں شگفتہ ہو جاتی ہیں۔ اور فصلِ گل میں پھولوں کی بہار ہوتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ بہار چند دنوں کی مہمان ہوتی ہے میں ایک قصوروار انسان ہوں اور غریب الدیار بھی۔ لیکن میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ فرشتے جو گناہوں سے پاک ہیں وہ آپ کی نظر میں محترم سہی۔ لیکن وہ اس خرابے یعنی دنیا کو آباد نہ کر سکے۔ اس دنیا میں جو چہل پہل اور رونق ہے وہ تو میرے ہی دم سے ہے۔ انسانی جفاطلبی اور مصائب برداشت کرنے کی قوتوں ہی نے تو اس دنیا کو رونقیں بخشی ہیں۔ انسان کی طبیعت خطرات

گوارا نہیں کرتی ہے۔ وہ گلستان ہی کیا کہ جہاں گھات میں کوئی صیاد نہ ہو۔ یہ دنیا تیرے فرشتوں کے بس کی نہیں۔ یہاں حوصلے کی ضرورت ہے اور جس میں حوصلہ زیادہ ہو گا۔ وہی اس دنیا میں رہ بھی سکتا ہے کیونکہ مصیبتیں حوصلے پست کر دیتی ہیں۔ پھر فرماتے ہیں۔ ایک مستعار زندگی کے عشق کی حقیقت ہی کیا؟ اور ایک فانی کے عشق کی پائداری ہی کیا؟ وہ عشق جس کی شمع کو اجل کی پھونک بجھا سکتی ہو۔ نہ تو اس میں تڑپ کا لطف ہے اور نہ انتظار کا مزا۔ اے خداوند کریم میری بساط ہی کیا ہے میں ایک بے حقیقت انسان ہوں۔ ایک شرارے کا شعلے سے الجھنے کا یارا کہاں ؟ اے خدا پہلے مجھے جاودانی کر دے۔ ہمیشہ کی زندگی عطا فرما۔ پھر میرے دل بے قرار دل کے ذوق و شوق کی تڑپ دیکھ۔ اے خدا میں دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس جذب و شوق کی نعمت عطا فرما دے کہ جو کبھی زوال پذیر نہ ہو۔ ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے ؎

کیا عشق ایک زندگیِ مستعار کا　　کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا
وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک　　اس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا
میری بساط کیا ہے تب و تاب یک نفس　　شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا
کر پہلے مجکو زندگیِ جاوداں عطا　　پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا

کاشانہ وہ دے کہ جس کی ٹھنڈک لازوال ہو
یارب! وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

دعا کی عظمت و اہمیت سے زمانہ واقف ہے۔ عبودیت کی تکمیل کا راز دعاؤں میں مضمر ہے۔ اقبال کی دعائیں عشق و جذب تسلیم و رضا۔ عرفانِ حقیقت اور عظمت الٰہی سے مملو ہیں۔ یہ دعائیں غور و فکر اور بصیرت کو جلا بخشتی ہیں اور حقیقت کے راستے پر گامزن ہونے کی تلقین کرتی ہیں۔ مایوسی اور پست ہمتی کے لئے یہ تازیانۂ عبرت ہیں۔ بلند حوصلگی اور اولوالعزمی کے لئے ایجاب ہیں۔ عجز و نیاز اور ذوقِ نیازمندی پیدا کرتی ہیں۔ دعائے سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی کی لذت ان دعاؤں میں ملتی ہے۔ یہ دعائیں زندگی کے بہت سے سربستہ رازوں کو سمجھنے کی دعوت دیتی ہیں۔ کہیں کہیں دعاؤں میں طلب اور ستائش کے پہلو پنہاں ہیں ان کی نوعیت بھی سوال ہی کی سی ہوتی ہے۔ ایسی دعائیں بھی اس مقالے میں کہیں کہیں مل جائیں گی۔ غرض اقبال کے کلام کا ایک بہت بڑا حصہ دعاؤں پر مشتمل ہے۔

اقبال اور تربیتِ نژادِ نو

یعقوب ہاشمی آزاد کشمیر

مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ پرائمری پاس کر کے چھٹی جماعت میں داخل ہوئے تو مڈل کی اس پہلی کلاس کے لئے اردو کورس کی جو کتاب خریدنے کے لیے بتایا گیا وہ تھی "اردو کورس حصہ اوّل مؤلفہ ڈاکٹر سر محمد اقبال و حکیم احمد شجاع"۔ کتاب خریدی تو اس پر مصنفین یا مؤلفین کا نام یوں لکھا تھا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی۔ بار ایٹ لا۔ و خان صاحب حکیم احمد شجاع بی، اے۔ اسسٹنٹ سیکرٹری لیجسلیٹو اسمبلی پنجاب۔ ساتویں آٹھویں جماعت میں بھی انہی مصنفین کے مرتب کردہ اردو کورس کا حصہ دوم و سوم پڑھا اس وقت علامہ اقبال کے مقام اور ان کی عظمت کا زیادہ علم نہیں تھا۔ لیکن اس شرف کا احساس ضرور تھا کہ جس ہستی کی لکھی ہوئی کتابیں ہم پڑھ رہے ہیں وہ ایک بہت بڑے شاعر، بہت بڑے بیرسٹر اور مسلمانوں کے بہت بڑے رہنما ہیں۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب علامہ اقبال ابھی ہم میں زندہ موجود تھے اور ملت اسلامیہ کے مقدر کا روشن ترین ستارہ تھے۔

راقم کو تعلیم اور اس وقت کی ملی سیاست جس کے روشن خطوط بھی خود علامہ اقبال نے متعین کئے تھے، دونوں سے فارغ ہو کر جب عملی زندگی میں قدم رکھنے کا موقع ملا تو اتفاق سے محکمہ تعلیم ہی منصب کے لحاظ سے جولان گاہ بنا۔ قیام پاکستان تک تو نصاب تعلیم کی اہمیت اور قومی زندگی میں اس کی افادیت کا کچھ زیادہ شعور نہیں تھا لیکن قیام پاکستان کے فوراً بعد جب ذرا ذمہ داری کی پوزیشن میں آ کر ملت اسلامیہ کے نژادِ نو کی صحیح اسلامی اور اخلاقی خطوط پر تربیت کے متعلق سوچا تو معلوم ہوا کہ پنجاب کے محکمہ تعلیم نے جس کی منظور کردہ نصابی کتب آزاد کشمیر میں بھی رائج تھیں اس محسن اعظم کے ان گنت احسانات چکا دینے کے لیے پہلا کارنامہ یہ سرانجام دیا تھا کہ ان کے مرتب کردہ کورس کی کتابیں یک قلم نصاب سے خارج کر دی تھیں۔ اور ان کی جگہ کسی پبلشر کی "حصہ رسدی" کی بنا پر اوٹ پٹانگ کتابیں کورس میں داخل کر دی تھیں۔ جب ان دونوں کورسوں کے مضامین اور مواد کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پاکیزہ نظمیں، اخلاقی اور اصلاحی کہانیاں اور وہ مضامین جن میں سے ہر ایک میں ایک واضح مقصدیت سموئی ہوئی تھی اور جن سے طالب علم کے تحت الشعور میں ایک پائندہ تاثر قائم ہوتا چلا جاتا تھا یکسر غائب ہیں اور ان کی جگہ اس قسم کی بے سود و بے مقصد قسم کی کہانیاں اور مضامین کورس میں بھر دیئے گئے ہیں۔ جن سے طالب علم کے ذہن کی کسی طرح مناسب تربیت ہونا مشکل تھی۔ یہ درست ہے کہ قیام پاکستان سے قبل مسلمانوں کے علاوہ ایک اور بڑی قوم ہندوؤں کی بھی تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس وقت کے کورس میں ان غیر مسلم اقوام کے کلچر اور تہذیب و تمدن کی جھلکیاں بھی دی جانی ضروری تھیں لیکن علامہ اقبال کے مرتب شدہ کورس میں جس انداز کی چیزیں دی گئی تھیں اس کی مثال غالباً پنڈت برج نارائن چکبست کی اس نظم کے ایک شعر سے مل سکتی ہے۔ جس میں انہوں نے رام چندر جی کے بن باس پر روانہ

ہونے کا ذکر کیا ہے۔ رام چندر جی بن باس پر جانے سے پہلے اپنے پتا جی سے اجازت طلب کرنے گئے تھے۔ یہ نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام

اب اس شعر میں باپ سے متعلق بیٹے کی سعادت مندی اور فرمانبرداری کا جو سبق ملتا ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن یہ بات بھی کتنی دلچسپ اور قابلِ غور ہے کہ ہندوؤں کا اوتار جب اپنے پتا جی سے رخصت ہوتا ہے تو اللہ کا نام لے کر رخصت ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس کورس میں سے چند چیزیں جو خالصتاً غیر مسلم اقوام کی تہذیب سے تعلق رکھتی تھیں خارج بھی کی جا سکتی تھیں۔ لیکن ہماری نئی نسلوں کی یہ انتہائی بدبختی ہے کہ انھیں اپنے ان ماہرینِ تعلیم کی بدولت جو نصاب مرتب کر کے یا دارج کرنے پر مامور رہے ہیں، بانیٔ تخیلِ پاکستان حکیم الامت ترجمانِ حقیقت، دانائے راز اقبالؒ کے اس مرتب شدہ کورس سے محروم رہنا پڑا ہے۔ جس نے آج تک ان کے پیشروؤں کے اذہان میں اجالا کیا ہوا ہے۔

آج بھی اگر مڈل کلاسوں کے لئے علامہ اقبالؒ کے اس مرتب شدہ کورس کا جائزہ لیا جائے تو صاف واضح ہو جائے گا کہ علامہ اقبالؒ نژادِ نو کے اذہان کی تربیت کن خطوط پر کرنا چاہتے تھے۔

علامہ کی اپنی تربیت جن خطوط پر ہوئی اس کے بارے میں انھوں نے رموزِ خودی میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک بار ایک سائل سوال کرتا ہوا ہمارے دروازہ پر آیا۔ اس نے سوال پر اس قدر اصرار کیا کہ مجھے غصہ آیا اور میں نے اسے مارا۔ میرے مارنے پر اس کے ہاتھ سے وہ سبھی کچھ گر گیا جو وہ پہلے سے مانگ کر لایا تھا۔ یہ ساری کیفیت میرے والد بھی دیکھ رہے تھے، وہ بے حد متاسف اور مضطرب ہوئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمانے لگے۔ اقبال! جب امتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ قیامت میں جمع ہوگی۔ غازی، شہید، عابد، زاہد، عالم، حافظ سب موجود ہوں گے اور حضور شفیع المذنبین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم مجھ سے دریافت فرمائیں گے کہ ہم نے ایک بندہ مسلم کو تیری فرزندی اور نگہداشت میں دیا تھا۔ تو اسے بھی آدمی نہ بنا سکا تو میں کیا جواب دوں گا۔" علامہ نے اپنے والد گرامی کے اس استفسار کو ان دلدوز الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

اندکے اندیش و یاد آر اے پسر
اجتماعِ امتِ خیر البشر
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر
لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن
پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن

اسی طرح والدہ مرحومہ کی یاد میں لکھی جانے والی نظم میں جہاں فلسفۂ موت و حیات پر نہایت فکر انگیز اور دل آویز انداز میں روشنی

ڈالی گئی ہے وہاں والدہ سے بے پناہ محبت اور ان کی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کا ایک گہرا تاثر بھی ملتا ہے۔

علامہ کی پہلی بیوی سے دو اولادیں ہوئی تھیں ان میں ایک صاحبزادہ مسٹر آفتاب اقبال بیرسٹر ابھی بقید حیات ہے۔ اس لڑکے کو مناسب تربیت دینے اور صحیح جادۂ حیات پر استوار کرنے کے لئے حضرت علامہ کے خیالات ان کے ایک خط سے معلوم ہوتے ہیں جو انھوں نے اس وقت کے حیدر آباد کے صدر اعظم یعنی وزیر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد کو ان کے ایک خط کے جواب میں لکھے تھے۔ مہاراجہ شاد ایک صوفی منش ہندو تھے اور ساتھ ہی انتہائی علم دوست اور ادب پرور شخصیت بھی، وہ علامہ کے بے حد قدر دان تھے۔ یہ خط علامہ نے ۱۹۱۷ء میں انھیں تحریر فرمایا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں۔

"میرا ایک لڑکا دہلی کالج میں پڑھتا ہے ذہین اور طباع ہے مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آج کل اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرا دوں یا اس کی شادی کرا دوں تاکہ اس کے ناز میں نیاز آ جائے۔" اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے ذہنی انتشار اور ان کے لا ابالی پن کو دور کرنے کے لئے علامہ کے ذہن میں کون سے حل تھے۔

علامہ کی فکر کا منبع قرآن حکیم ہے۔ ان کے بعض افکار چاہے وہ نظم میں ہیں یا نثر میں، قرآن حکیم کی آیات کی تشریح معلوم ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بچپن میں ہی مکتب کی تعلیم کے دوران قرآن حکیم کو جس شوق اور احترام سے پڑھا تھا اور اس سے جو روحانی فیوض و برکات ان کو حاصل ہوئے تھے، ان سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اس لئے وہ مسلمان بچوں کو مکتب کی تعلیم کے دوران قرآن حکیم پڑھایا جانا از بس ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت علامہ کا خیال تھا کہ اس ابتدائی عمر میں مسلمان بچہ قرآنِ حکیم، ناظرہ پڑھنا سیکھے لیکن بعد میں اس کی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کرے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

علامہ کے اس خیال کی تائید ان کے ایک خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے جناب ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے نام ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں اپنے انتقال سے کوئی ڈیڑھ برس پہلے لکھا تھا۔ لکھتے ہیں:۔

"ڈیئر ماسٹر صاحب، مولوی ابو مصلح کا پتہ مجھے معلوم نہیں اس واسطے آپ کو تکلیف دیتا ہوں۔ ان کی خدمت میں عرض کیجیے کہ مجھے اس کتاب کی ضرورت ہے جس میں انہوں نے بچوں کو قرآن پڑھانے کا نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ جس روز آپ کی معیت میں وہ مجھے ملے تھے اس روز اس کتاب یا قاعدہ کا ذکر کیا تھا۔ اس قاعدہ کی جاوید کے لیے ضرورت ہے۔"

علامہ کی تیسری بیگم سے دو اولادیں ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اور محترمہ منیرہ بانو۔ علامہ کو یہ دونوں بچے بے حد پیارے تھے اور وہ خود ان کی تعلیم و تربیت کا ہر وقت خیال رکھتے تھے۔ لیکن آخر عمر میں کچھ بیماری کی وجہ سے اور کچھ قومی و ملی مسائل میں گہری دلچسپی لینے کے باعث بچوں کی تربیت کی طرف اتنی توجہ نہیں دے سکتے تھے جتنی چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی وساطت سے ان بچوں کے لئے ایک جرمن گورنس کا انتظام کیا۔ علامہ نے اپنے بچوں کے لیے اس جرمن خاتون کا انتخاب اس لیے بھی کیا تھا کہ وہ اسلامی معاشرت سے بخوبی واقف تھی۔ اس امر کا ذکر انہوں نے سر راس مسعود کے نام اپنے خط

محررہ ۸ جون ۱۹۳۷ء میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "جاوید اور منیرہ کی نگہداشت کے لیے اور گھر کے تمام انتظام کے لئے جو ایک مدت سے بگڑا ہوا ہے۔ میں نے فی الحال آزمائشی طور پر علی گڑھ سے ایک جرمن خاتون کو جو اسلامی معاشرت سے واقف ہے اور اردو بول سکتی ہے بلوایا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس کی شرافت کی بہت تعریف کی ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کامیاب ہوگئی تو مجھے بے فکری ہو جائے گی۔ جاوید کی عمر اس وقت تیرہ سال ہے اور منیرہ کی سات سال۔ ماں کی موت سے ان کی تربیت میں بہت نقص رہ گئے ہیں۔ اس واسطے میں نے مذکورہ بالا انتظام کیا ہے۔ یہ جرمن لیڈی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی بیوی کی بہن ہے۔ جو ایک مدت سے علی گڑھ میں مقیم رہی ہے۔ شاید تم انھیں جانتے ہوئے . . . :

محترم ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں کہ علامہ ان کو اور منیرہ بانو کو بچپن میں مغلیہ دور کی رفیع الشان تعمیرات یعنی مسجدیں اور قلعے دکھانے کے لیئے لے جاتے تھے۔ چنانچہ لاہور کی مغلیہ عمارات دکھانے کے بعد وہ انھیں دلی لے گئے۔ جہاں انھیں شاہجہان کا بنایا ہوا قلعہ مسجد اور دیگر پُرشکوہ عمارات دکھائیں۔ علامہ فرماتے تھے کہ یہ عمارات اسلام کے عہدِ رفتہ کی جلالت وعظمت اور شکوہ و جبروت کی آئینہ دار ہیں۔ ان کو دیکھ کر مسلمان اپنے اسلاف کے کارناموں کو یاد کرتا ہے اور اس کا ذہن عظمتوں کے ان کنگروں کی طرف لپکنا شروع کرتا ہے جو ان کے آبا و اجداد کی درخشندہ روایات کے امین ہیں۔

دراصل علامہ اسلامی معاشرہ کے داعی ہیں اور اسلامی معاشرہ کو ہی فن کی اساس سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی فنون میں فن تعمیر ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فن کی زوال پذیری دراصل ایک قوم کی مجموعی زوال پذیری کے تابع ہوتی ہے۔ جب تک قوم جاندار فعال اور متحرک رہتی ہے فن بھی توانا رہتا ہے لیکن جونہی قوم میں زوال کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں فن بھی اپنے معیار سے گرنا شروع کر دیتا ہے۔ علامہ کے نزدیک فن تعمیر کی وقعت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ ایک تو اس میں قوم کے عزم بلند وارتفاعِ مقصد کی جھلک نظر آتی ہے۔ دوسرے متعلقہ عمارت میں آرکیٹیکٹ کا جذبۂ خودی بھی متشکل ہو جاتا ہے۔ فنِ تعمیر علامہ کے خیال میں تعمیر جذبہ خودی کی ہی ایک پروجیکشن ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے سرود

علامہ ضروری سمجھتے تھے کہ بچوں کو پہلے اپنے وطن میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے آثار و نقوش دکھائے جائیں تاکہ نئی نسل اپنے وطن کی تاریخ اور اپنی تہذیب و تمدن سے کما حقہ آگاہ ہو کر بعد میں کسی بیرونی کلچر یا تہذیب سے مرعوب نہ ہو سکے۔ علامہ کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ اس "خطہ گل" میں مغلیہ فن تعمیر کے کچھ نادر شاہکار بھی ہیں۔ جن میں شالامار باغ اور نشاط باغ سرِ فہرست ہیں۔ علامہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے دونوں بچوں کو اپنی زندگی میں خود کشمیر لے جا کر یہ مقامات دکھائیں اور اس کے لئے انہوں نے ۱۹۳۷ء میں ریاست کی حکومت سے اجازت بھی طلب کی تھی لیکن وہاں سے بروقت جواب نہیں آیا۔ غالباً ہری سنگھ ڈوگرہ کو یہ خطرہ تھا کہ :

یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

ہری سنگھ نے اجازت نامہ تو بھیجا لیکن اس وقت جب ایک تو علامہ کی صحت جواب دے چکی تھی اور وہ سفر کے قابل

نہ رہے تھے اور دوسرے موسم سرما بھی شروع ہو چکا تھا۔ لیکن ہری سنگھ کی حکومت سمجھ نہ سکی کہ اس آتش نفس مغنی کے آتشیں نغمات کی بدولت کشمیر کے گل و لالہ کی آگ پہلے ہی تیز ہو چکی تھی اس کے چناروں سے حریت کے شرارے پھوٹنا شروع ہو چکے تھے اور اس کے منبر و محراب پہلے ہی اپنے عظیم ترین فرزند کا یہ پیغام لے چکے تھے کہ:

گر صاحب ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دیں بندۂ مومن کے لئے موت ہے یا خواب
. . . . اے وادیٔ لولاب

تبصرے

رین اجیارا

دوہے کی ایک اپنی فرہنگ اور ایک اپنا کلچر ہے جو اس برصغیر کے ہزاروں برس پر پھیلے ہوئے ماضی کا ثمر بھی ہے اور مظہر بھی! شاید ہی کوئی شعری صنف بیک وقت اتنی رجعت پسند اور جدیدیت نواز ہو جتنی کہ دوہے کی یہ صنف جو اپنے قدیم لہجے اور مزاج سے دستبردار ہوئے بغیر جدید دَور کے لہجے اور مزاج کو خود میں سمونے پر ہمہ وقت مستعد دکھائی دیتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس ساز کو بجانے کے لئے کوئی ایسا مغنی آئے جو قدیم کی ساری غنائیت کو جدید کے آہنگ سے ہم رشتہ کرنے پر قادر ہو۔ پرتو روہیلہ ایک ایسا ہی مغنی ہے جس نے کبیر اور میرا بائی کی روایت کو بیسویں صدی کے جہاں گرد موسیقاروں کی روایت سے ہم آہنگ کیا ہے۔ یوں کہ آپ اُسے ایک ایسے پُل سے تشبیہہ دے سکتے ہیں جس کا ایک قدم قدیم کی اَنگنائی میں ہے اور دوسرا جدید کے رن بھومی پر!

دوہے کا کلچر اس برصغیر کے پورے ثقافتی تناظر کا آئینہ دار ہے اور یہ ثقافتی تناظر دو واضح فکری دھاروں سے مل کر مرتب ہوا ہے۔ ان میں سے ایک دھارا تو وہ ہے جو اس سرزمین کی قدیم ترین ارضی تہذیب سے پھوٹا ہے اور جس میں بعد ازاں مذاہب کے سارے پھل پھول شامل ہو گئے ہیں۔ یعنی اس نے تن کی دُنیا اور ارض کی بُو باس کو تمام تر اہمیت بخشی ہے۔ بنیادی طور پر یہ فکری زاویہ پوجا اور پرستش کا قائل ہے چاہے یہ پوجا دیوی دیوتا کی ہو یا تن اور دھن کی۔ اسے آپ ایک مادی زاویۂ نگاہ بھی کہہ سکتے ہیں جو خوش باش زندگی گزارنے، دھن دولت جمع کرنے اور جسم کے تقاضوں کو سیراب کرنے کی خواہش کو ایک مسلک کے طور پر اختیار کرتا ہے اور اس حیات چند روزہ سے قدرت کا آخری قطرہ تک کشید کر لینے کا ایڈیشن دیتا ہے۔ دوسرا دھارا اُن آوارہ خرام قبائل کے مخصوص میلانات کا آئینہ دار ہے جو ازمنۂ قدیم میں سے برصغیر ہند و پاک میں آتے اور یہاں جذب ہوتے رہے ہیں مگر کے اس دھارے نے ارضی میلان کے مقابلے میں ایک ایسے آسمانی اور ماورائی اندازِ نظر کو اپنایا جو اس دنیا اور اس کے لوازم کو چند روزہ اور غیر حقیقی تصور کرتا ہے اور ماورے کی دنیا کے پسِ پشت ایک لازوال اور بے کنار حقیقت کا ادراک کرتا ہے فقیری اور درویشی، مراقبہ اور گیان دھیان، بلند اخلاقی آدرشں اور ارضی لوازم کو مسترد کرتے کا رویّہ —— یہ سب اس زاویۂ نگاہ ہی کے اثمار ہیں۔

مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں دھارے کچھ عرصہ کے لئے گنگا اور جمنا کی طرح الگ الگ بہنے کے بعد آخر ایک روز آپس میں مل گئے اور یوں سنسکرتی نے جنم لیا جو سرسوتی سے مشابہہ تھی یعنی اس میں دونوں دھاروں کا ذائقہ موجود تھا۔ یہ بات ہندوؤں کے دیوتاؤں کے ہاں بالخصوص بہت نمایاں ہے۔ مثلاً کرشن بیک وقت زرخیزی کی ایک علامت بھی ہے اور علم و آگہی کا سرچشمہ بھی۔ اپنی پہلی حیثیت میں وہ گوپیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا اور مکھن چرا کر کھاتا ہے اور اپنی دوسری حیثیت میں ارجن کے رتھ کی باگیں پکڑے اُسے حیات و کائنات کے سربستہ رازوں سے آشنا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کا دیوتا شیو ہے جو ایک طرف تو

کیلاش کی چوٹی پر بیٹھ کر گیان دھیان میں مستغرق رہتا ہے اور دوسری طرف زمین پر اتر کر نٹ راج کا خطاب پاتا ہے۔ اپنی اس موخرالذکر حیثیت میں وہ تخریب کا دیوتا ہے اور اپنے ناچ کی دھمک سے پوری کائنات کو لرزہ براندام کر دینے پر قادر ہے۔ مگر یہ تو اساطیر یا دیومالا کی باتیں ہوئیں جن کی حیثیت پروازِ تخیل کے سوا اور کچھ نہیں مگر اصلاً یہ اساطیر انسانی خواہشات ہی کے نقاب پوش روپ ہیں۔ امرِ واقعی یہ ہے کہ دو ثقافتی دھاروں کے اتصال نے اس برصغیر کے ہر باسی کی ذات کو دو طرح کی خواہشوں کی آماجگاہ بنایا ہے — یعنی ارضی سطح پر رہنے اور لطف اندوز ہونے کی خواہش۔ دوسری ارضی سطح کو مسترد کر کے ایک آفاقی نظریے کو اپنانے کی آرزو! بظاہر یہ ایک عجیب سا تضاد ہے جسے نفسیات کی زبان میں SPLET PERSONALITY بھی کہا جا سکتا ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ یہی تضاد ایک اس برصغیر کے ہر باسی کا نوشتۂ تقدیر ہے — یوں کہ اب وہ بیک وقت با اخلاق بھی ہے اور بد اخلاق بھی، تعمیر پسند بھی ہے اور تخریب نواز بھی۔ درویش صفت بھی ہے اور دنیادار بھی اور سب سے زیادہ یہ کہ تن کی دنیا کا قتیل بھی ہے اور قاتل بھی! — اس ثقافتی امتزاج نے یوں تو اس برصغیر کے باسی کو زندگی کی جملہ سطحوں پر متاثر کیا ہے تاہم دوہے میں اس امتزاج کا منظر دیدنی ہے۔

یہاں قدرے توقف فرمائیے تاکہ میں ایک بنیادی بات کی طرف آپ کو متوجہ کر سکوں۔ بات یہ ہے کہ ارضی میلان ہو یا ماورائی رویہ — یہ دونوں اپنی مجرد حیثیت میں فن کے راستے میں ایک رکاوٹ سی بن جاتے ہیں۔ جب کوئی فنکار کلیتاً ارض کی سطح پر اتر آئے اور حواس کے تابع ہو جائے تو سست رفتار ہو کر تن کی بوجھل سطح سے گویا لپٹ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ تن اور ارض کو کلیتاً مسترد کر کے ماورائی رویہ اپنا لے تو بالا بالا ہی اڑ جاتا ہے اور فن تخلیق نہیں کر پاتا۔ فن کی تخلیق میں جذبہ اور تخیل کا امتزاج ضروری ہے۔ ارضی رویہ اسے جذبے کی قوت اور گرمی مہیا کرتا ہے اور ماورائی رویہ اسے تخیل کی زرخیزی سے سرفراز کرتا ہے اور یوں تخلیق کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اس برصغیر کے ہر باسی کی ذات میں یہ دونوں رویے موجود ہیں اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ اس کی زندگی بحیثیت مجموعی جمالیاتی عناصر سے عبارت ہے۔ اس کے مقابلے میں بعض ایسی اقوام ہیں جو ارضی سطح سے پوری طرح منسلک ہیں اور اس لئے ان کی زندگی بحیثیت مجموعی مادی ہے اور ایسے طبقات بھی ہیں جنہوں نے خود پر رہبانیت اور ماورائیت کو پوری طرح مسلط کر رکھا ہے۔ ان کے ہاں زندگی بنیادی طور پر غیر ارضی یا ماورائی ہے۔ یوں دیکھئے تو ہزاروں برس پر پھیلے ہوئے تاریخ کے جزر و مد نے برصغیر ہند و پاک کو ایک ایسا جمالیاتی رویہ بخش دیا ہے جسے بروئے کار نہ لانا یا جس سے مستفید نہ ہونا کفرانِ نعمت کے مترادف ہے۔ یوں تو دیگر شعری اصناف نے بھی اس رویہ کو اپنے اندر بڑی خوبی سے جذب کیا ہے تاہم دوہا شاید وہ واحد صنف ہے جس نے زمانۂ قدیم ہی میں اسے اپنے اندر جذب کرنا شروع کر دیا تھا اور خوبی کی بات یہ ہے کہ وہ آج بھی اسے حرزِ جاں بنائے ہوئے ہے۔

معذرت خواہ ہوں کہ تناظر کو اجاگر کرنے کی دھن میں پرتو روہیلہ کے دوہوں کے ذکر میں قدرے تاخیر ہو گئی۔ مگر چونکہ حکایت لذیذ تھی اس لئے مجھے "دراز تر گفتم" کی زد میں آنا پڑا۔ دوسرے یہ تاخیر ضروری بھی تھی تاکہ پرتو روہیلہ کے دوہوں کے مزاج کو پوری طرح گرفت میں لیا جا سکے۔ خوش قسمتی سے خود پرتو روہیلہ کو بھی دوہے کے ان دونوں زاویوں کا پوری طرح احساس ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے کُند ذہن قارئین کے لئے کتاب کو بظاہر تین لیکن دراصل دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ گیان دھیان سے متعلق ہے اور دوسرا روپ رنگ سے۔ تیسرا حصہ یعنی گھر انگنائی دراصل روپ رنگ ہی کا تتمہ ہے۔ بس اتنا ہوا ہے

کہ پرتو روہیلہ نے ارضی دنیا کے بنیادی کردار یعنی عورت کے ایک روپ کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے بعینہٖ جیسے قدیم زمانے میں شعر کی شکتی کو متعدد شکتیوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شیو کی یہ شکتیاں عورت کے مختلف بہروپ میں ظاہر ہوتی تھیں چنانچہ کالی تخریبی قوت کے لئے اناپورنا تعمیری قوت کے لئے ایک علامت بن گئی۔ پرتو روہیلہ نے روپ رنگ میں عورت کے کالی روپ ہی کو پیش کیا ہے گو اس میں اپنے جمالیاتی ذوق کی آمیزش کر کے اسے خوب صورت اور لطیف لبادوں میں ملبوس بھی کر دیا ہے اور یوں جنسی کراہت کو جنسی کشش میں ڈھال دیا ہے۔ اسی طرح گھر انگنائی میں پرتو روہیلہ نے عورت کے اناپورنا روپ کا منظر دکھایا ہے ـــــ ایک ایسا روپ جو سراسر تخلیقی اور امتزاجی ہے۔ انگنائی عورت کا وہ حسین جال ہے جس کے دھاگوں میں شوہر اور بچوں کے علاوہ تن اور دھن کے دیگر سب لوازم بھی یکجا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس لئے انگنائی کی عورت کو گھر کی لکشمی کا لقب بھی ملا ہے۔ پرتو روہیلہ نے عورت کی دنیا کو روپ رنگ اور گھر انگنائی میں تقسیم کر کے اس بات کا ثبوت مہیا کیا ہے کہ وہ نہ صرف عورت کی دنیا کے ان دونوں پہلوؤں سے واقف ہیں بلکہ برصغیر کے ثقافتی تناظر میں ابھرنے والی عورت کی روایتی حیثیت کے بھی پارکھ ہیں۔

کتاب کا پہلا حصہ "گیان دھیان" سے متعلق ہے۔ اور اس کے تحت پرتو روہیلہ نے ماورائیت کے تین اہم زاویوں کو پیش کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک زاویہ تو ایشور بھگتی کا ہے جو گویا مذہب کا نچوڑ ہے۔ واضح رہے کہ پرتو روہیلہ نے بھجن اور دوہے میں جو لاپ کرایا ہے، اس سے دوہے کے مخصوص درویشانہ مسلک میں دعا یا پرارتھنا کی "مانگ" اور تقدس کا اضافہ ہوا ہے۔ دوسرا زاویہ درویشانہ مسلک کا ہے جو دوہے کی عظیم اور قدیم روایت ہی کا پرتو ہے۔ اس زاویے کے تحت نہ صرف دنیاوی لوازم سے وابستگی کو ایک پست انسانی فعل قرار دیا گیا ہے بلکہ اس مرد دانا WISE OLD MAN کی آواز بھی سنائی گئی ہے جو انسان کے بطون میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ یہ مردِ دانا پوری نسلِ انسانی کے تجربات کی آواز ہے جو پست انسانی اقدامات اور میلانات کو بنظر استہزا دیکھتی ہے اور انسان کو دوبارہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کرتی ہے۔ بھگت شاعروں کے ہاں مرد دانا کی یہ علامت بہت واضح ہے اور دوہے میں بالخصوص اس نے اپنا مؤثر اظہار کیا ہے۔ تیسرا زاویہ فلسفیانہ تفکر کا مظہر ہے اور زندگی کی ماہیت پر غور کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ یہ زاویہ بھی دوہے کی روایت کا ایک اہم حصہ ہے۔ پرتو روہیلہ نے اس زاویۂ نگاہ کے تحت جیون کے مخصوص طریق کار ہی کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اندر اور باہر کی دنیاؤں میں پیدا ہونے والی خلیج کا احساس بھی دلایا ہے۔ مثلاً جیون کی مخصوص دائرہ بنانے کی روش کے بارے میں لکھتے ہیں:

ایک اٹھے اوپر کو لوگو دوجا نیچے جائے
جیون ایک رہٹ کا چکر مت میری چکرائے

یا

ہر رستہ چلتے سے پوچھوں کوئی مجھے سمجھائے
کون سمے کی چرخی لوگو اتنی تیز گھمائے

یا

ساگر سے جب کوئی ابھاگن بوند الگ ہو جائے
سورج تاپے بھاپ بنے پھر مجسے تب مل جائے

یہ وہی جیون چکر ہے جسے ہندو مذہب کی زبان میں آواگون کا نام ملا ہے اور جس کی قید سے نجات پانا نروان کے حصول کے لئے ازبس ضروری ہے۔ پرتو روہیلہ نے اپنے دوہوں میں دوہے کے اس پورے فلسفیانہ مزاج کو نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ مثلاً "دکھ" کے فلسفے کو پرتو روہیلہ نے جگہ جگہ اپنی سوچ کا محور بنایا ہے ع

جیون ایک کنواں ہے جس میں گونجیں بس سناٹے
دکھ کی ناگن اس میں لوٹے اس کی مٹی چاٹے

یا

من میں اک انجانا دکھ ہے راتوں نیند نہ آئے
سوچ کی وہ زہریلی ناگن رہ رہ کر بل کھائے

یہ "دکھ" کوئی عام سا انسانی دکھ نہیں بلکہ پورے جیون کا وہ دکھ ہے جو قید و بند کی مسلسل کیفیت سے جنم لیتا ہے۔ بدھ مت کا پورا فلسفہ اس "دکھ" ہی کی اساس پر قائم ہے اور دکھ سے نجات پانے کو دراصل جنم جنم کے روگ سے نجات پانے کے مترادف قرار دیتا ہے۔ ان سب باتوں سے آپ اندازہ لگائیے کہ پرتو روہیلہ نے کس خوبصورتی سے دوہے کی فرہنگ اور کلچر کو اپنے دوہے کا جزوِ بدن بنایا ہے۔ انہوں نے محض سُنی سنائی اور پیش پا افتادہ باتوں سے اپنے دوہوں کو نہیں سجایا بلکہ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے دوہے کے پورے کلچر میں غواصی کر کے پہلے اس کے تمام رنگوں اور خوشبوؤں کو اپنے اوپر وارد کیا ہے، پھر خود کو ان میں سمویا ہے اور یوں من تو شدم تو من شدم کے عمل سے گزر کر ایسے دوہے لکھے ہیں جن میں زبان کی شیرینی بھی ہے اور کھنک بھی، خیال کی لطافت بھی ہے اور گمبھیرتا بھی اور تجربہ کا ایسا لمس بھی جس کے بغیر فن کی تخلیق ناممکن ہے۔ (وزیر آغا)

اقبال اور پاکستانی ادب

از: عزیز احمد۔ مرتب: طاہر تونسوی۔ ناشر: مکتبۂ عالیہ، ایبک روڈ لاہور

عزیز احمد مدت ہوئی اپنا ادبی کیریر ختم کر چکے ہیں اور اب تو کئی برس سے ٹورنٹو یونیورسٹی سے وابستگی کے سبب کینیڈا میں مقیم ہیں۔ یوں وہ پاکستان کے ادبی پیش منظر میں موجود نہیں تاہم اپنے نمایاں ادبی کنٹری بیوشن کی وجہ سے "تاریخِ ادب اُردو" میں اُن کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ناول نگاری کے ارتقا میں ان کے ناولوں (گریز، شبنم، آگ، ایسی بلندی ایسی پستی) کا بہت اہم حصہ ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب "ترقی پسند ادب" آج بھی تنقید کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ عزیز احمد کے مدتوں کے مطالعۂ اقبال کا ثمر "اقبال نئی تشکیل" ہے جسے ذخیرۂ اقبالیات میں نہایت وقیع حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب عرصے سے ایم اے اُردو

کے پرچۂ اقبالیات کی تیاری کے لیے یونیورسٹی کی طرف سے مجوزہ PRESCRIBED تین چار کتابوں میں سے ایک ہے۔ تاہم تنقید اقبال کے ضمن میں ان کا کنٹری بیوشن صرف اسی ایک کتاب تک محدود نہیں رہا۔ "اقبال نئی تشکیل" کی اشاعت (۱۹۴۷ء) کے بعد بھی انہوں نے اقبال کے فکر و فلسفہ اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر متعدد مقالات لکھے ــــ اگرچہ اُن کا ایک طویل مقالہ "اقبال کا نظریۂ فن" ان کی کتاب "اقبال نئی تشکیل" کی دوسری اشاعت (۱۹۶۸ء) کے آخر میں شامل کر دیا گیا تھا تاہم ایسے متعدد مقالات ادبی جرائد کی فائلوں میں مدفون تھے ــ موضوع کی اہمیت اور بذاتِ خود مقالات کی قدر و قیمت کے پیشِ نظر ضروری تھا کہ ان منتشر اور گم شدہ تحریروں کی بازیابی کے لیے سنجیدہ کوشش کی جاتی ــــ مقامِ مسرت ہے کہ نوجوان ادیب اور نقاد پروفیسر طاہر تونسوی اس اہم کام کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے عزیز احمد کے مقالات کو پرانے رسائل سے ڈھونڈھ نکالا اور زیرِ نظر کتاب کی صورت میں مدون کر کے شائقینِ اقبالیات کے سامنے پیش کیا ہے

"اقبال اور پاکستانی ادب" کے عنوان سے پیشِ نظر کتاب عزیز احمد کے سات مقالات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا نام کتاب میں شامل اولیں مضمون سے اخذ کیا گیا ہے۔ مؤلف کو اس بات کا شکوہ ہے کہ پاکستان کے نوجوان شعرا پر اقبال کا اثر بہت کم ہے۔ اُن کے خیال میں اس کی بڑی وجہ ترقی پسند مصنفین ہیں تاہم عزیز احمد کو یقین ہے کہ پاکستانی ادب کی مخالف تحریکیں یہاں زیادہ دن تک نہ چل سکیں گی اور نئے ادیب اور شاعر پیدا ہوں گے جو پاکستان کی ملی اور قومی وحدت کی تعمیر اور ادب میں اس کی ترجمانی کر سکیں گے اور علامہ اقبال نئے ادب اور نئے فکری رجحانات میں اُن کی رہنمائی کریں گے ــــ عزیز احمد کی یہ امید آج کئی برسوں بعد اس شکل میں حقیقت کا روپ دھار رہی ہے کہ بہت سے ثقہ ترقی پسند نہ صرف اقبال کو پسند کرنے لگے ہیں بلکہ انھوں نے پاکستان اور ملی تشخص کے حق میں بھی لکھنا شروع کر دیا ہے ــــ دوسرے مضمون "اقبال کی شاعری میں حسن و عشق کا عنصر" میں مصنف نے مطالعۂ فطرت کے حوالے سے علامہ مرحوم کے ہاں جذباتِ حسن و عشق کی مختلف کیفیتوں کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے ــــ "اقبال کا رد کردہ کلام" میں مولوی عبدالرزاق کی مرتبہ "کلیاتِ اقبال" (شائع شدہ حیدر آباد دکن، ۱۹۲۴ء) پر بحث کی گئی ہے۔ اس مجموعے میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں جنھیں علامہ اقبال نے "بانگِ درا" میں شامل نہیں کیا۔ عزیز نے رد کردہ کلام کی روشنی میں مندرجہ ذیل تین اصول دریافت کئے ہیں جو، اُن کے خیال میں "بانگِ درا" کی ترتیب کے وقت علامہ اقبال کے پیشِ نظر رہے ہوں گے۔

۱۔ وطن کے اسلامی اور ملی تصور سے متصادم اشعار و منظومات خارج کر دیے گئے۔

۲۔ زبان و بیان کے اعتبار سے کمزور اشعار رد کر دیے گئے۔

۳۔ امرا کی مدح میں لکھے گئے اشعار حذف کر دیے گئے۔

متذکرہ بالا کلیات، مولوی عبدالرزاق نے بلا اجازت مرتب اور شائع کی تھی ــــ اس پر تنازعہ پیدا ہو گیا تھا اس ضمن میں عزیز احمد لکھتے ہیں، "تصفیہ یہ ہوا کہ کلیاتِ اقبال کی فروخت بند کر دی گئی اور جتنی جلدیں غیر فروخت شدہ تھیں، وہ سب اقبال کے حوالے کر دی گئیں"۔ (ص ۳۵)

یہ بات درست نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ کلیات کی اشاعت اقبال کو ناگوار گذری کیونکہ وہ انہی دنوں "بانگِ درا" شائع کرنے والے تھے۔ مولوی عبدالرزاق کلیات شائع کر چکے تھے، وہ تصفیے کے طالب ہوئے۔ انہوں نے سر اکبر حیدری کے توسط سے علامہ اقبال کو کچھ رقم دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ اقبال اس شرط پر راضی ہوئے کہ کلیات صرف دکن کی حدود میں فروخت کی جائے (مکتوب اقبال بنام اکبر حیدری ــ "انوارِ اقبال" ص ۳۲) ــــــ "کلاسیکی نظریات پر اقبال کی تنقید" میں مؤلف نے ادب میں کلاسیکی تحریک کے بعض پہلوؤں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے کیونکہ ان پر افلاطونی اثرات غالب ہیں جو سکون پرستی کا سبق دیتے ہیں جبکہ اقبال کو حرکت و عمل کے عناصر سے ہمیشہ رغبت رہی ہے ــــــــ "اقبال کا نظریۂ فن" زیرِ نظر مجموعے کا سب سے مفصل اور طویل ترین مقالہ ہے۔ اس ضمن میں عزیز احمد نے فن کے بارے میں مختلف مکاتیبِ فکر کے نظریات کا جائزہ لیا ہے اور اقبال کے حوالے سے اُن پر تنقید بھی کی ہے اُن کے نزدیک اقبال نے سارے فنونِ لطیفہ کو زندگی اور خودی کا تابع قرار دیا ہے ــــــــ مجموعے کے آخری مضمون "کلامِ اقبال میں خونِ جگر کی اصطلاح" مختصر ہونے کے باوجود زیرِ بحث موضوع کا جامعیت کے ساتھ احاطہ کرتا ہے۔

جناب عزیز احمد کا تعلق ادب کے اُن روایتی ناقدین سے نہیں جو محض الفاظ و اصطلاحات کی رنگینی سے قارئین کو مسحور و مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ان کی تنقید اُن کے وسیع مطالعے گہری تنقیدی بصیرت اور پختہ شعور کو ظاہر کرتی ہے۔ اُن کا تجزیاتی انداز قارئین کو متاثر کرنے کے ساتھ، زیرِ بحث موضوع کے پوشیدہ گوشوں کو بھی الم نشرح کرتا چلا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے پیشِ نظر مقالات، علامہ اقبال کے شعری و ادبی افکار و نظریات کو سمجھنے میں مفید و معاون ہیں۔

پروفیسر طاہر تونسوی، اس مجموعے کی ترتیب پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے عزیز احمد کے ان مقالات کو مدون کر کے اقبالیات کے سلسلے میں ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

۲ + ۲ = ۵

مصنف: شمیم احمد۔ ناشر: قلات پبلشرز مستونگ کوئٹہ۔ صفحات: ۱۸۴۔ قیمت: پچاس روپے۔ مبصر: سلیم اختر

اپنے نام سے یہ کتاب نثری نظموں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے جبکہ ہے یہ تنقیدی مقالات کا مجموعہ لیکن ایسا مجموعہ جس کا مصنف لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرنے کا عادی ہے ہمارے ہاں تنقید شرفا کا کاروبار ہے اور وضع دار بزرگوں کا من پسند کھاجا۔ اس لئے تشریحی نوٹس ایسے مقالات میں کافی سے زیادہ مٹھاس ہوتی ہے چنانچہ ہمارے ہاں کڑوی گولیاں دینے والے ناقدین کی ہمیشہ سے کمی رہی ہے۔ شمیم احمد نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لے رکھا ہے ــ "تلخ نوا ہو لیکن کہو کلمۂ حق! اس سے عنوان کی معنویت بھی جنم لیتی ہے۔ ۲+۲ = ۴ تو سب کہتے ہیں لیکن اس ۴ کو ۵ بنانے والا فالتو عنصر حق گوئی و بے باکی ہے اور اس کی وجہ شمیم احمد کے الفاظ میں یوں ہے:

"ادب کے خالقوں کا حال بھی دیکھتے چلئے خوش وقتی اور کرسی نشینی کا لالچ، زندگی کی ساری طمانیت سے دراصل عیاشی کے سارے مواقع حاصل، شارک اسکن، کیبرے اور بال روم، چربی کی تہہ، پبلسٹی، گروپ بندی،

بہم رکے تلخ اور سنگین تجربات عرق سے ناب اوئی، خوش اوقاتی قہقہے، چہچہے، لیکن ادب میں غم پسندی کا فیشن پیچھے کھل کر ہنسنا چاہ رہے تھے مگر تخلیقی آواز بسورتی ہوئی اور رمیاتی ہوئی باہر آرہی ہے نیکی برباد گناہ لازم، نتیجہ بے لطفی اور بے کیفی۔"

کتاب کے مندرجات پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالنے سے ہی موضوعات کے تنوع اور نقاد کی سوچ کی نئی سمت کا اندازہ ہوجاتا ہے ان میں تخلیقات، تخلیقی شخصیات، ادب اور ادیبوں کے مسائل اور ادب کے تخلیقی سفر کے جائزے، الغرض ابھی کچھ ملتا ہے یوں شمیم احمد کی ستائیس سالہ ادبی زندگی کا یہ ثمر معاصر تنقید میں ایک نئی جہت بن جاتا ہے۔ چند اہم مقالات یہ ہیں: دو جبلتوں کی جنگ میں کلیہ بازی۔ تنقید کی کھڑاؤں۔ طلسم ہوشربا کی علامتی اہمیت۔ تخلیق اور تنقید کا حیاتیاتی رشتہ۔ بے ضمیری کا مسئلہ۔ کلچر کا مسئلہ۔ جذباتیت کا مسئلہ۔ اردو شاعری میں امرد پرستی کا تصور اور میر۔ اندیشہ ہائے دور و دراز۔ جدید شاعری، شاعری کی تلاش میں اور حرف آخر کے طور پر درج ۲ + ۲ = ۵۔

اس مختصر سے تبصرہ میں ان تمام مقالات کا مطالعہ ممکن نہیں لیکن ان عنوانات سے شمیم احمد کی سوچ کی سمت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

شمیم احمد خود نقاد ہیں مگر تنقید کے بارے میں وہ کسی طرح کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں چنانچہ "تنقید کی کھڑاؤں" کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"تنقید وہ واحد صنفِ ادب ہے جس کا شمار نہ "ہیئتوں" میں کیا جاتا ہے نہ "شئیوں" میں۔ جی ہاں نہ اس کا شمار تخلیق میں کیا جاتا ہے اور نہ سماجی علوم میں۔"

اسی مضمون میں آگے چل کر شمیم احمد نے لکھا ہے:

"دراصل پورے اردو ادب میں صحیح معنوں میں ایک ہی تنقید نگار پیدا ہوا ہے اور وہ ہیں کلیم الدین احمد۔"

جو نقاد تنقید کے بارے میں یہ خیال رکھتا ہو اور جو معاصر ناقدین میں سے صرف کلیم الدین احمد کو مانتا ہو اور نہ سہی تو کم از کم اس لحاظ سے ہی اس کی تنقید کا مطالعہ دلچسپ بن جاتا ہے کہ خود اس نے اپنی تنقید میں کلیم الدین احمد کے معیار کو کہاں تک ملحوظ رکھا؟ یا یہ کہ کہیں وہ خود کو پاکستان کا کلیم الدین احمد تو تسلیم نہیں کرانا چاہتا؟

سوال دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی — ؎

کوئی تبلاؤ کہ ہم تبلائیں کیا؟

(سلیم اختر)

ضبط کی دیوار

مصنف: ڈاکٹر سلیم اختر، صفحات: ۹۶، قیمت: ۶ روپے، ناشر: مکتبہ عالیہ لاہور، مبصّر: رشید امجد۔

میں اس بات کا قائل ہوں کہ کسی بھی فن پارے کو لکھنے والے کے سارے فنی سفر اور فکری تناظر میں رکھ کر دیکھا جانا چاہیے کہ ہر اچھا لکھنے والا اپنی لغت بناتا ہے اور اپنا ایک فکری دائرہ مکمل کرتا ہے، اس کے جملوں کی نشست و برخاست، اس کی بُنت؛

اس کی تکنیک اور اظہار میں ایک داخلی معنی ہمیشہ رواں رہتے ہیں، چنانچہ جب ہم اُس کے نام کے ساتھ فن پارے کو پڑھتے ہیں تو ہمیں معنی کی داخلی اور خارجی دونوں سطحوں سے آشنائی ہوتی ہے۔ یہ بات میں نے اس لئے کہی کہ میں نے "ضبط کی دیوار" کو سلیم اختر کے نام سے ملا کر پڑھا ہے۔

سلیم اختر اپنے اظہار اور سوچ کے حوالے سے اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں، نفسیات سے انھیں خاص دلچسپی ہے خاص طور پہ جنس کے نفسیاتی پہلوؤں پر انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے، مضامین کی شکل میں بھی اور افسانوں کی صورت میں بھی، یوں اُن کے نقطۂ نظر کی ایک سطح بن گئی ہے اور ان کے مخصوص اظہار سے مل کر ایک انداز متعین کرتی ہے، جو سلیم اختر کا انداز ہے۔

"ضبط کی دیوار" اپنے موضوع، بُنت اور اظہار کے حوالے سے اس انداز کی مکمل ترجمانی کرتی ہے، متوسط طبقہ کے مذہبی ماحول میں کردار کی شکست و ریخت کا مطالعہ ایک خوفناک تصویر سے دوچار ہوتا ہے۔ کہ متوسط طبقہ کے والدین اپنے بچوں کو ایک عجیب خود ساختہ ڈھانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں، ایک طرف تو وہ دنیاداری کے نقطۂ نظر سے انھیں اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ایک مخصوص دینی چھاپ بھی پسند کرتے ہیں، اس تضاد میں کردار جس طرح بے ڈھنگ اور بے ڈھب ہو جاتے ہیں وہ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا المیہ ہے، سلیم اختر نے اس المیہ کو دیکھا، محسوس کیا اور نہ صرف محسوس کیا، بلکہ اس کے نفسیاتی عوامل کی تہہ میں جھانکنے کی جرأت بھی کی ہے۔ یہ موضوع اُردو ادب کے لئے نیا نہیں ہے، منٹو سے ممتاز مفتی تک بہت سے افسانہ نگاروں نے اس پر قلم اٹھایا ہے اور چھوٹے چھوٹے جذبوں کے پیچھے چھپے بڑے بڑے نفسیاتی مسائل کی نشاندہی کی ہے، مگر سلیم اختر کا اپنا ایک انداز اور رویہ ہے، ان کی یہ کہانی آہستہ خرامی سے آگے بڑھتی ہے، اس Slow Stemno سے انہوں نے بڑا کام لیا ہے، تیز آہنگ میں لکھنا بہت آسان ہوتا ہے کہ اس میں کسی طرح کے کھردرے پن کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے لیکن آہستہ خرامی میں کہانی کو سنبھالنا اور اسے سپاٹ ہونے سے بچانا بڑا مشکل کام ہے، سلیم اختر نے یہ کمال دکھایا ہے کہ اس آہستہ خرامی کے باوجود کہانی کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور بڑا کام انہوں نے یہ کیا ہے کہ اس آہستگی میں ارشد کے بہت سے ذہنی پردے کھلتے چلے جاتے ہیں، جن سے ایک طرف تو اس کے کردار کی تکمیل کے مراحل طے ہوتے ہیں اور دوسری طرف کہانی مسلسل آگے بڑھنے کے عمل میں دکھائی دیتی ہے۔

اس کہانی کے کئی کردار ہو سکتے ہیں، ارشد، طوائف، سرفراز، حاجی صاحب لیکن میں اس کہانی کو ماحول کی کہانی سمجھتا ہوں کہ یہ سارے کردار ایک مخصوص معاشرتی جبر میں جنم لیتے ہیں، ان کا سارا رویہ، سوچ اور عمل اس مخصوص سمت اور جبر کے تابع ہے، یہ جبر طبقاتی سماج کا وہ تشدد ہے جس میں چہرے اور کردار بگڑ جاتے ہیں، جہاں کردار اپنے فطری تناظر میں پروان نہیں چڑھتے بلکہ انھیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایک طے شدہ تناظر میں ایک مقرر کردہ شکل میں اپنی افزائش کریں، حاجی صاحب خود ایک مخصوص صورت حال میں حاجی صاحب بن گئے ہیں، ارشد، حاجی صاحب کے وضع کردہ ماحول میں ایک خاص نہج میں ڈھلتا چلا گیا ہے، اس نہج نے اس کی ایک نفسیات بنا دی ہے، طوائف بھی اسی مخصوص جبر کی پیدا

کردہ ہے۔ یہی حال سرفراز اور دوسرے لوگوں کا ہے، مطلب یہ کہ اس کہانی کا ایک کردار بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے منشا سے اپنا راستہ منتخب کر سکتا ہو۔ یہ سارے کردار اس طبقاتی سماج کے زیرِ اثر ہیں جس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں، اس لئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانی اس ماحول کی کہانی ہے جس میں یہ سارے کردار جنم لیتے ہیں اور اس ماحول کے وضع کردہ راستوں پر چلتے ہیں اور اپنے اپنے انجام سے دوچار ہوتے ہیں، مرزا حامد بیگ نے اسے خواب اور گرداوٹوں کے تضاد کی کہانی کہا ہے اس قسم کا تضاد طبقاتی معاشروں ہی میں جنم لیتا ہے آزاد معاشروں میں عموماً ایسے کردار نہیں ہوتے۔ ارشد دو متضاد دنیاؤں کے درمیان معلق ہو جاتا ہے، ایک طرف اس کا حاجی باپ اور زندگی کا مخصوص فلسفہ ہے دوسری طرف فطری خواہشیں جاننے کا شوق اور لاشعور کی کارفرمائیاں ہیں، سرفراز اور اس کے ساتھی Agent catalic کے طور پر کہانی کو آگے بڑھانے میں معاونت کرتے ہیں، وہ ایک طرف تو ارشد کے ان جذبوں کو مہمیز لگاتے ہیں جو اس کے لاشعور اور ساتھ ہی ساتھ اپنی موجودہ صورتِ حال کے خلاف رَدِ عمل کے طور پر ابھرے ہیں اور دوسری طرف وہ راستہ ہموار کرتے ہیں جن پر چل کر ارشد طوائف تک پہنچتا اور اپنے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ سلیم اختر پوری کہانی میں حقیقت سے دور نہیں گئے، انہوں نے کرداروں کو ان کی سچائیوں اور اصلی تصویروں کے قریب تر رکھا ہے، یہ بھی ایک مشکل فن ہے کہ کرداروں کی بہت زیادہ سادگی اور حقیقت سے قربت انہیں اکثر مبلغ بنا کر رکھ دیتی ہے لیکن سلیم اختر نے فنی مہارت سے کام لے کر ان کی دلچسپی برقرار رکھی ہے، وہ حقیقی ہونے کے باوجود اپنا ایک داستانی تاثر بھی رکھتے ہیں۔

مجھے اے حمید کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ "ہمارے نفسیاتی افسانوں میں اکثر یہی دیکھنے میں آیا کہ تجربہ مشرقی ہے تو نفسیات یورپی، ان کے تجزیے اور تحلیل کی منطق مغربی ہے۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بہت سے افسانہ نگاروں نے یورپ کے SEX CASES کا مطالعہ کیا ہوا تھا، وہ صرف کرداروں کے نام بدل کر انہی تجربوں کو لکھ دیتے تھے اور اس سے نتائج اخذ کرتے تھے۔ یہ درست ہے کہ Sex ایک بین الاقوامی تجربہ ہے بلکہ اسے انسانی جبلت کا تجربہ کہنا چاہیے، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ سیکس کے مختلف مراحل میں اپنے اپنے معاشروں، تہذیبی رویوں اور اخلاقیات کی کارفرمائی رہتی ہے اور اسی لئے مختلف علاقوں کے رہنے والوں کے جنسی اظہار اور رویوں میں تھوڑا تھوڑا فرق آجاتا ہے، یہ بات میں نے اس لئے عرض کی ہے کہ منٹو، ممتاز مفتی اور چند ایک اور افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر ہمارے بہت سے کہانی نویسوں نے سیکس کو مغرب کے حوالے سے دیکھا ہے اور اس کا مطالعہ ان ہی تھیوریوں کی روشنی میں کیا ہے جو مغربی معاشرے کو سامنے رکھ کر وضع کی گئی ہیں، ہمارا معاشرہ اپنے مزاج اور رفتار کے حوالے سے مغرب سے خاصا مختلف ہے، اس لئے ہمارے جذبوں کے اظہاری رویے بھی الگ ہیں، سلیم اختر نے اس کا خیال رکھا ہے، انہوں نے ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح ان سارے کرداروں کا مطالعہ اپنے ماحول اور پس منظر میں کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے ہم اپنی زندگی کے ورق پلٹ رہے ہیں۔

سلیم اختر کی ایک خوبی نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا ہے کہ ان کے یہاں ایک توازن ہے، اظہار میں، بُنت میں، کرداروں کے رویہ میں، کہانی کی اٹھان میں۔ یہ خوبی ضبط کی دیوار میں بھی پوری طرح موجود ہے، کہانی ایک لمحہ کے لیے بھی کہیں ناہموار نہیں ہوتی

کردار بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرتے ہیں مگر غیر متوازن نہیں ہوتے، یہ توازن ان کے اظہار میں بھی ہے۔ جنسی معاملات کے بیان میں بڑے بڑے خود رفتہ ہو جاتے ہیں اور ایسی ایسی جملہ بازی کرتے ہیں کہ اصل کہانی ایک طرف رہ جاتی ہے، سلیم اختر ایسے مشکل مرحلوں سے بھی آسانی سے گزر گئے ہیں اور یہ توازن ہی کی خوبی ہے جو انھیں بچا لے گئی ہے۔

کہانی کی بُنت اور اٹھان میں فنکارانہ چابکدستی سے کام لیا گیا ہے، اظہار میں ایک نرمی ہے لیکن حقیقتاً یہ نرمی نہیں بلکہ اپنے پس منظر میں تیز کاٹ لیے ہوئے ہے۔ اختتام ایک ایسے موڑ پر ہوتا ہے جو اپنے پیچھے سوچنے کے لئے بہت سی باتیں چھوڑ جاتا ہے اور یوں یہ کہانی مکمل ہوتے ہوئے بھی نامکمل محسوس ہوتی ہے اور نامکمل ہوتے ہوئے بھی تکمیل کا احساس کراتی ہے۔ سلیم اختر کا سلیقہ، توازن اور فنی چابکدستی ایک ایک لفظ میں اپنی پہچان کراتے ہیں اور احمد ندیم قاسمی کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ضبط کی دیوار طویل مختصر افسانوں میں ایک اہم اضافہ ہے۔

میں اسے اردو کے طویل مختصر افسانوں میں اہم اضافہ کے ساتھ ساتھ سلیم اختر کے اپنے فنی سفر اور کہانیوں میں ایک اہم خوبصورت موڑ اور کہانی سمجھتا ہوں۔

(رشید امجد)

ڈوبتے چاند کا منظر (مجموعۂ غزل)

شاعر: ناصر زیدی، ضخامت: ۱۱۲ صفحات، سائز: $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$، قیمت: بارہ[۱۲] روپے۔

ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز، چوک اُردو بازار ۔ لاہور

کتاب کا نام ہے "ڈوبتے چاند کا منظر" — جی ہاں! یہ منظر کشی، ناصر زیدی کے پہلے شعری مجموعے سے عبارت ہے۔ نئی نئی غزلوں کا صاف ستھرا مجموعہ — ایک جواں سال شاعر کے تجرد تجسس اور جذب و کیف کا آئینہ دار — اس شاعرِ خوش بیاں کی حسین غزلوں کا مرقع، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ:

"میں فطری طور پر حُسن کا پرستار ہوں، حُسن جہاں ہو جس رنگ میں ہو، میرے دل و دماغ کی دُنیا میں ہلچل برپا کر دیتا ہے۔"

یہ ہلچل ناصر زیدی کی غزلیہ شاعری میں نت نئے تجربے کو جنم دیتی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ "میں نے اپنے ہر ہر شعر میں اپنے تجربے کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے، جیسے اور جو کچھ محسوس کیا ہے، کہا ہے۔ گویا میری شاعری سچی اور واردا تی شاعری ہے۔"

ناصر زیدی کی اس وارداتی شاعری نے صنفِ غزل کو کچھ دیا ہے چند جھلکیاں اس کی ملاحظہ کیجیے فرماتے ہیں:-

میں کون ہوں کیا ہوں سوچتا ہوں
یہ کس کو تلاش کر رہا ہوں
تو مجھ سے بچھڑ کے مطمئن ہے
میں تجھ سے بچھڑ کے مر چکا ہوں

کیا غضب ہے کہ بناوٹ کی ادا پیار لگے
مجھ کو وہ سادہ سی لڑکی بڑی پُرکار لگے
یہ عجب ہے کہ بنے پاؤں کی زنجیر طلب
شوق جب حد سے گزر جائے تو دیوار لگے

شام و سحر وہ شعلہ بدن گردشوں میں تھا
تھا روشنی کا پھول مگر ظلمتوں میں تھا
دیکھا اُسے تو آنکھ سے آنسو نکل پڑے
دریا اگرچہ خشک تھا پانی تہوں میں تھا

ناصر زیدی کا یہ اندازِ بیان ان تمام غزلوں میں نمایاں ہے جو اس کتاب کے قریب قریب سَو صفحات کو اپنے واردانی اشعار سے سجائے ہوئے ہیں۔ پچاس سے زیادہ غزلوں کا یہ مجموعہ اُردو غزل کے ارتقائی سفر میں کیا حیثیت رکھتا ہے بقول ناصر یہ دیکھنا اور پرکھنا نقادوں کا کام ہوگا۔

معلوم نہیں فکر و فن کے مستند نقاد ناصر زیدی کی غزل گوئی کے بارے میں کیا رائے قائم کریں مگر ایک عام قاری کی حیثیت سے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے بیس پچیس سال میں اُردو غزل نے جو بانکپن دکھایا اس میں ناصر زیدی کی غزلوں کا اسلوب بھی نمایاں ہے اور وہ اس لئے کہ ناصر نے اپنے شاعرانہ وجود کے اظہار کا ذریعہ ہی غزل کو بنایا ہے جو رواجی اور روایتی طور پر اس کے مزاج میں دخیل نہیں بلکہ پیمانۂ غزل کو انہوں نے اپنی واردات و کیفیات کی اثر آفریں ترجمانی کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور اپنے پُرخلوص و پُرمحبت لب و لہجے سے ہم آہنگ پایا ہے۔

مجھے حضرت احسان دانش کی اس رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو کہ: "ناصر زیدی نسلِ نَو کے نمائندہ غزل گو ہیں" تاہم ان کی غزلوں کی بے ساختگی اور پُرکشش نغمگی کو دیکھتے ہوئے یہ بات خاصی اہم ہے کہ نت نئے تجربات کے خمیر سے ان کی جوانی جواں تغزل کی تخلیق کر رہی ہے۔"

قمر جمیل کا کہنا ہے کہ "ناصر زیدی نئی غزل لکھنے والوں میں ممتاز ہیں، ان کی غزل میں بظاہر وہ ڈکشن (DICTION) ہے جو عام طور پر غزل میں استعمال ہو رہا ہے مگر اس ڈکشن کے پیچھے ناصر کا دل دھڑکتا ہے۔"

اپنے حساس دل کی معنی خیز دھڑکنوں کو پیرایۂ غزل میں ناصر نے عصری تغزل کی علامات اور حُسن و عشق کے سچے اشارات کے دامنِ رنگین پر جو نقوش اُجاگر کئے ہیں وہ نئی روشنی کے ایسے خوش رنگ پھول ہیں جن کی بہار آفرینی سے یقیناً اس سدا بہار صنفِ شاعری کی سج دھج کے امکانات نکھرا اور روشن ہوئے ہیں۔

سادگی، بے ساختگی، بے تکلفی اور بے باکی سے واردات قلبی کے اظہار میں ناصر زیدی نے غزل کی پرانی اور نئی قدروں کے خوشگوار امتزاج سے ایک ایسے لہجے کو اپنایا ہے جس میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ ہر چند کہ یہ انفرادیت ابھی اتنی جاندار نہیں جو فیصلہ کُن ثابت ہو سکے مگر اس کے خد و خال یہ بتاتے ہیں کہ مستقبل قریب میں اس کا رکھ رکھاؤ الفاظ و معانی کی مرصع کاری میں وہ کردار ادا کرے گا جو صفِ اوّل کے غزل گو شعراء کا طرۂ امتیاز ہے۔

یہ دیدہ زیب شعری مجموعہ سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار لاہور نے بڑے اہتمام سے دوبارہ شائع کیا ہے۔ بارہ روپے اس کی قیمت ہے جسے طباعت و اشاعت کی گراں بازاری کے پیشِ نظر نامناسب نہیں کہہ سکتے۔ (پروفیسر آفاق صدیقی)

اقبال کا نفسیاتی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر سلیم اختر۔ صفحات: ۳۱۶، قیمت ۲۱ روپے۔ ناشر: مکتبہ عالیہ لاہور۔ مبصر: عارف عبدالمتین۔

یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ اس نے نفسیات کو علم (SCIENCE) کی ایک باقاعدہ اور گرانقدر شاخ کے طور پر تسلیم کرنے میں بہت دیر لگا دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کائنات شناسی اور تسخیرِ کائنات کی منضبط جد و جہد کی تاریخ تو بہت طویل ہے مگر خود شناسی اور تسخیرِ ذات کے حوالے سے اس کی قواعد آشنا تگ و تاز کی تقویم انتہائی مختصر ہے، وہ خارجی دنیا کے واقعات و حادثات کے اسباب و علل کی تلاش میں تو سرگرداں ضرور رہا مگر داخلی عالم کے واردات و سانحات کی وجوہات اور ان کے محرکات کا سراغ لگانے میں سنجیدہ منصوبہ بندی کی ضرورت کم ہی محسوس کرتا رہا ہے اور پھر خارج اور داخل کے باہمی رابطوں اور اُن کی ایک دوسرے پر اثر انگیزی کو بھی اس نے اپنی علمی تحقیق کا موضوع کم ہی بنایا، مگر بہر حال اس صورتِ حال پر کفِ افسوس ملنے کی طرف راغب ہو ہی گیا اور عہدِ جدید میں اس نے نفسیات کے سلسلے میں اپنی کاوشوں کو ایسی برق رفتاری سے مجتمع کیا کہ آج وہ اپنے جذبات و افکار، اپنی آرزوؤں اور تمناؤں، اپنی ذہنی آویزشوں اور الجھنوں سے آگہی کے بارے میں اتنا تہی مایہ نہیں، جتنا کہ وہ کبھی تھا، یہی وجہ ہے کہ آج وہ فرد کی شخصیت کی پہچان اس کی عمرانی مشروطیت اور فرد و معاشرہ کے باہمی عمل و ردِّ عمل کے طویل، پیچیدہ اور پُراسرار سلسلے کو زیادہ آسانی سے اپنی گرفت میں لینے کی اہلیت رکھتا ہے اور یہ حقیقت اسی اہلیت کے اطلاق کا قدرتی نتیجہ ہے کہ اس نے نفسیات کی مدد سے فن اور فنکار کے مطالعہ کا وہ ڈھنگ سیکھ لیا ہے، جس نے اس کی ناقدانہ بافت کو زیادہ عمق اور گہرائی سے سرفراز کر دیا ہے!

یہ صداقت اپنی جگہ تکلیف دہ ہی سہی، مگر اسے تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ اردو ادب میں نفسیاتی تنقید ابھی اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے اور ابھی ہمارے نقادوں نے فن کی تفہیم و تحسین کے سلسلے میں اور فنکار کی شخصیت کی شناخت و تمیز کے بارے میں نفسیات کے حربے کی اس اہمیت کا ادراک نہیں کیا، جس نے مغربی ناقدین کے تنقیدی تجزیوں کو انتہائی پُرمایہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اس ضمن میں مزید افسوسناک بات یہ ہے کہ جن ناقدوں نے اس میدان میں قدم رکھنے کی کوشش کی ہے، اُن میں سے بہت سوں نے نفسیات دانی کے تقاضوں کی تکمیل، مطلوبہ معیار کے مطابق نہیں یا نفسیاتی اصولوں کے اطلاق میں اس ضبط، احتیاط

اور توازن کا مظاہرہ نہیں کیا، جو نفسیاتی تنقید کی صحت کے لئے ناگزیر شرط کی حیثیت رکھتا ہے، یہی وجہ کہ اُن کے استخراجِ نتائج میں کہیں افسوسناکی در آئی اور کہیں مضحکہ خیزی!

اس تناظر میں دیکھا جائے تو ڈاکٹر سلیم اختر ہمیں اردو کے نفسیاتی دبستان کے اُن معتبر پیش رووُں میں سے ایک محسوس ہوتے ہیں، جنہوں نے اپنے وسیع نفسیاتی فہم و مطالعہ، اپنے متوازن اندازِ فکر اور معروضی طرزِ استدلال سے نفسیاتی تنقید کو اعتبار بخشا ہے اور اُن کی تنقید کو اس حقیقت نے مزید مستحکم بنیاد فراہم کی ہے کہ وہ خود ایک اعلیٰ درجہ کے تخلیق کار ہونے کی وجہ سے تخلیقی عمل کی پُراسراریت سے عملاً آشنا ہیں اور تخلیق و خالق کے باہمی علائق کے سرا گیں تلنے پانے سے براہِ راست متعارف ہیں اور اس آشنائی اور تعارف کو انہوں نے ہمیشہ اپنی تنقید میں بروئے کار لانے کی کامیاب سعی کی ہے اور یوں انہوں نے اُسے باوزن اور گمبھیر بنانے کا فریضہ سرانجام دیا ہے —— "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" اسی فریضہ کی انجام دہی کا درخشاں ثبوت ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے اس تنقیدی صحیفہ میں علامہ اقبال کی شخصیت اور اُن کے فکر و فن کا نفسیاتی تجزیہ ایسے دلآویز اسلوب میں کیا ہے کہ یہ اپنے موضوع اور اس کے برتاؤ کے لحاظ سے سالِ اقبال میں شائع ہونے والی ڈھیر ساری مطبوعات میں ایک منفرد اور رفیع پیش کش کے مرتبہ پر فائز دکھائی دیتی ہے۔

علامہ اقبال کو ہمارے ادب اور ہمارے معاشرے میں بجا طور پر ایک ایسا عظیم مقام میسر آچکا ہے، جس نے قدرتی طور پر ان کی شخصیت اور اُن کے فن کے گرد تقدس و احترام کا ایسا سنہرا ہالہ بُن دیا ہے، جس کی موجودگی پہ کسی اقبال شناس کو اعتراض تو نہیں ہو سکتا مگر یہ حقیقت اپنے طور پر ہر اقبال دوست کو متردد کر سکتی ہے کہ یہ ہالہ علامہ اقبال کو اس انسان کی حیثیت میں پرکھنے اور جانچنے کے عمل میں رخنہ اندازی کر سکتا ہے، جو مثبت و منفی سبھی بشری تقاضوں کا حامل بھی ہے اور ان تقاضوں کی شناخت ہی دراصل اس کی انسانی عظمت کے صحیح خدوخال کی تعیین میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے نفسیاتی اور فنی محاکمہ کے سلسلے میں اس ہالہ کو کسی قسم کی رخنہ اندازی کا موقعہ نہیں دیا اُن کا اندازِ تحلیل و تجزیہ ایسا سائنسی ہے کہ اس نے انھیں ہر قدم پر بُت پرستی سے بھی بچایا ہے اور بُت شکنی سے بھی محفوظ رکھا ہے —— یہ کام تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا اور حق بات یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی انتقادی یافت میں تلوار کی دھار پر چلنے کے ہنر کا مظاہرہ بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ اس دوران میں بعض بڑے نازک مقام بھی آئے ہیں اور وہ ایسے مقامات سے اس سکوت کو ڈھال بنا کر گزر گئے ہیں جو ابلاغ و ترسیل کے حوالے سے دفتروں پر حاوی محسوس ہوتا ہے، مثلاً ایک مقام پر وہ علامہ اقبال اور عطیہ کے مراسم کی نوعیت اور اُن کے رابطوں کے نین نقش کی تعیین کرتے ہوئے، اور حتی الامکان معروضی طریقہ اختیار کرتے ہوئے علامہ اقبال کے اس خط کا ایک اقتباس ناظرین کے زیرِ مطالعہ لاتے ہیں، جو انہوں نے عطیہ کو لکھا اور جس میں اُنہوں نے عطیہ کی دعوتِ جنجیرہ کو قبول کرنے کے لئے دوران سفر جن صعوبتوں میں سے گزرنا پڑے گا، اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"........ اور یہ حقیقی ہفت خواں ہیں جو مجھے رستم کی شہرت دے دیں گے اگر میں اُن کو عبور کر لوں گا۔ رستم کا انعام بہت بڑا تھا اور مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ میرا انعام کیا ہو گا؟"

اس اقتباس کی پیش کش کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر نے خود کو کسی تنقید و تبصرہ کا مکلف نہیں بنایا، بلکہ ناظرین سے ایک سوال پوچھ کر جواب یوں SUGGEST کر دیا ہے:

"یہ انعام کیا ہو سکتا تھا، سوال اہم بھی ہے اور خطرناک بھی!
کوئی تبلاؤ کہ ہم تبلائیں کیا!"

واضح رہے کہ نفسیاتی تنقید کسی بھی حالت میں جزوی مطالعہ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ وہ فن اور فنکار دونوں کو حتی الامکان اُن کی کلیت میں مشاہدہ کرنے کی قائل ہے، کیونکہ زیرِ نظر فنکار کی کوئی سی تحریر، اس کا کوئی سا لفظ اور اس کا کوئی سا طورِ شخصیت اور اس کی فنکارانہ کاوشوں کی ماہیت کی تفہیم کے سلسلے میں اس قدر انکشافی نوعیت کا حامل ہو سکتا ہے کہ ناقد کو اپنی تمام آراء اور اپنی جملہ FINDINGS پر نظرِ ثانی کی ضرورت پیش آجائے۔ اس تقاضے کی تکمیل کوہ کنی کے مترادف ضرور ہے، مگر اس کے نتیجہ میں ناقد جوئے شیر لانے میں بالعموم کامیاب ہو جاتا ہے اور یہی اس کی جانفشانی کا بیش قیمت صلہ ہے ۔۔۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس منصبی جانکاہی کے معاملہ میں بخل سے کام نہیں لیا، انہوں نے اپنے ناقدانہ فیصلے صادر کرنے سے قبل اقبال کی زندگی اور فن کے متعلق جس قدر مواد خود اُن کی تصانیف، خطوط، خطبات اور شذرات وغیرہ کی صورت میں دستیاب تھا اور اُن پر دیگر مصنفین و محققین کی اہم تحریرات، تالیفات وغیرہ کی شکل میں بتنا مٹیریل میسر تھا، اس کا تفصیلی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ اپنے اوپر فرض سمجھا، یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر فیصلہ ایسے قولِ فیصل کے سے رنگ روپ کا امین بن گیا ہے جسے آسانی سے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے معروضی، منطقی اور بے لاگ طرزِ نگارش کی بدولت جہاں نفسیات کے حوالے سے بعض ناقدین کے غلط تصورات اور اُن کے غلط اطلاق کی نشاندہی کی اور اُن کی اصلاح کا فریضہ سر انجام دیا، وہاں انہوں نے اقبال کے بعض شعوری یا غیر شعوری معاندین کی اُن نوازشات کو بھی بے نقاب کیا ہے، جو انہوں نے جذباتی شدت کے زیرِ اثر روا رکھیں اور یوں علامہ اقبال کے فن اور شخصیت کے سلسلے میں پیدا ہونے والی امکانی غلط فہمیوں کے ازالے کی منصفانہ کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ہم انہیں ڈاکٹر سلام سندیلوی[1] اور سید شبیہ الحسن[2] کے تصورِ نرگسیت کی درستی کرتے اور اس کے اقبال پر اطلاق کی معقول تردید کرتے دیکھتے ہیں، وہاں سید حامد جلالی[3] کی امکانی جارحیت کا عقلی توڑ بھی فراہم کرتے ہوئے مشاہدہ کرتے ہیں۔

فکر و فن کے حوالے سے یہ کتاب یوں اہم ہے کہ اس میں علامہ اقبال کے نظریات اپنی بوقلمونیوں اور فکری ترجیحات سمیت پوری جامعیت و وضاحت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے زندگی کے فروغ و ارتقار کے حوالے سے علامہ اقبال کے مقاصد کو صرفِ نظر نہیں کیا گیا بلکہ اُن کی یوں توضیح کی گئی ہے کہ وہ ہمارے سامنے بیک وقت ملی نشاۃ الثانیہ کے نقیب بن کر بھی اُبھرتے ہیں اور انسانیت کے کارواں کے حُدی خواں بن کر بھی طلوع ہوتے ہیں اور یوں ہم اپنے اندر انہیں امروز و فردا کے

---

[1] "اردو شاعری میں نرگسیت"۔ [2] "تنقید اور تحلیل"۔ [3] "علامہ اقبال اور انکی پہلی بیوی یعنی والدہ آفتاب اقبال"۔

PERSPECTIVE میں رکھ کر دیکھنے کی استعداد کا ادراک کرتے ہیں، یہی اس کتاب کا مجموعی ثمر ہے، جس کے پیش نظر ہم اسے اقبالیات میں ایک اہم اور قیمتی اضافہ قرار دے سکتے ہیں!　　　(عارف عبدالمتین)

کلام بلھے شاہ

مرتب ڈاکٹر نذیر احمد، پبلشر پیکجز میٹڈ لاہور، قیمت: ۲۷ روپے۔

بلھے شاہ جس دور میں شعر کہہ رہے تھے۔ اس دور میں ملک پر نادر شاہ ایرانی اور احمد شاہ ابدالی کے حکمرانہ اثرات تھے اور وہ حالات سے مطمئن نہ تھے۔ وہ سچے شاعر تھے۔ اس لئے انہوں نے حاکمانِ وقت کے خلاف آواز اٹھائی۔ جس کی گونج آج تک سنائی دے رہی ہے۔ اِس طرف کتاب کے مرتب نے بھی، بڑے خوب صورت انداز میں اشارہ کیا ہے۔

"وہ آواز جو کبھی بھی اور کہیں بھی ظلم کے خلاف بلند ہوئی ہے۔ ہماری تحسین اور عقیدت کی حق دار ہے۔ ہم میں سے اکثر نے کبھی حق کی لڑائی نہیں لڑی۔ کبھی ظلم کو روکنے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کبھی ظالم کو للکارا نہیں۔ بس اپنے گوشۂ عافیت کو مستحکم کرکے زیادہ سے زیادہ اتنا کیا ہوگا کہ کسی مبہم طریق پر ظلم سے اپنی برّیت کا اظہار کر دیا ہوگا اور بعض کو اس کی بھی توفیق نہیں ہوگی اس لئے وہ جو مظلوموں کی سپر بنے اور جن کے احتجاج کی صدا ظلم کے خلاف بے باکی سے اٹھی ہماری عقیدت اُن کا حق ہو گئی۔ بلھے شاہ کی آواز بھی انہی آوازوں میں سے ایک ہے اور ہمارے احترام کی حق دار ہے۔"

بلھے شاہ کے کلام کا کوئی مصدقہ متن دستیاب نہ تھا۔ اُن کے زمانے میں ان کا کلام مدوّن نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام بے یقینیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ پریم سنگھ قصوری نے جو چاہا لکھا۔ ڈاکٹر لاجونتی نے بھی جو کچھ ٹوہ لگائی۔ اس کے مطابق اظہارِ خیال کر دیا۔ بہر حال وہ ساری باتیں ڈاکٹر صاحب کے سامنے تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے کلام بلھے شاہ کو یونہی اور روا روی میں مرتب نہیں کر ڈالا۔ جیسا کہ قبل ازیں بلھے شاہ کے کلام کے ساتھ ہُوا۔ ان کے سامنے مختلف نسخے تھے۔ مطبوعہ بھی اور قلمی بھی، انہوں نے بھی کم از کم درجن بھر مستند نسخوں کو سامنے رکھ کر، کلام کو مرتب کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ نسخہ مستند ترین نسخہ کہلانے کا حق دار ہے۔ کیونکہ اس کے ایک ایک لفظ پہ غور کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اِس کلام کے انتخاب میں، اپنے ساتھ دیگر اہلِ علم اور اہلِ قلم حضرات کو بھی شریک کیا ہے۔ مثلاً احمد راہی، اشفاق احمد، افضل صوفی، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری، استاد دامن، سلیم الرحمٰن، فیض احمد فیض اور نجم حسین سیّد نے بھی اس انتخاب میں حصہ لیا۔ یوں ایک مجموعی رائے مرتب ہوئی اور اسی کے مطابق اِس مجموعہ کو ترتیب دیا گیا۔ اس طرح بلھے شاہ کے کلام پہ جتنے بھی انتخاب چھپے۔ اُن میں یہ نسخہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جسے ہر لائبریری کی زینت بننا چاہیے۔

پیکجز لمیٹڈ نے یہ کتاب بھی اتنی ہی خوب صورت چھاپی۔ جیسی کہ وہ اس سے پہلے چھاپ چکے ہیں۔ علم و ادب کی ترویج میں اِس ادارہ کی دلچسپی حد درجہ خوشی کی بات ہے۔　　　(راجا رسالو)

نقوش کے وہ نمبر

جو

اسٹاک میں موجود ہیں

---

(۱)	اقبال نمبر	(جلد دوم)	۲۴ روپے
(۲)	منٹو نمبر		۲۴ روپے
(۳)	سالنامہ	۱۹۶۵ء	۴۵ روپے
(۴)	سالنامہ	۱۹۷۷ء	۲۰ روپے
(۵)	خطوط نمبر		۵۰ روپے
(۶)	غالب نمبر	(تیسری جلد)	۲۵ روپے
(۷)	افسانہ نمبر	۱۹۷۴ء	۱۵ روپے
(۸)	شمارہ نمبر ۱۱۴		۱۰ روپے
(۹)	شمارہ نمبر ۱۱۵		۱۰ روپے

باقی نمبر ترامیم اور اضافوں کے ساتھ دوبارہ پیش کئے جا رہے ہیں

'نقوش' کا آئندہ شمارہ 'اقبال نمبر' ہوگا۔ جو 'غیر مطبوعہ دستاویزات' پر مشتمل ہوگا

وہ کتابیں

جو اُدب کی دنیا میں اہمیت رکھتی ہیں

(۱)	تلاشِ غالب	نثار احمد فاروقی	۳۰ روپے
(۲)	محاسنِ الفاظِ غالب	نذیر احمد	۱۵ روپے
(۳)	خیر البشرؐ کے حضور	ممتاز حسن	۱۸ روپے
(۴)	درِ دل کشا	منظور الٰہی	۱۰ روپے
(۵)	بادۂ شبانہ	اختر انصاری دہلوی	۶ روپے
(۶)	من آنم	فراق گورکھپوری	۸ روپے
(۷)	اندازے	فراق گورکھپوری	۱۰ روپے
(۸)	جناب	محمد طفیل	۸ روپے
(۹)	معظم	محمد طفیل	۱۰ روپے
(۱۰)	پیچ و خم	عبد الحمید عدم	۶ روپے
(۱۱)	پھولوں کے محل	صادق حسین	۸ روپے
(۱۲)	انگلیاں فگار اپنی	اختر جمال	۲۰ روپے
(۱۳)	نوکِ زبان	عبد الحمید عدم	۵ روپے
(۱۴)	قول و قرار	عبد الحمید عدم	۵ روپے
(۱۵)	گدھے کی واپسی	کرشن چندر	۵ روپے
(۱۶)	سرکشیدہ	ادیبہ بزمی	۶ روپے
(۱۷)	مٹی کی مونا لیزا	اے حمید	۶ روپے
(۱۸)	آپ بیتی	قیسی رامپوری	۴ روپے
(۱۹)	نشو	ابو سعید قریشی	۱۰ روپے
(۲۰)	پٹھانیں اور رومان	خاطر غزنوی	۴ روپے
(۲۱)	عہد نبوی کی اسلامی سیاست	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	۸ روپے
(۲۲)	اسلام کا نظام عدل	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	۸ روپے
(۲۳)	خالد بن ولید	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	۸ روپے
(۲۴)	سودیشی ریل	شوکت تھانوی	۸ روپے
(۲۵)	قاضی جی (۳ حصے)	شوکت تھانوی (فی حصہ)	۸ روپے
(۲۶)	وغیرہ وغیرہ	شوکت تھانوی	۷ روپے
(۲۷)	بھابی	شوکت تھانوی	۸ روپے
(۲۸)	مضامین شوکت	شوکت تھانوی	۷ روپے
(۲۹)	کمی کمی	شوکت تھانوی	۷ روپے
(۳۰)	غالب کے ڈرامے	شوکت تھانوی	۷ روپے
(۳۱)	نمک مرچ	شوکت تھانوی	۷ روپے
(۳۲)	سایۂ کوہ آنچ	شوکت تھانوی	۸ روپے
(۳۳)	خدانخواستہ	شوکت تھانوی	۸ روپے
(۳۴)	مابدولت	شوکت تھانوی	۸ روپے
(۳۵)	کچھ یادیں کچھ باتیں	شوکت تھانوی	۸ روپے

ادارہ فروغِ اُردو ۔ ایبک روڈ ۔ انارکلی ، لاہور



نقوش